فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ۝ الآية
وبالنجم هم يهتدون ۝ الآية

نجم الفتاویٰ

{ جلد دوم }

کتاب الطہارۃ والصلاۃ

تالیف

شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی

مہتمم و رئیس دار الافتاء جامعہ دار العلوم یاسین القرآن

جدید ترتیب و تبویب

مفتی وقار احمد

استاذ جامعہ دار العلوم یاسین القرآن

کتاب کا نام	نجم الفتاویٰ (جلد دوم) ''کتاب الطہارۃ والصلوٰۃ''
مؤلف	حضرت شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
ترتیب وتبویب	مولانا مفتی وقار احمد صاحب (استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی)
کمپوزنگ، سیٹنگ	بھائی شکیل احمد صدیقی صاحب
سن اشاعت	۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۰۱۰ء
مطبع	پرنٹ مارک 0321-3939101, 0321-9270048
ناشر	شعبہ نشر واشاعت دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

حاصل کرنے کیلئے رابطہ کیجئے

شعبۂ نشر واشاعت، جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

0301-3452678 021-3206466 4021-38302662

مکتبۃ المعارف، اسلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

0333-2833755

نیز ملک کے تمام مشہور کتب خانوں پر بھی دستیاب ہے

فہرست کتاب الطھارۃ

فصل فی الوضوء

(وضوء کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب، مکروہات کا بیان)

﴿فصل فی الغسل﴾

(غسل کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی التیمم﴾

(تیمم کے مسائل کا بیان)

فصل في النجاسات واحكام التطهير

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

فصل فی احکام الماء

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

فصل فی احکام الجنب والمعذور

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الحیض والنفاس

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی المسح الخفین والجبیرة

(موزوں اور پٹی وغیرہ پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرقة المتعلق بالطهارة﴾

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

فہرست کتاب الصلوٰۃ

«فصل فی المواقیت»

(اوقات نماز سے متعلق مسائل و جوابات)

«فصل فی الاذان»

(اذان و اقامت سے متعلق مسائل و جوابات)

فصل فی شروط الصلاة وارکانہا وواجباتہا وسننہا وآدابہا

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی المسبوق واللاحق

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

فصل فی القراءة

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

﴿فصل فی التراویح﴾

(تراویح سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی الوتر﴾

(وتر سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی سجود السہو والتلاوۃ﴾

(سجدہ سہو اور سجدہ تلاوت کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المریض والمسافر﴾

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

فصل فی الجمعة والعیدین

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا بیان)

فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

احکام المساجد

﴿کتاب الجنائز والشہید﴾

(نماز جنازہ، تجہیز و تکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

کتاب الطہارۃ

(طہارت کا بیان)

﴿فصل فی الوضوء﴾

(وضو کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب و مکروہات کا بیان)

(۱) مسواک کی مقدار اور برش کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسواک کرنا مسنون ہے لیکن کیا ہر چھوٹی بڑی شاخ کے استعمال سے مسواک کی سنت ادا ہو جائے گی؟ یا اس کی لمبائی وموٹائی متعین ہے؟ اگر اس میں اس طرح کی تعیین ہو تو تفصیل سے بتا دیں۔

المستفتی آپ کا خیر خواہ، اجر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مسواک کی مقدار متعین ہے یعنی ایک بالشت لمبی اور ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے بقدر موٹی ہونی چاہیے اسی طرح سب سے افضل مسواک پیلو کے درخت کی ہے اس کے بعد زیتون کے درخت کی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں درخت کی شاخ کے علاوہ کوئی اور چیز استعمال کی جائے جیسے برش، کپڑا یا انگلی وغیرہ تو اس سے صفائی کی سنت تو ادا ہو جائے گی لیکن مسواک کی سنت ادا نہ ہوگی۔

لما فی الکبیری (ص ۲۲-۲۳): ثم المستحب ان یکون السواک من شجرة مرة لزیادة ازالة تغیر الفم قالوا ویستاک بکل عود الا الرمان والقصب والقصبة الاراک ثم الزیتون وان یکون طول شبر فی غلظ الخنصر

وفی الهندیة (۱/۷): ومنها السواک وینبغی ان یکون السواک من اشجار مرة لانه یطیب نکهة الفم ویشد الاسنان ویقوی المعدة ولیکن رطبا فی غلظ الخنصر وطول الشبر ولا یقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحینئذ یقوم الاصبع من یمینه مقام الخشبة.

وفی الدر المختار (۱/۱۱۳، ۱۱۵): (و) ندب امساکه (بیمناه) وکونه لینا مستویا بلا عقد فی غلظ الخنصر وطول شبر. وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه کما یقوم العلک مقامه للمرأة مع القدرة علیه.

(۲) ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو اور اس کے پاس ٹوتھ برش ہو

تو کیا وہ مسواک کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور اس سے مسواک کی سنت ادا ہو جاتی ہے؟ براہ کرم تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مسواک کا استعمال سنت مؤکدہ ہے شرعی نقطۂ نظر سے مسواک کا اطلاق اس لکڑی پر ہوتا ہے جس کو دانتوں کی صفائی کیلئے استعمال کیا جائے اور مستحب یہ ہے کہ مسواک کسی کڑوے درخت مثلاً زیتون، پیلو وغیرہ کی ہو البتہ اگر مسواک دستیاب نہ ہو تو انگلی سے بھی یہ سنت ادا ہو سکتی ہے اور یہی حکم ٹوتھ پیسٹ کا بھی ہے البتہ مسواک شرعی میں دو مستقل سنتیں ہیں (۱) لکڑی کا استعمال (۲) دانتوں (منہ کی صفائی) تو ٹوتھ برش کے استعمال سے صرف ایک کی سنت ادا ہو جائے گی البتہ لکڑی کی سنت اس سے ادا نہیں ہوگی۔

لما في الهندية (۱/۷): (ومنها السواك) وينبغي ان يكون السواك من اشجار مرة لانه يطيب نكهة الفم ويشد الاسنان ويقوي المعدة وليكن رطبا في غلظ الخنصر وطول الشبر ولا يقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحينئذ يقوم الاصبع من يمينه مقام الخشبة.

وفي المغني (۱/۹۷): ويستحب ان يكون السواك عودا لينا ينقي الفم ولا يجرحه ولا يضره ولا يتفتت فيه كالاراك والعرجون ولا يستاك بعود الرمان ولا الآس ولا الاعواد الذكية

وان استاك باصبعه او خرقة فقد قيل لا يصيب السنة لان الشرع لم يرد به ولا يحصل الانقاء به حصوله بالعود والصحيح انه يصيب بقدر ما يحصل من الانقاء ولا يترك القليل من السنة للعجز عن كثيرها.

(۳) ٹوتھ برش یا انگلی کا مسواک کے قائم مقام ہونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت ادا نہیں ہوتی لیکن میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو تو وہ انگلی کو اپنے دانتوں پر مل لے یہ مسواک کے قائم مقام ہو جائے گی تو کیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر ٹوتھ برش کو مسواک کے قائم مقام کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟ حالانکہ اس سے دانتوں کی صفائی بھی انگلی کے مقابلے میں بہر حال زیادہ اچھی ہوتی ہے؟ براہ کرم جواب آسان الفاظ میں تحریر کر کے عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مسواک کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو صورت ثابت ہے وہ یہی ہے کہ لکڑی سے مسواک کی جائے اور لکڑیوں میں بھی پیلو کے درخت کی لکڑی زیادہ پسندیدہ ہے لیکن اگر لکڑی کی مسواک اتفاقاً موجود نہ ہو تو انگلی وغیرہ سے دانت صاف کر لینا مسواک کے قائم مقام ہو سکتا ہے اور برش کا اصل حکم بھی یہی ہے کہ اگر اتفاقاً مسواک موجود نہ ہو تو اس کا استعمال قائم مقام مسواک کے ہو جائے گا۔ اور لکڑی کی مسواک کی موجودگی میں انگلی اور برش وغیرہ مسواک کے قائم مقام نہیں بنیں گے۔

لما في سنن النسائي (۱/۳): سمعت عائشة عن النبي ﷺ قال السواك مطهرة للفم مرضاة للرب.

وفي كنز العمال (۹/۳۱۱): الاصابع تجري مجرى السواك اذا لم يكن سواك (ابو نعيم في كتاب السواك عن عمرو بن عوف المزني).

وفی اعلاء السنن (۱/۴۳): ثم اعلم ان الاصابع تقوم مقام السواک عند فقدانه ... الخ.

وفی الفقه علی المذاهب الاربعة (۱/۶۸): ومن السنن المؤکدة السواک ولا یشترط ان یکون من شجر الاراک المعروف بل الافضل ان یکون من اشجار مرة لانه یساعد علی تطییب الفم وله فوائد معروفة فهو یقوی اللثة فاذا لم یجد سواکاً فان الفرشة تقوم مقامه واذا لم یجدها استاک باصبعه ویقوم مقام السواک العلک للمرأة واذا کان لا یطیقه فانه یترکه للضرورة.

وفی المفصل فی احکام المرأة والبیت المسلم (۱/۵۳): یستحب ان یستاک المسلم او المسلمة بعود من اراک فان لم یوجد او وجده واستعمل شیئاً آخر غیره جاز ذالک بشرط ان یکون هذا الشیء تحصل به تنقیة فمه وتنظیف اسنانه کالخرقة الخشنة والاشنان وقیاساً علی هذا القول یجوز استعمال فرشة تنظیف الاسنان مع المعجون الخاص للتنظیف. واذا لم یجد مایستاک به من عود السواک وغیره استعمل اصابعه فی استیاکه للحدیث الذی رواه البیهقی عن رسول الله ﷺ تجزی فی السواک الاصابع.

وفی الشامیة (۲/۱۶۸): (واستیاکه) لانه مطلوب الیه فی سائر الصلوات اعتبارا ومفاده ان المراد به الاستیاک عند القیام الی الصلوة فانه مستحب کما قدمناه فی سنن الوضوء وکذا عند الاجتماع بالناس وعلیه فیستحب قبل التوجه الیها ایضاً واما السواک فی الوضوء فانه سنة مؤکدة ولا خصوصیة للعید فیه.

(۴) مسواک سنتِ صلوٰۃ ہے یا سنتِ وضو؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ہر وضو کے وقت مسواک کرنا چاہیے اور بعض کہتے ہیں کہ نماز کے وقت مسواک کرنا مسنون ہے ان میں سے صحیح اور افضل بات کون سی ہے؟ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کیا تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ہمارے نزدیک وضو کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے اور جن احادیث میں یہ آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے وقت مسواک فرماتے تھے تو ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے وقت جب وضو فرماتے تھے اس میں مسواک فرمایا کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی شخص احتیاط کی نیت سے نماز کے وقت بھی مسواک کرلے تو درست ہے۔ بشرطیکہ اس کے مسوڑھے مضبوط ہوں اور مسوڑھوں کی وجہ سے خون وغیرہ نہ نکلے۔

لما فی فتح الملهم (۲/۲۸۸): وقد صرح کثیر من الشافعیة والحنفیة باستحباب السواک عند

الوضوء وعند القيام الى الصلوة كليهما. فمن نقل الخلاف في انه من سنن الوضوء او من سنن الصلوة فلعل مراده ان الكلام في تعيين الموضع الذي كان قصد النبي ﷺ ايجاب السواك فيه لولا ان يشق على امته فان ذلك الموضع ينبغي ان يكون محلا لمزيد تاكد الاستياك بالنسبة الى سائر المواضع وهذا البحث انما يدور على الفاظ حديث الباب

وقد صرح العلامة الرضي في شرح الكافية "ان معنى "عند" القرب حسا او معنى واما لفظة (مع) فيقال جئنا معا اي في زمان واحد وكنا معا اي في مكان واحد على الظرفية

فعلى هذا "عند" اعم من "مع" فالمعية تستلزم العندية ولا عكس. فالذي يظهر من مجموع الروايات المعروفة انه كان قصد النبي ايجاب السواك عند كل صلوة اي قريبا منها مشروعا لاجلها كالوضوء مع كل وضوء متصلا ومتعقبا بها واقعا في زمان يقع فيه الوضوء. والصريح شيء في هذا المعنى مارواه ابن حبان في صحيحه من حديث عائشة ان رسول الله ﷺ قال "لولا ان اشق على امتي لامرتهم بالسواك مع الوضوء عند كل صلوة"

وفي البحر الرائق (١/٢٢): واما ماورد من افضلية الصلوة التي بسواك على غيرها فيدل على الاستحباب وهو الحق

لكن قولهم يستحب عند القيام الى الصلوة ينافي ماتقدم من انه عندنا للوضوء لا للصلاة خلافا للشافعيؒ

وفي الشامية (١/١١٤): يظهر لي التوفيق بان معنى قولهم هو للوضوء عندنا بيان ماتحصل به الفضيلة الواردة فيما رواه احمد من قوله صلى الله عليه وسلم صلاة بسواك افضل من سبعين صلاة بغير سواك اي انها تحصل بالاتيان به عند الوضوء وعند الشافعيؒ لاتحصل الا بالاتيان به عند الصلوة فعندنا كل صلوة صلاها بذلك الوضوء لها هذه الفضيلة خلافا له ولا يلزم من هذا نفي استحبابه عندنا لكل صلوة

(۵) کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی کیا ہونی چاہیے؟ اگر اس بارے میں کوئی حدیث ہو تو حوالہ ضرور دیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: ہر قسم کی لکڑی سے مسواک کرنا جائز ہے، البتہ حضرات علماء اور ائمہ کرام کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر پیلو اور زیتون کی مسواک ہے۔ نیز مسواک کی لمبائی ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہو، جیسے روایت سے معلوم ہوتا ہے

حضرت زید بن خالدؓ جب مسجد میں تشریف لاتے تو مسواک ان کے کان پر ایسے ہوتی جیسے قلم کاتب کے کان پر ہوتا ہے۔ مسواک کی لمبائی تقریباً ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہوتی ہے۔

لما في جامع الترمذي (١/١٢): عن زيد بن خالد الجهني قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لولا أن أشق على أمتي لأمرتهم بالسواك عند كل صلوة ولأخرت صلوة العشاء إلى ثلث الليل قال: فكان زيد بن خالد يشهد الصلوات في المسجد وسواكه على أذنه موضع القلم من أذن الكاتب لا يقوم إلى الصلوة إلا استن ثم رده إلى موضعه

وفي كنز العمال (٩/٣١٣): ٢٦١٧٤: الأسوكة ثلاثة أراك فإن لم يكن فعنم أو بطم [العنم العنمة بفتحتين شجرة لطيفة الأغصان يشبه بها بنان العذارى والجمع عنم (النهاية ٣/٣١٢) بطم: الحبة الخضراء]

وفي المعجم الأوسط (١/٢٠٩) رقم ٦٨٢: عن إبراهيم بن أبي عبلة عن عبد الرحمن بن غنم الأشعري عن معاذ بن جبل رضي الله عنه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول نعم السواك الزيتون من شجرة مباركة يطيب الفم ويذهب بالحفر وهو سواكي وسواك الأنبياء من قبلي

وفي الفقه الإسلامي وأدلته (١/٣٠٠): والأفضل أن يكون من أراك ثم من النخل ثم ذو الريح الطيب ثم اليابس المندى بالماء ويكره أن يزيد طول السواك على شبر. وفي البيهقي عن جابر رضي الله عنه قال "كان موضع سواك رسول الله ﷺ موضع القلم من أذن الكاتب"

(٦) مسوڑھوں پر مسواک پھیرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت نہ ہوں تو مسوڑھوں پر مسواک کرنا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً: اگر کسی کے دانت نہ ہوں تو اس کو چاہیے کہ مسواک کے بجائے انگلی یا کسی اور نرم چیز کو سنت کی نیت سے اپنے مسوڑھوں پر پھیر لے تاکہ ثواب سے محروم نہ ہو۔

لما في البحر الرائق (١/٢١): وتقوم الأصبع أو الخرقة الخشنة مقامه عند فقده أو عدم أسنانه في تحصيل الثواب الخ

وفي الدر المختار (١/١١٥): وعند فقده أو فقد أسنانه تقوم الخرقة الخشنة أو الأصبع مقامه كما يقوم العلك مقامه للمرأة مع القدرة عليه

(۷) مسواک کو پکڑنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ مسواک کو پکڑنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے اسی طریقے سے مسواک پکڑ کر استعمال کرنا چاہئے اگر کوئی مخصوص طریقہ ہے تو اس کو مدلل بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مسواک کو دائیں ہاتھ میں پکڑنا مستحب ہے اور پکڑنے کا طریقہ فقہاء کرام نے یہ بتایا ہے کہ مسواک کو ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے کے پوروں سے اس طرح پکڑا جائے کہ چھوٹی انگلی (چھنگلی) اور انگوٹھا نیچے کی جانب رہے اور بقیہ انگلیاں اوپر کی طرف ہوں، اور انگوٹھے کو مسواک کے برش والے حصے کی جانب رکھے اور چھنگلی کی پشت کو دوسری جانب کے آخر میں اور دوسری انگلیاں ان کے درمیان میں اوپر کی جانب رہیں۔

كما في الهندية (١/[illegible]): ويستحب ان يمسكه بيمينه بان يجعل الخنصر اسفله والابهام اسفل راسه وباقي الاصابع فوقه

وفي الشامية (١/[illegible]): والسنة في كيفية أخذه أن يجعل الخنصر اسفله والابهام أسفل راسه وباقي الأصابع فوقه

(۸) دورانِ وضو اذکار کا ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران وضو جو مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں، کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنا ثابت ہیں؟ تو الفاظ نقل کریں، میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ دعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں بلکہ بعد کے فقہاء نے یہ تجویز کی ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی عبارتوں میں تو ان کا ذکر ملتا ہے، احادیث میں نہیں، تو کیا یہ بات ٹھیک ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: وضو میں دو طرح کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں، اول جو دعائیں دوران وضو پڑھی جاتی ہیں، دوم جو وضو کے بعد پڑھی جاتی ہیں، وضو کے بعد پڑھی جانے والی دعائیں شہادتین وغیرہ تو احادیث کثیرہ وصحیحہ سے ثابت ہیں، البتہ جو دعائیں یا اذکار دوران وضو پڑھے جاتے ہیں یہ روایات سے ثابت تو ہیں لیکن یہ روایات ضعیف ہیں اسی ضعف کی وجہ سے بعض حضرات جیسے علامہ نووی وغیرہ ان کا سرے سے انکار کرتے ہیں کہ ان اذکار کا کوئی ثبوت نہیں ہے، جبکہ شوافع ہی کے دوسرے فقہاء جیسے علامہ رملی وغیرہ اور خاص طور پر فقہاء احناف نے ان کو مستحب قرار دیا ہے لہذا ان اذکار کا پڑھ لینا بہتر ہے۔

كما في الهندية (١/٩): وتسمية الله تعالى عند غسل كل عضو ويقول عند المضمضة اللهم اعني على تلاوة القرآن وذكرك وشكرك وحسن عبادتك وعند الاستنشاق اللهم ارحني رائحة

الجنة ولا ترحني رائحة النار وعند غسل الوجه اللهم بيض وجهي يوم تبيض وجوه وتسود وجوه وعند غسل يده اليمنى اللهم اعطني كتابي بيميني وحاسبني حسابا يسيرا وعند غسل اليسرى اللهم لا تعطني كتابي بشمالي ولا من وراء ظهري وعند مسح رأسه اللهم اظلني تحت ظل عرشك يوم لا ظل الا ظل عرشك وعند مسح اذنيه اللهم اجعلني من الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه وعند مسح عنقه اللهم اعتق رقبتي من النار وعند غسل رجله اليمنى اللهم ثبت قدمي على الصراط يوم تزل الاقدام وعند غسل رجله اليسرى اللهم اجعل ذنبي مغفورا وسعي مشكورا وتجارتي لن تبور ويصلي على النبي ﷺ بعد غسل كل عضو.

وفي تنوير الأبصار مع الدر المختار (۱/۱۲۳): (ومن آدابه استقبال القبلة) وفي (ص ۱۲۷) (والدعاء بالوارد عنده) اي عند كل عضو وقد رواه ابن حبان وغيره عنه عليه الصلاة والسلام من طرق قال محقق الشافعية الرملي فيعمل به في فضائل الاعمال وان انكره النووي

وفي (ص ۱۲۸) (فائدة) شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه وان يدخل تحت اصل عام وان لا يعتقد سنية ذلك الحديث

(۹) وضو اور غسل کیلئے پانی کی شرعی مقدار

سوال ۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ وضو اور غسل میں کتنا پانی استعمال کرنا چاہیے نیز صاع اور مد کی موجودہ مقدار کتنی بنتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً لوگوں کے احوال اور طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے وضو اور غسل کیلئے پانی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں کہ جسے معیار بنایا جائے، البتہ وضو اور غسل میں پانی کا استعمال اس قدر ہو کہ نہ تو اتنی کمی کی جائے کہ اعضاء وضو سے پانی کا قطرہ بھی نہ ٹپکے اور نہ ہی اتنی زیادتی کی جائے کہ اسراف لازم آئے جو کہ حرام ہے۔ لہذا اعتدال کو اپنانا چاہئے جو کہ شرعاً محمود و مطلوب ہے۔

البتہ روایات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ منقول ہے کہ آپ وضو ایک مد اور غسل ایک صاع پانی سے فرماتے تھے۔ ایک مد کا وزن آدھ سیر ساڑھے پانچ چھٹانک ہے جو کہ عام طور پر ایک لوٹا پانی کے برابر ہوتا ہے، اور ایک صاع کا وزن تین سیر چھ چھٹانک جو کہ عام طور پر ایک درمیانی بالٹی کے پانی کے برابر ہوتا ہے جو معتدل طبیعت و جسم والے شخص کے وضو اور غسل کیلئے آسانی کافی ہو جاتا ہے، اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت اعتدال پر مبنی ہے۔ بصورت دیگر زائد پانی بھی استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہنچے، البتہ پانی کی مذکورہ مقدار سے کمی نہ کرنا اولیٰ ہے۔

لما في الهندية (۱/۹): ولا ينقص ماء وضوئه عن مد كذا في التبيين.

وفیہ ایضاً (۱/۹۰): ذکر فی ظاہر الروایۃ وادنیٰ مایکفی من الماء للاغتسال صاع وللتوضؤ مد قال بعض مشایخنا رحمہم اللہ تعالیٰ صاع اذا ترک الوضوء واما اذا جمع بین الوضوء والغسل فانہ یتوضأ بالمد من غیر الصاع ویغتسل بالصاع وقال عامۃ مشایخنا رحمہم اللہ الصاع کاف للغسل والوضوء جمیعا وھو الاصح قال مشایخنا ھذا بیان مقدار ادنی الکفایۃ ولیس بتقدیر لازم بل ان کفاہ اقل من ذلک ینقص منہ وان لم یکفہ زاد علیہ بقدر مالا اسراف ولا تقتیر کذا فی محیط السرخسی وکذلک لو توضأ بدون المد واسبغ وضوءہ جاز ھکذا فی شرح الطحاوی... وکل ھذا غیر لازم لاختلاف طباع الناس کذا فی شرح المبسوط.

وفی رد المحتار (۱/۱۵۸): (قولہ وقیل المقصود) الاصوب حذف قیل لما فی الحلیۃ انہ نقل غیر واحد اجماع المسلمین علی ان مایجزئ فی الوضوء والغسل غیر مقدر بمقدار وما فی ظاہر الروایۃ من ان ادنی مایکفی فی الغسل صاع وفی الوضوء مد للحدیث المتفق علیہ، کان ﷺ یتوضأ بالمد ویغتسل بالصاع الی خمسۃ امداد لیس بتقدیر لازم بل ھو بیان أدنی القدر المسنون اھ قال فی البحر حتی ان من اسبغ بدون ذلک اجزاہ وان لم یکفہ زاد علیہ لان طباع الناس واحوالھم مختلفۃ کذا فی البدائع اھ وبہ جزم فی الامداد وغیرہ.

وفی الفقہ الاسلامی (۱/۳۳۶): وعند ابی حنیفۃ وفقہاء العراق ثمانیۃ ارطال باعتبار ان المد رطلان فیکون (۳۸۰۰ غم) وفی تقدیر آخر وھو المشائع ان الصاع (۲۷۵۱ غم)

(۱۰) ہاتھ کی انگلیوں کا خلال ہاتھ دھونے سے پہلے ہوگا یا بعد میں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو میں ہاتھ کی انگلیوں کا خلال سنت ہے یہ کس وقت ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ہاتھ کی انگلیوں کا خلال وضو کے اندر ہاتھوں کو دھونے کے بعد ہوگا اس لئے کہ ہاتھوں کا دھونا فرض ہے اور تخلیل یعنی سنت ہے، وہ سنت تکمیل فرض کے لئے ہوتی ہے اس لئے انگلیوں کا خلال فرض کے بعد ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ بہشتی زیور میں تحریر فرماتے ہیں: پھر تین بار اپنا داہنا ہاتھ کہنی سمیت دھوئے پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت تین دفعہ دھوئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کرے اور انگوٹھے چھلا چوڑی جو کچھ ہاتھ میں پہنے ہوئے ہو ہلالیوے کہ کہیں سوکھا نہ رہ جاوے۔ پھر ایک مرتبہ سارے سر کا مسح کرے پھر کان کا مسح کرے۔

لما فی البنایۃ (۱/۱۳۰، ۲۰۲): (ولانہ) ای ولان تخلیل الاصابع (اکمال الفرض فی محلہ) ای فی محل الفرض... وھذا ایضا فیہ نظر لان فی حدیث وائل بن حجر رواہ البزار فی مسندہ قال شہدت

النبي ﷺ واتي بماء فاكفأ على يمينه ثلاث الحديث وفيه ثم غسل بيده اليمنى قدمه اليمنى وفصل بين اصابعه او قال خلل بين اصابعه اھ

وفي الشامي (۱/۱۱۷): اقول قد علمت من الحديث المار التقييد في تخليل اللحية بأخذ كف من ماء، وفي البحر ويقوم مقامه اي تخليل الاصابع الادخال في الماء ولو لم يكن جاريا، وفيه عن الظهيرية ان التخليل انما يكون بعد التثليث لانه سنة التثليث. والله اعلم

(۱۱) بیت الخلاء میں وضو کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے مدرسہ میں غسل خانے موجود نہیں ہیں نہ ہونے کے برابر کیونکہ بیت الخلاء اور غسل خانے ساتھ ہیں ہمارے طلباء اس میں فراغت حاصل کرتے ہیں اور غسل بھی کرتے ہیں اب بعض طلباء اس کے اندر جاکر وضو کرتے ہیں تو کیا ان کا وضو صحیح ہو جائے گا یا دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں وضو درست ہے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں البتہ چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر مسنون کا اہتمام نہیں ہوتا لہذا وضو کی دعائیں جہراً نہ پڑھی جائیں۔

لما في بذل المجهود في حل ابي داؤد (۱/۳۰): اذا دخل الخلاء اي اذا اراد دخول مكان التخلية عند قضاء الحاجة الخ الى ان قال وهذا مذهب الجمهور وقالوا من نسي يستعيذ بقلبه لا بلسانه اھ

وفي الهندية (۱/۲): ويسمي قبل استنجاء ... ولا يسمي في حال الانكشاف ولا في محل النجاسة هكذا في فتح القدير

وفي الشامية (۱/۱۰۹): الظاهر ان المراد انه يسمي قبل رفع ثيابه ان كان في غير المكان المعد لقضاء الحاجة والا فقبل دخوله فلو نسي فيهما سمي بقلبه ولا يحرك لسانه تعظيما لاسم الله تعالى

وفي الدر المختار (۱/۱۳۲): ومن منهياته التوضؤ ... في موضع نجس، لان لماء الوضوء حرمة.

(۱۲) آب زمزم سے وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہو جہاں پانی نہ ہو اور اس کے پاس آب زمزم موجود ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو کیا یہ شخص آب زمزم سے وضو کر سکتا ہے یا تیمم کر کے نماز پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اس شخص کیلئے آب زمزم سے ہی وضو کرنا ضروری ہے تیمم کرنا جائز نہیں البتہ اگر آب زمزم کم ہے اور پانی پینے کی بھی شدید ضرورت ہو تو اس کو پینے کیلئے رکھ لے اور نماز کیلئے تیمم کرے۔

لما في الخانية (۱/۴۷): ولو كان في رحله ماء زمزم وقد رصص رأس القمقمة بحمله للهدية أو ما أشبه ذلك وهو لا يخاف على نفسه العطش لا يجوز له التيمم.

وفي الدر المختار (۱/۱۷۰): (يرفع الحدث مطلقا بماء مطلق) ... (وماء زمزم) بلا كراهة.

(۱۳) آب زمزم سے وضو و غسل کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آب زمزم کو اگر استنجاء، وضو و غسل کیلئے استعمال کیا جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ کیونکہ ہمارے ہاں ایک صاحب حج کرکے آئے اور اپنے ساتھ آب زمزم بھی لائے اب جو آب زمزم لائے تھے اس کو کنویں میں ڈال دیا تاکہ یہ پانی پینے کے لئے آب زمزم بن جائے اب استعمال کیلئے یہی کنواں ہے تو کیا اس پانی سے استنجاء کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں زمزم کے پانی سے وضو اور غسل کرنا جائز ہے البتہ زمزم کے پانی سے استنجاء کرنا مکروہ ہے۔ نیز کنویں میں آب زمزم ڈالنے سے کنویں کا پانی آب زمزم کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ ماء مطلق کے حکم میں ہوگا۔

لما في الهندية (۱/۲۱): رجل في البادية معه ماء زمزم في القمقمة وقد رصص رأسها لا يجوز التيمم كذا في الخلاصة.

وفي الدر المختار (۱/۱۷۹، ۱۸۰): (يرفع الحدث) مطلقا (بماء مطلق ... وماء زمزم) بلا كراهة.

وفي الشامية (۲/۲۲۵): (قوله يكره الاستنجاء بماء زمزم) وكذا إزالة النجاسة الحقيقية من ثوبه أو بدنه، حتى ذكر بعض العلماء تحريم ذلك.

(۱۴) سبیل وغیرہ کے پانی سے وضو کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض جگہوں پر لوگوں کے پینے کیلئے جو پانی رکھا ہوتا ہے، جیسے سبیل وغیرہ کیا اس سے وضو اور غسل کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر سبیل وغیرہ میں رکھا ہوا پانی کم ہو تو وضو کرنا درست نہیں ہے، وہ پانی صرف پینے کیلئے ہوتا ہے۔ ہاں اگر پانی زیادہ ہو تو اس سے وضو کرنا بھی درست ہے، البتہ پینے کے پانی سے غسل کرنا درست نہیں ہے۔

لما في رد المحتار (۱/۲۵۳): (قوله المسبل) أي الموضوع في الحباب لأبناء السبيل. (قوله لا يمنع التيمم) لأنه لم يوضع للوضوء بل للشرب فلا يجوز الوضوء به وإن صح. (قوله ما لم يكن كثيرا) قال في شرح المنية: الأولى الاعتبار بالعرف لا بالكثرة، إلا إذا اشتبه.

(۱۵) بارش کے قطرات سے وضو کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص راستے میں جا رہا ہو اور وہاں بارش ہونے لگے اور بارش کے پانی سے اس کے اعضائے وضو بھیگ جائیں تو کیا اس سے وضو ہو جائے گا یا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً — بارش کے قطرات سے اگر اعضائے وضو مکمل بھیگ جائیں تو اس سے وضو ہو جائے گا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الدر المختار (۱/۱۵۶): لومکث فی ماء جار او حوض کبیر او مطر قدر الوضوء والغسل فقد اکمل السنة

وفی الشامیة تحته: (قوله قدر الوضوء والغسل) انظر هل المراد قدر زمنهما لو کان یصب الماء علیه بنفسه او مقدار مایتحقق فیه جریان الماء علی الاعضاء بلحظات یسیرة یتحقق فیها غسل اعضاء الوضوء مرتبة ثلاثا مع غسل باقی الجسد کذلک؟ لم اره لاتمنا.

(۱۶) بارش میں بھیگنے سے وضو کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص بارش میں بھیگ جائے تو وضو ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ بعض دفعہ گرمی کی شدت میں برف جسم کے مختلف اعضاء پر ملی جاتی ہے تو اگر وضو کے اعضاء پر برف مل لی جائے تو وضو ہو جانا چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً — اگر کوئی شخص بارش میں اس طرح بھیگ جائے کہ اعضاء وضو میں کوئی جگہ خشک نہ رہے تو وضو ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر برف اعضاء وضو پر اس طرح مل لی جائے کہ اعضاء سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگیں اور کوئی جگہ خشک بھی نہ رہے تو وضو ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

لما فی الدر المختار (۱/۱۵۶): فلو مکث فی ماء جار او حوض کبیر او مطر قدر الوضوء والغسل فقد اکمل السنة.

وفی الهندیة (۱/۳): فقی مسئلة الثلج اذا توضأ به ان قطر قطرتان فصاعداً یجوز اجماعا وان کان بخلافه فهو علی قول ابی حنیفةؒ ومحمدؒ لایجوز وعلی قول ابی یوسفؒ یجوز کذا فی الذخیرة والصحیح قولهما کذا فی المضمرات.

(۱۷) برف سے وضو کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھی سفر کے دوران بعض ایسے علاقوں میں جانا ہوتا ہے جہاں سب برف ہی برف ہوتی ہے۔ پانی بالکل نہیں ملتا تو ایسی صورت حال میں وضو کا کیا حکم ہے؟ آیا تیمم کرے یا برف سے وضو کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اس صورت میں اگر برف پگھلانے کا آلہ موجود ہو (مثلاً چولہا، برتن وغیرہ) تو اس سے برف کو پگھلا کر وضو کرے، اگر یہ سہولت میسر ہو تو تیمم کرنا جائز نہیں، بلکہ اس پانی سے وضو کرنا واجب ہے۔ اور اگر میسر نہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔ اور اگر مٹی وغیرہ بھی دستیاب نہ ہو تو پھر تشبہ بالمصلین کرے۔

لما في الهندية (۱/۲۸): وفي جمد أو ثلج ومعه آلة الذوب لا يتيمم وقيل يتيمم والظاهر الأول منهما كما لا يخفى

وفي الدر المختار (۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورين) بأن حبس في مكان نجس لا يمكنه اخراج تراب مطهر وكذا العاجز عنهما لمرض (يؤخرها عنده وقالا يتشبه) بالمصلين وجوبا

(۱۸) گرم پانی سے اور دھوپ کی شدت سے گرم ہونے والے پانی سے وضو وغسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو وغسل کرنا کیسا ہے؟ نیز آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے غسل اور وضو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو وغسل کرنا کراہت تنزیہی کے ساتھ جائز ہے۔ البتہ آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے وضو اور غسل بلا کراہت جائز ہے۔

لما في الشامية (۱/۱۷۹): (قوله مطلقا) اى سواء كان اكبر او اصغر (قوله هو ما يتبادر عند الاطلاق) اى ما يسبق الى الفهم بمطلق قولنا ماء، ولم يقم به خبث ولا معنى يمنع جواز الصلاة فخرج الماء المقيد والماء المتنجس والماء المستعمل .... ولذا قيده بعض العلماء الشادر بقوله بالنسبة للعالم بحاله. وفيه ايضاً (۱/۱۸۰) منها ان لا يكون بماء مشمس وبه صرح في الحلية مستدلا بما صح عن عمر من النهي عنه ولذا صرح في الفتح بكراهته وعلله في البحر وقال في معراج الدراية وفي القنية، وتكره الطهارة بالمشمس لقوله ﷺ لعائشة حين سخنت الماء بالشمس ((لا تفعلي يا حميراء، فانه يورث البرص)) وعن عمر مثله. فقد علمت ان المعتمد الكراهة عندنا لصحة الاثر

وان عدمها رواية، والظاهر انها تنزيهية عندنا ايضاً

(۱۹) بلی کے جھوٹے پانی سے وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص وضو کیلئے پانی کا لوٹا بھر کر رکھ دے اور بلی آ کر اس سے پی لے تو کیا باقی پانی سے وضو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً: صورت مسئولہ میں اگر اس پانی کے علاوہ پاک پانی موجود ہو تو پاک پانی سے وضو کرنا بہتر ہے اور اگر اس پانی کے علاوہ دوسرا پانی موجود نہیں تو پھر اس پانی سے وضو کرنا بلا کراہت درست ہے۔

لما في الهندية (۱/۲۴): فان اكلت فارة وشربت الماء في فورها يتنجس وان مكثت ساعة او ساعتين ثم شربت لا يتنجس هو الصحيح كذا في الظهيرية.

وفي الشامية (۱/۲۲۴): (قوله طاهر للضرورة) بيان ذلك ان القياس في الهرة نجاسة سؤرها لانه مختلط بلعابها المتولد من لحمها النجس لكن سقط حكم النجاسة اتفاقاً بعلة الطواف المنصوصة بقوله ﷺ انها ليست بنجسة انها من الطوافين عليكم والطوافات اخرجه اصحاب السنن الاربعة وغيرهم.

(۲۰) پرنالے کے پانی سے وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی اور ہمارے گھر کا پانی ختم ہو چکا تھا تو نماز کے وقت میں نے پرنالے والے پانی سے وضو کر لیا اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ پرنالے والے پانی سے وضو یا غسل کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً: صورت مسئولہ میں اگر پرنالے سے آنے والے پانی کا رنگ، بو یا مزہ کسی نجاست وغیرہ سے بدلا نہ ہو تو اس سے وضو وغسل درست ہے۔

وفي الهندية (۱/۱۷): وفي بعض الفتاوى قال مشائخنا المطر مادام يمطر فله حكم الجريان حتى لو اصاب العذرات على السطح ثم اصاب ثوبا لا يتنجس الا ان يتغير.

وفي الشامية (۱/۱۸۸، ۱۸۹): وعلى هذا ماء المطر اذا جرى في الميزاب وعلى السطح عذرات فالماء طاهر وان كانت العذرة عند الميزاب او كان الماء كله او نصفه اكثره يلاقي العذرة فهو نجس والا فطاهر وعلى ما رجحه الكمال قال في الحلية ينبغي ان لا يعتبر في مسألة السطح سوى

(۲۶) ناخن میں خشک آٹے کے ہوتے ہوئے وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی لڑکی کے ناخن میں آٹا لگ کر سوکھ گیا ہو اور دوران وضو آٹے کی نیچے والی جگہ پر پانی نہ پہنچا ہو نیز اس نے وضو پورا ہو جانے کے بعد دیکھا کہ آٹا لگا ہوا ہے جو کہ خشک ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ پورا وضو کرے یا صرف آٹا کھرچ کر اس جگہ تک پانی پہنچائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: وضو کے اندر موالات یعنی (اعضاء کو پے در پے دھونا) اور ترتیب کی رعایت رکھنا سنت ہے اور صورت مسئولہ میں صرف موالات اور ترتیب کی رعایت باقی نہیں رہی لہذا آٹا کھرچ کر صرف اس جگہ تک پانی پہنچا دینا کافی ہے۔

في فتاوى قاضي خان (١/٢٠): ولو كان على يديه خبز ممضوغ قد جف وبقي، والغسل لا يخرج من الجنابة حتى يدلك ذلك الموضع ويجري الماء تحته لأنه لا حرج فيه.

وفي الطحطاوي على الدر المختار (١/٩٤): (قوله حتى ما تحت الدرن) قال في البحر والدرن اليابس في الأنف كالخبز الممضوغ والعجين يمنع تمام الاغتسال

(۲۷) ناخنوں کے اندر میل وضو اور غسل میں حائل نہیں ہوتا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے ناخن بڑے بڑے ہوتے ہیں اور ان کے اندر میل خوب ہوتا ہے بظاہر اس میل کے اندر پانی کا جانا بھی مشکل ہے جب یہ لوگ وضو یا غسل کریں گے تو ان کے وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ناخنوں کے اندر صرف میل ہو تو وضو اور غسل میں حائل نہیں ہوتا۔ لہذا ایسے لوگوں کا وضو و غسل درست ہو جائے گا البتہ بڑے بڑے ناخن رکھنا خلاف سنت ہے۔

وفي خلاصة الفتاوى (١/٢٢): وما تحت الأظافير من أعضاء الوضوء حتى لو كان فيه عجين يجب إيصال الماء إلى ما تحته وفي الوسخ لا، وكذا الطين القروي والمصري سواء.

وفي التاتارخانية (١/١٥١): وفي الخانية وما يكون على البدن يقال بالفارسية فشماخ (كذا) لا يمنع عن تمام الغسل لأنه يتولد من البدن بمنزلة الدرن.

وفي الهندية (١/٣): وفي الجامع الصغير سئل أبو القاسم عن وافر الظفر الذي يبقى في أظفاره الدرن أو الذي يعمل عمل الطين أو المرأة التي صبغت أصبعها بالحناء أو الصرام أو الصباغ قال كل ذلك سواء يجزيهم وضوءهم إذ لا يستطاع الامتناع عنه إلا بحرج والفتوى على الجواز من غير

نحو عجین) ای کعلک وشمع وقشر سمک وخبز ممضوغ متلبد ۔۔۔ (قوله ان صلبا) ای ان کان ممضوغا مضغا متاکدا بحیث تداخلت اجزاءہ وصارله لزوجة وعلاکة کالعجین الخ

(۲۹) ہاتھوں پر رنگ لگ جانے کی صورت میں وضو اور غسل کا حکم

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رنگ سازی کا کام کرتا ہوں تو میرے ہاتھوں پر رنگ لگ جاتا ہے جب نماز کا وقت آجاتا ہے تو میں وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں تو کیا رنگ کے لگ جانے کی صورت میں وضو اور غسل ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ اگر رنگ ایسا ہے کہ اعضاء وضو یا جسم پر اس کی تہہ جم جاتی ہے، جیسے گوندھے ہوئے آٹے کی تہہ اور اس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ پاتا تو وضو اور غسل کی صحت کیلئے ایسے رنگ کا ہر حال میں جسم سے صاف کرنا ضروری ہوگا اور اگر رنگ پانی کے ساتھ حل ہو جاتا ہے اور وہ پانی کو جسم تک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تو ایسے رنگ کو اگر صاف نہ بھی کیا جائے تو بھی وضو اور غسل درست ہو جائے گا۔ اور اگر رنگ ناخن میں سرایت کر چکا ہے اور اس کو صاف کرنا اذیت سے خالی نہیں اور اسی طرح دھونے کے باوجود بھی رنگ ہاتھوں پر برقرار ہے تو حرج واذیت کی وجہ سے وضو اور غسل درست ہو جائیں گے اور اگر ناخن طویل ہیں تو ان کو لازمی طور پر کاٹ لیا جائے۔

لما فی الهندیة (۱/۴): وما تحت الاظافیر من اعضاء الوضوء حتی لو کان فیه عجین یجب ایصال الماء الی ما تحته کذا فی الخلاصة واکثر المعتبرات...... سئل ابو القاسم عن وافر الظفر الذی یبقی فی اظفاره الدرن او الذی یعمل عمل الطین والمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء أو الصرام أو الصباغ قال کل ذالک سواء یجزیهم وضوءهم اذ لا یستطاع الامتناع عنه الا بحرج والفتوی علی الجواز من غیر فصل بین المدنی والقروی کذا فی الذخیرة۔

وفی الدر المختار (۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة ۔۔۔ (وتراب) وطین ولو (فی ظفر مطلقاً) ای قرویا او مدنیا فی الاصح بخلاف نحو عجین

(وفی الشامیة تحته): (قوله بخلاف نحو عجین) ای کعلک وشمع وقشر وسمک وخبز ممضوغ متلبد جوهرة ۔۔۔ نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیة فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء۔

(۳۰) پاؤں کی پھٹن پر دوا لگانے کے بعد وضو کا حکم

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سردیوں میں عام طور پر پاؤں پھٹ جاتے ہیں اگر ان پر

لیکن اگر ضرورت کی بناء پر ہو تو جائز ہے۔

اب اگر دانت میں دوا وغیرہ بھری ہے تو اس پر پانی کا گزر جانا کافی ہے اسی سے وضوء غسل میں سنت و فرض ادا ہو جائے گا، اور سونے یا چاندی کا خول ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس خول کو بلا مشقت نکالا جا سکتا ہے یا نہیں اگر نکالا جا سکتا ہے تو نکالنا ضروری ہوگا بغیر نکالے وضوء ہو جائے گا لیکن غسل درست نہ ہوگا اور اگر بلا مشقت نہیں نکالا جا سکتا تو پھر نکالنا ضروری نہیں بلکہ اوپر سے پانی کا گزر جانا کافی ہے۔

لمافي الهندية (۱/۳۵): ولو انكسر ظفره فجعل عليه دواء او علكا فان كان يضره نزعه مسح عليه وان ضره المسح تركه

وفيها ايضا (۵/۳۳۶): قال محمد في الجامع الصغير ولا يشد الأسنان بالذهب ويشدها بالفضة يريد به اذا تحركت الاسنان وخيف سقوطها فاراد صاحبها ان يشدها يشدها بالفضة ولا يشدها بالذهب وهذا قول أبي حنيفة وقال محمد يشدها بالذهب ايضا۔

وفي الدر المختار (۶/۳۴۱): (ولا يشد سنه) المتحرك (بذهب بل بفضة) وجوزهما محمد (ويتخذ انفا منه) لان الفضة تنتنه

وفي الشامية (لان الفضة تنتنه) الاولى تنتن بلا ضمير واشار الى الفرق للامام بين شد السن واتخاذ الانف فجوز الانف من الذهب لضرورة نتن الفضة لان المحرم لا يباح الا لضرورة وقد اندفعت في السن بالفضة فلا حاجة الى الاعلى وهو الذهب

(۳۳) وضو میں زائد انگلیوں کے دھونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کے ہاتھ میں پانچ سے زائد انگلیاں ہوتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں کے پاؤں کے ساتھ چھوٹے سے پاؤں کی شکل ہوتی ہے، کیا وضو کے فرائض میں ان زائد اعضاء کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟ اگر کسی نے ان اعضاء کو نہیں دھویا تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر زائد انگلی پاؤں وغیرہ میں عضو اصلی کی طرح حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت موجود ہو تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر اس میں حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت نہ ہو تو یہ زائد عضو شمار ہوگا، اب یہ عضو اگر محل فرض وضو میں نکل آیا تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر غیر محل فرض وضو میں نکل آیا تو پھر دیکھا جائے گا کہ عضو اصلی کے محاذات میں ہے یا نہیں اگر عضو اصلی کے محاذات میں ہو تو دھونا لازم ہے اور اگر عضو اصلی کے محاذات میں نہ ہو تو دھونا لازم نہیں البتہ مستحب ضرور ہے۔

لمافي الهندية (۱/۴): ويجب غسل كل ما كان مركبا على اعضاء الوضوء من الاصبع الزائدة والكف الزائدة كذا في السراج الوهاج.

المشايخ كمافي القنية عن المحيط. (الشامي ص ۱۵۳)

(قوله لم يصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غير ممكن حلية.

(قوله به يفتى) صرح به في المنية عن الذخيرة في مسألة الحناء والطين والدرن معللا بالضرورة. قال في شرحها ولان الماء ينفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته، والمعتبر في جميع ذلك نفوذ الماء ووصوله الى البدن اهـ. لكن يرد عليه ان الواجب الغسل وهو اسالة الماء مع التقاطر كما مر في اركان الوضوء والظاهر ان هذه الاشياء تمنع الاسالة فالاظهر التعليل بالضرورة، ولكن قد يقال ايضا ان الضرورة في درن الانف اشد منها في الحناء والطين لندورهما بالنسبة اليه مع انه تقدم انه يجب غسل (۱) ماتحته فينبغي عدم الوجوب فيه ايضا تامل . . الدرن الوسخ، واشار بهذا الى ان المراد بالدرن هنا المتولد من الجسد وهو ما يذهب بالدلك في الحمام بخلاف الدرن الذي يكون في محاذاة الانف فانه لو يابسا يجب ان يصل الماء الى ماتحته كمامر (قوله بخلاف نحو عجين) اى كعلك وشمع وقشر سمك وخبز ممضوغ متلبد جوهرة، لكن في النهر ولو في اظفاره طين او عجين فالفتوى على انه مغتفر قرويا كان او مدنيا اهـ نعم ذكر الخلاف في شرح المنية في العجين واستظهر المنع لان فيه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء (قوله به يفتى) صرح به في الخلاصة وقال لان الماء شيء لطيف يصل تحته غالبا اهـ ويرد عليه ما قدمناه آنفا ومفاده عدم الجواز اذا علم انه لم يصل الماء تحته: قال في الحلية وهو اثبت. (الشامي ص ۱۵۴)

(۱) (قوله انه يجب غسل الخ) فيه انه لا يقال ذلك مع وجود النص بخلافه وانما يلزم التامل في وجه الفرق، ويظهر ان علة عدم منع الطهارة في هذه الاشياء الضرورة مع وجود وصول الماء ولو بغير التقاطر، بخلاف درن الانف فان الضرورة وجدت فيه الا ان الوصول لم يوجد، وهذا هو الفرق، ويؤيده اكتفاؤهم بتحريك الخاتم الضيق مع انه يمنع الاسالة تامل اهـ.

(۳۵) وضو اور غسل میں مصنوعی ٹانگ کے دھونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں جہاد افغانستان میں شریک ہوا پانچ چھ بار لڑائی کے بعد میرے پاؤں میں گولی لگ گئی جس کی وجہ سے بیکار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے میری ٹانگ گھٹنے سے نیچے کاٹ دی، اب میں نے اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگوائی ہے تو کیا وضو اور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: وضو اور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری نہیں۔ البتہ غسل میں مصنوعی ٹانگ کو نکال کر باقی بدن کا دھونا

(۳۷) ریل کے دوسرے درجے کے مسافر کیلئے پہلے درجے میں جا کر وضوو غسل کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ ریل سفر کرتے ہوئے اکانومی درجے میں سفر کرنے والے مسافر کیلئے اکانومی ڈبے میں پانی ختم ہونے کی صورت میں وضو کرنے کیلئے یا بوقت حاجت غسل کرنے کیلئے اے سی اور اس ریل کار وغیرہ میں جا کر وضو یا غسل کرنا شرعاً کیسا ہے؟ واضح رہے کہ (۱)۔ اکانومی ڈبے کی ٹکٹ اور دوسرے درجات کی ٹکٹوں میں فرق ہوتا ہے۔ (۲)۔ ایک درجے والا دوسرے درجے میں سفر نہیں کر سکتا۔ نیز اس صورت میں اگر اجازت نہیں ہے تو نماز کیلئے تیمم کرنا درست ہوگا؟ اس حال میں کہ وقت کے اندر اندر گاڑی رکنے کا امکان نہیں یا پھر اگر رکے تو اسٹیشن پر غسل کا انتظام نہیں اور اگر ہو بھی تو گاڑی رکنے کا وقت اتنا قلیل ہے کہ غسل ممکن نہیں۔ اور اندر بھی کسی اکانومی ڈبے میں پانی نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ صورت مسئولہ میں اگر ریلوے انتظامیہ والوں کی طرف سے ہر خاص وعام ڈبے کو برابر طور پر پانی پہنچانا اُن کی ذمہ داری ہو چاہے اکانومی درجے کے ڈبے ہوں یا اے سی کے ڈبے ہوں، ان کی طرف سے پانی وغیرہ کے استعمال پر کوئی پابندی نہ ہو، اکانومی درجے کے ڈبے میں پانی ختم ہو گیا، تو اس صورت میں اے سی والے ڈبے میں جا کر وہاں وضو بنانا یا وہاں سے پانی لانا یہ جائز ہوگا، تیمم کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر ہر خاص وعام ڈبے میں انتظامیہ والوں کی طرف سے جانے پر یا پانی کے استعمال پر پابندی ہو، تو اس صورت میں یہ مسافر اکانومی درجے کے ڈبے میں حتی الامکان پانی تلاش کرے، اگرچہ مناسب جگہوں پر کیوں نہ ہو، اگر پانی اکانومی درجے کے ڈبے میں نہ ہو اور گاڑی کے رکنے کا امکان بھی نہ ہو یا گاڑی اسٹیشن پر رکتی ہو لیکن وہاں پانی موجود نہ ہو تو یہ شخص تیمم کر سکتا ہے چاہے وضو کیلئے ہو یا جنابت کیلئے ہو۔ اس شخص کیلئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اے سی یا لوئر برتھ وغیرہ میں جا کر بغیر اجازت کے وہاں کے پانی سے وضو بنائے یا غسل کرے۔ کیونکہ کسی مسلمان کے مال کو بغیر اس کی رضامندی کے استعمال کرنا یہ غصب میں آتا ہے، اور مغصوبہ چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

لما في الشامية (۱/۲۳۲): (قوله من عجز) العجز على نوعين: عجز من حيث الصورة والمعنى، وعجز من حيث المعنى فقط، فأشار الى الاول بقوله لبعده، والى الثاني بقوله (أو المرض) ــــ وأيضاً (صـ ۲۳۳) (قوله ولو مقيما) لأن الشرط هو العدم فأينما تحقق جاز التيمم، نص عليه في الأسرار بحر ــــ وأيضاً في تنوير الابصار مع شرحه (صـ ۲۴۶ ـ ۲۴۷) (ويجب) أي يفترض (طلبه) ولو برسوله (قدر غلوة) للشمالة ذراع من كل جانب، ذكره الحلبي، وفي البدائع: الأصح طلبه قدر مالا يضر بنفسه ورفقته بالانتظار (إن ظن) ظنا قويا (قربه) دون ميل بأمارة أو اخبار عدل (وإلا) يغلب على ظنه قربه (لا) يجب بل يندب إن رجا وإلا لا، ولو صلى بتيمم وثمه من يسأله ثم اخبره بالماء أعاد وإلا لا۔

وفي الفقه الاسلامي (۱/ ۵۹۵): ويلزمه شراء الماء بثمن معتاد لم يحتج له، نقداً أو ديناً في الذمة، فإن زاد على الثمن المعتاد، ولو درهماً على الراجح في ذلك المحل وما قاربه، فلا يلزمه الشراء.

(۳۸) غسل سے پہلے یا غسل کے بعد وضو کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ غسل کرتے ہیں تو غسل کے بعد بھی وضو کرتے ہیں کیا ان کا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو اس کیلئے غسل کے بعد وضو کرنا ضروری ہوگا یا غسل ہی کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے۔ غسل کے بعد وضو کرنا حدیث پاک کی رو سے مکروہ ہے۔ اگر کوئی غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ غسل کرنا کافی ہوگا۔ البتہ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے۔

لما في فتاوی سراجیہ (ص ۲): اذا اصاب الرجل المطر او وقع في نهر جاز وضوءه وغسله ايضا ان اصاب جميع بدنه وعليه المضمضة والاستنشاق.

وفي التاتارخانية (۱/ ۱۵۱): وتقديم الوضوء على الاغتسال في الجنابة سنة وليس بفرض عند علمائنا رحمهم الله. حتى انه لو لم يتوضأ وافاض الماء على رأسه وسائر جسده ثلاثا أجزأه اذا كان قد تمضمض واستنشق.

وفي الدر المختار (۱/ ۱۵۹): لو توضأ أولاً لا يأتي به ثانياً

لأنه لا يستحب وضوءان للغسل اتفاقاً. اما لو توضأ بعد الغسل واختلف المجلس على مذهبنا الخ

وقال الشامي رحمه الله تحته. (قوله لانه لا يستحب) ... اخرج الطبراني في الأوسط عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من توضأ بعد الغسل فليس منا والظاهر أن عدم استحبابه لو بقي متوضأ الى فراغ الغسل فلو أحدث قبله ينبغي اعادته.

(۳۹) اعضاء وضو کٹے ہوئے ہوں تو وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں جس کی وجہ سے وضو نہ کر سکتا ہو یا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو کہ وضو کرنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں وضو ساقط ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح نماز پڑھنی ضروری ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ صورت مسئولہ میں جس شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور وضو پر قادر نہ ہو تو اس صورت میں اگر خادم وغیرہ ہو تو وہی وضو کرائے، اگر خادم وغیرہ نہ ہو تو کسی کو اجرت پر مزدور رکھ لیں لیکن اگر نہ تو خادم وغیرہ ہو اور نہ ہی مزدور رکھنے کی استطاعت ہو تو ایسے شخص سے وضو ساقط ہو جائے گا، لہٰذا تیمم کر کے نماز پڑھ لے، اور تیمم کی صورت یہ ہوگی کہ اپنے چہرے اور کٹے ہوئے ہاتھوں سے جو حصہ باقی ہو اسے دیوار سے مل لے۔

اور جس شخص کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو تو وہ عام طور پر وضو پر قادر ہوتا ہے لہٰذا اس سے وضو ساقط نہیں ہوگا، البتہ جو ہاتھ کٹا ہوا ہے اگر وہ کہنی سے اوپر تک کٹا ہوا ہو تو اس ہاتھ کو نہیں دھوئے گا اور اگر وہ کہنی کے نیچے سے کٹا ہوا ہو تو باقی ماندہ ہاتھ کو دھونا لازم ہوگا۔

لمافی الهندیه (۱/۲۸): أو كان لايجد من يوضيه ولايقدر بنفسه فان وجد خادماً او ما يستأجر به اجيراً او عنده من لو استعان به اعانه فعلى ظاهر المذهب انه لا يتيمم لانه قادر

وفيها ايضاً (۱/۵): ولو قطعت يده او رجله فلم يبق من المرفق والكعب شئ سقط الغسل ولو بقي وجب وكذا غسل موضع القطع

وفي ردالمحتار (۱/۱۰۲): وقيل لاصلوة عليه اختاره صاحب الدرر في متنه وشرحه فقال قطعت يداه ورجلاه من المرفق والكعب لا صلوة عليه كذافي الكافي وقيل ان وجد من يوضيه يامره ليغسل وجهه وموضع القطع ويمسح راسه والاوضع وجهه وراسه في الماء او يمسح وجهه وموضع القطع على جدار فيصلي كذا في التاتارخانية.

(۳۰) وضو میں اکثر شک ہو تو نیا وضو کرے یا نہ کرے؟

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو اکثر وضو میں شک ہوتا ہو تو کیا وہ ہر نماز کیلئے وضو کرے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے ایسے شخص کو ہر نماز کے لئے نئے سرے سے وضو کرنا ضروری نہیں، اور اگر کسی کو اس طرح کے شک کی عادت ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کی طرف بالکل التفات نہ کرے کیونکہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور حدیث شریف میں اس سے بچنے کی تلقین آئی ہے۔

لمافي الهندية (۱/۱۳): في الاصل من شك في بعض وضوئه وهو اول ماشك غسل الموضع الذي شك فيه فان وقع ذلك كثيراً لم يلتفت اليه هذا اذا كان الشك في خلال الوضوء فان كان بعد الفراغ من الوضوء لم يلتفت الى ذلك ومن شك في الحدث فهو على وضوئه ولو كان محدثا فشك في الطهارة فهو على حدثه ولا يعمل بالتحري كذا في الخلاصة

(۴۳) کلی کرتے وقت دانتوں سے خون آنے کی صورت میں وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جب کلی کرتا ہوں تو منہ سے یا دانتوں سے تھوڑا بہت خون نکل آتا ہے۔ ایسی صورت میں میرا وضو صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: دورانِ وضو کلی کرتے ہوئے اگر منہ سے تھوڑا بہت خون نکلتا ہو تو اس صورت میں وضو جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں البتہ وضو کر چکنے کے بعد دیکھ لیا کریں، پس اگر منہ سے خون نکلے اور خون تھوک پر غالب یا مساوی ہو (اس طور پر کہ تھوک میں سرخی آ گئی ہو) تو وضو ٹوٹ جائے گا، اور اگر تھوک غالب اور خون مغلوب ہو (اس طور پر کہ تھوک زردی مائل ہے) تو پھر وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لما في الهندية (۱/۱۱): وإن خرج من بين الأسنان يعتبر الغلبة بينه وبين الريق فإن تساويا انتقض الوضوء ويعتبر ذلك من حيث اللون فإن كان أحمر انتقض وإن كان أصفر لا ينتقض كذا في التبيين. المتوضئ إذا عض شيئاً فوجد فيه أثر الدم أو استاك بسواك فوجد فيه أثر الدم لا ينتقض ما لم يعرف السيلان.

وفي الدر المختار (۱/۱۳۸، ۱۳۹): (و) ينقضه (دم) مائع من جوف أو فم (غلب على بزاق) حكماً للغالب (أو ساواه) احتياطاً (لا) ينقضه (المغلوب بالبزاق).

وفي الشامية تحته: (قوله غلب على بزاق) ..... وعلامة كون الدم غالباً أو مساوياً أن يكون البزاق أحمر وعلامة كونه مغلوباً أن يكون أصفر.

(۴۴) دورانِ وضو کوئی ناقضِ وضو پایا جائے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کو وضو کرتے ہوئے کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو دوبارہ از سرِ نو وضو کرنا پڑے گا یا جو ہو چکا وہی کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اس صورت میں از سرِ نو وضو کرنا ضروری ہے۔

لما في الهندية (۱/۲۶): لو ضرب بيديه فقبل أن يمسح أحدث لا يجوز المسح بتلك الضربة كما لو أحدث في الوضوء بعد غسل بعض الأعضاء.

(۴۵) اگر دانتوں سے خون آجائے تو وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ شخص مذکور باوضو ہوتے ہوئے جب دوسری نماز کا وقت

آج سے تو میں صرف مسواک استعمال کرتا ہوں، اب اس میں بعض دفعہ خون کے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں، کیا منہ سے تھوڑا سا بھی خون نکل آئے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر خون کے بارے میں معلوم ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو دیکھا جائے گا، اگر بہہ رہا ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نہ بہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو تھوک کو دیکھیں گے اگر خون کی سرخی تھوک کے برابر یا تھوک سے زیادہ ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا لیکن اگر خون کی سرخی تھوک سے کم ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لما في الهندية (١/١١): المستيقظ اذا عض شيئا فوجد فيه اثر الدم او استاك بسواك فوجد فيه اثر الدم لا ينتقض ما لم يعرف السيلان كذا في الظهيرية.

وفي الشامية (١/١٣٩): (غلب على البزاق) علامة كون الدم غالبا او مساويا ان يكون البزاق احمر وعلامة كونه مغلوبا ان يكون اصفر بحر ط.

واحتياطا: اي لاحتمال السيلان وعدمه فرجح الوجود احتياطا بخلاف ما اذا شك في الحدث لانه لم يوجد الا مجرد الشك ولا عبرة له مع اليقين.

(٣٦) کیا تھوڑا سا خون نکلنا بھی ناقض وضو ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے جسم پر پھوڑا نکل آئے اور اسے دبایا جائے جس سے تھوڑا خون بھی نکل آئے تو کیا اس طرح تھوڑا سا خون نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر خون اتنا نکلا کہ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھا تو وضو نہیں ٹوٹا اور اگر اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا یا بہہ پڑا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

لما في الهندية (١/١١): خرج دم من القرحة بالعصر ولولاه ما خرج نقض في المختار كذا في الوجيز للكردري.

وفي الدر المختار (١/١٣٥): المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفي غيرهما عين السيلان ولو بالقوة.

وفي الشامية (عين السيلان) اختلف في تفسيره، ففي المحيط عن ابي يوسف ان يعلو وينحدر، وعن محمد اذا انتفخ على رأس الجرح وصار اكبر من رأسه نقض، والصحيح لا ينقض. قال في الفتح بعد نقله ذلك وفي الدراية جعل قول محمد أصح ومختار السرخسي الأول وهو الاولى. قلت: وكذا صححه قاضي خان وغيره.

نماز کی حالت میں سو جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نیند کی ہر وہ حالت جو سبب بنے استرخائے مفاصل (اعضاء کے ڈھیلے ہونے) کا سبب بنتی ہو وہ ناقض وضو ہے خواہ نماز کی حالت میں ہو یا خارج از صلوٰۃ ہو۔ لہٰذا نماز میں مطلقاً نیند آجانے سے وضو نہیں ٹوٹے گا خواہ قیام کی حالت میں ہو یا رکوع و قعود کی حالت میں، چاہے جان بوجھ کر سو جائے، لیکن اگر سجدہ کو غیر مسنون طریقے سے ادا کرتے ہوئے سو گیا تو چونکہ اس صورت میں استرخائے مفاصل ہو جاتا ہے اس لئے اس صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا اور نماز فاسد ہو جائے گی۔

لما في الهندية (١/١٢): (ومنها النوم) ينقضه النوم مضطجعا في الصلوة وفي غيرها بلا اختلاف بين الفقهاء ولا ينقض نوم القائم والقاعد ولو في السرج أو المحمل ولا الراكع ولا الساجد مطلقا إن كان في الصلوة وإن كان خارجها فكذلك إلا في السجود فإنه يشترط أن يكون على الهيئة المسنونة له بأن يكون رافعا بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه وإن سجد على غير هذه الهيئة انتقض وضوءه.

وفي الدر المختار (١/١٣١): (و) ينقضه حكما (نوم يزيل مسكته) أي قوته الماسكة بحيث تزول مقعدته من الأرض وهو النوم على أحد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه (وإلا) يزل مسكته (لا) ينقض وإن تعمده في الصلوة أو غيرها على المختار كالنوم.

وفي الشامية تحته: ظاهر الرواية أن النوم في الصلوة قائما أو قاعدا أو ساجدا لا يكون حدثا سواء غلبه النوم أو تعمده.

(۵۱) انجکشن کے ذریعے خون نکالنے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص انجکشن کے ذریعے سے خون نکلوائے جیسے کہ ٹیسٹ وغیرہ کیلئے نکالتے ہیں تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں انجکشن کے ذریعے خون نکلوانے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ خون سے وضو کے ٹوٹ جانے کیلئے بہنا ضروری ہے وہ اگرچہ یہاں بالفعل نہیں پایا جا رہا لیکن بالقوۃ پایا جا رہا ہے یعنی اس میں بہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

لما في الهندية (١/١١): القراد إذا مص عضو إنسان فامتلأ دما إن كان صغيرا لا ينقض وضوءه كما لو مصت الذباب أو البعوض وإن كان كبيرا ينقض.

وفي الدر المختار (١/١٣٥): ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفي غيرهما عين

اس صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ دوبارہ وضو کرے۔

لما فی الطحطاوی علی الدر (۱/۸۰): (قوله علی بزاق) هو بالزای والسین والصاد كما فی شرح المنیه. (قوله حكما للغالب) علة للنقض (قوله او ساواه) علامة كون الدم غالبا او مساويا أن يكون البزاق احمر و علامة كونه مغلوبا ان يكون اصفر (قوله احتياطاً) علة للنقض حال المساواة و ذلك لانه يحتمل أن يكون سيلانه بنفسه او اساله غيره فوجد الحدث من وجه فرجحنا جانب الوجود احتياطاً... (قوله لاينقضه المغلوب) لان الغالب البزاق والحكم له فكان كله بزاق.

وفی الدر المختار (۱/۱۳۸): (و) ينقضه (دم) مائع من جوف او فم (غلب على بزاق) حكما للغالب (او ساواه) احتياطاً (لا) ينقضه (المغلوب بالبزاق) والقيح كالدم والاختلاط بالمخاط كالبزاق.

(۵۴) آنکھوں سے بہنے والے پانی سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کی آنکھوں میں تکلیف ہو اور اس تکلیف کی وجہ سے آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا ہو تو کیا اس پانی کے نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا یا اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورتِ مسئولہ میں اگر پانی چندھیا پن یا آشوبِ چشم کی وجہ سے ہو اور اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ ایک نماز کے وقت میں صرف فرض کی ادائیگی بھی دشوار ہو (کہ وضو کے بعد پانی بہنے سے پہلے پہلے نماز ادا نہ کی جاسکتی ہو) تو وہ معذور ہے، ہر نماز کے لیے وضو کیا کرے، اور اگر اس قدر مسلسل نہ ہو بلکہ کبھی کبھار نکل آتا ہو تو چونکہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا دوبارہ وضو کیا کرے، اور یہ پانی کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ صرف آنسو بہہ جائیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا لہٰذا دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لما فی الهندية (۱/۱۱): والعرب فی العین بمنزلة الجرح فما يسيل منه ينقض الوضوء كذا فی فتاوى قاضيخان، ولو كان فی عينيه رمد أو عمش يسيل منهما الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلاة لاحتمال أن يكون صديدا أو قيحا.

وفی رد المحتار (۱/۱۴۸): وعن محمد اذا كان فی عينيه رمد و تسيل الدموع منها امره بالوضوء لوقت كل صلاة لاني اخاف أن يكون ما يسيل منها صديدا فيكون صاحب العذر

(۵۵) سوزش آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا ہو تو وضو ونماز کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی آدمی کی آنکھ میں سوزش ہو رہی ہو اور اس کی وجہ سے آنکھ سے پانی نکل رہا ہو، کیا از روئے شرع وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہوگا جبکہ پانی مسلسل

دما فانه بافضل...... فالأحسن ما في النهر عن بعض المتأخرين من أن المراد السيلان ولو بالقوة، أي فإن دم الفصد ونحوه سائل إلى ما يلحقه حكم التطهير حكما تأمل. والله أعلم بالصواب

(۵۸) ناخن کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن بڑے ہو جائیں وہ وضو کی حالت میں کاٹ لے تو کیا ناخن کاٹنے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ناخنوں کے کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ انگلیوں کے پوروں پر پانی بہا دینا بہتر ہے۔

لما في الهندية (۱/۳) ولو أمر الماء على شعر الذقن ثم حلقه لا يجب عليه غسل الذقن وكذا لو حلق الحاجب والشارب أو مسح رأسه ثم حلق أو قلم أظافيره لا تلزمه الإعادة كذا في فتاوى قاضي خان.

وفي الدر المختار (۱/۱۰۱) (ولا يعاد الوضوء) (بحلق رأسه ولحيته كما لا يعاد الغسل للمحل ولا الوضوء) بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره) وكشط جلده.

(۵۹) ناخن یا بال کاٹنے سے وضو کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناخن یا بال کاٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا واقعی یہ بات درست ہے؟ یا ناخن اور بال کاٹنے سے وضو برقرار رہتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ناخن یا بال کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔

وفي البزازية على الهندية (۴/۲۰۳): حلق لحيته أو رأسه أو شاربه، أو قلم أظافره بعد الوضوء لا يعيد ولا يجب امرار الماء أيضا

وفي الدر المختار (۱/۱۰۱). (ولا يعاد الوضوء) بل ولا بل المحل (بحلق رأسه ولحيته كما لا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره)

(۶۰) اگر ستر کھل جائے یا ناخن کاٹ لے تو دوبارہ وضو کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی باوضو شخص کسی ضرورت سے کپڑے اتار دے اور بالکل برہنہ ہو جائے یا پھر ناخن یا بال کتروائے تو ان صورتوں میں وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً باوضو ہونے کی حالت میں کپڑے اتار دینے یا ناخن یا بال کتروانے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اسی وضو سے

بيان استنباط الأحكام: الأول أن فيه استحباب المضمضة بعد الطعام وقال بعضهم استدل به البخاري على جواز صلاتين فاكثر بوضوء واحد . الثاني فيه دلالة على عدم وجوب الوضوء مما مسته النار

وفي الدر المختار (١: ١٣٣): (وينقضه خروج) كل خارج (نجس) (منه) أي من المتوضئ الحي معتادا أو لا من السبيلين أو لا (إلى ما يطهر) أي يلحقه حكم التطهير (ص ١٣٤ إلى ١٣٥) (و) ريح أو دودة أو حصاة من دبر لا (ريح من قبل) غير مفضاة اما هي فيندب لها الوضوء وقيل يجب (و) (ص ١٣٧ إلى ١٣٨) ينقضه (قيء ملأ فاه) بأن يضبط بتكلف (من مرة) (أو علق) (أو طعام أو ماء) إذا وصل إلى معدته وإن لم يستقر وهو نجس مغلظ.

(۲۳) معصیت اور گناہ سے وضو یا تیمم ٹوٹنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شانِ صحابہ میں گستاخی کرنا بہت بڑا جرم ہے، اگر کوئی شخص شانِ صحابہ میں گستاخی کرے تو کیا اس سے وضو یا تیمم ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: شانِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں گستاخی کرنا اگرچہ بہت بڑا جرم ہے لیکن اس سے وضو یا تیمم نہیں ٹوٹتا۔

لما في رد المحتار (١: ٢٥٦): قوله لا تنقضه ردة أي فيصلي به إذا أسلم، لأن الحاصل بالتيمم صفة الطهارة والكفر لا ينافيها كالوضوء والردة تبطل ثواب العمل لا زوال الحدث شرح النقاية.

(۲۴) مرتد ہونے کی وجہ سے وضو اور تیمم کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص (العیاذ باللہ) مرتد ہو جائے تو ارتداد کی وجہ سے اس کا وضو یا تیمم ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہو جائے اور اس نے اس سے پہلے وضو کر لیا ہو، پھر اسلام لے آئے تو اس کا وضو بالاتفاق باقی رہے گا لیکن اگر کسی نے پہلے تیمم کیا ہو پھر ارتداد کے بعد اسلام لے آیا تو ائمہ ثلاثہ (امام اعظم ابو حنیفہ اور صاحبین) کے نزدیک تیمم باقی رہے گا لیکن امام زفرؒ کے نزدیک اس کا تیمم باطل ہو جائے گا۔

لما في رد المحتار (١: ٢٥٦): قوله لا تنقضه ردة أي فيصلي به إذا أسلم، لأن الحاصل بالتيمم صفة الطهارة والكفر لا ينافيها كالوضوء

(۲۵) غیر تحریف شدہ آسمانی کتابوں کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن مجید کے علاوہ آسمانی کتب میں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو بے وضو چھونا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قرآن مجید کے علاوہ باقی آسمانی کتب میں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو اگر غیر محرف (یعنی تحریف شدہ نہ ہوں) تو بے وضو چھونا مکروہ ہے۔

وفي حاشية الطحطاوي على الدر (۱/۱۵۱): يكره مس كتب التفسير والفقه والسنن لأنها لا تخلو عن آيات القرآن وهذا التعليل يفيد كراهة ... من القرآن فلا يمنع من التوراة والانجيل والزبور نهر.

وفي الهندية (۱/۳۸): ويكره للحائض والجنب قراءة التوراة والانجيل والزبور.

(۲۶) بغیر طہارت اخبارات میں لکھی آیات کو ہاتھ لگانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبارات میں بعض دفعہ آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ لکھی ہوتی ہیں، کیا اخبارات میں ان کا شائع کرنا صحیح ہے؟ جبکہ اس میں بے حرمتی کا شائبہ ہے نیز ایسے اخبار کو بغیر وضو چھونا جائز ہوگا یا نہیں جس میں آیات لکھی ہوئی ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اخبار ایک سیدھا اور پختہ عام روز مرہ کی چیز ہے اور قرآنی آیات وغیرہ کا احترام باقی نہیں رہتا اور آیات واحادیث لکھے ہوئے اوراق ردی اور کوڑے میں پھینک دیئے جاتے ہیں، ایسی صورت میں اخبارات واشتہارات میں آیات واحادیث لکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ آیات واحادیث کی بے حرمتی ہے اور اگر یہ مناسب ہوں یا بطور تعظیم کوئی لکھ دیا جائے تو پھر جائز ہوگا، نیز جب اخبارات وغیرہ میں آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہوں تو بغیر وضو صرف اس جگہ پر ہاتھ لگانا منع ہے اس کے علاوہ اخبار کے باقی حصہ میں ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

لما في الهندية (۵/۳۲۲): ويكره أن يجعل شيئا في كاغذة فيها اسم الله تعالى كانت الكتابة على ظاهرها أو باطنها بخلاف الكيس عليه اسم الله تعالى فإنه لا يكره.

وفي الدر المختار (۱/۱۷۶): (والتفسير كمصحف لا الكتب الشرعية) فإنه رخص مسها باليد لا التفسير كما في الدرر عن مجمع الفتاوى.

وفي الشامية: (والتفسير كمصحف) ظاهره حرمة المس كما هو مقتضى التشبيه وفيه نظر إذ لا نص

لما فی الهندية (۱/۳۸): لا يجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف۔

وفی الفقه الحنفی وادلته (۱/۶۰): لايجوز لمحدث مس المصحف

وفی الفقه الاسلامی (۱/۴۰۳): واتفق الفقهاء على أن غير المتوضى يجوز له تلاوة القرآن او النظر اليه دون لمسه . وفی (ص۳۵۳): والخلاصة انه وقع الاجماع ماعدا داؤد انه لايجوز المحدث حدثا اكبر أن يمس المصحف واما المحدث حدثا اصغر فلم تدل الأدلة قطعا على منعه من مس القرآن لكن اكثر الفقهاء على انه لا يجوز له.

(۷۹) تین انگلیوں سے سر کا مسح کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تین انگلیاں سر پر رکھنے سے سر کا مسح ہو جاتا ہے کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر تین انگلیوں کے بجائے صرف انگلیوں کے تین پورے رکھے جائیں تو بھی مسح ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مسئولہ صورتوں کی پہلی صورت میں اگر تین انگلیوں سے چوتھائی سر کا مسح کر لیا تو مسح ہو جائے گا اور تین انگلیوں سے کم سے مسح نہیں ہوگا۔

(۲) انگلیوں کے پوروں سے پانی ٹپک رہا ہو اور پورے سر کے چوتھائی کے بقدر مسح کیا جائے تو مسح ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

لما فی الهندية (۱/۵): المفروض فی مسح الرأس مقدار الناصية كذا فی الهداية والمختار فی مقدار الناصية ربع الراس كذا فی الاختيار شرح المختار الواجب أن يستعمل فيه ثلاث أصابع اليد على الأصح كذا فی الكفاية.

وفی الدر المختار (۱/۹۹): ولو مد أصبعا أو اصبعين لم يجز الا ان يكون مع الكف او بالابهام والسبابة.

وفی الشامية (۱/۱۰۰): (قوله الا ان يكون مع الكف الخ) لانهما مع الكف او مع مابين الابهام والسبابة يصيران مقدار ثلاث أصابع او اكثر فاذا مدهما وبلغ قدر الربع جاز۔

وفی الهداية (۱/۵): اذا مسح رأسه برؤس اصابعه فان كان الماء متقاطرا يجوز وان لم يكن متقاطراً لا يجوز كذا فی الذخيرة۔

وفی رد المحتار (۱/۹۹): لو مسح باطراف اصابعه والماء متقاطر جاز والا فلا لأنه اذا كان متقاطرا فالماء ينزل من اصابعه الى اطرافها فاذا مده صار كأنه اخذ ماءً جديدة۔

وفیھا ایضاً (۱/۲۰۰): (قولہ وقیل اذا استقر) ای بشرط ان یستقر فی مکان من ارض او کف او ثوب ویسکن عن التحرک وحذفہ لانہ اراد بالاستقرار التام منہ وھذا قول طائفۃ من مشایخ بلخ واختارہ فخر الاسلام وغیرہ وفی الـ... الاصۃ وغیرھا انہ المختار الا ان العامۃ علی الاول وھو الاصح واثر الخلاف یظھر فیما لو انفصل فسقط علی انسان فاجراہ علیہ صح علی الثانی لا الاول نھر. قلت وقد مر ان اعضاء الغسل کعضو واحد فلو انفصل منہ فسقط علی عضو آخر من اعضاء المغتسل فاجراہ علیہ صح علی القولین (قولہ ورجح للحرج) لانہ لو قیل باستعمالہ بالانفصال فقط لتنجس ثوب المتوضی علی القول بنجاسۃ الماء المستعمل وفیہ حرج عظیم کما فی غایۃ البیان.

(۷۲) مصنوعی بالوں پر مسح اور غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی عرصہ پہلے میرے سر کے بال گر گئے تھے لوگ مجھے گنجا کہتے تھے جس کی وجہ سے مجھے پریشانی ہوتی، تو مجبوراً میں نے مصنوعی بال لگوا لئے ہیں جو کافی خوبصورت لگتے ہیں اب ان بالوں کا وضو اور غسل میں کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورتِ مسئولہ میں اگر مصنوعی بال وگ کی شکل میں لگائے گئے ہوں، تو وضو میں ان پر مسح کرنا اور غسل میں ان کا دھونا جائز نہیں ہوگا۔ بلکہ اس وگ کو اتارنا ضروری ہوگا۔ اور اگر مصنوعی بال آپریشن کے ذریعے لگائے گئے ہوں تو ایسا کرنا اگرچہ جائز اور گناہ ہے، ایسا کرنے والا توبہ واستغفار کرے، البتہ اگر کسی نے لگوا لئے تو جسم کا جزء بننے کی وجہ سے اس پر مسح کرنا اور غسل میں دھونا کافی ہوگا۔

لما فی الخانیۃ (۳/۳۷۱): ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام سواء کان شعرھا أو شعر غیرھا، ولا بأس للمرأۃ أن یجعل فی قرونھا وذوائبھا شیئا من الوبر ویکرہ ان تصل شعرھا غیرھا. ولا بأس للتاجر حلق شعر جبھۃ الغلام لانہ یزید فی الثمن فان کان العبد للخدمۃ ولا یرید بہ التجارۃ لایستحب ان یفعل ذلک.

وفی فتح القدیر مع شرح العنایۃ (۱/۱۵۷، ۱۵۸): (ویجوز المسح علی الجبائر الخ) قال قاضیخان: ھذا إذا کان یضرہ المسح علی الجراحۃ، وأما إذا لم یضرہ فلا یمسح علی الجبائر، والجبائر جمع جبیرۃ وھی العیدان التی تجبر بھا العظام، وإنما قال (وإن شدھا علی غیر وضوء) لأنھا إنما تربط حالۃ الضرورۃ، واشتراط الطھارۃ فی تلک الحالۃ یفضی إلی الحرج فلا یعتبر.

وفی المبسوط السرخسی (۱/۴۴): قال لأن البشرۃ التی نبت علیھا الشعر لایجب ایصال الماء الیھا

فما هو ابعد أولى لكن الصحيح من المذهب أنه يجب امرار الماء على ذلك الموضع لأن الموضع الذي نبت عليه الشعر قد استتر بالشعر فانتقل الفرض منه الى ظاهر الشعر الخ .. وايضاً (ص۲۰) فالحاصل أن امرار الماء على جميع البدن فرض لقوله ﷺ تحت كل شعرة جنابة الا فبلوا الشعر وأنقوا البشرة. وايضاً (ص۶۳) لأن المسح على الشعر بمنزلة المسح على البشرة التي تحته الخ وايضاً (ص۶۶،۶۵) قال (ثم المسح على الشعر مثل المسح على البشرة التي تحته) لا أنه بدل عنه بدليل أن الأصح اذا مسح على الشعر جاز ولا يجوز المصير الى البدل مع القدرة على الأصل فكان جز الشعر بعد المسح كتقشير الجلد عن العضو المغسول بعد الغسل فكما لا يلزمه امرار الماء ثمة فكذلك هنا. وايضاً (ص۶۷) فقيا اذا سقط عن غير برء فالمسح على الجبائر كالغسل لما تحته مادامت العلة باقية ولهذا لا يتوقف بخلاف المسح بالخف.

(۴۳) دوپٹہ پر مسح کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ سفر میں گھر کی خواتین ساتھ ہوتی ہیں اور نماز کے اوقات میں ایک طرف بیٹھ کر وضو کیا جا سکتا ہے لیکن مسح کیسے دوپٹہ یا چادر اتارنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی عورت دوپٹے کے اوپر سے مسح کرے تو اس ضرورت کی بناء پر جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر کوئی عورت ایسے دوپٹے پر مسح کرے کہ جس سے تری بالوں تک پہنچ جاتی ہو تو ایسے دوپٹے پر مسح کرنا جائز ہے اور اگر دوپٹے پر مسح کرنے سے تری بالوں تک نہ پہنچتی ہو تو مسح کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر مسح کرنا ضروری ہوگا۔

لما في الخلاصة (۲۶/۱) ولا يجوز المسح على القلنسوة والعمامة وكذا لو مسحت المرأة على الخمار الا اذا كان الماء متقاطراً بحيث يصل الى الشعر فحينئذ جاز.

وفي الهندية (۵۶/۱) ولا يجوز المسح على القلنسوة والعمامة وكذا لو مسحت المرأة على الخمار الا انه اذا كان الماء متقاطراً بحيث يصل الى الشعر فحينئذ يجوز ذلك عن الشعر كذا في الخلاصة هذا اذا لم يتلون الماء هكذا في الظهيرية والأفضل أن تمسح تحت الخمار كذا في فتاوى قاضي خان.

(۴۳) کان کے نیچے لمبے بالوں پر مسح کرنے سے مسح کی ادائیگی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وہ لمبے بال جو کان کے نیچے تک ہوتے ہیں اگر ان پر کوئی

شخص کان کے نیچے حصہ پر مسح کرے تو مسح ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں مسح ادا نہ ہوگا۔

لما فی حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی (صـ ۳): قال فی الخانیۃ: فلو مسح علی شعره ان وقع علی شعر تحته رأس جاز وان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لایجوز.

وفی الهندیة (۱/۶): ان وقع علی شعر تحته رأس یجوز عن مسح الرأس و ان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لایجوز.

(۷۵) کنپٹی پر لگے پلاسٹر پر مسح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر میں شدید درد رہتا تھا جس کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف محسوس ہوتی تھی ڈاکٹر نے مجھے ایسا پلاسٹر تجویز کیا کہ جس کے لگانے کے بعد مجھے کوئی آرام محسوس ہوتا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں نے پلاسٹر کو پیشانی سے ذرا سا اندر میں لگایا ہوا ہے یعنی کنپٹی پر تو آیا وضو کرتے وقت مجھے اس پلاسٹر کو ہٹانا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: وضو میں پورے چہرے کا دھونا فرض ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر پلاسٹر ایسا ہو کہ اس کے ہٹانے سے تکلیف کے بڑھنے کا خوف ہو یا ہٹانے کے بعد خود لگا نہ سکتا ہو تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست ہے اور اگر تکلیف کے بڑھنے کا خوف نہ ہو اور ہٹانے کے بعد خود لگا سکتا ہو تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست نہیں۔ بلکہ وضو کرتے وقت اس کو اتارنا ضروری ہوگا۔

لما فی سنن ابن ماجه (۲۰۸): عن علی بن ابی طالب قال انکسرت احدی زندی فسألت النبی ﷺ فأمرنی ان امسح علی الجبائر

وفی الدر المختار (۱/۲۸۰-۲۸۱): (ویمسح) نحو (مفتصد وجریح علی کل عصابة) مع فرجتها فی الاصح (ان ضره) الماء (او حلها) ومنه أن لا یمکنه ربطها بنفسه ولا یجد من یربطها.

وفی الشامیة تحته: (قوله علی کل عصابة) ای علی کل فرد من افرادها سواء کانت عصابة تحتها جراحة وهی بقدرها او زائدة علیها کعصابة المفتصد، او لم یکن تحتها جراحة اصلا بل کسر او کی، وهذا معنی قول الکنز کان تحتها جراحة اولا لکن اذا کانت زائدة علی قدر الجراحة فان ضره الحل والمسح مسح الکل تبعا والافلا. بل یغسل ما حول الجراحة ویمسح علیها لاعلی الخرقة.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۵۰۲): شرائط المسح علی الجبیرة ... ألا یمکن نزع الجبیرة او یخاف من نزعها بسبب الغسل حدوث مرض او زیادته او تأخر البرء.

(۷۷) داڑھی کے خلال اور گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔ داڑھی کو وضو میں دھونا ضروری ہے یا اس کا خلال کیا جائے گا چاہے داڑھی چھوٹی ہو یا بڑی اور گھنی ہو یا نہ ہو؟ براہِ مہربانی تمام صورتیں مفصل بیان کریں۔

(۲)۔ مسح الرقبہ کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے یا نہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کرام نے مسح الرقبہ کیا ہے یا نہیں؟ بعض علماء اس کا انکار کرتے ہیں کہ مسح الرقبہ کرنا درست نہیں ہے۔ مسح الرقبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کوئی نہ کرے تو اس کا وضو ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز رقبہ کا اطلاق کہاں تک ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً داڑھی کا وہ حصہ جو کہ چہرے کے ساتھ ملا ہوا ہے اس کا دھونا وضو میں فرض ہے۔ البتہ اگر داڑھی اتنی گھنی ہو کہ چہرے کی جلد کو بالکل ڈھانپ لیتی ہو تو اس صورت میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔ اگر داڑھی گھنی نہیں ہے اور چہرے کی جلد اس میں سے نظر آتی ہے۔ تو اس صورت میں اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔ جبکہ داڑھی کا وہ حصہ جو چہرے کی حد سے باہر ہو۔ اس کا خلال کرنا سنت ہے۔

(۲)۔ دوسری بات مسح الرقبہ (گردن کے مسح) کی تو یہ مستحب ہے۔ اس کا ثبوت روایات میں موجود ہے۔ اس لئے اس کا انکار کرنا درست نہیں۔ ہاں البتہ گلے کا مسح بدعت ہے۔ اور رقبہ کا اطلاق گردن کے پچھلے حصے (گدی) پر ہوتا ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۱۰۰، ۱۰۱): (وغسل جميع اللحية فرض) يعني عملياً (ايضا) على المذهب الصحيح المفتى به المرجوع اليه، وما عدا هذه الرواية مرجوع عنه كما في البدائع. ثم لا خلاف ان المسترسل لايجب غسله ولا مسحه بل يسن، وان الخفيفة التي ترى بشرتها يجب غسل ماتحتها كذا في النهر.

وفيه ايضاً (۱/۱۲۴): (ومسح الرقبة) بظهر يديه (لا الحلقوم) لانه بدعة.

وفي الشامية تحته: (قوله ومسح الرقبة) هو الصحيح. وقيل انه سنة كما في البحر وغيره. اعلاء السنن (۱/۱۲۱): تحقيق معنى الرقبة والحلقوم ـــ والذى ظهر لنا من تتبع اللغة والاحاديث، ان مقدم العنق وموخره كلاهما في جانب الرأس. فمقدمه اى مبتداه هو ما يلي القذال اى موخر الراس ـــ فجعل مقدم العنق بياناً للقذال وهو موخر الراس كما في القاموس.

وفي اعلاء السنن (۱/۱۲۰): باب استحباب مسح الرقبة. عن فليح بن سليمان عن نافع عن ابن عمر ان النبي ﷺ قال: "من توضا و مسح بيديه على عنقه وقى الغل يوم القيامة" رواه ابو الحسن ابن فارس باسناده وقال: هذا ان شاء الله. حديث صحيح (التلخيص الحبير ۱/۳۳)

(۷۸) اعضاء وضو کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے خشک کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ وضو کرنے کے بعد اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال سے خشک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کا ثبوت قرآن وسنت سے ملتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: وضو کرنے کے بعد اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے خشک کرنا جائز ہے اور اس کا ثبوت احادیثِ طیبہ سے ملتا ہے۔

لما في الترمذي (۱/۱۸): عن عائشة قالت كانت لرسول الله ﷺ خرقة ينشف بها بعد الوضوء.

وفي الشامية (۱/۱۳۱): (قوله والتمسح بمنديل)...... ففي الخانية: ولا بأس للمتوضئ والمغتسل روي عن رسول الله ﷺ انه كان يفعله

وفي الفقه الاسلامي (۱/۳۰۷): وقال المالكية المسح بالمنديل جائز لحديث قيس بن سعد قال "زارنا رسول الله ﷺ في منزلنا فامر له سعد بغسل فوضع له فاغتسل ثم ناوله ملحفة مصبوغة بزعفران او ورس فاشتمل بها"

(۷۹) وضو کے استعمال شدہ پانی کو کھانے پینے وغیرہ کے استعمال میں لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس صرف تھوڑا سا پانی ہو اور وہ اس امید پر کہ بعد میں پانی مل جائے گا اس سے وضو کرلے اور بعد میں پانی نہ ملے تو کیا اس پانی کو دوبارہ استعمال کرسکتا ہے، جیسے پینے کیلئے یا کھانا پکانے وغیرہ کے لئے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: وضو میں استعمال شدہ پانی ضرورت کے موقع پر کھانے یا پینے وغیرہ میں استعمال کرسکتے ہیں لیکن بلا ضرورت یہ استعمال کراہت سے خالی نہیں اس لئے احتیاط بہتر ہے۔

كما في الدر المختار (۱/۲۰۰،۲۰۲): (اذا انفصل عن عضو وان لم يستقر) (وهو طاهر) ولو من جنب وهو الظاهر لكن يكره شربه والعجن به تنزيها للاستقذار وعلى رواية نجاسته تحريما.

وفي الشامية (تحريما) قال في البحر ولا يخفى ان الكراهة على رواية الطهارة اما على رواية النجاسة فحرام لقوله تعالى ويحرم عليهم الخبائث والنجس منها

(۸۰) اٹیچ باتھ روم میں ادعیۂ وضو پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید ایک ایسی جگہ وضو کرتا ہے جہاں غسل خانے کے

ساتھ بیت الخلاء بھی ہے۔ اب زید وضو کے دوران کچھ دعائیں پڑھنا چاہتا ہے تو کیا زید ایسی جگہ میں دوران وضو دعاؤں کا اہتمام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔ صورت مسئولہ میں چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا۔ لہذا اللہ کے نام کی تعظیم کی وجہ سے ایسی جگہ پر وضو کرتے وقت وضو کی دعائیں جہراً یعنی زبان سے نہ پڑھے بلکہ دل میں پڑھنے کا اہتمام کرے۔

لما في الهندية (۱/۶): ويسمى قبل الاستنجاء وبعده هو الصحيح كذا في الهداية، ولا يسمى في حال الانكشاف ولا في محل النجاسة.

وفي الدر المختار (۱/۱۰۹): (قبل الاستنجاء وبعده) الا حال انكشاف وفي محل نجاسة فيسمى بقلبه (الشامية) (قوله الا حال انكشاف الخ) الظاهر ان المراد أنه يسمى قبل رفع ثيابه ان كان في غير المكان المعد لقضاء الحاجة، والا فقبل دخوله، فلو نسي فيهما سمى بقلبه، ولا يحرك لسانه تعظيماً لاسم الله تعالى.

(۸۱) عورتوں کا ننگے سر وضو کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض خواتین جب وضو کرتی ہیں تو اپنے سر سے دوپٹہ اتار لیتی ہیں وضو کے بعد پھر پہن لیتی ہیں تو کیا یہ فعل خواتین کا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز عورتوں کیلئے ننگے سر وضو کرنا کیسا ہے اور ان کا وضو درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔ عورتوں کا دوران وضو سر سے دوپٹہ اتارنا جائز ہے جبکہ وہاں پر کوئی نامحرم موجود نہ ہو کیونکہ سر کے بالوں کا نامحرم سے چھپانا ضروری ہے۔ نیز ننگے سر وضو کرنے سے وضو پر کوئی اثر نہ پڑے گا وضو درست ہو جائے گا۔

لما في الدر المختار (۶/۳۶۷): (ومن محرمه) هي من لا يحل له نكاحها ابداً بنسب او سبب ولو بزنا (الى الرأس والوجه والصدر والساق والعضد ان امن شهوته.

وفي فتاوى اللجنة (۵/۲۳۵): س- عورة الرجل من السرة الى الركبة فما حكم وضوئه عاريا؟ لابسا سروالا قصيرا لا يستر ركبته؟

ج: الحمد لله وحده والصلوة والسلام على رسوله وآله وصحبه وبعد يصح وضوءه لان كشف العورة ولبس السروال القصير لايمنعان من صحة الوضوء ولكن يحرم عليه كشف عورته بحضرة غير زوجته او سريته وهي الامة المملوكة له التي يباح له الاستمتاع بها

(۸۲) وضو کے بعد شہادتین پڑھنا

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا وضو کرنے کے بعد شہادتین پڑھنا اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنا مسنون ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　وضو کے بعد شہادتین پڑھنے کو تمام فقہاء کرام نے سنت وآداب میں سے شمار کیا ہے۔ اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو بعض فقہاء نے ادب قرار دیا ہے۔

لما في حاشية الطحطاوي على المراقي (ص۷۷): (والاتيان بالشهادتين بعده) وذكر الغزنوي انه يشير بسبابته حين النظر الى السماء

وفي الهندية (۱/۸): وان يقول بعد الفراغ من الوضوء سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله إلا انت استغفرك واتوب إليك واشهد ان لا إله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله

﴿فصل في الغسل﴾

(غسل کے مسائل کا بیان)

(۸۳) کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہو جاتا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوتا ہے؟ اگر کوئی شخص عورت سے ہمبستری کرے لیکن منی خارج نہ ہو تو کیا اس پر غسل فرض ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مندرجہ ذیل صورتوں میں غسل فرض ہو جاتا ہے۔

(۱) جوش کے ساتھ منی کا نکلنا۔ (۲) مرد کی سپاری کا اندر چلا جانا چاہے انزال ہو یا نہ ہو۔

(۳) حیض کے خون کا بند ہونا۔ (۴) نفاس کے خون کا بند ہو جانا۔

لما في الفتاوى التاتارخانية (۱/۱۵۲): أسباب الغسل ثلاثة الجنابة والحيض والنفاس.

وفي الهندية (۱/۱۵): الإيلاج في أحد السبيلين إذا توارت الحشفة يوجب الغسل على الفاعل والمفعول به أنزل أو لم ينزل.

(۸۴) جن (ناری مخلوق) کے جماع سے غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت پر جن عاشق ہو گیا ہے اور وہ اس عورت سے جماع بھی کرتا ہے تو کیا جن کا عورت سے جماع کرنے کی وجہ سے عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورتِ مسئولہ میں اگر جن کے جماع کرنے کی وجہ سے عورت کو انزال ہو جائے تو پھر انزال کی وجہ سے غسل فرض ہوگا ورنہ محض جن کے جماع کرنے سے غسل واجب نہیں ہوگا البتہ اگر جن آدمی کی صورت میں آکر جماع کرتا ہو تو پھر بغیر انزال کے بھی غسل واجب ہو جائے گا۔

لما في الهندية (۱/۱۵): لو قالت امرأة معي جني يأتيني وأجد في نفسي ما أجد إذا جامعني زوجي لا غسل عليها.

وفي الدر المختار (۱/۱۶۱): احتراز عن الجني يعني إذا لم تنزل وإذا لم يظهر لها في صورة

الآدمي

وفي الشامية تحته: ففي المحيط لو قالت معي جني يأتيني مرارا وأجد ما أجد إذا جامعني زوجي لا غسل عليها لانعدام سببه وهو الإيلاج أو الاحتلام أما إذا ظهر في صورة آدمي وكذا إذا ظهر للرجل جنية في صورة آدمية لو طئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصورية.

(٨٥) جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے سے غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرد نے جانور کے ساتھ بدفعلی کی صرف دخول ہوا، منی خارج نہیں ہوئی تو آیا اس پر غسل فرض ہو گیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جانور کے ساتھ بدفعلی کرنا ایک غیر فطری اور قبیح حرکت ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس طرح کی حرکت کرتا ہے اور اس کی منی خارج نہیں ہوئی تو پھر اس پر غسل فرض نہیں۔

كما في الهندية (١/١٥): والإيلاج في البهيمة والميتة والصغيرة التي لا يجامع مثلها لا يوجب الغسل بدون الإنزال

وفي الدر المختار (١/١٦٦): (و) لا عند (وطء بهيمة أو ميتة أو صغيرة غير مشتهاة) (بلا إنزال).

(٨٦) احتلام میں غسل کب واجب ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی نیند سے بیدار ہونے پر کپڑوں پر احتلام کے اثرات محسوس کرے، جس کی وجہ سے احتلام کا یقین ہو جائے اور اسے خواب یاد نہ ہو تو ایسی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں غسل واجب ہوگا۔

كما في الدر المختار (١/١٦٣): (عند رؤية مستيقظ) (وإن لم يتذكر الاحتلام)

وفي الشامية: أي والحال أنه لم يتذكر الاحتلام يجب الغسل

(٨٧) احتلام کے بعد خواب یاد نہ ہو تو غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے ساتھ ایک عرصے سے یہ مسئلہ پیش آرہا ہے کہ جب بھی سوتا ہوں تو بے خبری میں احتلام ہو جاتا ہے، خواب وغیرہ کچھ بھی یاد نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے ہر وقت شلوار دھونا اور غسل کرنا بہت مشکل کا باعث ہے۔ آیا اس کو بیماری شمار کیا جائے گا یا احتلام ہی ہے؟ جو بھی صورت ہو میرے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ جبکہ ہر وقت

غسل کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ حکم تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　اگر سونے کی حالت میں کسی کو احتلام ہو جائے اور جاگنے کے بعد تری دیکھے اور اس کو یقین ہو یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو اس پر غسل واجب ہوگا اگرچہ خواب یاد نہ ہو۔ پس صورت مسئولہ میں اگر یقین یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو غسل واجب ہوگا اگرچہ خواب یاد نہ ہو۔

لما في الهندية (۱/۱۵،۱۴): وان استيقظ الرجل ووجد على فراشه او فخذه بللا وهو يتذكر احتلاما ان تيقن انه مني او تيقن انه مذي او شك انه مني او مذي فعليه الغسل وان تيقن انه ودي لا غسل عليه وان رأى بللا الا انه لم يتذكر الاحتلام فان تيقن انه ودي لا يجب الغسل وان تيقن انه مني يجب الغسل.

وفي الدر المختار مع الشامية (۱/۱۶۴): في الدر المختار (و) عند (رؤية مستيقظ) وان لم يتذكر الاحتلام وفي الشامية فيجب الغسل اتفاقا في سبع صور منها (الى قوله) او علم انه مني مطلقا

(۸۸) بدفعلی کی وجہ سے غسل کتنی بار کیا جائے؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں کہیں سفر پر جا رہا تھا تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو شکل وصورت سے عالم لگ رہا تھا ان سے مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ ایک بات انہوں نے بیان کی جس پر میرا دل مطمئن نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکے کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کو ہر نماز کے وقت غسل کرنا ضروری ہوگا بغیر غسل کئے اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی کیا یہ بات قرآن وحدیث یا فقہ وغیرہ میں ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... بدفعلی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اس فعل بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر پتھروں کی بارش برسائی اور ان کو نشان عبرت بنا دیا اور شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بھی اس فعل سے روکا گیا ہے اگر خدانخواستہ کسی مکلف سے یہ فعل صادر ہو جائے تو ایک ہی دفعہ غسل کرنے سے پاکی حاصل ہو جائے گی کیونکہ جو حدیثیں بدفعلی کرنے والے کی عدم طہارت کے بارے میں آئی ہیں۔ ان کو علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے باطل اور من گھڑت کہا ہے۔

لما في المقاصد الحسنة (ص ۳۵۳): ۸۸۷ حديث: لو اغتسل اللوطي بماء البحر لم يجئ يوم القيامة الا جنبا اسنده الديلمي عن انس به مرفوعا، وهو عنده ايضا من حديث ابي هريرة رفعه بلفظ: المتلوط لو اغتسل بكل قطرة تنزل من السماء على وجه الارض الى ان تقوم الساعة لما طهره الله من نجاسته او يتوب، وكل مافي معناه باطل.

ایضاً فان کانت الدابة لغیر الواطئ یطالب صاحبها أن یدفعها الیه بالقیمة ثم تذبح هکذا قالوا ولا یعرف ذلک الا سماعاً فیحمل علیه زیلعی ونهر (قوله الظاهر انه یطالب ندبا الخ) ای قولهم یطالب صاحبها أن یدفعها الی الواطئ لیس علی طریق الجبر وعبارة النهر: والظاهر انه یطالب علی وجه الندب ولذا قال فی الخانیة کان لصاحبها أن یدفعها الیه بالقیمة وعبارة البحر: والظاهر لایجبر علی دفعها.

(۹۰) غسل کے دوران ناف میں پانی پہنچانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ دو مہینہ ... روز وہ جماعت میں ... وہاں اتفاق سے مجھے احتلام ہوگیا، چونکہ نماز میں وقت کم تھا اس لئے میں جلد از جلد نہا کر غسل کر آیا اور نماز پڑھ لی، لیکن نماز کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے نہاتے وقت ناف میں انگلی نہیں ڈالی، اور صرف ویسے ہی پورے بدن پر پانی بہا کر باہر آگیا۔ کیا اب مجھے اس نماز کا اعادہ کرنا ہوگا؟ اور کیا دوران غسل ناف میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: غسل میں پورے بدن پر پانی بہانا فرض ہے دوران غسل ناف میں انگلی ڈالنا فرض نہیں البتہ ناف میں پانی پہنچانے کا مناسب طریقہ انگلی ڈالنا ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر یقین ہے کہ ناف میں بھی پانی پہنچ گیا ہے تو غسل ہو جائے گا ورنہ غسل نہیں ہوگا اور نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لما فی التاتارخانیة (۱/۱۵۰): ویجب ایصال الماء الی داخل السرة وینبغی ان یدخل اصبعه فیها للمبالغة وفی الخانیه وان علم انه یصل الماء الیه من غیر إدخال الاصبع أجزاه.

وفی الهندیة (۱/۱۳): ویجب ایصال الماء الی داخل السرة وینبغی أن یدخل اصبعه فیها للمبالغة.

وفی الدر المختار (۱/۱۵۲): (ویجب) ای یفرض (غسل) کل یمکن من البدن بلا حرج مرة کأذن (وسرة وشارب وحاجب) واثناء (لحیة).

(۹۱) غسل میں غرغرہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج رات میرے اوپر غسل فرض ہوگیا صبح اٹھ کر میں نے غسل کیا اس میں کلی وغیرہ تو کی لیکن غرغرہ کرنا بھول گیا تو کیا میرا غسل صحیح ہوا یا دوبارہ غسل کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: غسل میں مضمضہ اور استنشاق فرض ہیں اور غرغرہ سنت ہے اور صورت مسئولہ میں چونکہ مضمضہ اور استنشاق ہوا ہے، لہٰذا آپ کا غسل صحیح ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لما فی الفتاوی التاتارخانیة (۱/۱۵۱): فالفرض ان یغسل جمیع بدنه — ویتمضمض ویستنشق

فالمضمضة والاستنشاق فرضان في الغسل نفلان في الوضوء.

وفي البزازية ([illegible]): ترك المضمضة في الغسل ثم شرب الماء على وجه السنة لا ينوب ولو على غير وجهها ينوب لانه مص في الاول وعب في الثاني والاحوط ان لا يخرج ما لم يمج الماء.

وفي الشامية ([illegible]): (وفرض الغسل) الفرض بمعنى المفروض (ما به العملي) اي ليشمل المضمضة والاستنشاق (وغسل كل فمه) عبر عن المضمضة والاستنشاق بالغسل لافادة الاستيعاب او للاختصار.

(۹۴) فلنگ شدہ (بھرائی کئے ہوئے) دانت کے ساتھ وضو اور غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت میں کیڑا لگ جائے اور وہ اس دانت میں بھرائی کروالے تو وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کیڑا لگنے کی وجہ سے دانت کی بھرائی کو دانت کا حصہ تصور کیا جائے گا لہٰذا وضو میں تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ وضو میں کلی سنت ہے فرض نہیں۔ البتہ غسل میں کلی فرض ہے لیکن بھرائی کے نیچے تک پانی کا پہنچانا ناممکن ہے اور اس میں حرج عظیم لازم آتا ہے لہٰذا صرف کلی کر لینے سے وضو میں سنت اور غسل میں فرض ادا ہو جائے گا۔

لما في الهندية ([illegible]): وفي مجموع النوازل اذا كان برجله شقاق فجعل فيه الشحم وغسل الرجلين ولم يصل الماء الى ماتحته ينظر ان كان يضره ايصال الماء الى ماتحته يجوز وان كان لا يضره لا يجوز ... وان كان في اعضائه شقاق وقد عجز عن غسله سقط عنه فرض الغسل ويلزمه امرار الماء عليه فان عجز عن امرار الماء يكفيه المسح فان عجز عن المسح سقط عنه المسح ايضا فيغسل ما حوله ويترك ذلك الموضع.

وفي الدر المختار (۱/۱۵۲): (ويجب) اي يفرض (غسل) كل ما يمكن من البدن بلا حرج مرة كاذن وسرة وشارب وحاجب و(اثناء) لحية وشعر الراس ولو متلبدا (وفرج خارج) (لا) يجب (غسل ما فيه حرج كعين وان اكتحل بكحل نجس (وثقب انضم) و(لا) داخل قلفة بل يندب هو الاصح.

وفي رد المحتار (۱/۱۵۲): (قوله وثقب انضم) قال في شرح المنية وان انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال ان امر عليه الماء يدخل وان غفل لا فلا بد من امراره ولا يتكلف لغير الامرار من ادخال عود ونحوه فان الحرج مدفوع.

(۹۳) رنگے ہوئے بالوں کے ساتھ غسل وغیرہ کا حکم

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں مرکے بال مختلف قسم کے رنگ سے رنگنے کا فیشن ہے تو ایسی حالت میں فرض غسل ان کا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ اگر وہ رنگ جس سے بالوں کو رنگوایا گیا ہے ذی جسم ہو اور پانی بالوں تک نہ پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح نہیں ہوگا اور اگر ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح ہوگا۔

لما فی مراقی الفلاح (ص۸۱): ولا بد من زوال مایمنع وصول الماء للجسد کشمع وعجین لا صبغ بظفر صباغ ولامابین الاظفار.

وفی الدر المختار (۱/۱۵۳): (ولایمنع) الطهارة (ونیم) ... (وحناء) ولو جرمه وبه یفتی

وفی الشامیة تحته: (قوله وبه یفتی) صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسألة الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورة. قال فی شرحها ولان الماء ینفذه لتخلله وعدم لزوجته و صلابته. والمعتبر فی جمیع ذالک نفوذ الماء ووصوله الی البدن.

(۹۴) نابالغ پر جماع کے سبب غسل کا حکم

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نابالغ لڑکا لڑکی اور مراہق ومراہقہ پر جماع کی وجہ سے غسل کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ نابالغ یا قریب البلوغ لڑکا یا لڑکی پر جماع کی وجہ سے شرعاً غسل واجب نہیں البتہ عادت ڈالنے کیلئے غسل کا حکم دیا جائے گا اور بغیر غسل وطہارت کے نماز سے بھی روکا جائے گا غفلت کی صورت میں تھوڑی بہت مار پیٹ کی بھی گنجائش ہے۔ البتہ اگر نابالغ بہت چھوٹا بچہ یا بچی ہے تو اس پر اس معاملے میں سختی نہیں کی جائے گی۔

لما فی الهندیة (۱/۱۵): غلام ابن عشر سنین جامع امرأة بالغة فعلیها الغسل ولاغسل علی الغلام إلا انه یومر بالغسل تخلقا واعتیاداً کما یؤمر بالصلوة تخلقا واعتیادا ولو کان الرجل بالغا والمرأة صغیرة یجامع مثلها فعلی الرجل الغسل ولا غسل علیها.

وفی الدر المختار (۱/۱۶۳): أی الفاعل والمفعول (لو) کانا (مکلفین) ولو أحدهما مکلفاً فعلیه فقط دون المراهق لکن یمنع من الصلوة حتی یغتسل ویؤمر به ابن عشر تادیباً.

وفی الشامیة تحته: (قوله تادیبا) فی الخانیة وغیرها یؤمر به اعتیادا وتخلقا کما یؤمر بالصلوة

والطهارة وفي القنية قال محمد وطي صبية يجامع مثلها يستحب لها أن تغتسل كأنه لم يجبرها وتأديبا على ذلك: وقال ابو علي الرازي: تضرب على الاغتسال وبه نقول وكذا الغلام المراهق يضرب على الصلوة والطهارة

(۹۵) عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج کے ظاہری حصے کا دھونا ضروری ہے اس میں انگلی داخل کرنا ضروری نہیں۔

لما في الهندية (۱/۱۳): ويجب على المرأة غسل فرجها الخارج في الجنابة والحيض والنفاس لاتدخل المرأة اصبعها في فرجها عند الغسل.

وفي الدر المختار مع تنوير الابصار (۱/۱۵۲): (ويجب) اى يفرض (غسل) كل ما يمكن من البدن بلا حرج مرة كأذن وسرة وشارب وحاجب... و(فرج خارج) لانه كالفم لا داخل لانه باطن. ولاتدخل اصبعها في قبلها به يفتى

وفي الشامية تحته (قوله لا داخل) اى لا يجب غسل فرج داخل (قوله ولاتدخل اصبعها) اى لا يجب ذلك كما في الشرنبلالية لا يجب ادخالها الاصبع في قبلها وبه يفتى فافهم

(۹۶) دوران غسل عورت کا سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت کیلئے دوران غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جی ہاں! عورت کیلئے دوران غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۳): وليس على المرأة ان تنقض ضفائرها في الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر ولو الزقت المرأة رأسها بطيب بحيث لايصل الماء الى اصول الشعر وجب عليها ازالته ليصل الماء الى اصوله

وفي الشامية (۱/۱۵۳): لكن في المبسوط وانما شرط تبليغ الماء اصول الشعر لحديث حذيفة فانه كان يجلس الى جنب امرأته اذا اغتسلت فيقول يا هذه ابلغي الماء اصول شعرك وشؤون رأسك

(۹۷) غسل جنابت میں اگر کلی بھول جائیں تو پانی پینے سے ادائیگی فرض کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب نے صبح غسل جنابت کیا، وہ کلی کرنا بھول گئے، اسی حالت میں نماز پڑھ لی، انہوں نے دو سنتوں کے بعد پانی پیا تھا، ہمارے مسجد میں ایک صاحب کا کہنا ہے، اس طرح کلی ہو جاتی ہے کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً　صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ کلی میں منہ کے تمام اطراف میں پانی پہنچانا ضروری ہے، اگر کوئی ایک حصہ بھی خشک رہ گیا تو اس صورت میں غسل نہیں ہوگا، اب اگر ان صاحب نے فرض کی ادائیگی سے پہلے جو پانی پیا اگر وہ پانی انہوں نے ایک ہی سانس میں غیر مسنون طریقے سے (منہ بھر کر) پیا تو ان کی نماز ہو جائے گی اور اگر مسنون طریقے سے ایک ایک گھونٹ پیا تو غسل نہیں ہوا، لہذا نماز بھی نہیں ہوئی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ منہ بھر کر پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک گھونٹ پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں نہیں پہنچتا۔

لمافی الهندية (۱/۱۳): الجنب اذا شرب الماء ولم يمجه لم يضره ويجزيه عن المضمضة اذا اصاب جميع فمه.

وفي الدر المختار (۱/۱۵۱): (فرض الغسل)... (غسل) كل (فمه) ويكفي الشرب عباً.

وفي الشامية: (ويكفي الشرب عباً)　والمراد به هنا الشرب بجميع الفم وهذا هو المراد مما في الخلاصة ان شرب على غير وجه السنة يخرج عن الجنابة والا فلا وبما قيل ان كان جاهلا جاز وان كان عالما فلا "اي لان الجاهل يعب والعالم يشرب مصا كما هو السنة".

(۹۸) غسل جنابت سے پہلے پانی میں ہاتھ ڈالنا

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو رات میں احتلام ہو جائے، اب صبح غسل کے وقت یہ دیکھنے کیلئے کہ پانی زیادہ گرم تو نہیں وہ بالٹی میں ہاتھ ڈال دے تو کیا اس سے وہ پانی ناپاک ہو جائے گا جبکہ اس نے وہ ہاتھ ابھی تک دھوئے نہیں تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　صورت مسئولہ میں اگر اس کے پاس پانی نکالنے کیلئے کوئی دوسرا برتن نہیں تھا اور ہاتھ پر کوئی نجاست بھی لگی ہوئی نہیں تھی تو ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک نہیں ہوا بلکہ اس سے غسل کرنا بالکل صحیح ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۲): اذا ادخل المحدث او الجنب او الحائض التي طهرت يده في الماء للاغتراف لا يصير مستعملا.

وفي رد المحتار (۱/۲۰۰): (قوله اغتراف) فلو قصد الاغتراف ونحوه كاستخراج كوز لم يصر مستعملا للضرورة

(۹۹) غسل کرتے ہوئے جسم کا کچھ حصہ خشک رہ جائے تو غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی پر غسل واجب ہوا جب اس نے غسل کیا تو بدن کا کچھ حصہ پانی کے ختم ہونے کی وجہ سے خشک رہ گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ غسل اس کا پورا سمجھا جائے گا کیونکہ اکثر حصہ دھل چکا ہے یا نہیں تو کچھ اور کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: غسل فرض ہونے کے بعد ضروری ہے کہ تمام بدن کے ہر حصے کو دھویا جائے اگر بال برابر بھی کوئی جگہ خشک رہ گئی تو غسل صحیح نہیں ہوگا، ہاں اگر غسل کرتے ہوئے پانی ختم ہوگیا اور پانی تک رسائی بھی ممکن نہیں تو پھر باقی ماندہ غسل کے لئے تیمم کرے اور پانی پر رسائی ممکن ہو تو پھر باقی ماندہ حصہ دھولے۔

كما في الهندية (۱/۲۹): جنب اغتسل وبقي لمعة ولم يجد ماء فيتيمم لبقاء الجنابة فإن أحدث تيمم للحدث فإن وجد ماء يكفيهما صرفه إليهما

وفي الشامية (۱/۲۵۹): (قوله ولمعة جنابة) أي لو اغتسل وبقيت على بدنه لمعة لم يصبها الماء فتيمم لها.

(۱۰۰) غسل کے بعد منی نکلنے سے غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے خاص حصے سے کچھ منی نکلی اور اس نے غسل کرلیا غسل کے بعد دوبارہ کچھ بغیر شہوت کے نکلی تو کیا دوبارہ پھر غسل کرنا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر سونے، پیشاب کرنے اور کچھ قدم چلنے سے پہلے غسل کیا گیا اور پھر منی نکلی ہو تو راجح قول کے مطابق احتیاطاً غسل کرنا ضروری ہے اور اگر سونے یا پیشاب کرنے یا کچھ قدم چلنے کے بعد غسل کیا گیا اور پھر بقایا منی کا خروج ہوا تو بالاتفاق غسل کرنا ضروری نہیں۔

كما في الهندية (۱/۱۴): ولو خرج بعد ما بال أو نام أو مشى لا يجب عليه الغسل اتفاقا.

وفي رد المحتار (۱/۱۶۰): وكذا لو خرج منه بقية المني بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشي الكثير نهر أي لا بعده لأن النوم والبول والمشي يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثاني زائلا عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقا.

(۱۰۱) غسل کے بعد اگر منی کے قطرے آجائیں تو غسل کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وظیفہ زوجیت ادا کیا صبح غسل کر لیا تو بعد چند قطرے منی کے آ گئے کیا ایسی صورت میں دوبارہ غسل واجب ہوتا ہے حالانکہ ان قطروں کے وقت شہوت بالکل نہ تھی؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص ہمبستری سے فارغ ہونے کے بعد سو گیا تھا یا اس نے پیشاب کیا اس کے بعد غسل کیا تھا تو اب جو قطرات بغیر شہوت کے نکل گئے ان سے غسل واجب نہیں ہوتا اور اگر فراغت کے فوراً بعد غسل کر لیا اور غسل کے بعد چند قطرے آ گئے تو اس سے دوبارہ غسل واجب ہو جائے گا۔

لما فی الهندية (۱/۱۴): لو اغتسل من الجنابة قبل أن يبول أو ينام وصلى ثم خرج بقية المني فعليه أن يغتسل عندهما خلافاً لأبي يوسف رحمه الله تعالى . ولو خرج بعد ما بال أو نام أو مشى لا يجب عليه الغسل اتفاقاً

وفی رد المحتار (۱/۱۶۰): لو خرج منه بقية المني بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشي الكثير نهر اى لا بعده لان النوم والبول والمشي يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثاني زائلاً عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقاً .

(۱۰۲) انجکشن کے ذریعے سے مادۂ منویہ رحم میں پہنچانے سے غسل کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے ہر کام جدید طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جانوروں کو انجکشن کے ذریعے حاملہ کیا جاتا ہے اسی طرح عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعہ مادۂ منویہ پہنچایا گیا تو عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً . انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچانے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ غسل خروج منی بالدفق سے یا دخول حشفہ سے واجب ہوتا ہے اور یہاں ایک بھی نہیں پایا جاتا۔

لما في المحيط البرهاني (۱/۸۴): وقال محمد في الكبر: إذا جومعت فيما دون الفرج فدخل من ماءه فرجها فلا غسل عليها. لأن الغسل إنما يجب بالتقاء الختانين أو بنزول الماء، ولم يوجد واحد منهما. حتى لو حبلت يجب الغسل عليها لنزول ماء ها.

وفي الخانية (۱/۴۱): الجنابة تثبت بسببين احدهما انفصال المني عن شهوة والثاني الايلاج في الآدمي الخ.

وقت نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غسل واجب نہیں طرفین کے نزدیک واجب ہے، عدم وجوب مقتضیٰ قیاس ہے اور وجوب مبنی بر احتیاط ہے لہٰذا احتیاطاً غسل کرے واجب نہیں ہے۔ معدن الحقائق شرح کنز الدقائق

(کتاب الطہارۃ، صفحہ ۱۰۰)

المجیب

حسین عرفان ابن شیخ الحدیث مولانا علاؤ الدین صاحب

الجواب حامداً ومصلیاً ...... اصحاب المذہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب منی اپنے مقر سے شہوت کے ساتھ جدا ہو جائے تو جب تک اس کا خروج وظہور من الذکر نہ ہوگا اس وقت تک اس پر غسل واجب نہیں ہوگا، خروج من الذکر شہوت کے ساتھ ہونا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک شرط ہے جبکہ طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک شرط نہیں بغیر شہوت کے خروج ہو جائے تب بھی غسل واجب ہوگا اور اسی قول کو اکثر فقہاء نے ترجیح دی ہے، البتہ مہمان کے حق میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو لیا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ شخص پر احتیاطاً غسل واجب ہوگا اور سوالنامے کے ساتھ منسلکہ فتویٰ میں مذکورہ جواب میں جو معدن الحقائق کی عبارت نقل کی گئی ہے اسی عبارت کے آگے یہ عبارت بھی مذکور ہے۔

نیز فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ تاج الشریعۃ وغیرہ محققین نے جو طرفین کے مذہب کو متون میں ذکر کیا ہے وہی ظاہر، واضح اور احوط ہے اس بارے میں درمختار کا قول (جو انھوں نے بحوالہ قہستانی وفتاویٰ تاتارخانیہ نوازل سے نقل کیا ہے کہ "وبقول ابی یوسف ناخذ لانہ ایسر علی المسلمین" قلت ولا سیما فی الشتاء والسفر) لائق التفات نہیں اور اس پر فتویٰ دینا جائز ہے الا یہ کہ حرج اور ضرورت ہو۔

منسلکہ فتویٰ کے مجیب سے دو غلطیاں ہوگئی ہیں، پہلی غلطی یہ کہ اردو شرح سے فتویٰ دیا ہے، دوسری غلطی یہ کہ شارح اور فقہاء کی عبارت میں تحریف کر کے ان کی طرف غلط نسبت کی ہے، اصل عبارت چھوڑ دی ہے جس کو وہ احتیاطاً واجب کہہ رہے ہیں یہ اس کو واجب نہیں سمجھتے شارح جس پر فتویٰ دینے کو ناجائز کہہ رہے ہیں یہ اس کو جائز اور اس پر فتویٰ دے رہے ہیں۔

لما فی البحر الرائق (۱/۱۰۳، ۱۰۲): والاحتیاط واجب وھو العمل بالاقوی من الوجھین فوجب ...... وفی المستصفی یعمل بقول ابی یوسف اذا کان فی بیت انسان واحتلم مثلا ویستحی من اھل البیت او خاف ان یقع فی قلبھم ریبۃ بان طاف حول اھل بیتھم وفی السراج الوھاج والفتوی علی قول ابی یوسف فی الضیف وعلی قولھما فی غیرہ.

وفی البنایۃ (۱/۱۸۸): (فی الایجاب) ای الاحتیاط واجب فی ایجاب الغسل ترجیحا لجانبہ وقال الاسرازی قال بعض الشارحین الخروج علی وجہ الشھوۃ قد وجد وانما عدم الدفق لا غیر فباعتبار ماوجد یجب الاغتسال وباعتبار ماعدم لا یجب فیرجح حال الوجود احتیاطاً.

(وفي بدائع الصنائع (١/٣٧): (ومنها) ان ينفصل المني عن شهوة ويخرج لا عن شهوة وانه يوجب الغسل في قول ابي حنيفة ومحمد وعند ابي يوسف لا يوجب فالمعتبر عندهما الانفصال عن شهوة وعنده المعتبر هو الانفصال مع الخروج عن شهوة وفائدته تظهر في موضعين احدهما اذا احتلم الرجل فانتبه وقبض على عورته حتى سكنت شهوته ثم خرج المني بلا شهوة والثاني اذا جامع فاغتسل قبل ان يبول ثم خرج منه بقية المني وجه قول ابي يوسف ان جانب الانفصال يوجب الغسل وجانب الخروج ينفيه فلا يجب مع الشك ولهما انه اذا احتمل الوجوب والعدم فالقول بالوجوب اولى احتياطاً.

وفي الشامية (١/١٦٠): (قوله وبقول ابي يوسف نأخذ) أي في الضيف وغيره وفي الذخيرة ان الفقيه ابا الليث وخلف بن ايوب اخذا بقول ابي يوسف وفي جامع الفتاوى ان الفتوى على قوله اسماعيل. (قوله قلت الخ) ظاهره الميل الى اختيار ما في النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر ولا سيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الاحوط فينبغي الافتاء بقوله في مواضع الضرورة فقط تأمل.

وفي الفقه الإسلامي (١/٥١٤): واتفق ائمة الحنفية على انه لا يجب الغسل اذا انفصل المني عن مقره من الصلب بشهوة الا اذا خرج على رأس الذكر وهناك خلاف بينهم في انه هل تشترط مقارنة الشهوة للخروج؟ فعند ابي حنيفة ومحمد: لا تشترط وعند ابي يوسف تشترط وثمرة الخلاف تظهر فيمن لو احتلم او جامع الخ ولم يبل حتى توضأ وصلى ثم انزل، اغتسل ولا يعيد الصلاة في رأيهما ولا يغتسل في رأيه ولو اغتسل بعد الجماع قبل النوم او البول او المشي ثم خرج منه المني بلا شهوة يجب اعادة الغسل عندهما لا عنده وقولهما احوط لان الجنابة قضاء الشهوة فاذا وجدت مع الانفصال تحقق اسمها.

(۱۰۳) ضرورت کی وجہ سے غسل جنابت کو مؤخر کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غسل جنابت کو ضرورت کی بناء پر مؤخر کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جنبی کیلئے غسل کرنا فی الفور ضروری نہیں، تاخیر کی گنجائش ہے البتہ اتنی تاخیر کرنا کہ جس سے نماز کا وقت نکل جائے باعث گناہ ہے۔

لما في الهندية (١/١٦): الجنب اذا أخر الاغتسال إلى وقت الصلاة لا يأثم كذا في المحيط قد نقل

الشیخ سراج الدین الھندی الاجماع علی انہ لایجب الوضوء علی المحدث والغسل علی الجنب والحائض والنفساء قبل وجوب الصلاۃ أو ارادۃ مالا یحل إلابہ.

وفی رد المحتار(۱/۱۶۵): قال فی الشرنبلالیۃ: واختلف فی سبب وجوب الغسل. وعند عامۃ المشایخ ارادۃ فعل ما لایحل فعلہ مع الجنابۃ وقبل وجوب مالا یحل معھا، والذی یظھر لہ ارادۃ فعل مالا یحل إلابہ عند عدم ضیق الوقت أوعند وجوب مالا یصح معھا، وذلک عند ضیق الوقت لما قال فی الکافی ان سبب وجوب الغسل الصلاۃ أو ارادۃ مالا یحل فعلہ مع الجنابۃ والانزال والالتقاء شرط اھ.

(۱۰۵) مرتد کا دوبارہ اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص پہلے کافر ہو بعد میں اسلام لائے تو اس کو غسل کرنا چاہیے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہو جائے اور بعد میں پھر اسلام لائے تو اس پر غسل کرنا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کافر کا اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے بشرطیکہ حالت کفر میں جنابت لاحق نہ ہوئی ہو۔ اگر حالت کفر میں جنابت لاحق ہوئی تھی۔ اور غسل نہیں کیا تھا۔ تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔ مرتد کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ یعنی مرتد کا دوبارہ اسلام لانے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے۔ لیکن اگر حالت ارتداد میں جنابت لاحق ہوئی تھی اور غسل نہیں کیا تھا تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۲۷۲): أما المستحب فھو غسل الکافر اذا اسلم لما روی ان رسول اللہ ﷺ کان یأمر بالغسل من جاءہ یرید الاسلام، وادنی درجات الامر الندب والاستحباب، ھذا اذا لم یعرف انہ جنب فاسلم، فاما اذا علم کونہ جنبا فاسلم قبل الاغتسال. اختلف المشایخ فیہ قال بعضھم: لا یلزمہ الاغتسال أیضا لان الکفار غیر مخاطبین بشرائع ھی من القربات والغسل یصیر قربۃ بالنیۃ فلا یلزمہ وقال بعضھم. یلزمہ لان الاسلام لاینافی بقاء الجنابۃ بدلیل انہ لا ینافی بقاء الحدث حتی یلزمہ الوضوء بعد الاسلام کذا الجنابۃ، الخ.

وفی المحیط البرھانی(۱/۲۲۸): والکافر اذا أجنب ثم اسلم ففی وجوب الغسل علیہ اختلاف المشایخ قال بعضھم یجب، والیہ أشار محمد رحمہ اللہ فی السیر الکبیر.

وفی الھندیۃ(۱/۱۶): الکافر اذا أجنب ثم اسلم یجب علیہ الغسل فی ظاھر الروایۃ(الی قولہ) وواحد مستحب وھو غسل الکافر اذا أسلم ولم یکن جنبا کذا فی محیط السرخسی.

وفی الشامیة (۱/۲۳۲): (اوقول حاذق مسلم) ای اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاهر الفسق
وفی البحر ولا فرق عندنا بین ان یشتد بالتحرک کالمبطون او بالاستعمال کالجدری.

(۱۱۳) وضو کی اجازت نہ ہونے پر تیمم جائز ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہے جہاں پانی نہیں یا پانی تو ہے لیکن وضو کیلئے جگہ نہیں اور وضو کی اجازت بھی نہیں تو کیا ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے؟ نیز ایسی جگہ اگر تیمم کیلئے بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر پانی نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ ایک میل شرعی (جو کلو میٹر کے حساب سے 1.609 ہوتا ہے) کی مسافت تک پانی ہے یا نہیں اگر ایک میل تک پانی مل سکتا ہو تو پانی حاصل کر کے وضو کرے گا، اور اگر ایک میل تک پانی نہیں یا اسے پانی کا ہونا یا نہ ہونا معلوم نہ ہو تو اگر ظن غالب یہی ہے کہ پانی نہیں ہوگا تو بھی تیمم کرنا جائز ہوگا لیکن اگر پانی کے موجود ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو تو تلاش کرنا ضروری ہوگا، تلاش کے بعد اگر مل جائے تو ٹھیک ورنہ تیمم کر لے۔ اور اگر پانی تو ہے لیکن وضو کی جگہ نہیں تو تیمم جائز نہیں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر پانی موجود ہے لیکن وضو کی اجازت نہیں تو دیکھا جائے گا کہ اگر وضو کرنے سے شدید مشقت کا اندیشہ ہے مثلاً منع کرنے والا قید میں ڈال دے گا یا قتل کر دے گا تو بھی تیمم کرنا جائز ہوگا، ورنہ نہیں اور ایسے نماز پڑھنے کی صورت میں بعد میں جب یہ عذر ختم ہو جائے تو اس نماز کو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا۔ اور اگر پانی اور تیمم کیلئے کوئی چیز نہ پائے تو اگر نماز کا وقت فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں تشبہ بالمصلین کرے گا یعنی جیسے نماز میں حرکات وسکنات ہوتی ہیں خاموشی (بغیر قراءت کے) کے ساتھ ویسے ہی کرے گا اور بعد میں جب پانی وغیرہ مل جائے تو دوبارہ ان نمازوں کی قضاء کرے۔

لما فی الهندیة (۱/۲۷): یجوز التیمم لمن کان بعیداً من الماء میلاً هو المختار فی المقدار سواء کان خارج المصر او فیه وهو الصحیح

وفی الدر المختار (۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورین) بان حبس فی مکان نجس ولا یمکنه اخراج تراب مطهر ...... (یؤخرها عنده: وقالا یتشبه) بالمصلین وجوباً

وفی الشامیة تحته (وقالا یتشبه بالمصلین) ای احتراما للوقت. قال ط ولا یقرأ کما فی ابی مسعود سواء کان حدثه اصغر او اکبر اهـ قلت: وظاهره انه لاینوی ایضاً لانه تشبه لاصلاة حقیقیة تامل

وفی الشامیة (۱/۲۳۵): اعلم ان المانع من الوضوء ان کان من قبل العباد کاسیر منعه الکفار من الوضوء ومحبوس فی السجن ومن قیل له ان توضأت قتلتک جاز له التیمم ویعید الصلاة اذا زال المانع.

اور نماز کے وقت میں رکنے کا امکان بھی نہ ہو، یہ شخص ٹرین میں تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے؟ نیز یہ شخص تیمم کپڑے پر کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر پانی ایک میل سے زیادہ دور ہو، اور ٹرین میں بھی کسی سے پانی ملنے کی امید نہ ہو جس سے وضو ہو سکے تو یہ شخص ٹرین میں تیمم کر کے نماز پڑھ لے، پھر اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر پڑھے ورنہ بیٹھ کر پڑھ لے، لیکن پانی اگر ایک میل سے کم دور ہو اور ٹرین کے وہاں پہنچنے تک نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر بھی تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ البتہ اس صورت میں نماز کی قضاء بھی ضروری ہے۔ نیز کپڑے پر اگر تھوڑا بہت غبار ہو تو اس پر تیمم کرنا درست ہے۔

لما في الهندية (۱/۲۶): وصورة التيمم بالغبار ان يضرب بيديه ثوبا أو لبدا او وسادة او ما اشبهها من الاعيان الطاهرة التي عليها غبار فاذا وقع الغبار على يديه تيمم أو ينفض ثوبه حتى يرتفع غباره فيرفع يديه في الغبار في الهواء فاذا وقع الغبار على يديه تيمم كذا في المحيط ومنها عدم القدرة على الماء

وفيه ايضا (۱/۱۴۳): أما الصلاة في السفينة فالمستحب ان يخرج من السفينة للفريضة اذا قدر عليه كذا في المحيط السرخسي

وفي الدر المختار (۱/۲۴۳): (و) جاز (لخوف فوت صلاة جنازة) (أو) فوت (عيد).

(ص ۲۴۶) (لا) يتيمم (لفوت جمعة ووقت) وقيل يتيمم لفوات الوقت قال الحلبي: فالأحوط ان يتيمم ويصلي ثم يعيده

وفي الشامية تحته: (قوله وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) اى ولو كان الماء قريبا.

وتحت (قوله قال الحلبي) ثم قال ما حاصله: ولعل هذا من هؤلاء المشايخ اختيار لقول زفر لقوة دليله وهو ان التيمم انما شرع للحاجة الى اداء الصلاة في الوقت فيتيمم عند خوف فوته

قلت وهذا قول متوسط بين القولين، وفيه الخروج عن العهدة بيقين فلذا اقره الشارح بل قد علمت من كلام القنية انه رواية عن مشايخنا الثلاثة. ونظير هذا مسألة الضيف الذي خاف ريبة فانهم قالوا يصلي ثم يعيد والله تعالى اعلم.

(۱۱۷) ٹریننگ کے دوران تیمم کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں پاکستان آرمی میں ہوں، ہماری ٹریننگ کبھی کبھی ایسے صحراؤں میں ہوتی ہے جہاں پانی کا نام و نشان نہیں ہوتا اور ہمیں کئی کئی دن وہاں گزارنے پڑتے ہیں، تھوڑا سا پانی صرف پینے کیلئے ملتا ہے اس کے علاوہ پانی موجود تو ہوتا ہے لیکن افسران بالا کے قبضے میں ہوتا ہے سوائے پینے کے کچھ نہیں ملتا ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے یا

نہیں تو کیا تیمم جائز ہوگا یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں جو پانی آپ کو ملتا ہے وہ اتنا کم ہو کہ اگر وضو میں استعمال کیا جائے تو ختم ہو جائے گا اور شدت پیاس کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں ان لوگوں سے وضو کیلئے پانی مانگنا ضروری ہے، اگر وہ دینے سے انکار کردیں تو پھر تیمم کرنا جائز ہے۔

لما في الهندية (١/٢٨): وكذا اذا خاف العطش على نفسه أو رفيقه المخالط له أو آخر من اهل القافلة.

وفي الدر المختار (١/٢٣٢): (من عجز) ... (عن استعمال الماء) ... (لبعده) ... ص ٢٣٤ (أو خوف عدو) (أو عطش) ... ص ٢٣٤ (تيمم)

وفي الشامية (أو عطش) معطوف على عدو أي لانه مشغول بحاجته والمشغول بالحاجة كالمعدوم.

وفي الدر المختار (١/٢٥٠): (ويطلبه) وجوبا على الظاهر من رفيقه (ممن هو معه فإن منعه) ولو دلالة بأن استهلكه (تيمم) لتحقق عجزه.

وفي الشامية (ص ٢٥١): (من رفيقه) ذكر الرفيق جرى مجرى العادة، والا فكل من حضر وقت الصلاة فحكمه كذلك رفيقا كان أو غيره.

(١١٨) سردی کی وجہ سے تیمم کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو غسل کی ضرورت ہے لیکن پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہے جبکہ وہ وضو کر سکتا ہے تو کیا اس کیلئے شرعاً جائز ہے کہ وہ غسل کیلئے تیمم کرے اور وضو کرکے نماز پڑھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر غسل کی ضرورت کے وقت سخت سردی کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہو یا یہ یقینی ہو کہ بیمار ہو جائے گا یا سخت نقصان کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ اور جائز ہونے کی صورت میں صرف تیمم کرے گا بعد میں وضو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وضو اور تیمم دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

لما في خلاصة الفتاوى (١/٣٨): في الأصل الجنب والحائض والمحدث في التيمم سواء ويجوز للمريض ان يتيمم في المصر اذا لم يستطع الوضوء او الغسل للمرض او يخاف على نفسه الهلاك بسبب استعمال الماء او يخاف تلف عضو من اعضائه وان كان لا يخاف الهلاك ولا تلف العضو ولكن يخاف زيادة المرض او ابطاء البرء يجوز التيمم عندنا ولو كان الماء لايضره ولكن لايمكنه استعمال الماء جاز له التيمم عندنا.

في الهندية (١/٢٨): ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد او يمرضه هذا اذا كان خارج المصر اجماعا فان كان في المصر فكذا عند ابي حنيفة خلافا لهما والخلاف فيما اذا لم يجد ما يدخل به الحمام فان وجد لم يجز اجماعا وفيما اذا لم يقدر على تسخين الماء فان قدر لم يجز

وفي الدر المختار (١/٢٣٤): (من عجز) (عن استعمال الماء) (المطلق) (أو برد) يهلك الجنب أو يمرضه ولو في المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا ما يدفئه

وفي الشامية (ولا ما يدفئه) قال في البحر: فصار الأصل أنه متى قدر على الاغتسال بوجه من الوجوه لا يباح له التيمم اجماعا

(۱۱۹) سخت سردی کی حالت میں تیمم کا شرعی حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر سخت سردی ہو جس میں پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو اس میں تیمم کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سخت سردی کی حالت میں اگر ہلاکت یا عضو کے تلف ہونے کا یا بیماری کی زیادتی کا قوی اندیشہ ہو اور گرم پانی یا کوئی چیز جس سے گرمی حاصل کر سکے بھی نہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔

لما في الهندية (١/٢٨): ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد او يمرضه

وفي الدر المختار (١/٢٣٤): أو برد يهلك الجنب او يمرضه ولو في المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا ما يدفئه.

وفي الشامية (١/٢٣٤): نعم مفاد التعليل بعدم تحقق الضرر في الوضوء عادة أنه لو تحقق جاز فيه ايضاً اتفاقاً، ولذا مشى عليه في الامداد لان الحرج مدفوع بالنص.

(۱۲۰) نماز جنازہ کے فوت ہونے کے خوف سے تیمم کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ ہو رہا ہے اگر وضو کرے تو نماز جنازہ نہ ملنے کا اندیشہ ہے اب وضو کرے یا تیمم؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورت مسئولہ میں نماز جنازہ نہ ملنے کے خوف سے وہ تیمم کر سکتا ہے جبکہ امام یا ولی نہ ہو۔

لما في الهندية (١/٣١): ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولي غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة ان

تفوته الصلاة ولا يجوز للولي وهو الصحيح هكذا في الهداية.

وفي الشامية (۱/۲۴۵): قوله بخلاف صلاة جنازة اي فان تيمما تجوز به سائر الصلوات لكن عند فقد الماء واما عند وجوده اذا خاف فوتها فانما تجوز به الصلاة على جنازة اخرى اذا لم يكن بينهما فاصل كما مر ولا يجوز به غيرها من الصلوات افاده ح

(۱۲۱) نماز جنازہ کیلئے تیمم کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک دم سے جنازہ سامنے آجائے یا کہیں جنازہ کیلئے جانا ہو اور وضو کی فرصت نہ ہو یعنی وضو میں مشغولیت کی وجہ سے نماز جنازہ نکل جانے کا اندیشہ ہو ایسی صورت میں اگر بلا وضو جنازہ پڑھ لیں تو کیسا ہے؟ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ بلا وضو اگر کوئی سجدہ کرے تو کافر ہو جاتا ہے جبکہ نماز جنازہ میں سجدہ نہیں ہوتا یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بغیر وضو نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں، جس طرح اور نمازوں کیلئے طہارت شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی طہارت شرط ہے، البتہ اگر اچانک جنازہ سامنے آجائے یا جنازہ کیلئے جانا ہو اور وضو میں مشغول ہونے سے نماز جنازہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کرکے نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ تیمم کرنے والا امام یا میت کا ولی نہ ہو کیونکہ ان دونوں کیلئے ہر صورت میں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر کسی نے بغیر وضو نماز (چاہے فرض نماز ہو، نفل ہوں یا نماز جنازہ) کی ادائیگی کی تو اگر مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کیا یا لوگوں سے شرم کی وجہ سے تو ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا جس پر اسے توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے اور اگر کسی نے یہ فعل جان بوجھ کر اسے جائز وحلال سمجھتے ہوئے کیا تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

لما في الروض الازهر (ص ۱۸۶): وفي الفتاوى الصغرى والجواهر: ومن صلى مع الامام بجماعة بغير طهارة عمدا كفر وفيه ان قيد الجماعة مع الامام لا يظهر وجهه ثم الصلوة بغير طهارة معصية فلا ينبغي ان يقال يكفر الا اذا استحلها. (وفي ص ۲۲۹) وفي التتمة من سجد أو صلى محدثا رياء كفر. فيه أن قيد الرياء يفيد أنه ان صلى حياء لا يكفر واما اذا جمع بين الرياء وترك الطهارة فكانه غلظ المعصية ومع هذا لا يخلو عن الشبهة لا سيما في السجدة المفردة حيث يتوهم كثيرون أنها تجوز من غير طهارة. كذا إذا صلى بغير طهارة أو مع الثوب النجس يعني مع القدرة على الثوب الطاهر كفر يعني اذا استحل والا فلا شك انها معصية وانه كانه ترك تلك الصلوة وبمجرد تركها لا يكفر.

وفي الهندية (۱/۳۱): ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولي غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة ان

تفوته الصلاة ولا یجوز للولی هو الصحیح

وفی الدر المختار (۱/۲۴۱): (و)جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)

وفی الشامیة تحته ولو کان الماء قریبا

(۱۲۲) عید کی نماز کیلئے تیمم کی ایک صورت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب عید کی نماز پڑھنے عید گاہ گئے نماز سے ذرا پہلے ان کا وضوءٹوٹ گیا، وہاں وضو کا کوئی انتظام نہیں، اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ تیمم کرکے نماز پڑھ لیں یا وضو کرنے کیلئے گھر جائیں، اگر جانے کی صورت میں نماز نکلنے کا اندیشہ ہے، یا عید گاہ کے قریب جو گھر ہیں وہاں سے پانی مانگ کر وضو کرلے لیکن اس صورت میں غیر محرم سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اور اس سے پانی لینا پڑتا ہے کیونکہ سب لوگ یہاں تک کہ بچے بھی نماز کیلئے عید گاہ جاتے ہیں اور عید گاہ میں یہ پوچھنا کہ قریب میں کس کا گھر ہے، جو وضو کیلئے پانی دے دے، یہ مشکل ہے؟ اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں؟۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں جب عید گاہ میں پانی موجود ہو تو اگر نماز میں اتنا وقت باقی ہو کہ پانی کے انتظام اور وضو سے فراغت تک نماز ملنے کی امید ہو تو پانی کے انتظام کی کوشش کرنی ضروری ہے، اور اگر پانی کا انتظام کرکے وضو کرنے میں نماز فوت ہونے یا نہ ملنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرکے نماز پڑھ لیں۔

لما فی الدر المختار (۱/۲۴۱): (و)جاز (لخوف فوت صلاة الجنازة) (أو) فوت (عید) بفراغ امام اوزوال شمس (ولو) کان یبنی (بناء) بعد شروعه متوضأ وسبق حدثه (بلا فرق بین کونه اماما اولا) فی الاصح لان المناط خوف الفوت لا الی بدل.

وفی الشامیة: (لان المناط)ای الذی تعلق به الحکم المذکور و هو التیمم لخوف فوت الصلاة بلا بعد عن الماء.

وفی الخیریة(صـ۵): فلا یجوز التیمم له مع وجود الماء الا فی موضع یخشی الفوات لا إلی خلف کصلوٰة الجنازة والعید

(۱۲۳) پانی کی موجودگی میں تلاوت کیلئے تیمم کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانی کی موجودگی میں قرآن کریم کی تلاوت کیلئے تیمم کرنے سے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

(۱۲۵) چلتی ہوئی ریل سے چشمے تالاب وغیرہ دکھائی دینے سے تیمم نہیں ٹوٹتا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ریل میں سفر کر رہا ہو اور اس نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کیا ہوا ہو اور اثناء راہ میں چلتی ہوئی ریل سے اسے پانی کا چشمہ و تالاب وغیرہ دکھائی دیں تو کیا اس کا تیمم باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورتِ مسئولہ میں چلتی ہوئی ریل سے چشمہ یا تالاب وغیرہ صرف دکھائی دینے سے تیمم نہیں ٹوٹے گا، جب تک کہ اس پانی کے استعمال پر قدرت حاصل نہ ہو۔

لما في الهندية: (۱/۳۰) ولو مر على الماء وهو في موضع لا يستطيع النزول إليه لخوف عدو أو سبع لم ينتقض تيممه كذا في السراج الوهاج .... المسافر إذا مر على الفلاة بماء موضوع في حب أو نحوه لا ينتقض تيممه

وفي الدر المختار (۱/۲۵۲): (والحاصل أن كل ما يمنع وجوده التيمم نقض وجوده التيمم (وما لا) يمنع وجوده التيمم في الابتداء (لا) ينقض وجوده بعد ذلك التيمم

وفي الشامية تحته: (قوله والحاصل) أراد به التنبيه على أن ذلك قاعدة كلية تغني عن ذكر قدرة الماء الكافي فافهم

(۱۲۶) مقتدیوں کا امام سے بغیر کسی عذرِ شرعی کے ناراض ہونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کا ایک امام ہے جس کی عمر تقریباً پچپن سال ہے وہ اکثر بیمار رہتا ہے اس کی اولاد بھی صحیح نہیں ہے لوگ اس کو کہتے ہیں اپنی اولاد کو سمجھاؤ تو وہ کہتا ہے میرے بس سے زیادہ ہیں لوگ اس کو امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ امامت چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے اب بعض لوگ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے آیا ایسے امام کی امامت صحیح ہے؟ اور اس کا روکنے کے باوجود امامت کرانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: امامت ایک عظیم الشان منصب ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے امام کو ہر اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے جو فتنہ و فساد اور مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب بنے لہٰذا اپنے گھر والوں اور اولاد کی بھی نگرانی رکھے اور ان کی اصلاح کرتا رہے تاکہ وہ گناہوں میں مبتلا اور نافرمان نہ ہو جائیں، لقوله تعالیٰ "قوا انفسكم واهليكم نارا" یعنی خود بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی جہنم سے بچاؤ۔ صورتِ مسئولہ میں امام صاحب کو اپنی اولاد کی فکر کرنی چاہیے اگر وہ سمجھانے کے باوجود نہ سمجھیں تو ان سے قطع تعلق کرنا (بشرطیکہ ان کے اس طرح سدھرنے کی امید ہو) بھی جائز ہے لیکن امام صاحب کا اکثر بیمار رہنا اور ان کی اولاد کا صحیح نہ ہونا اگرچہ اس سے ان کی ذات میں شرعاً

قباحت ان میں نہیں آتی جس کی وجہ سے ان کو امامت سے ہٹایا جائے اگر مقتدی ان افعال کی وجہ سے امام کو ہٹانا چاہتے ہیں تو ہٹانا ان کیلئے ناجائز ہے اجتناب کرنا چاہیے البتہ امام کو اس منصب کا لحاظ کرتے ہوئے خود مستعفی ہو جانا چاہیے کیونکہ وہ کثیر لوگ ناراض ہیں [illegible] امامت سے مستعفی نہ ہو پھر بھی ان کے پیچھے نماز درست ہے۔

لما في مرقاة المفاتيح (٨٧/٣): (وإمام قوم) أي الإمامة الكبرى أو إمامة الصلاة (وهم له) وفي نسخة لها أي الإمامة (كارهون) لمعنى مذموم في الشرع وإن كرهوا لخلاف ذلك فالعيب عليهم ولا كراهة قال ابن الملك أي كارهون لبدعته أو فسقه أو جهله أما إذا كان بينه وبينهم كراهة وعداوة بسبب أمر دنيوي فلا يكون له هذا الحكم.

وفي التجنيس والمزيد (٧٢/٢): رجل أم قوما وهم له كارهون فهذا على ثلاثة أوجه أما إن كانت الكراهية لفساد فيه أو كانوا أحق بالإمامة منه أو هو أحق بالإمامة منهم ولا فساد فيه ومع هذا كرهوا فالأول والثاني مكروه هكذا روى الحسن البصري عن أصحاب رسول الله ﷺ والثالث لا، لأن الجاهل والفاسق يكره العالم والصالح، وهو الصحيح.

وفي الدر المختار (٥٥٩/١): (ولو أم قوما وهم له كارهون، إن) الكراهة (لفساد فيه أو لأنهم أحق بالإمامة منه كره) له ذلك تحريما لحديث أبي داود "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون" (وإن هو أحق لا) والكراهة عليهم.

وفي فتح الملهم (٥٢٩/٣): تأديب الرجل ولده وإن كان كبيرا إذا تكلم بما لا يعني له وجواز التأديب بالهجران.

(۱۲۷) غسل خانے کی عدم موجودگی میں تیمم کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کو غسل کی حاجت ہو اور وہ ایسے مقام پر ہو جہاں غسل کرنے کیلئے غسل خانے کا انتظام نہ ہو تو کیا وہ تیمم کر سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون پر غسل واجب ہے لہٰذا اس کو چاہیے کہ پردہ کا انتظام کرے یا کسی کپڑے وغیرہ میں یا کوئی اور مناسب طریقہ استعمال کرتے ہوئے غسل کرے، اور غسل کرنے کی صورت میں بدن ضروری طور پر دوسرے کے سامنے ظاہر ہو اور پردے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تو اگر اس خاتون کے ارد گرد خواتین ہیں تو غسل کرے اور اگر اس کے ارد گرد صرف مرد یا مرد و خواتین دونوں ہیں تو مناسب انتظام نہ ہونے تک غسل میں تاخیر کرے۔

نیز غسل نہ کرنے کی صورت میں مناسب یہ ہے کہ تیمم کر کے نماز ادا کرے اور غسل کرنے کے بعد احتیاطاً نماز لوٹائے۔

لما في سنن النسائي (۱/ ٦۲): عن يعلى أن رسول الله ﷺ رأى رجلا يغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد الله وأثنى عليه وقال إن الله عز وجل حليم حيي ستير يحب الحياء والستر فإذا اغتسل أحدكم فليستتر.

وفي الدر المختار (۱/ ۲٥٤): والمرأة بين رجال أو رجال ونساء تؤخره لا بين نساء فقط وينبغي لها أن تتيمم وتصلي لعجزها شرعا عن الماء.

وفي الشامية (۱/ ۲٥٤): والأشبه الإعادة تفريعا على ظاهر المذهب في الممنوع من إزالة الحدث بصنع العباد إذا تيمم وصلى ثم ... واستظهر الرحمتي عدم الإعادة، قال لأن العذر لم يأت من قبل المخلوق، فإن المانع لها الشرع والحياء وهما من الله تعالى.

﴿فصل فی النجاسات واحکام التطهیر﴾

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

(۱۲۸) چوتھائی کپڑے کے بقدر نجاست کا حکم اور چوتھائی سے مراد کیا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے سنا ہے کہ اگر کسی جانور کے پیشاب کی چھینٹیں کپڑوں پر لگ جائیں تو اگر وہ نجاست ایک چوتھائی حصے سے کم ہو تو وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوگا اور ان کپڑوں میں پڑھی گئی نماز درست بھی ہو جائے گی۔ اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک چوتھائی کی مقدار کیا ہے؟ اگر جانوروں کے بیچ میں کوئی شخص کھڑا ہو اور وہاں کسی جانور نے پیشاب کیا اور چھینٹیں اس کے پائنچوں پر لگ گئیں تو کیا وہ پاک ہے جبکہ وہ کم بھی ہیں؟ اگر درست ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مفہوم ہوگا جس میں جانوروں کے پیشاب سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ((عن ابی هريرة أن رسول الله ﷺ قال استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه)) (دار قطنی ۱/۱۲۷)۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں جب کسی حلال جانور کے پیشاب کی چھینٹیں چوتھائی کپڑوں سے کم پر لگ جائیں۔ (۱) اور وہ کسی عذر کی بناء پر دھوئی نہ جاسکتی ہوں یا پھر نماز شروع کرنے کے بعد اس پر نظر پڑی ہو اور باجماعت نماز ملنے کی کوئی امید نہ ہو یا اسی طرح نماز کا وقت نکل رہا ہو) تو ان کپڑوں میں نماز ہو جائے گی۔ (اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی عذر نہ ہو اور مقدار ربع سے کم ہو تو اس کو دھونا افضل ہے۔ چاہے نماز توڑ کر ہی کیوں نہ ہو) (۲) چوتھائی کپڑے سے وہ حصہ مراد ہوگا کہ جہاں پر یہ نجاست لگی ہوئی ہو۔ مثلاً آستین پر اگر لگی ہوئی ہو تو اس کا چوتھائی مراد ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں پائنچے کا چوتھائی مراد ہے۔ (۳) قابل معافی سے مراد پاک ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ہے تو یہ نجاست ہی، مگر مذکورہ مسئلے میں نجاست وطہارت دونوں طرح کی احادیث آنے سے اس میں خفت پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ سوال مذکور میں اس کی نجاست کی حدیث پیش کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ اس کے (حلال جانور کا پیشاب) پینے تک کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام کے قاعدے کے مطابق جب کسی شئی کی نجاست اور طہارت دونوں پر احادیث وارد ہوں تو پھر اس صورت میں اس شئی کی نجاست میں تخفیف آجاتی ہے جیسا کہ مذکورہ مسئلے میں ہوا۔

لما في الصحيح للبخاري (۱/۳۵): (باب ما جاء في غسل البول وقال النبي ﷺ لصاحب القبر كان لا يستتر من بوله ولم يذكر سوى بول الناس) ..... عن ابن عباس قال مر النبي ﷺ بقبرين فقال انهما ليعذبان وما يعذبان في كبير. اما أحدهما فكان لا يستتر من البول.

وفيه ايضاً (۱/۳٦): (باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، وصلى ابو موسى في دار البريد والسرقين والبرية الى جنبه. فقال هٰهنا وثم سواء). عن أنس قال قدم ناس من عكل أو عرينة فاجتووا المدينة، فأمرهم النبي ﷺ بلقاح وان يشربوا من ابوالها والبانها الخ

وفي البحر الرائق (۱/۲۹٦): ومراده من العفو صحة الصلاة بدون ازالته لا عدم الكراهة وان كانت اقل وقد دخل في الصلاة نظر ان كان في الوقت سعة فالأفضل ازالتها وان كان في آخر الوقت يمضي على صلاته ولا يقطعها

وفيه ايضاً (۱/۲۹۸): قال في الكافي ولا يظهر الاختلاف في غير الروث والخثي لثبوت الاختلاف المذكور مع فقد تعارض النصين ثم على طرده أنه يثبت التخفيف عندهما بالتعارض، كما باختلاف المجتهدين تقع الحاجة الى الاعتذار لمحمد عن قوله بطهارة بول الحيوان المأكول. ثم لا يخفى أن المراد باختلاف العلماء المقتضي للتخفيف

وفيه ايضاً (۱/۲۹۷): وحاصله انه ان ورد نص واحد بنجاسة شيء فهو مغلظ. وان تعارض نصان في طهارته ونجاسته فهو مخفف عنده. وعندهما ان اتفق العلماء على النجاسة فهو مغلظ، وإن اختلفوا فهو مخفف.

وفي الدر المختار (۱/۳۲۱): (وعفي دون ربع) جميع بدن و(ثوب) ولو كبيرا هو المختار ذكره الحلبي، ورجحه في النهر على التقدير بربع المصاب كيد وكم، وان قال في الحقائق وعليه الفتوى. (من) نجاسة (مخففة كبول مأكول) ومنه الفرس وطهره محمد.

(۱۲۹) نجاست کتنی مقدار میں معاف ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں بھینسوں کے باڑے میں ملازمت کرتا ہوں چونکہ ہمیں ہر وقت باڑے میں آنا جانا ہوتا ہے بعض اوقات کوئی بھینس پیشاب کرتی ہے جس کے چھینٹے میرے کپڑوں پر بھی پڑ جاتے ہیں تو کیا میں انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں جبکہ بار بار کپڑے تبدیل کرنے میں دشواری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... حلال جانوروں کا پیشاب نجاست خفیفہ ہے اور نجاست خفیفہ اگر جسم یا کپڑے کے کسی حصے پر چوتھائی یا اس سے کم مقدار میں لگ جائے تو وہ معاف ہے اگر اس سے بڑھ جائے تو پھر معاف نہیں ہے تو اسی اصول کے تحت صورت مسئولہ میں دیکھا جائیگا کہ اگر چھینٹے کپڑوں کے چوتھائی حصے یا اس سے کم پر ہیں تو پھر گنجائش ہوگی کہ انہی کپڑوں میں نماز پڑھ لیں لیکن اگر چھینٹے اتنی کثیر مقدار میں ہوں کہ چوتھائی حصے سے بڑھ جائیں تو پھر اس صورت میں ان کپڑوں میں نماز جائز نہیں ہے۔

کریہۃ کخرء الدجاج والبط والاوز فھو مجس نجاسۃ غلیظۃ.

وفی الھندیۃ (۱/۴۶): وبول مایؤکل لحمہ والفرس وخرء طیر لا یؤکل مخفف. ...... وذرق مایؤکل لحمہ من الطیر طاھر عندنا مثل الحمام والعصافیر وجم البق والبراغیث والقمل والکتان طاھر وان کثر.

وفی الدر المختار (۱/۳۱۹، ۳۲۰): ودم سمک وقمل وبرغوث وبق وزاد فی السراج وکتان.

(۱۳۲) چمگادڑ کے بول و براز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چمگادڑ کے بول و براز کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ چمگادڑ کا بول و براز پاک ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ چمگادڑ کا بول و براز ضرورت کی وجہ سے پاک ہے۔

وفی التاتارخانیۃ ([illegible]): وبول الخفاش وخرءہ لیس بشئ لانہ لا یستطاع الامتناع عنہ.

وفی الدر علی ھامش الطحطاوی (۱/۱۵۴): بول الخفاش وخرءہ فطاھر

وفی الشامیۃ (۱/۳۰۸): بول الخفافیش وخرءھا لیس بنجس لتعذر صیانۃ الثوب والاوانی عنھا.

(۱۳۳) پرندوں کی بیٹ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن قبل میں گلی سے گزر رہا تھا کہ گلی کے کنارے پر بیٹھے کوے نے میرے کپڑوں پر بیٹ کر دی جس کا کچھ حصہ میرے سر پر بھی آیا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا میرے کپڑے اور سر ناپاک ہو گئے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: کوے کی بیٹ نجاست خفیفہ کی قسم سے ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر چوتھائی کپڑے یا جس عضو پر لگی ہے اس کے چوتھائی سے کم ہو اور اسی حالت میں نماز پڑھ لی جائے تو یہ نماز صحیح ہو جائے گی، اور اگر چوتھائی سے زیادہ ہو تو ان کپڑوں میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے چونکہ بیٹ وغیرہ عام طور پر ایک چوتھائی سے کم ہی ہوتی ہے لہٰذا اگر آپ نے اسی حالت میں نماز پڑھ لی تو لوٹانے کی ضرورت نہیں البتہ نماز سے پہلے موقع ملنے کی صورت میں چوتھائی سے کم ہونے کے باوجود دھو لینا چاہیے۔

لما فی الھندیۃ ([illegible]): (و) النجاسۃ (المخففۃ) (وعفی منھا مادون ربع الثوب کذا فی اکثر المتون) اختلفوا فی کیفیۃ اعتبار الربع قیل المعتبر ربع طرف اصابتہ النجاسۃ کالذیل والکم والدخریص ان کان المصاب ثوبا وربع العضو المصاب کالید والرجل ان کان بدنا وصححہ صاحب التحفۃ والمحیط والبدائع والمجتبی والسراج الوہاج وفی الحقائق وعلیہ الفتوی کذا فی البحر الرائق.

وبول مایؤکل لحمہ والفرس وخرء طیر لا یؤکل مخفف ھکذا فی الکنز۔

(۱۳۴) مکھی نجاست پر بیٹھ کر کپڑوں پر بیٹھے تو کپڑے ناپاک ہوں گے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب انسان بیت الخلاء جاتا ہے تو وہاں پر موجود مکھیاں نجاست پر بیٹھ کر انسان پر بیٹھتی ہیں اور میں نے سنا ہے کہ اس نجاست کی تھوڑی سی مقدار بھی معاف نہیں ہے کیا کیا جائے، میں تو اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مکھی بیٹھ ہی جاتی ہے، تو کیا اس سے میرے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو بچنے کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جس نجاست کا آپ نے ذکر کیا یہ نجاست غلیظہ کہلاتی ہے اور اس کی تھوڑی سی مقدار جو درہم کے برابر ہو (ہتھیلی کے درمیانی حصے کے برابر) معاف ہے، اس سے زائد معاف نہیں، اور مکھیوں کے ذریعے جو نجاست انسان کے جسم پر لگتی ہے وہ اس سے کم ہوتی ہے لہٰذا اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

لما فی الھندیۃ (۱/۴۷): ذباب المستراح اذا جلس علی ثوب لا یفسدہ الا ان یغلب ویکثر.

(۱۳۵) ناپاک صابن کے استعمال کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل مشہور ہے کہ بعض وہ صابن جو غیر ملکی کمپنیاں بناتی ہیں، ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے تو کیا ایسے صابن کا استعمال کرنا جائز ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں عام استعمال کی اشیاء میں صرف سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر واقعی یہ بات تحقیق سے ثابت ہو تو بھی صابن میں انقلاب حقیقت کی بناء پر اس کا استعمال جائز لیکن خلاف اولیٰ ہے لہٰذا اگر کوئی ضرورت شدیدہ نہ ہو تو استعمال سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

وفی الدر المختار (۱/۳۱۵): (و) یطھر (زیت) تنجس (بجعلہ صابونا) بہ یفتی للبلوی کتنور رش بماء نجس لا بأس بالخبز فیہ.

وفی الشامیۃ (۱/۳۱۶): جعل الدھن النجس فی صابون یفتی بطھارتہ لانہ تغیر والتغیر یطھر عند محمد ویفتی بہ للبلوی.

(۱۳۶) ٹینکی میں مینڈک گرنے سے ٹینکی ناپاک نہیں ہوگی

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھروں میں جو ٹینکی وغیرہ بنائی جاتی ہے، اس میں بعض دفعہ

مینڈک وغیرہ گر جاتے ہیں اور اس پانی میں زندہ رہتے ہیں کیا اس سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے؟ اور اگر ناپاک ہو جائے تو پاکی کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ٹنکی میں مینڈک گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس پر کوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو۔

لما في الهندية (۱/۲۴): وموت ما يعيش في الماء فيه لا يفسده كالسمك والضفدع والسرطان وفي غير الماء قيل غير السمك يفسده وقيل لا وهو الاصح والضفدع البحري والبري سواء كذا في الهداية. ولا فرق في الصحيح بين ان يموت في الماء او خارج الماء ثم يلقى فيه كذا في التبيين ويستوي الجواب بين المتفسخ وغيره الا انه يكره شرب الماء لانه لا يخلو عن اجزاء وهو غير ماكول كذا في محيط السرخسي.

وفي الدر المختار (۱/۱۸۴، ۱۸۵): (ومائي مولد) ولو كلب الماء وخنزيره (كسمك وسرطان وضفدع الا بريا له دم سائل وهو ما لا سترة له بين اصابعه فيفسد في الاصح كحية برية ان لها دم والا لا.

وفي الشامية (فيفسد في الاصح) وعليه فما جزم به في الهداية من عدم الافساد بالضفدع البري وصححه في السراج محمول على ما لا دم له سائل كما في البحر والنهر.

(۱۳۷) قربانی کی کھالوں پر لگے خون کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے بعد کھالوں پر جو خون لگا ہوا ہوتا ہے اس میں بعض تو گوشت کا خون ہوتا ہے اور بعض دم مسفوح ہوتا ہے ان دونوں کا حکم ایک ہے یا الگ الگ، بر تقدیر ثانی وجہ فرق کیا ہے؟ حالانکہ خون تو نجس ہوتا ہے اور علمائے کرام دم مسفوح کے علاوہ مثلاً گوشت کے خون کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر کپڑوں کو لگ جائے تو اس میں نماز ادا کرلو نماز ہو جاتی ہے اور یہ قول بقرعید کے موقع پر فرمایا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ان دونوں خونوں کا حکم الگ الگ ہے ہر خون نجس نہیں، نجس خون صرف دم مسفوح ہے جیسا کہ منصوص ہے وما مسفوحاً اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو دم مسفوح نہیں وہ نجس نہیں۔ حدیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "احلت لنا ميتتان ودمان الميتتان الحوت والجراد والدمان الكبد والطحال" کہ دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، مچھلی اور ٹڈی، جگر اور تلی۔ یہ دونوں خون جامد ہیں دم مسفوح نہیں ہیں۔ ان کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر خون نجس نہیں بلکہ دم مسفوح نجس ہے لہٰذا جو گوشت کا خون ہے جو ذبح کے بعد رگوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ نجس نہیں لیکن احتراز اس سے بھی بہتر ہے۔

لما في الكلام المجيد (الانعام: ۱۴۵): قل لا اجد في ما اوحي الي محرما على طاعم يطعمه الا ان

نے پینے کی کوشش کی لیکن منہ دودھ تک نہیں پہنچ رہا تھا تو اس نے ایک تدبیر اختیار کی کہ اپنا پاؤں دودھ میں ڈبو کر اس کو چاٹ لیتی پھر دوبارہ داخل کر کے چاٹ لیتی اب اس دودھ کا کیا حکم ہوگا اس کو پینے یا کسی دوسرے استعمال میں لانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ مذکورہ مسئلہ میں اگر کسی کو یقینی طور پر یہ بات معلوم ہے کہ بلی کے منہ میں یا پاؤں پر ظاہری نجاست لگی ہوئی تھی اور وہ اپنے پاؤں کو دودھ کی پیالی میں ڈبو کر پھر اپنے پاؤں کو چاٹتی ہے تو اس سے پیالی میں موجود دودھ سب نجس اور ناپاک ہو جاتا ہے، اس کا استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی کو نجاست کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، بلکہ شک ہو، اگر اس دودھ کے مقابلے میں کوئی اور دودھ موجود ہو تو اس کا استعمال نہ کرنا افضل ہے۔ اگر کسی نے استعمال کر لیا تو یہ جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ہے۔

لما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ(۱/۲۸۴): سور طاهر مكروه تنزيهاً استعماله مع وجود غيره وهو سؤر الهرة والدجاجة المخلاة الخ. مالم تر النجاسة في فمها، لأنها تلازم التطواف في المنازل، أو للضرورة وعدم إمكان الاحتراز منها.

وفیہ ایضاً(۱/۲۸۵): وسؤر ما يستعمل النجاسة: كالهرة والفأرة، فإن رئي في أفواهها نجاسة كان كالماء الذي خالطته النجاسة، فإن تحقق طهارة أفواهها، فطاهر. وإن لم يعلم فيعتبر ما يعسر التحرز عنه، لكنه مكروه، وفي تنجيس ما يتحرز منه قولان أرجحهما: القول بالطهارة.

(۱۴۰) وضو کے پانی میں چیونٹی کا مرجانا

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے وضو کرنے کیلئے لوٹا بھر کر رکھا اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی میں ادھر چلا گیا واپس آیا تو اس پانی میں چیونٹیاں مری ہوئی تھیں میں نے ان کو نکال کر اسی پانی سے وضو کر لیا بعد میں ایک صاحب سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ فرمانے لگے جس پانی میں کوئی چیز مرجائے وہ ناپاک ہو جاتا ہے اس سے وضو کرنا جائز نہیں۔ تو کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟ اور کیا میرا وضو صحیح ہوگیا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ پانی یا دیگر مائعات میں اگر کوئی ایسی چیز گر کر مرجائے جس میں بہنے والا خون نہ ہو تو اس سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ اس سے وضو وغیرہ کرنا صحیح ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا وضو درست ہے۔

لما فی حاشیۃ الطحطاوی علی الدر(۱/۱۰۳): الا لبث الحكم في الذباب ثبت في غيره مما هو بمعناه كالبق والزنابير ــــ والنمل.

وفی الدر المختار(۱/۱۸۳): (ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وإن مات فيه) أي الماء ولو قليلاً (غير دموي كزنبور) وعقرب.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (١/٢٩١): لا ينجس البئر بموت حيوان لا دم له سائل كالذباب والعقرب والزنبور ونحوه.

(۱۴۱) گھی میں مینگنیاں گر جانے سے گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک دن گھی کا ڈبہ کمرے میں رکھا لیکن ڈھکن بند کرنا بھول گیا ایک دو دن بعد میں نے دیکھا تو اس میں چوہے کی دو تین مینگنیاں گری ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو اسی وقت نکال دیا۔ تو کیا یہ گھی نجس ہے یا نہیں؟ اس کا کھانا اور دیگر ضروریات کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد تھا تو مینگنیاں نکال کر اس کے ارد گرد موجود گھی نکال لینے کے بعد اس بقیہ گھی کا استعمال درست ہے، اور اگر گھی سیال (بہنے والا) تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ البتہ بعض اہل فتویٰ نے ضرورت کی بناء پر اس کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے۔ بشرطیکہ گھی کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہو۔

لما في الدر (١/٣١٨، ٣١٩): وبول غير مأكول ولو من صغير لم يطعم إلا بول الخفاش وخرءه فطاهر وكذا بول الفأرة لتعذر التحرز عنه وعليه الفتوى. في الرد: قوله وكذا بول الفأرة: اعلم أنه ذكر في الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأها نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب ولو طحن بعر الفأرة مع الحنطة ولم يظهر أثره يعفى عنه للضرورة. وفي الخلاصة: إذا بالت الهرة في الإناء أو على الثوب تنجس وكذا بول الفأرة، وقال الفقيه أبو جعفر: ينجس الإناء دون الثوب. قال في الفتح وهو حسن لعادة تخمير الأواني وبول الفأرة في رواية لا بأس به، والمشايخ على أنه نجس لخفة الضرورة بخلاف خرئها فإن فيه ضرورة في الحنطة. والحاصل: أن ظاهر الرواية نجاسة الكل، لكن الضرورة متحققة في بول الهرة في غير المائعات كالثياب وكذا في خرء الفأرة في نحو الحنطة دون الثياب والمائعات، وأما بول الفأرة فالضرورة فيه غير متحققة إلا على تلك الرواية المارة التي ذكرها الشارح أن عليها الفتوى، لكن عبارة التاترخانية: بول الفأرة وخرؤها نجس وقيل بولها معفو عنه وعليه الفتوى. وفي الحجة الصحيح أنه نجس، ولفظ الفتوى وإن كان آكد من لفظ الصحيح إلا أن القول الثاني هنا تأيد بكونه ظاهر الرواية فافهم، ولكن تقدم في فصل البئر أن الأصح أنه لا ينجسه

وفيه أيضاً (صـ ٢٢٢) في فصل البئر: في الدر: ولا نزح في بول الفأرة في الأصح فيض.

في الرد: قوله في بول الفأرة في الأصح وسيذكر في الأنجاس أن عليه الفتوى، وأن خرأها لا يفسد

مالم يظهر أثره — القول وفي الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأهما نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب ولعلهم رجحوا القول بالعفو للضرورة.

(۱۴۲) خنزیر کی چربی سے بنے ہوئے صابن کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو صابن یورپ سے آتے ہیں تو ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے تو ایسے صابن سے غسل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً — ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، ان کا استعمال غسل میں جائز ہے، کیونکہ جب ایک چیز کی حقیقت بدل جائے تو اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے۔ تاہم ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔

وفي رد المحتار (۱/۳۱۶): جعل الدهن النجس في الصابون يفتى بطهارته لأنه تغير والتغير يطهر عند محمدؒ ويفتى به للبلوى. وظاهره أن دهن الميتة كذلك — ثم اعلم ان العلة عند محمدؒ هي التغير وانقلاب الحقيقة وأنه يفتى به للبلوى.

وفي الدر المختار (۱/۳۲۶): (و) لا (ملح كان حمارا) أو خنزيرا ولا قذر وقع في بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى.

وفي الشامية تحته: (قوله لانقلاب العين) علة للكل وهذا قول محمد — وكثير من المشايخ اختاروه، وهو المختار لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة وتنتفي الحقيقة بانتفاء بعض اجزاء مفهومها فكيف بالكل؟ فان الملح غير العظم واللحم، فاذا صار ملحا ترتب حكم الملح، ونظيره في الشرع النطفة نجسة وتصير علقة وهي نجسة وتصير مضغة فتطهر، والعصير طاهر، فيصير خمراً فينجس ويصير خلا فيطهر، فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها.

(۱۴۳) نجاست کے اوپر پڑی گرد وغبار اگر کپڑوں پر لگ جائے

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نجاست کے اوپر جو گرد وغبار ہے اگر وہ بدن یا کپڑے پر لگ جائے تو کیا اس سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً — صورتِ مسئولہ میں اگر اس گرد وغبار کے کپڑوں پر لگنے سے کپڑوں میں اس نجاست کا اثر وغیرہ ظاہر ہو جائے تو پھر کپڑے ناپاک ہوں گے ورنہ نہیں۔

وفي فتاوى قاضي خان (۱/ ۱۳): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لاينجس مالم ير فيه أثر النجاسة ولو مر الريح على النجاسات وثمة ثوب مبلول معلق يصيبه الريح قيل إنه يتنجس.

وفي الهندية (۱/ ۴۷): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لاينجس مالم ير فيه أثر النجاسة هكذا في فتاوى قاضي خان: إذا مرت الريح بالعذرات وأصابت الثوب المبلول يتنجس إن وجدت رائحة النجاسة وما يصيب الثوب من بخارات النجاسات لايتنجس بها وهو الصحيح.

(۱۴۴) غلہ گاہتے وقت بیلوں کے پیشاب کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلہ گاہنے کے وقت یعنی جب اس پر بیلوں کو چلاتے ہیں اور بیل غلہ پر پیشاب کرتے ہیں تو کیا وہ غلہ سب کا سب اس سے ناپاک ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: دیکھا جائے گا کہ اگر غلہ کو تقسیم کرلیا گیا یا گندم کسی کو ہبہ کردی گئی یا گندم بیچ دی گئی یا اس کو کھالیا گیا ہو ان تمام صورتوں میں گندم کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا اور اگر گندم کے بعض حصہ کو اندازے سے دھولیا گیا تو بھی کل گندم کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا تب صورت اور فی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے احتیاط یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو تمام گندم کو دھولیا جائے یا متعین جگہ پر پیشاب نظر آئے تو اس کو دھولیا جائے۔

وفي التاتارخانية (۱/ ۳۴۲، ۳۴۳): ونقل عن الشيخ المعروف بخواهرزاده إذا غسل موضعا بلا تحري يطهر وفي الخلاصة والنصاب هو المختار وفي الذخيرة ونظير هذه المسئلة الحنطة التي تداس بالحمر فتبول وتروث ويصيب بعض الحنطة ويختلط ما أصيب منها بغيرها. قالوا: لو عزل بعضها وغسل ثم خلط الكل أبيح تناولها وكذلك لو عزل بعضها ووهبها من إنسان أو تصدق به حل له تناول الباقي.

وفي الدر المختار (۱/ ۳۴۸): كما لو بال حمر على حنطة تدوسها فقسم أو غسل بعضه أو ذهب بهبة أو أكل أو بيع حيث يطهر الباقي وكذا الذاهب لاحتمال وقوع النجس في كل طرف.

(۱۴۵) ناپاک چیز پانی میں گرنے کے بعد اس پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناپاک چیز پانی میں گرے اور اس کے گرنے سے

چھینٹیں اڑ کر کسی پر جا پڑیں تو کیا وہ پاک ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... صورت مسئولہ میں اگر نجاست کا اثر چھینٹوں میں ظاہر ہو جائے تو وہ ناپاک ہو جائیں گی ورنہ پاک رہیں گی۔

لما فی الهندية (۱/۴۷): حمار بال فی الماء فاصاب من ذلک الرشاش ثوب انسان لا یمنع جواز الصلاة وان کثر حتی یستیقن انه بول وکذا لو رمیت العذرة فی الماء فخرج منها رشاش فاصاب ثوبا ان ظهر اثرها فیه یتنجس والا فلا هذا هو المختار وبه اخذ الفقیه ابو اللیث سواء کان الماء جاریا او راکدا.

وفی ردالمحتار (۱/۳۲۵): وفی الخانية ماء الطابق نجس قیاساً لا استحسانا: وصورته: اذا احرقت العذرة فی بیت فاصاب ماء الطابق ثوب انسان لا یفسده استحسانا مالم یظهر اثر النجاسة فیه

(۱۳۶) راستوں کی کیچڑ اور ناپاک پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ راستوں کی کیچڑ اور ناپاک پانی کی چھینٹوں کا کپڑے اور بدن پر لگنے سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... راستوں میں چلتے ہوئے عموماً جو ناپاک پانی کے چھینٹے اور کیچڑ وغیرہ کپڑوں یا بدن پر لگ جاتے ہیں تو اس میں بوجہ عموم بلویٰ اور دفع حرج کے حضرات فقہاء کرام نے گنجائش لکھی ہے کہ ان سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے البتہ اگر کوئی ایسی نجاست لگ جائے جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا ضروری ہوگا۔ نیز یاد رہے کہ یہ جواز کی صورت اس وقت ہے جب ضرورت شدیدہ ہو ورنہ عدم ضرورت شدیدہ کے وقت ایسا نہ کرنا چاہئے بلکہ احتیاط کر لی جائے۔

لما فی التاتارخانية (۱/۲۸۸): روی المعلی عن محمد رحمه الله انه قال الروث لایمنع جواز الصلوة وان کان کثیرا فاحشا قیل هذا آخر اقواله ورجع الی هذا القول حین جاء مع الخلیفة الی الری ورای اسواقهم وسککهم مملوءة من الأرواث فرجع الی هذا القول دفعا للبلوی قال مشایخنا علی قیاس هذه الروایة طین بخارا لایمنع جواز الصلوة وان کان کثیرا فاحشا مع أن التراب مخلوطا بالعذرات دفعا للبلوی وفی الفتاوی العتابیه مالم یر عین النجاسة.

وفی الشامية (۱/۳۲۳) (قوله وطین شارع) مبتدأ خبره قوله عفو والشارع الطریق ط وفی الفیض: طین الشوارع عفو وان ملأ الثوب للضرورة ولو مختلطا بالعذرات وتجوز الصلاة معه وقدمنا ان هذا قاسه المشایخ علی قول محمد آخرا بطهارة الروث والخثی ومقتضاه انه طاهر لکن لم یقبله الامام الحلوانی کما فی الخلاصة، قال فی الحلية ای لایقبل کونه طاهراً وهو متجه بل الاشبه المنع

ما تنفصل النجاسة منه الا بمشي به بحيث يجئ ويذهب في ايام الاوحال في بلادنا الشامية لعدم انفكاك طرقها من النجاسة غالبا مع عسر الاحتراز بخلاف من لا يمر بها اصلا في هذه الحالة فلا يعفى في حقه حتى ان هذا لا يصلي في ثوب ذاك. اه اقول والعفو مقيد بما اذا لم يظهر فيه اثر النجاسة كما نقله في الفتح عن التجنيس (والحاصل ان الذي ينبغي انه حيث كان العفو للضرورة وعدم امكان الاحتراز ان يقال بالعفو وان غلبت فيها النجاسة ما لم ير عينها لو اصابها بلا قصد وكان ممن يذهب ويجئ والا فلا ضرورة) وقد حكى في القنية ايضا قولين فيما لو ابتلت قدماه مما رش في الاسواق الغالبة النجاسة ثم نقل انه لو اصاب ثوبه طين السوق او السكة ثم وقع الثوب في الماء تنجس.

(۱۴۷) شیرخوار بچے کی قے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹے شیرخوار بچے کی قے پاک ہے یا ناپاک؟ اگر ناپاک ہے تو غلیظ ہے یا خفیفہ؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر شیرخوار بچے نے منہ بھر کر قے کی ہے تو وہ ناپاک ہوگی اور نجاست غلیظہ ہوگی اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو ناپاک نہیں ہوگی۔

وفي الهندية (۱: ۴۶) الصبي اذا قاء على ثدي الام ثم مص الثدي مرارا يطهر.

وفي تنوير الابصار مع الدر (۱: ۱۳۷) (و) ينقضه (قيء ملأ فاه) ... (من مرة او علق او طعام او ماء) اذا وصل الى معدته وان لم يستقر وهو نجس مغلظ ولو من صبي ساعة ارتضاعه هو الصحيح لمخالطة النجاسة ذكره الحلبي.

(۱۴۸) نجس گوشت کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کلو گوشت لے کر آیا کہ رات کے وقت پکا کر کھائیں گے میں نے اس کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا تاکہ خراب نہ ہو جائے ہوا لگتی رہے چارپائی کے اوپر میرا ایک چھوٹا بچہ سویا تھا اس نے پیشاب کر دیا جو نیچے گوشت میں گر گیا جس سے گوشت نجس ہو گیا اب اس گوشت کو پاک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر پاک ہو سکتا ہے تو پاک کرنے کا طریقہ بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: نجاست جو گوشت میں لگنے کے بعد نظر نہ آتی ہو جیسے پیشاب وغیرہ وہ نجاست غیر مرئی کہلاتی ہے اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا دل مطمئن ہو جائے اور یہ اطمینان تین مرتبہ دھونے سے حاصل ہو جاتا ہے لہذا

صورت مسئولہ میں گوشت کو تین مرتبہ دھولیا جائے اور ہر مرتبہ اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ گوشت سے پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہوجائیں تو گوشت پاک ہوجائے گا۔

لما فی الفتاوی الولوالجیۃ(۱/۳۳): رجل علی یدہ نجاسۃ رطبۃ فجعل یضع یدہ علی عروۃ القمقمۃ کلما صبت الماء علی الید فاذا غسل ثلاث مرات طھرت العروۃ مع طھارۃ الید لان نجاستھا بنجاسۃ الید فطھارتھا بطھارۃ الید.

وفی التاتارخانیۃ(۱/۳۰۶): (وان کانت غیر مرئیۃ) کالبول والخمر ذکر فی الاصل وقال: یغسلھا ثلاث مرات ویعصر فی کل مرۃ فقد شرط الغسل ثلاث مرات وشرط العصر فی کل مرۃ ...... وفی القدوری وما لم یکن مرئیۃ فالطھارۃ موکولۃ الی غلبۃ الظن وقدرنا بالثلاث ...... الا قولہ ثم التقدیر لیس بلازم عندنا بالثلاث بل ھو مفوض الی اجتھادہ ان کان غالب ظنہ انھا تزول بما دون الثلاث یحکم بطھارتہ.

وفی الدر المختار(۱/۳۳۳): ویطھر لبن وعسل ودبس ودھن یغلی ثلاثا ولحم طبخ بخمر یغلی وتبرید ثلاثا.

(قولہ ولحم طبخ الخ) فی الظھیریۃ ولو صبت الخمرۃ فی قدر فیھا لحم ان کان قبل الغلیان یطھر اللحم بالغسل ثلاثا وان بعدہ فلا.

(۱۴۹) بچوں کے پیشاب کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ چھوٹے بچوں کا پیشاب پاک ہے اگر کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوتے انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے تو کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... پیشاب علی الاطلاق نجاست مغلظہ میں سے ہے، چاہے بچوں کا ہو یا بڑوں کا ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ بقدر ایک درہم (ہتھیلی کی گہرائی کے بقدر) یا اس سے کم کپڑوں پر لگ جائے اور اس کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہوجائے گی البتہ معلوم ہوجانے پر اس کو بھی دھوکر نماز پڑھی جائے اور بقدر ایک درہم سے زیادہ کپڑوں پر لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز پڑھ لینے سے نماز ہی درست نہ ہوگی۔

لما فی الھندیۃ (۱/۴۶): کل مایخرج من بدن الانسان مما یوجب خروجہ الوضوء أو الغسل فھو مغلظ کالغائط والبول والمنی والمذی والودی والقیح والصدید والقیء اذا ملأ الفم کذا فی البحر

الرائق...... وکذلک بول الصغیر والصغیرۃ اکلا اولا کذا فی الاختیار۔

وفی المراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی (۱/۱۴۳): (قولہ وبول مالا یؤکل لحمہ) شمل بول الحیۃ فانہ مغلظ　(قولہ ولو رضیعا) ولو رضیعاً لم یطعم سواء کان ذکراً او انثی۔

(۱۵۰) ٹینکی میں چھپکلی گر جائے تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر کی ٹینکی میں چھپکلی گر جائے تو کیا پانی ناپاک ہو جائے گا؟ نیز اگر گر کر مر بھی جائے تو پھر صفائی کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　صورت مسئولہ میں چھپکلی کے ٹینکی میں گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ یہی حکم مرنے کی صورت میں بھی ہے

لما فی الھدایۃ (۱/۲۲): وموت مالیس لہ نفس سائلۃ فی الماء لا ینجسہ کالبق والذباب والزنابیر والعقارب ونحوھا

وفی الدر المختار (۱/۱۸۳): (ویجوز) رفع الحدث (بما ذکر وان مات فیہ) ای الماء ولو قلیلا (غیر دموی کزنبور) وعقرب وبق

وفی الشامیۃ (غیر دموی) المراد مالا دم لہ سائل لما فی القھستانی ان المعتبر عدم السیلان لا عدم اصلہ حتی لو وجد حیوان لہ دم جامد لا ینجس۔

(۱۵۱) اچار میں چوہیا مر جانے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ گھروں میں اچار بناتے ہیں میرے گھر میں اچار کا ایک ڈبہ رکھا ہوا تھا اس میں کسی طرح چوہیا چلی گئی وہ اس ڈبے کے اندر مر چکی ہے اب اس اچار کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ ہم نے اس پر کافی خرچہ کیا ہوا ہے اور محنت بھی خوب کی ہے اس کے کھانے کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً　سیال چیز میں اگر کوئی نجاست گر جائے تو وہ پورا کا پورا نجس ہو جاتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اچار بھی سیال چیز ہے اور اس میں چوہیا گر جانے کی صورت میں سارا اچار نجس ہو جائے گا۔

لما فی فتح القدیر مع شرح العنایۃ (۱/۸۳): (ولانہ لا دم فیھا) ای فی ھذہ الحیوانات اذا لدموی لا یسکن الماء والدم ھو المنجس، واذا مات (فی غیر الماء) کالخل والعصیر والحلیب ونحوھا

وفی فتح القدیر (۱/۸۳): وموت مالیس لہ نفس سائلۃ فی الماء لا ینجسہ کالبق الخ ولان المنجس ھو اختلاط الدم المسفوح باجزائہ عند الموت الخ، کل طعام وشراب وقعت فیہ دابۃ لیس لھا دم

فماتت فيه فهو حلال أكله وشربه والوضوء به.

وفي الهندية (١/٢٥): في جامع الجوامع اذا تنجس الماء القليل بوقوع النجاسة فيه ان تغيرت اوصافه لا ينتفع به من كل وجه.

وفي الدر المختار (١/١٨٥): (ويتنجس) الماء القليل (بموت مائي معاش بري مولد) في الاصح (كبط واوز) الخ.

(۱۵۲) گھی میں چوہا گر جائے تو گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں گھی کا [illegible] برتن تھا [illegible] آخر اس میں گر گیا اور چوہا بھی کافی بڑا ہے اور مرنے کے بعد صبح کے وقت اس میں مرا ہوا تھا، اس نے اپنے خون نکلنے کی [illegible] جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوا لہذا کچھ خون بھی گھی پر لگا ہوا ہے، کیا یہ سارا گھی ناپاک ہو گیا؟ اگر ناپاک ہو گیا ہے تو [illegible] کہاں استعمال کر سکتے ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد ہو تو چوہے کے ارد گرد اور جہاں خون لگا ہوا ہے اسے ہٹا کر باقی گھی کا استعمال جائز ہے، ہاں اگر گھی مائع (پگھلا ہوا) ہو تو پھر سارا گھی ناپاک ہو گیا اور ایسے گھی کو کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات میں لا سکتے ہیں جیسے چراغ جلانے کے لئے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات جائز ہیں۔

لما في الهندية (١/٣٥): الفأرة لو ماتت في السمن ان كان جامداً قور ما حوله ورمي به والباقي طاهر يؤكل وان كان مائعا لم يؤكل وينتفع به من غير جهة الاكل مثل الاستصباح ودبغ الجلد.

(۱۵۳) حلال جانوروں کے پیشاب کی کتنی مقدار معفو عنہ ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حلال جانور کا پیشاب کپڑوں پر لگ جائے تو کتنی مقدار سے کپڑے ناپاک شمار ہوں گے؟ نیز اسی صورت میں حرام جانوروں کے پیشاب کا حکم بھی بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: حلال جانوروں کا پیشاب (نجاست خفیفہ) کپڑوں پر لگ جائے تو اگر نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی حصہ سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک شمار ہوگا، اور اگر حرام جانوروں کا پیشاب (نجاست غلیظہ) کپڑے پر لگ جائے تو اگر درہم کی مقدار (ہتھیلی کے درمیانی حصے کے برابر مقدار) سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اگر اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ نیز سوئی کے سرے (ناکے) کے برابر چھوٹی چھوٹی چھینٹیں کپڑے پر لگ جائیں تو ان سے کپڑا ناپاک نہیں ہوگا چاہے وہ چھینٹیں حرام جانور کے پیشاب کی ہوں یا حلال جانور کے پیشاب کی۔

لما فی الهندیة (۱/۴۵): الاول المغلظة وعفی منها قدر الدرهم ـــ وکذلک الخمر والدم المسفوح ولحم المیتة وبول مالا یؤکل والروث ـــ نجاسة غلیظة ـــ (والثانی المخففة) وعفی منها مادون ربع الثوب ـــ وفی الحقائق وعلیه الفتوی ـــ وبول ما یؤکل لحمه والفرس وخرء طیر لا یؤکل مخفف

وفی الدر المختار (۱/۳۱۹،۳۱۸): (وعفا) الشارع (عن قدر درهم) ـــ (وهو مثقال) ـــ (فی) ـــ (کثیف) له جرم (وعرض مقعر الکف) ـــ (فی رقیق من مغلظة کعذرة) ـــ (وبول غیر ماکول ولو من صغیر لم یطعم) الا بول خفاش وخرءه.

(۱۵۴) دوران غسل پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جائیں تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض اوقات غسل کرتے ہوئے پانی کی چھینٹیں پانی میں گر جاتی ہیں، اب اگر یہ غسل جنابت ہو تو کیا ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک ہو جائے گا؟ اگر مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق پڑتا ہو تو وہ بھی بیان فرما دیں، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ صورت مسئولہ میں پانی میں صرف چھینٹیں گرنے سے بالٹی کا پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

لما فی اعلاء السنن (۱/۲۵۴): ان ابن عمر والبراء بن عازب ادخل یده فی الطهور ولم یغسلها ثم توضأ ولم یر ابن عباس بأسابما ینتضح من غسل الجنابة.

وفیها ایضاً (ص۲۵۳): عن ابن عباس فی الرجل یغتسل من الجنابة فینتضح فی انائه من غسله فقال لا بأس به اخرجه ابن ابی شیبة فی المصنف.

وفی الهندیة (۱/۲۳): جنب اغتسل فانتضح من غسله شیء فی انائه لم یفسد علیه الماء اما اذا کان یسیل منه سیلانا افسده وکذا حوض الحمام علی قول محمد لایفسده مالم یغلب علیه یعنی لا یخرجه من الطهوریة کذا فی الخلاصة.

(۱۵۵) چائے یا پانی وغیرہ میں مکھی گرنے کا حکم

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چائے کے کپ میں مکھی گر جائے تو اس چائے کا پینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ مکھی کو غوطہ دے کر نکال دے اور چائے پی لے تو کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ اگر چائے میں مکھی گر جائے اور اسے نکال کر پھینک دیا جائے تو چائے کا پینا درست ہے کیونکہ اس سے چائے

ناپاک نہیں ہوتی ہیں اس لئے کہ ان کے اندر دم مسفوح (بہنے والا خون) نہیں ہوتا اور جن اشیاء میں دم مسفوح نہیں ہوتا وہ ناپاک نہیں تو دوسری چیزوں میں گرنے سے ان کو ناپاک نہیں کرتیں، البتہ مکھی کو چاہئے سالن، پانی وغیرہ کے اندر ڈبو کر نکالنا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ارشادی ہے، امر وجوبی نہیں یعنی بطور رحم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ کسی غریب آدمی کو وہ ہر وقت میسر نہیں ہوتا نہیں وہ حرج میں مبتلا نہ ہو جائے لیکن اگر کسی کی طبیعت متنفر ہوتی ہو تو وہ نہ پئے اس لئے کہ یہ امر وجوبی نہیں اور نہ پینے سے وہ گنہگار نہ ہوگا اور یہی حکم تمام حشرات کا ہے۔

وفي الهندية (۱/۲۴): وموت ما ليس له نفس سائلة في الماء لا ينجسه كالبق والذباب والزنابير والعقارب ونحوها

وفي رد المحتار (۱/۲۲۲): (قوله ومثله ماء لادم له) اى سائل سواء كان يعيش في الماء أو في غيره عن البحر: (قوله قيد للكل) اى للآدمي وماكول اللحم ولادم له (قوله طاهر) أى في ذاته طهور أى مطهر لغيره من الأحداث والأخباث.

وفي أصول الشاشي (ص ۲۷): وعلى هذا قلنا في قوله عليه السلام اذا وقع الذباب في طعام أحدكم فامقلوه ثم انقلوه فان في احدى جناحيه داء وفي الأخرى دواء وانه ليقدم الداء على الدواء دل سياق الكلام على أن المقل لدفع الأذى عنا، لا للأمر تعبدى حقا للشرع فلايكون للإيجاب

(۱۵۶) ناپاک فرش کو خشک ہونے کے بعد پانی سے دھونا ضروری ہے؟ کچے فرش کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کچے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو کیا خشک ہونے سے وہ پاک ہو جائے گا یا پانی سے دھونا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کچے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو اس کو پاک کرنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ خشک ہونے سے وہ پاک ہو جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پر پانی ڈال کر لیں اور کپڑے سے خشک کیا جائے اس طرح تین مرتبہ کرنے سے وہ پاک ہو جائے گا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بہت زیادہ پانی ڈال کر چھوڑ دیں یہاں تک کہ نجاست کی بو اور رنگ باقی نہ رہے پانی خشک ہو جائے تو زمین پاک ہو جائے گی۔

البتہ پہلے طریقے میں اس پر نماز پڑھنا تو جائز ہے لیکن تیمم کرنا جائز نہیں، اور خشک ہونے کے بعد اس پر دوبارہ پانی آنے کی صورت میں بھی نجاست لوٹ کر نہیں آئے گی۔

وفی الھندیۃ (۱/۴۳): الأرض اذا تنجست ببول واحتاج الناس الی غسلھا فان کانت رخوۃ یصب الماء علیھا ثلاثا فتطھر وان کانت صلبۃ قالوا یصب الماء علیھا وتدلک ثم تنشف بصوف او خرقۃ یفعل کذالک ثلاث مرات فتطھر وان صب علیھا ماء کثیر حتی تفرقت النجاسۃ ولم یبق ریحھا ولا لونھا وترکت حتی جفت تطھر کذا فی فتاوی قاضی خان.

وفی الشامیۃ (۱/۳۱۱): (قولہ ولہ الطھوریۃ) لأن الصعید علم قبل التنجس طاھرا وطھورا وبالتنجس علم زوال الوصفین ثم ثبت بالجفاف شرعا أحدھما أعنی التطھیر فیبقی الآخر علی ماعلم من زوالہ واذا لم یکن طھورا لا یتیمم بہ اھ

وفی الدر المختار (۱/۳۱۱): (وحکم آجر) ونحوہ کلبن (مفروش وخص) بالخاء تحجیرۃ سطح (وشجر وکلاء قائمین فی ارض کذلک) ای کارض فیطھر بجفاف وکذا کل ما کان ثابتا فیھا لأخذہ حکمھا باتصالہ بھا فالمنفصل یغسل لاغیر الاحجرا اخشنا کرحی فکارض.

وفی الشامیۃ (۱/۳۱۱): (قولہ بیبسھا) لما فی سنن ابی داؤد باب طھور الأرض اذا یبست وساق بسندہ عن ابن عمرؓ قال کنت ابیت فی المسجد فی عھد رسول اللہ ﷺ وکنت شابا عزبا وکانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد ولم یکونوا یرشون شیئا من ذلک" ولو أرید تطھیرھا عاجلا یصب علیھا الماء ثلاث مرات وتجفف فی کل مرۃ بخرقۃ طاھرۃ وکذا لو صب علیھا الماء بکثرۃ حتی لا یظھر اثر النجاسۃ...... یفھم من قول البحر صب علیھا الماء کثیرا ثم ترکھا حتی نشفت طھرت أنہ نجس.

وفی الدر المختار (۱/۳۱۳): ثم ھل یعود نجسا ببلہ بعد فرکہ؟ المعتمد لا، وکذا کل ما حکم بطھارتہ بغیر مائع

وقال الشامی رحمہ اللہ تحتہ: (قولہ بغیر مائع) ای کالدلک فی الخف، والجفاف فی الارض ——— ومقتضاہ أن الخف لو وقع فی ماء قلیل لا ینجسہ ——— وقدمنا ان الآجرۃ اذا تنجست فجفت ثم قلعت فالمختار عدم العود

(۱۵۷) کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کا حکم

سوال ——— کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے اور گھروں کے اردگرد فصلیں ہوتی ہیں ہم ان میں جا کر پیشاب کرتے ہیں ایک دن ایک مولانا صاحب ہمارے

ہاں تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے۔ تو اب پوچھنا یہ ہے کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ قضاء حاجت کیلئے ایسی جگہ تلاش کرنی چاہئے جس میں ستر کا مکمل اہتمام ہو، اور کسی کی ایذا رسانی نہ ہوتی ہو، اور نہ ہی کسی محترم چیز کی بے حرمتی ہو، کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے، لیکن اگر کھیتوں میں کسی ایسی جگہ پر قضاء حاجت کی جائے جس میں ستر کا اہتمام ہو، اور فصل کی تکویث کا اندیشہ نہ ہو، اور نہ ہی کسی کی ایذا رسانی کا سبب بنے تو اس صورت میں کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۵۰): ویکره علی طرف نهر او بئر او حوض او عین او تحت شجرة مثمرة او فی زرع.

وفی الدر المختار (۱/۳۴۳): وعلی طرف نهر او بئر او حوض او عین او تحت شجرة مثمرة او فی زرع.

(۱۵۸) استعمال شدہ کمبل، کپڑے وغیرہ کو بغیر دھوئے استعمال کرنے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل لائٹ ہاؤس وغیرہ پر گرم کمبل سویٹر، جرسیاں وغیرہ جو ملتی ہیں انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ استعمال شدہ اشیاء (مثلاً گرم کمبل، سویٹر، جرسیاں اور کپڑے وغیرہ) جو مختلف جگہوں پر سستے داموں ملتی ہیں اگر یہ کفار کی استعمال کردہ ہوں تو جب تک ان کے ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب نہ ہو، انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا درست ہے تاہم دھو کر استعمال کرنا بہرحال اولیٰ اور بہتر ہے۔

لمافی الولوالجیة (۱/۲۹): لاباس بلبس ثیاب اهل الذمة والصلوة فیها واما الازار والسراویل فانها تکره الصلوة فیهما مالم یغسلا فی قول ابی حنیفة و محمد وقال ابو یوسف اجزاه بلاکراهة انما الجواز فی الکل فلان الطهارة فی الثیاب اصل ولیس فی حالة الکفر ما یوهم نجاسة ثیابهم فلهذه العلة لم یکره ابو یوسف فی الازار والسراویل وهما کرها.

وفی الدر المختار (۱/۳۵۰): ثیاب الفسقة واهل الذمة طاهرة

(وفی الشامیة تحته): الاصح انه لایکره لانه لم یکره من ثیاب اهل الذمة الا السراویل مع استحلالهم الخمر، فهذا اولی اهـ

(۱۵۹) نجاست سے کپڑے کو پاک کرنے کے بعد اگر داغ رہ جائے تو کپڑے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو احتلام ہوا صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا اور شلوار

ہو (جس کا ٹھوس وجود ہو) تو اس عین نجاست کو زائل کرنے سے کپڑے پاک ہو جاتے ہیں۔ خواہ ایک مرتبہ پانی بہانے سے زائل ہو جائے۔ کیونکہ پاکی سے مراد نجاست کو دور کرنا ہوتا ہے اور اس صورت میں یہ پایا جاتا ہے اور اگر نجاست غیر مرئیہ یعنی نظر نہ آنے والی ہو جیسے مائعات کی نجاستیں تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کپڑوں کو کسی برتن میں دھویا جائے تو یہ ضروری ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے اور نچوڑا جائے۔ البتہ اگر کپڑوں کو ماء جاری جیسے نہر وغیرہ کے پانی میں یا وہ پانی جو ماء جاری کے حکم میں ہو میں دھویا جائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے کہ بالٹی یا کسی اور برتن میں کپڑوں کو ڈال دیا جائے اور پھر یہاں تک پانی ڈالا جائے اور اتنا پانی بہہ جائے کہ دھونے والے کو غالب گمان ہو کہ اب نجاست نکل چکی ہے۔ اس صورت میں یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہو جائے گا۔ اور کپڑوں کو نچوڑنا بھی ضروری نہ ہوگا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے طالب علم ساتھی کا یہ کہنا تو درست ہے کہ جب بالٹی وغیرہ سے پانی بہنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے اور نچوڑنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی لیکن یہ ضروری ہے کہ اتنا پانی بہہ جائے کہ نجاست نکل جانے کا ظن غالب ہو جائے۔

لما فی مراقی الفلاح (ص ۱۲۹): (ویطهر) محل النجاسة (غیر المرئیة بغسلها ثلاثا) وجوبا وسبعاً مع التتریب ندباً فی نجاسة الکلب خروجاً من الخلاف (والعصر کل مرة) تقدیراً لغلبة الظن فی استخراجها فی ظاهر الروایة وفی روایة یکتفی بالعصر مرة وهو أوفق ووضعه فی الماء الجاری یغنی عن التثلیث والعصر کالاناء اذا وضعه فیه فامتلأ وخرج منه طهر.

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح: قوله ووضعه فی الماء الجاری الخ یعنی اشتراط الغسل والعصر ثلاثا انما هو اذا غمسه فی إجانة، اما اذا غمسه فی ماء جار حتی جری علیه الماء او صب علیه ماء کثیراً بحیث یخرج ما أصابه من الماء ویخلفه غیره ثلاثا فقد طهر مطلقاً بلا اشتراط عصر وتجفیف، وتکرار غمس هو المختار والمعتبر فیه غلبة الظن هو الصحیح.

وفی الشامیة (۱/۳۳۳): تحت قوله اما لو غسل الخ. أن المعتبر فی تطهیر النجاسة المرئیة زوال عینها ولو بغسلة واحدة ولو فی اجانة کمامر فلا یشترط فیها تثلیث غسل ولا عصر، وأن المعتبر غلبة الظن فی تطهیر غیر المرئیة بلا عدد علی المفتی به ..... ولا شک ان الغسل بالماء الجاری وما فی حکمه من الغدیر او الصب الکثیر الذی یذهب بالنجاسة اصلاً ویخلفه غیره مراراً بالجریان اقوی من الغسل فی الاجانة التی علی خلاف القیاس، لأن النجاسة فیها تلاقی الماء وتسری معه فی جمیع اجزاء الثوب فیبعد کل البعد التسویة بینهما فی اشتراط التثلیث.

(قوله فی غدیر) ای ماء کثیر له حکم الجاری (قوله أو صب علیه ماء کثیر) ای بحیث یخرج الماء ویخلفه غیره ثلاثاً لان الجریان بمنزلة التکرار والعصر، هو الصحیح.

(۱۶۱) نجس کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ نیز نجس کپڑے کو دھوپ سے خشک کرنے کے بعد پاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا، نیز اگر نجس کپڑے کو دھوپ میں سکھا دیا جائے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ نچوڑا جائے اس طرح کہ پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہو جائیں، نجس کپڑا دھوئے بغیر محض دھوپ میں سکھانے سے پاک نہیں ہوگا۔

لما فی البدائع الصنائع (۱/۹۳): واما سائر النجاسات اذا اصابت الثوب أو البدن و نحوهما فانها لا تزول الا بالغسل سواء كانت رطبة او يابسة وسواء كانت سائلة او لها جرم.

وفی الهندية (۱/۴۲): اذا غسل ثلاثا وعصر فی كل مرة ثم تقاطرت منه قطرة فاصابت شيئا ان عصره فی المرة الثالثة وبالغ فيه بحيث لو عصره لا يسيل منه الماء فالثوب واليد وما تقاطر طاهر والا فالكل نجس

(۱۶۲) ناپاک جوتا پاک کرنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر راستے میں چلتے ہوئے کسی کے جوتے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کیلئے جوتا دھونا ضروری ہے یا کپڑے سے صاف کرلینا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جوتے پر لگنے والی نجاست خواہ جسم رکھنے والی ہو (مثلاً پاخانہ، خون، لید وغیرہ) یا جسم رکھنے والی نہ ہو (مثلاً شراب، پیشاب وغیرہ) اگر اسے زمین سے رگڑ دیا جائے یا کسی کپڑے وغیرہ سے صاف کرلیا جائے اس طرح کہ نجاست کا اثر دور ہو جائے تو وہ جوتا صحیح قول کے مطابق پاک ہو جانے کا، چنانچہ اسے دھونا ضروری نہیں۔

لما فی الهندية (۱/۴۲): الخف اذا اصابته النجاسة ان كانت متجسدة ... اذا مسحه علی وجه المبالغة بحيث لا يبقى لها اثر يطهر وعليه الفتوى لعموم البلوى كذا فی فتاوى قاضيخان وان لم تكن النجاسة متجسدة ... اذا التصق بها مثل التراب او ألقي عليها فمسحها يطهر وهو الصحيح هكذا فی التبيين وعليه الفتوى للضرورة كذا فی معراج الدراية.

وفی الدر المختار (۱/۳۰۹، ۳۱۰): (و) يطهر (خف ونحوه) كنعل (تنجس بذی جرم) هو كل ما يرى بعد الجفاف ولو من غيرها كخمر وبول أصابه تراب به يفتى (بدلك) يزول به اثرها

(۱۶۳) اسٹیل یا پلاسٹک کے نجس برتن پاک کرنے کا طریقہ

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل گھروں میں عام طور پر اسٹیل یا پلاسٹک کے برتن استعمال ہوتے ہیں بسا اوقات ان پر کوئی نجاست لگ جاتی ہے اور یہ ناپاک ہوجاتے ہیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... اسٹیل اور پلاسٹک کے برتن اگر چکنے ہوں اور کھردرے نہ ہوں ان پر نجاست لگ جائے تو وہ پانی مٹی یا صاف کپڑے سے پونچھنے سے بھی پاک ہوجائیں گے جبکہ نجاست زائل ہوجائے اگر وہ برتن کھردرے یا ابھرے ہوئے ہوں تو پانی سے دھوئے بغیر وہ پاک نہ ہوں گے۔

لما فی البحر الرائق (۱/۳۹۰، ۳۹۱): (ونحو السیف بالمسح) ای یطھر کل جسم صقیل لامسام له بالمسح جدید اکان او غیره فخرج الحدید إذا کان علیه صدأ أو منقوشا فانه لا یطھر الا بالغسل ... وزاد فی السراج الوھاج العظم والآبنوس وصفائح الذھب والفضة اذا لم تکن منقوشة ... الخ.

وفی الھندیة (۱/۴۳): (ومنھا المسح) اذا وقع علی الحدید الصقیل الغیر الخشن کالسیف والسکین والمرآة ونحوھا نجاسة من غیر أن یموه بھا فکما یطھر بالغسل یطھر بالمسح بخرقة طاھرة ... ولا فرق بین الرطب والیابس ولا بین ماله جرم وما لا جرم له ... الخ.

وفی الدر المختار (۱/۳۱۰): ویطھر (صقیل) لامسام له (کمرآة) وظفر وعظم وزجاج وآنیة مدھونة أو خراطی وصفائح فضة غیر منقوشة بمسح یزول به اثرھا مطلقا وبه یفتی.

(۱۶۴) کتاب کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن گھر میں مطالعہ کر رہا تھا اچانک کسی کام کیلئے جانا ہوا تو کتاب تپائی پر چھوڑ کر چلا گیا ادھر کہیں سے گھومتا پھرتا میرا بیٹا اس کمرے میں آپہنچا اس نے کتاب اٹھالی اس سے کھیلتا رہا آخر میں اس پر پیشاب کر دیا اب اس کتاب کو کس طرح پاک کریں گے جبکہ دھونے کی صورت میں کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... صورت مسئول میں چونکہ پانی سے دھونے سے کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے کسی اور ایسی پاک مائع چیز سے دھوئیں جو نجاست کو دور کرے اور اس سے کتاب خراب نہ ہو جیسے پیٹرول وغیرہ۔

وفی اعلاء السنن (طبع ادارة القرآن والعلوم) (۱/۴۰۲): کانت إحدانا تغسل دم الحیضة بریقھا تقرصه بظفرھا

وفی اعلاء السنن (۱/۴۰۵): قوله عن عائشة رضی اللہ عنھا قلت یستنبط منه جواز ازالة النجاسة

تغير الصفات فإن الشيء نجس وهو إجماع المسلمين ويستنبط منه أن إزالة النجاسة لا يشترط فيها العدد بل المراد الإنقاء قاله العيني

وأصرح منه ما في رواية عبد الرزاق جعلت رضي الله عنها ذلك غسلاً.

وفي المختصر القدوري (ص ۲۱): يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن إزالتها به كالخل وماء الورد.

وفي ملتقى الأبحر (۱/۶۳): يطهر بدن المصلي ... وبكل مائع طاهر مزيل كالخل وماء الورد

وقال في الحاشية المسماة بالتعليق الميسر ومثله البنزين والكاز لأنهما مزيلان الخ.

وفي الشامية (۱/۳۰۹): وبكل مائع) أي سائل فخرج الجامد الخ (قوله طاهر) فخرج ما لو كان لا يطهر الخ قالع) أي مزيل الخ (قوله ينعصر بالعصر) تفسير لقالع الخ.

(۱۲۵) ناپاک روئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں روئی رکھی ہوئی تھی کہ اس کے اوپر میرے بچے نے پیشاب کر دیا تو اب روئی کو کس طرح پاک کیا جائے جبکہ دھونے سے وہ خراب ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نجس چیزوں کو پاک کرنے کا افضل طریقہ تو یہی ہے کہ ان کو پانی سے دھویا جائے، اور دھونے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو فقہاء کرام نے جو متبادل طریقے بتائے ہیں ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جیسے کہ روئی کے پاک کرنے میں فقہاء کرام نے متبادل طریقہ بتایا ہے کہ اس کو دھنوایا جائے، البتہ روئی کی اگر کل مقدار کا نصف یا نصف سے زیادہ حصہ ناپاک ہو جائے تو دھنے سے پاک نہیں ہوگا، اور اگر نصف سے کم حصہ ناپاک ہے تو دھنے سے پاک ہو جائے گا۔

كما في الهندية (۱/۴۲): المحلوج النجس إذا ندف إن كان الكل أو النصف نجساً لا يطهر وإن كان يسيراً بحيث يحتمل أن يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارة كالكدس إذا تنجس فقسم بين الدهقان والعامل يحكم بطهارته.

وفي الشامية (۱/۳۱۳): وإنما يجوز الانتفاع لو توقع الشك في بقاء النجاسة في الموجود، وكذا الندف ومن عده شرط كون النجس مقداراً قليلاً يذهب بالندف وإلا فلا يطهر.

(۱۲۶) روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی علت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم صاحب سے سنا ہے کہ روئی دھنوانے

تک کہ غالب گمان اس کے پاک ہونے کا ہو جائے تو اس سے بھی وہ چیز پاک ہو جاتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں روئی اور فوم کے گدوں کا نچوڑنا اگر ممکن نہیں تو ان کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد لٹکا دیا جائے یہاں تک کہ قطرے ٹپکنا بند ہو جائیں یا پھر غیر بہتا ہوا ان پر اتنا پانی بہا دیا جائے کہ پاک ہونے کا غالب گمان حاصل ہو جائے تو پاک ہو جائیں گے۔

لما فی البحر الرائق (۱/۲۳۱): قوله (وبتثليث الجفاف فيما لا ينعصر) اى مالا ينعصر فطهارته غسله ثلاثا وتجفيفه فى كل مرة لان للتجفيف اثرا فى استخراج النجاسة وهو ان يتركه حتى ينقطع التقاطر ولا يشترط فيه اليبس.

وفی الشامية (۱/۳۳۲): حاصله كما فى البدائع ان المتنجس اما ان لا يتشرب فيه اجزاء النجاسة اصلا او يتشرب فيه قليلا او يتشرب كثيرا ففى الاول طهارته بزوال عين النجاسة المرئية او بالعدد على ما مر وفى الثانى كذلك واما فى الثالث، فان كان مما يمكن عصره كالثياب فطهارته بالغسل والعصر الى زوال المرئية وفى غيرها بتثليثها وان كان مما لا ينعصر كالحصير المتخذ من البردى ونحوه ان علم انه لم يتشرب فيه بل اصاب ظاهره يطهر بازالة العين او بالغسل ثلاثا بلا عصر وان علم تشربه فعند محمد لا يطهر ابدا وعند ابى يوسف ينقع فى الماء ثلاثا ويجفف كل مرة والاول اقيس والثانى اوسع اهـ وبه يفتى درر.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۳۳۵): واما ان كان مما لا ينعصر كالحصير والسجاد والخشب فينقع فى الماء ثلاث مرات ويجفف فى كل مرة وهو قول ابى يوسف وهو الرأى الراجح وقال محمد لا يطهر ابداً.

وفيه ايضا (۱/۳۳۷): وقد اتفق الحنفية مع غيرهم على ان المتنجس اذا غسل فى ماء جار او غدير (ذى ماء كثير له حكم الجارى) او صب عليه ماء كثير او جرى عليه الماء طهر مطلقا بلا شرط عصر وتجفيف وتكرار غمس لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر.

(۱۶۹) ناپاک قالین کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو مسلسل بول کی بیماری ہے ایک روز وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ قالین پر پیشاب کے قطرات گر گئے تو اس نے اس پر گیلا کپڑا لگا کر صاف کر دیا تو کیا اس طرح کرنے سے قالین پاک ہو گیا یا دھونا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قالین چونکہ ایسی چیز ہے جو نجاست کے اثرات کو جذب کر لیتی ہے اور اس کو عام طور پر نچوڑنا بھی ممکن نہیں ہوتا

اس لئے چٹائی پر اگر نجاست لگ جائے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے وقفے وقفے سے تین مرتبہ اس طرح دھویا جائے کہ ہر مرتبہ اس سے قطرے گرنا بند ہو جائیں اور جب تین مرتبہ مذکورہ طریقے سے دھولیا جائے گا تو چٹائی پاک ہو جائے گی۔

وفي الهندية (ج۱ ص۴۲): ما لا ينعصر يطهر بالغسل ثلاث مرات والتجفيف في كل مرة لأن للتجفيف أثرا في استخراج النجاسة

وفي الدر المختار (ج۱ ص۳۳۳): (وغيرها) أي غير مرئية (بغلبة ظن غاسل)...... (طهارة محلها بلا عدد به يفتى) (وقدر) ذلك لموسوس (بغسل وعصر ثلاثا) أو سبعا (فيما ينعصر)...... (و) قدر (بتثليث جفاف) أي انقطاع تقاطر (في غيره) أي غير منعصر.

(۱۷۰) دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنویں کی طہارت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دریائی مینڈک کنویں میں گر جائے تو طہارت کا کیا حکم ہے؟ کیا دریائی مینڈک کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ اس پر ظاہری نجاست نہ لگی ہو، اور اگر اس پر نجاست لگی ہو تو کنواں ناپاک ہو جائے گا اور سارے پانی کا نکالنا ضروری ہوگا اور کنویں کے چشمہ دار ہونے کی صورت میں جب سارا پانی نکالنا ممکن نہ ہو تو تین سو ڈول نکال لیے جائیں تو کنواں پاک ہو جائے گا۔

كما في الهندية (ج۱ ص۱۹): وإذا وجب نزح جميع الماء ولم يمكن فراغها لكونها معينا ينزح مائتا دلو كذا في التبيين وهذا أيسر كذا في الاختيار شرح المختار والأصح أن يؤخذ بقول رجلين لهما بصارة في أمر الماء في مقدار ما في البئر فإذا قالا إن في البئر كذا ينزح ذلك القدر وهو أشبه بالفقه.

وفي الدر المختار (ج۱ ص۲۱۱): (وإذا وقعت نجاسة) ليست بحيوان ولو مخففة أو قطرة بول أو دم ...... (ينزح كل مائها)

وفي الدر المختار (ج۱ ص۲۱۲): (وإن تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبي (يؤخذ) ذلك (بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى وقيل يفتى بمائة إلى ثلاث مائة وهذا أيسر وذاك أحوط.

(۱۷۱) دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں کی پاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہوں، کیا دھوبی کے دھلے

ہوئے کپڑے پاک ہوتے ہیں" اور اگر کپڑے مشین میں دھوئے جائیں تو ان میں سے بعض پاک اور بعض ناپاک ہوتے ہیں اب جب انہیں ایک ساتھ دھویا جائے گا تو دھونے کے بعد ہر کپڑے کو تین دفعہ دھونا ضروری ہے؟ اگر تین دفعہ دھونا ضروری ہو تو جب ایک کپڑے کو پانی میں ڈال دیا تو اسے نکالنے کے بعد دوسرے کپڑے کو اسی پانی میں دھو سکتے ہیں یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً کپڑے دھونے کی دو صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ کپڑے کسی بڑے حوض یا بہتے ہوئے پانی میں دھوئے جائیں یا ان کے اوپر سے پانی بہایا جائے تو ایسی صورت میں اگر نجاست دکھائی دینے والی ہے تو نجاست کے زائل ہونے سے کپڑا پاک ہو جائے گا چاہے ایک مرتبہ دھونے سے ہو یا ایک سے زیادہ مرتبہ دھونے سے، اور اگر نجاست دکھائی دینے والی نہیں ہے تو تین دفعہ دھونے سے کپڑا پاک ہو جائے گا، بلکہ اگر تین دفعہ سے پہلے پاکی کا گمان غالب ہو جائے تو بھی کپڑا پاک ہو جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کپڑے پانی کے برتن مثلاً مشین وغیرہ میں دھوئے جائیں تو ان میں پاک کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک دفعہ نکال کر انہیں نچوڑ لیا جائے اور جو پانی بالٹی یا مشین وغیرہ میں ہو وہ گرا دیا جائے اور مشین وغیرہ کو کھنگال لیا جائے، اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ یہ عمل کیا جائے یا مشین وغیرہ سے نکال کر صاف پانی میں تین دفعہ ڈال کر نچوڑ لیے جائیں تو کپڑے پاک ہو جائیں گے۔

لہذا جب پاک اور ناپاک کپڑے دونوں کو ایک ساتھ پانی میں ڈال دیا تو سب کپڑوں کو پاک کرنے کے لیے سب کو تین دفعہ دھونا پڑے گا کیونکہ ایک ساتھ دھونے سے سب ہی ناپاک ہو گئے۔ مجیب: مذکورہ دو صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرے گا تو کپڑے پاک ہوں گے ورنہ نہیں۔ نیز مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر ناپاک کپڑے کو بالٹی وغیرہ میں ڈالے جائیں گے تو وہ پانی بھی ناپاک ہو جائے گا لہذا دوسرے کپڑے اس میں نہیں ڈال سکتے البتہ اگر تین دفعہ دھونے کے بعد ڈالے جائیں تو کپڑے پاک ہونے کی وجہ سے پانی ناپاک نہیں ہوگا لہذا اس میں دوسرے کپڑے ڈال سکتے ہیں۔

لما في الدر المختار (۱: ۳۲۸): ويطهر محل نجاسة مرئية بعد جفاف كدم بقلعها أي بزوال عينها وأثرها ولو بمرة أو بما فوق ثلاث في الأصح.

وفي الشامية (۱: ۳۲۸): (ولو بمرة) يعني لو زال عين النجاسة بمرة واحدة تطهر سواء كانت تلك الغسلة الواحدة في ماء جار أو راكد كثير أو بالصب أو في إجانة أما الثلاثة الأول فظاهر وأما الإجانة فقد نص عليها في الدرر حيث قال غسل المرئية عن الثوب في إجانة حتى زالت طهر

(۱۷۲) ٹوائلٹ پیپر کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جو ٹوائلٹ پیپر استعمال ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے کہ اگر کوئی یہ استعمال کرے تو پانی استعمال کیے بغیر اس کی نماز درست ہو جائے گی؟ نیز عذر اور غیر عذر کی صورت میں کوئی فرق ہوگا یا دونوں صورتیں برابر ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں ٹیشو کا استعمال جائز ہے، اگر نجاست اپنے مخرج سے تجاوز نہ کرے تو یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے بلکہ اگر پانی نہ بھی استعمال کیا جائے تو بھی نماز صحیح ہو جائے گی البتہ اگر نجاست اپنے مخرج سے تجاوز کر گئی ہو تو پانی کا استعمال ضروری ہوگا صرف ٹیشو کا استعمال کافی نہ ہوگا۔ نیز مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہوگا بلکہ دونوں صورتیں برابر ہیں۔

لما فی الهندیة (۱/۴۸): یجوز الاستنجاء بنحو حجر منق کالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد وما اشبهها ... ثم الاستنجاء بالاحجار انما یجوز اذا اقتصرت النجاسة علی موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا علی ان ما جاوز موضع الشرج من النجاسة اذا کانت اکثر من قدر الدرهم یفترض غسلها بالماء.

وفی الدر المختار (۱/۳۳۸، ۳۴۰): (ویجب) ای یفرض غسله (ان جاوز المخرج نجس) مانع ویعتبر القدر المانع لصلاة (فیما وراء موضع الاستنجاء ... وکره) تحریما (بعظم وطعام وروث و) شیء محترم

(۱۷۳) مردہ جانور کی کھال کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ کسی مردہ جانور کی کھال اتار کر فروخت کرنا کیسا ہے؟ کیونکہ گوشت وغیرہ تو استعمال نہیں کر سکتے لیکن میں نے سنا ہے کہ کھال استعمال کر سکتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً مردہ جانور کی کھال کو دباغت (دھوپ، مٹی یا نمک وغیرہ سے رطوبات خون وغیرہ دور کرنا) کے بعد فروخت کر سکتے ہیں اور استعمال بھی کر سکتے ہیں البتہ دباغت سے پہلے فروخت نہیں کر سکتے۔

لما فی الهندیة (۳/۱۱۵): واما جلود السباع والحمر والبغال فما کانت مذبوحة او مدبوغة جاز بیعها وما لا فلا وهذا بناء علی ان الجلود کلها تطهر بالذکاة او بالدباغ الا جلد الانسان والخنزیر واذا طهرت بالذکاة جاز الانتفاع بها فتکون محلا للبیع.

وفی الدر المختار (۱/۲۰۳): (وکل اهاب) ... (دبغ) ولو بشمس ... (طهر).

وفیها ایضاً (۵/۷۳): (وجلد المیتة قبل الدبغ) لو بالعرض ولو بالثمن فباطل ... (وبعده) ای الدبغ (یباع) الا جلد الانسان وخنزیر وحیة (وینتفع به) لطهارته حینئذ.

(۱۷۴) اُکھڑے ہوئے بالوں کی طہارت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید اور بکر کا اس بات میں اختلاف ہوا کہ زندگی کے دو

بال پاک ہیں یا نہیں جو داڑھی سے الگ ہو جائیں؟ زید کا کہنا ہے کہ بال کا وہ سرا جو کھال سے ملا ہوتا ہے وہ ناپاک ہے اس لئے کہ انسان کا جسم اور گوشت ناپاک ہے۔ لہٰذا بال کا وہ حصہ جو کھال سے ملا ہوتا ہے ناپاک ہے۔ جبکہ بکر کا کہنا اس کے خلاف ہے کہ بال پاک ہیں اگر یہ مسجد میں گر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ درست مدلل جواب مرحمت فرما کر دونوں کے اختلاف کو ختم فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع کے موقع پر حلق فرما کر اپنے بال مبارک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم فرمانا بالوں کے پاک ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اسی طرح فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق ہر وہ عضو حیوانی جس میں خون نہ ہو پاک ہے، بالوں میں بھی خون نہیں ہوتا اس لئے یہ بھی پاک ہیں البتہ وہ بال جن کو اکھیڑا جائے اور ان کے سروں پر جسم کی رطوبت پائی جائے تو ان بالوں کے سرے رطوبت کی وجہ سے ناپاک ہوں گے لہٰذا صورت مسئولہ میں داڑھی کے وہ بال جن کو اکھیڑا گیا ہو، اور ان کے ساتھ جسم کی رطوبت بھی موجود ہو تو ان کے رطوبت والے سرے ناپاک ہوں گے اور ان کو مسجد میں گرنے سے بچایا جائے اگر گر جائیں تو ان کو اٹھا کر کسی محترم جگہ ڈال دیا جائے تا کہ انسان کے بالوں کی بے احترامی لازم نہ آئے۔

لما في ابي داؤد (۱/۲۷۲): عن انس بن مالکؓ قال ان رسول اللہ ﷺ رمي جمرة العقبة يوم النحر ثم رجع الي منزله بمنى فدعا بذبح فذبح ثم دعا بالحلاق فأخذ بشق رأسه الايمن فحلقه فجعل يقسم بين من يليه الشعرة والشعرتين ثم أخذ بشق رأسه الأيسر فحلقه ثم قال ههنا ابو طلحة فدفعه الي أبي طلحة.

وفي الهداية (۱/۴۰): وشعر الإنسان وعظمه طاهر وقال الشافعيّ نجس لأنه لا ينتفع به ولا يجوز بيعه ولنا أن عدم الانتفاع والبيع لكرامته فلا يدل على نجاسته.

وفي قاضي خان (۱/۳۲): وان كان في المسجد عش خطاف لا بأس بأن يرمي بها تنزيهاً للمسجد.

وفي الشامية (۱/۲۰۷): (قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والإطهارة ما على الانسان مستغنية عن البيان. والأولى اسقاط حياً وعن محمد في نجاسة شعر الأدمي وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التي فيها الدسومة. اقول و عليه فما يبقى بين اسنان المشط ينجس الماء القليل اذا بل فيه وقت التسريح لكن يؤخذ من المسالة الاتية كما قال ط ان ماخرج من الجلد مع الشعر ان لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء تأمل.

(۱۷۵) بالوں کے ساتھ نکلنے والی دسومت کے ناپاک ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعیین

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء کا کل ما ليس بحدث ليس بنجس کا قاعدہ

متعارض ہیں؟ لہذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: بارش وغیرہ کے پانی کی وجہ سے راستوں پر جو کیچڑ پیدا ہو جاتی ہے اگر نجاست کا اثر اس میں محسوس نہ ہو تو ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے پاک ہے لہذا ایسے کپڑوں کے ساتھ پڑھی گئی نماز درست ہے، البتہ احتیاطاً ایسے کپڑوں کو دھو کر نماز پڑھنا چاہئے۔

لما في الطحطاوي على الدر (١/١٦٢): وطين شارع لو اصاب الثوب ما سال من الكثيف فلا يجب ان يغسله ولا يجب ما لم يكن اكبر رأيه انه نجس (الى ان قال) والطين المسرقن والردغة في الطريق فيه نجاسة طاهرة الا اذا رأى عين النجاسة. بحر.

(١٧٧) خروج ریح سے کپڑے ناپاک نہ ہونے کی وجہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احناف کے ہاں جو چیز ناقض وضو ہو وہ نجس بھی ہوتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خروج ریح سے وضو تو ٹوٹ جاتا ہے لیکن شلوار وغیرہ کے پاک کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا، اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ وضاحت سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ یہ ضابطہ کہ جو چیز ناقض وضو ہے وہ نجس بھی ہے سبیلین کے علاوہ میں ہے اور سبیلین میں تو ہر شئی جو خارج ہو خواہ نجس ہو یا پاک ہر صورت میں خروج ناقض وضو ہے لہذا ریح کے خارج ہونے میں اصل علت خروج نجس نہیں ہے بلکہ ریح فی نفسہ پاک ہے لیکن خروج چونکہ سبیلین سے پایا جا رہا ہے اس لئے ناقض وضو ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اگر سبیلین سے کنکری کا خروج ہو تو یہ ناقض وضو ہے حالانکہ یہ نجس نہیں ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا مرور نجاست سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس نجاست کے کچھ نہ کچھ اثرات پائے جاتے ہیں لیکن ان اثرات کا اعتبار اگر کپڑے کی طہارت وعدم طہارت کے اعتبار سے کیا جائے تو اس میں حرج بھی ہے لہذا ان اثرات کا اعتبار نقض وضو اور عدم نقض وضو میں تو کیا جاتا ہے لیکن کپڑوں کی طہارت وعدم طہارت میں نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے خروج ریح اگرچہ ناقض وضو ہے لیکن اس کی وجہ سے کپڑوں کی پاکی کا حکم نہیں دیا جاتا۔

لما في التاتارخانية (١/٢١٤): وكذلك الريح الخارجة من الدبر واختلف المشايخ رحمهم الله في الريح نجسة أو هي طاهرة الا انها تتنجس بمرورها على النجاسة قالوا: وفائدة هذا الخلاف فيما اذا خرج منه الريح وعليه سراويل مبتلة هل يتنجس سراويله؟ فمن قال عينها نجسة يقول يتنجس ومن قال عينها ليست بنجسة يقول لا يتنجس.

وفي الدر المختار (١/١٣٠): (و) كل (ما ليس بحدث) اصلا بقرينة زيادة الباء كقئ قليل ودم لو ترك لم يسل (ليس بنجس)

وقال الشامي رحمه الله تعالى تحته: (قوله ليس بنجس) اي لا يعرض له وصف النجاسة بسبب

خروجه بخلاف القليل من قيء عين الخمر أو البول فإنه وإن لم يكن حدثاً لقلته لكنه نجس بالإصابة لا بالخروج هذا ما ظهر لي تأمل.

وفي الشامية (١/١٣٥): (مثل ريح) فإنها تنقض لأنها منبعثة عن محل النجاسة لا لأن عينها نجسة لأن الصحيح أن عينها طاهرة حتى لو لبس سراويل مبتلة أو ابتل من أليتيه الموضع الذي تمر به الريح فخرج الريح لا يتنجس وهو قول العامة وما نقل عن الحلواني من أنه كان لا يصلي بسراويله فورع منه بحر.

﴿فصل فی احکام الماء﴾

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

(۱۷۸) مروجہ ٹینکیوں کا پانی ماء جاری شمار ہوگا؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے جامعہ کے پانی کی ٹینکی جبکہ اس میں پانی ایک طرف سے آ رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل رہا ہوتا ہے۔ نجاست گرنے کی صورت میں اس کا حکم، جاری کا ہوگا یا نہیں؟ جبکہ فتاوی عثمانی میں ٹینکی کو ماء جاری میں شمار کیا گیا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی ٹینکی ہوگی جو ہمارے جامعہ کی ہے یا کسی اور نوعیت کی ٹینکی مراد ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً پانی کی ٹینکی ایسی ہو کہ ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف سے نکاسی کا سلسلہ ہو تو یہ ماء جاری کے حکم میں ہے نجاست گرنے کی صورت میں رنگ، بو اور مزہ میں تغیر نہ آئے تو ہر طرح اس کا استعمال درست ہے۔ اگر ٹینکی ایسی نہ ہو بلکہ ایک طرف سے بند ہو صرف پانی کی آمد یا صرف نکاسی کا سلسلہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ "دہ دردہ" ہے یا عرض میں تو "دہ دردہ" نہیں ہے لیکن طول (لمبائی) اتنی ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو دہ دردہ ہو سکتا ہے تو یہ ماء کثیر ہے نجاست گرنے کی صورت میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو پاک ہے اور اگر نجاست کا اثر ظاہر ہو جائے تو ناپاک۔ ولہ طول لا عرض لکنہ یبلغ عشرا فی عشر جاز تیسیرا (الدر المختار، ۱/۱۹۳)

اگر ٹینکی مقدار میں چھوٹی ہو اور پانی کی آمد ورفت کا تسلسل بھی نہ ہو اور لمبائی بھی اتنی نہیں ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو دہ دردہ ہو سکے تو تھوڑی سی نجاست گرنے سے بھی ناپاک ہو جائے گی۔

نظیر ان ساری صورتوں کی حوض صغیر اور حوض کبیر ہے۔ حوض صغیر کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ حوض صغیر میں پانی ایک طرف سے آ رہا ہو اور دوسری طرف سے نکل رہا ہو تو اس میں ہر طرف سے وضو جائز ہے۔ اذا کان الحوض صغیرا یدخل فیه الماء من جانب ویخرج من جانب آخر یجوز الوضوء فی جمیع جوانبه وعلیه الفتوی. من غیر تفصیل بین ان یکون اربعا فی اربع او اقل یجوز او اکثر فلا یجوز. (شرح الوقایة اولین ص ۷۸)

حوض کا پانی ساکن ہو پائپ وغیرہ کے ذریعے داخل نہ ہو رہا ہے نہ کوئی آدمی چلو بھر رہا ہے اس میں کوئی شخص اپنا ہاتھ ڈالے جبکہ ہاتھوں میں نجاست لگی ہو تو وہ پانی ناپاک ہو جائے گا۔

فان ادخل رجل یدہ فی الحوض وعلیها نجاسة وان کان الماء ساکنا لا یدخل فیه شیء من انبوبه ولا یغترف منه

نجس ہو جاتا ہے۔ اور اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ٹینک کے تمام پانی کو نکال دیا جائے لہٰذا تمام پانی نکالنے کے بعد ٹینک پاک ہو جائے گا۔

كما في الشامية (۱/۱۸۹): وإذا وصل بالي الحياض في البيوت متغيرا ونزل في حوض صغير أو كبير فهو نجس وإن زال تغيره بنفسه لأن الماء النجس لا يطهر بتغيره بنفسه إلا إذا جرى بعد ذالك بماء صاف فإنه حينئذ يطهر

وفي الدر المختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه وكذا البئر وحوض الحمام.

وفي الشامية تحته: (قوله بمجرد جريانه) أي بأن يدخل من جانب ويخرج من آخر حال دخوله وإن قل الخارج بحر: قال ابن الشحنة لأنه صار جاريا حقيقة، وبخروج بعضه وقع الشك في بقاء النجاسة فلا تبقى مع الشك اهـ وقيل لا يطهر حتى يخرج قدر ما فيه، وقيل ثلاثة أمثاله بحر، فلو خرج بلا دخول كأن تغب منه فليس بجار.

وفي الشامية (۱/۲۱۹): (قوله بخلاف نحو صهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس . وأراد بذالك الرد على من أفتى بنزح عشرين في فأرة وقعت في صهريج إن الفأرة لو وقعت في الحب يهراق الماء كله، قال: ووجهه أن الاكتفاء بنزح البعض في الآبار على خلاف القياس بالآثار فلا يلحق بها غيرها.

(۱۸۰) چھوٹی ٹینکی میں چڑیا کے گرنے سے پانی نجس ہو جاتا ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک ٹینکی ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی گہرائی چار فٹ ہے اس کے اندر ایک چڑیا گر کر مر گئی ہے معلوم نہیں کہ کب سے گری ہے تو اب اس پانی کا کیا حکم ہے اور ہماری نمازوں کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہوگا نیز اس ٹینکی کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں مذکورہ ٹینکی کا پانی نجس ہو گیا ہے چڑیا کے مرنے کی وجہ سے، اور اگر یہ چڑیا پھول کر پھٹ گئی ہے تو تین دن وتین راتوں کی نمازوں کا لوٹانا بھی ضروری ہوگا، اور اگر چڑیا پھولی یا پھٹی نہیں ہے تو صرف ایک دن اور ایک رات کی نمازیں لوٹانا ضروری ہوں گی۔ ٹینکی کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اس کے پانی کو نکالا جائے گا۔

كما في نور الإيضاح (صـ۲۸-۳۰): الرابع ماء نجس وهو الذي حلت فيه نجاسة وكان راكداً قليلا والقليل مادون عشر في عشر. فينجس وجود حيوان ميت فيها ينجسها من يوم وليلة ومنتفخ من

ثلاثة ایام ولیالیها ان لم یعلم وقت وقوعه.

وفي البحر الرائق (۱/۲۱۳): وفي الكافي، والمستصفى، والبدائع ان الفارة اذا وقعت في الحب بالحاء المهملة، يهراق الماء كله ولم يعلل له، ووجهه ان الاكتفاء بنزح البعض مخصوص بالآبار ثبت بالآثار على خلاف القياس فلا يلحق به غيره فعلى هذا اذا وقعت الفارة في الصهريج او في الفسقية ولم يكونا عشراً في عشر فان الماء كله يهراق كما لا يخفى.

وفي الشامية (۱/۲۱۲): (قوله بخلاف نحو الصهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس .... واراد بذلك الرد على من افتى بنزح عشرين في فارة وقعت في صهريج .... ان الفارة لو وقعت في الحب يهراق الماء كله قال ووجهه ان الاكتفاء بنزح البعض في الآبار على خلاف القياس بالآثار فلا يلحق بها غيرها. انتهى قوله.

(قوله يهراق الماء كله) اقول وهل يطهر بمجرد ذلك ام لابد من غسله بعده ثلاثا والظاهر الثاني ثم رأيته في التاتارخانية قال ما نصه وفي فتاوى الحجة سئل عبدالله بن المبارك عن الحب المركب في الارض تنجس قال يغسل ثلاثا ويخرج الماء منه كل مرة فيطهر.

(۱۸۱) کیا ٹینک میں جوتا گرنے سے پانی نجس ہو جاتا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک زمین دوز ٹینک ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی چار فٹ اور گہرائی آٹھ فٹ ہے ایک دن بچے کھیل رہے تھے تو ایک نے دوسرے کو جوتا مارا اور وہ جوتا ٹنکی میں گر گیا اب اس پانی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیا: صورت مسئولہ میں جوتا اگر پاک ہے تو پانی نجس نہیں ہوگا اور اگر جوتا ناپاک ہے تو اس صورت میں پانی ناپاک ہو جائے گا اور اگر جوتے کا پتہ نہیں پاک ہے یا ناپاک تو بقاعدہ الاصل في الاشياء الاباحة کے تحت اس کو پاک سمجھا جائے گا اور پانی پاک ہوگا۔

لما في بدائع الصنائع (۱/۲۰۳، ۲۰۲): وقال عامة العلماء: ان كان الماء قليلا ينجس وان كان كثيراً لا ينجس لكنهم اختلفوا في الحد الفاصل بين القليل والكثير .... وقال اصحابنا ان كان بحال يخلص بعضه الى بعض فهو قليل وان كان لا يخلص فهو كثير ...... فاتفقت الروايات عن اصحابنا انه يعتبر الخلوص بالتحريك وهو انه ان كان بحال لو حرك طرف منه يتحرك الطرف الآخر فهو مما يخلص وان كان لا يتحرك فهو مما لا يخلص .... وروى عن محمد انه قدره بمسجده فكان

مسجده ثمانيا في ثمان وبه اخذ محمد بن سلمة وفي كان مسجده عشرا في عشر: وقيل مسح مسجده فوجد داخله ثمانيا في ثمان وخارجه عشرا في عشر.

وفي الدر المختار (۱/۱۹۲): وانت خبير بان اعتبار العشر اضبط ولا سيما في حق من لا رأي له من العوام فلذا افتى به المتأخرون الاعلام.

وفي الدر المختار مع الشامية (۱/۱۰۵): (قاعدة) الاصل في الاشياء الاباحة.

(۱۸۲) کنویں میں اگر گمراہ عقائد رکھنے والا شخص اتر جائے تو پانی کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کنویں کے کنارے بچے کھیل رہے تھے ایک بچے نے لکڑی کو دیکھی ہوئی تھی اس نے اندر کر کے رکھ دی تاکہ کھیل میں خراب نہ ہو جائے دوسرے بچے نے اٹھا کر لکڑی کنویں میں ڈال دی لکڑی نکالنے کیلئے کوئی شخص کنویں میں نہیں اتر رہا تھا اتنے میں ایک شخص آ گیا جو اہل تشیع میں سے تھا اس نے کنویں میں جا کر لکڑی نکال لی اب بعض لوگ کہتے ہیں چونکہ شیعہ بدترین کافر ہیں ان کا پانی میں جانا خنزیر کے جانے کے برابر ہے یہ سارا پانی نجس ہے جب تک نکالا نہ جائے کنواں پاک نہیں ہوگا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اثنا عشری شیعہ عقائد والے شخص کے پانی میں داخل ہونے سے پانی ناپاک ہو جائے گا؟ اب اس کنویں کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نجاست کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ نجاست حقیقیہ (جیسے پیشاب پاخانہ خون وغیرہ)، ۲۔ نجاست حکمیہ (جیسے بے وضو ہونا یا حالت جنابت میں ہونا)۔ نجاست حقیقیہ کے گرنے سے کنواں ناپاک ہو جاتا ہے، نجاست حکمیہ سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کنویں میں اترنے والے شخص کے بدن یا کپڑوں پر اگر نجاست لگی ہوئی تھی تو کنویں کا پانی نجس ہو گیا ہے، اگر اس کے بدن یا کپڑوں میں نجاست لگی ہوئی نہ تھی تو کنویں کا پانی پاک ہے البتہ احتیاطاً بیس ڈول پانی نکال دیا جائے۔

لما في البحر الرائق (۱/۱۲۲): ثم رأيت بعد هذا العلامة ابن امير حاج في شرح منية المصلي صرح بما ذكرته وقال: الماء المستعمل هو الماء الذي لاقى الرجل الذي زال حدثه فيجب نزح جميع الماء على رواية نجاسة الماء المستعمل ولا يجب نزح شيء منها على رواية طهارته بل هو باق على طهوريته، وقد عرفت ان رواية الطهارة هي المختارة اهـ. فعلى هذا قولهم صار الماء مستعملا معناه صار الماء الملاقي للبدن مستعملا لا أن جميع ماء البئر صار مستعملا.

وفي الشامية (۱/۲۱۳): (قوله كآدمي محدث) اي انه ينزح فيه أربعون كما عزاه في التتارخانية إلى فتاوى الحجة وفي شرح الوهبانية: والتحقيق النزح للجميع عند الامام والثاني على القول بنجاسة الماء المستعمل، وقيل اربعون عنده، ومذهب محمد انه مسلوب الطهورية، وهو الصحيح

عند الشیخین فینزح منه عشرون لیصیر طهوراً وتمامه فیه، والمراد بالمحدث مایشمل الجنب.

وفیه ایضاً (۱/۲۱۳): واستشکل فی البدائع نزح العشرین بأن الماء المستعمل طاهر فلم یطهر مالم یغلب علی المطلق کسائر المائعات، ثم قال: ویحتمل ان یقال طهارته غیر مقطوع بها للخلاف فیها، بخلاف سائر المائعات، فینزح أدنی ماورد به الشرع وذالک عشرون احتیاطاً

(۱۸۳) کبوتر وغیرہ کے کنویں میں گرنے کے بعد نہ ملنے پر کنویں کی پاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا ایک کنواں ہے جس سے ہم پانی لیتے رہتے ہیں اس کنویں میں دو کبوتر گر گئے باوجود تلاش کرنے کے وہ نہیں ملے تو اس کنویں سے پانی پینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کنویں کو کس طرح پاک کریں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کنویں میں اگر حیوان گر کر پھول جائے یا پھٹ جائے خواہ حیوان چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گری ہوئی نجس چیز کو پہلے نکال لیا جائے پھر اس کے بعد کنویں میں موجود سارا پانی نکال لیا جائے اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو دو سو ڈول وجوباً اور تین سو ڈول استحباباً نکال لئے جائیں اب مذکورہ بالا صورت میں یہ بات تو ظاہر ہے کہ کبوتر پھول و پھٹ گئے ہوں گے لیکن چونکہ تلاش کرنے کے بعد نہیں ملے جبکہ پاکی کیلئے نجس چیز کا پہلے نکالنا ضروری ہے اس لئے فی الحال اس کنویں کو چھوڑ دیا جائے حتی کہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ پانی میں حلول کر کے کیچڑ بن گئے ہوں گے بعض فقہاء کرام نے اس مدت کا اندازہ چھ ماہ سے لگایا ہے لہٰذا اتنی مدت گزر جانے کے بعد اس کنویں کا سارا پانی اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو تین سو ڈول نکال لئے جائیں تو وہ کنواں پاک ہو جائے گا اس سے قبل اس کنویں سے پانی پینا جائز نہیں ہے۔

لمافی الشامیة (۱/۲۱۲): انه لابد من اخراج عین النجاسة کلحم میتة وخنزیر اھ ح قلت فلو تعذر ایضاً ففی القهستانی عن الجواهر. لووقع عصفور فیها فعجزوا عن اخراجه فما دام فیها فنجسة فتترک البئر مدة یعلم انه استحال وصار حماة وقیل مدة ستة اشهر.

وفی الفقه الاسلامی (۱/۲۹۱): وینزح مابین اربعین دلواً الی ستین دلواً اذا کان الحیوان ذا حجم متوسط مثل الحمامة والدجاجة ــــ وفی الاثنین من هذه الحیوانات ینزح الماء کله.

وفی الدر المختار (۱/۲۱۳،۲۱۵): (وان تعذر) نزح کلها لکونها معینا (فبقدر ما فیها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (یؤخذ ذلک بقول رجلین عدلین لهما بصارة بالماء) به یفتی وقیل یفتی بمائة الی ثلثمائة وهذا ایسر وذاک احوط.

(۱۸۴) جوتے کنویں میں گرنے سے کنویں کی ناپاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے جوتے کنویں میں گر گئے جن کے پاک یا ناپاک ہونے کے بارے میں معلوم نہیں تو ایسی صورت میں یہ کنواں ناپاک ہوگیا یا نہیں؟ کیا اس سے وضو وغیرہ کیلئے پانی لے سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر جوتوں کے بارے میں ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں ناپاک شمار ہوگا اور اگر ان کے پاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں پاک شمار ہوگا اور اگر دونوں جانب کسی بارے میں یقین یا ظن غالب نہ ہو تو یہ کنواں پاک شمار ہوگا اس کا پانی استعمال کر سکتے ہیں۔

لما فی الھندیۃ (۱/۲۵) ویجوز للرجل ان یتوضأ من الحوض الذی یخاف ان یکون فیہ قذر ولا یتیقن بہ ولیس علیہ ان یسأل عنہ ولا یدع التوضؤ منہ حتی یتیقن ان فیہ قذراً للاثر.

وفی ردالمحتار (۱/۱۵۱) وفی التاتارخانیۃ من شک فی انائہ او ثوبہ او بدنہ اصابتہ نجاسۃ او لا فھو طاھر مالم یستیقن وکذا الآبار والحیاض والجباب الموضوعۃ فی الطرقات ویستقی منھا الصغار والکبار والمسلمون والکفار.

(۱۸۵) کنویں میں نجاست گرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے قریب ایک کنواں ہے جس سے گاؤں کے لوگ پانی لیتے ہیں ایک دن اس کنویں میں ایک بکری گر گئی اس کو تو ہم نے زندہ نکال لیا لیکن نکالتے وقت اس نے کنویں میں پیشاب کر دیا اب لوگ اس سے پانی نہیں پیتے اور دوسری جگہ سے پانی لانے میں دشواری بہت ہے سارے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مفتی صاحب سے مسئلہ معلوم کر لیں جیسے وہ فرمائیں گے ویسے عمل کریں، آپ بتائیں کہ یہ کنواں ناپاک ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ناپاک ہے تو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا جبکہ پانی نکالنا بہت مشکل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: (۱) بکری کا پیشاب نجس ہے، کنویں میں نجاست گرنے سے سارا پانی ناپاک ہوگا لہٰذا صورت مسئولہ میں کنواں ناپاک ہو چکا ہے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سارا پانی نکالا جائے۔

(۲) اگر سارا پانی نکالنا مشکل ہو تو پھر دو عادل آدمی جو پانی کے معاملے میں مہارت رکھتے ہوں ان کو بلایا جائے وہ جتنا اندازہ لگائیں اتنی مقدار میں پانی نکالا جائے۔

(۳) البتہ اگر اس پر بھی عمل کرنا مشکل ہے تو جیسا کہ صاحبین کے قول پر عمل کرنے سے پانی نکلوانے پر مجبور لازم آئے گا ایسی صورت میں تین سو ڈول تک نکالنے سے کنواں پاک ہوگا، لیکن احتیاط بہرحال دو عادل آدمیوں کے قول پر عمل کرنے کی صورت

نجس ہے۔

في البحر الرائق (١/ ٢٠٣): قوله (وبول مايؤكل نجس) انما ذكرها هنا وان كان محلها باب الانجاس ليبين انه اذا وقع في البئر نجس ماءها، وهذا عند ابي حنيفة وابي يوسف، وقال محمد طاهر، فلا ينزح الماء من وقوعه الا اذا غلب على الماء فيخرج من ان يكون طهوراً.

وفيه ايضاً (١/ ٢١٩): وقوله (ومائتان لو لم يمكن نزحها) وعن أبي نصر أنه يؤتى برجلين لهما بصارة بأمر الماء فاذا قدراه بشيء وجب نزح ذالك القدر وهو الاصح والاشبه بالفقه والافتاء بما عن محمد اسهل على الناس والعمل بما عن ابي نصر احوط.

وفي الدر المختار (١/ ٢١١): اذا وقعت نجاسة ولو مخففة او قطرة بول ينزح كل مائها.

وفي الشامية تحته: (قوله او قطرة بول) اي ولو بول ماكول اللحم.

وفي الدر المختار (١/ ٢١٣): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معيناً (فبقدر ما فيها) وقت النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذالك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى وقيل يفتى بمائة الى ثلثمائة وهذا ايسر وذاك احوط.

وفي الشامية تحته: (قوله به يفتى) وهو الاصح، كافي ودرر. وهو الصحيح، وعليه الفتوى، ابن كمال: وهو المختار، معراج. وهو الاشبه بالفقه. هداية.

على انهم قالوا ان محمداً أفتى بما شاهد في ابار بغداد فانها كثيرة الماء وكذا ماروى عن الامام من نزح مائة في مثل آبار الكوفة لقلة مائها فيرجع الى القول الأول لانه تقدير ممن له بصارة وخبرة بالماء في تلك النواحي لا لكون ذالك لازما في ابار كل جهة

(١٨٦) پاکی حاصل کرنے سے جھیل ناپاک نہیں ہوتی

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک بڑی سی جھیل ہے جس میں ہم لوگ چھٹیوں میں کلمہ سے پہلے غسل کرتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہیں، چند دن پہلے ایک صاحب ہمارے علاقے میں آئے اور ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کا اس طرح غسل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ لوگ مٹی سے استنجاء کرتے ہیں جس کے بعد جھیل پر جا کر غسل کرتے ہیں جس سے سارا پانی ناپاک ہو جاتا ہے لہٰذا آپ لوگوں کی نماز ہی نہیں ہوتی، کیا یہ بات صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو ہمیں کافی عرصہ ہو گیا اسی طرح نمازیں پڑھتے ہوئے، ہماری ان کی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کیا انہیں دوبارہ ادا کرنا چاہیے؟ جلد از جلد جواب دے کر ہماری اس پریشانی کو دور فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزا عطا فرمائے۔

صابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمد، ويفتى به للبلوى اهـ وظاهره ان دهن الميتة كذلك لتعبيره بالنجس دون المتنجس الا ان يقال هو خاص بالنجس لان العادة في الصابون وضع الزيت دون بقية الادهان تأمل ثم رايت في شرح المنية مايؤيد الاول حيث قال: وعليه يفرع مالو وقع انسان او كلب في قدر الصابون فصار صابونا يكون طاهرا لتبدل الحقيقة اهـ

ثم اعلم ان العلة عند محمد هي التغير وانقلاب الحقيقة وانه يفتى به للبلوى كما علم مما مر، ومقتضاه عدم اختصاص ذلك الحكم بالصابون، فيدخل فيه كل ما كان فيه تغير وانقلاب حقيقة وكان فيه بلوى عامة

قلت: لكن قد يقال: ان الدبس ليس فيه انقلاب حقيقة لانه عصير جمد بالطبخ، وكذا السمسم اذا درس واختلط دهنه باجزائه ففيه تغير وصف فقط، كلبن صار جبنا، وبر صار طحينا، وطحين صار خبزا، بخلاف نحو خمر صار خلا، وحمار وقع في مملحة فصار ملحا، وكذا دردي خمر صار طرطيرا، وعذرة صارت رمادا او حمأة، فان ذلك كله انقلاب حقيقة الى حقيقة اخرى لا مجرد انقلاب وصف كما سياتي، والله اعلم.

وايضا في الدر المختار (۱/۳۲۶): (لا) يكون نجسا (رما دقذر) والالزم نجاسة الخبز في سائر الامصار (و) لا (ملح كان حمارا) او خنزيرا ولا قذر وقع في بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى.
وقال ابن عابدين الشامي رحمه الله تحته: (قوله كان حمارا او خنزيرا) افاد ان الحمار مثال لا قيد احترازي، واشار باطلاقه الى انه لا يلزم وقوعه وهو حي، فانه لو وقع في المملحة بعد موته فهو كذلك كما في شرح المنية الخ.

وفي الدر المختار (۱/۱۸۰): (و) يرفع (بماء ينعقد به ملح لا بماء) حاصل بذوبان (ملح) لبقاء الاول على طبيعته الاصلية، وانقلاب الثاني الى طبيعة الملحية. وقال الشامي رحمه الله تحته (قوله لبقاء الاول الخ) ... وقال الزيلعي: ولا يجوز بماء الملح، وهو ما يجمد في الصيف ويذوب في الشتاء عكس الماء، واقره صاحب البحر والعلامة المقدسي، ومقتضاه انه لا يجوز بماء الملح مطلقا: اي سواء انعقد ملحا ثم ذاب ام لا؟ وهو الصواب عندي اهـ ملخصا.

(۱۸۸) نالے کے ذریعے نہر سے آنے والے صاف پانی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک نالہ ہے جس میں نہر کا

گندہ پانی آ کر جاتا ہے اب بھی گٹر اس کے ذریعے نہر کا پانی اپنے کھیتوں تک لے جاتے ہیں جب نہر والا پانی بند کر دیتے ہیں تو پھر جاتا ہے تو یہ پانی بالکل صاف ہوتا ہے حالانکہ اس میں گندگی والا پانی بھی ملا ہوتا ہے تو کچھ لوگ اس پانی کو پیتے اور وضو کرتے ہیں تو کیا ایسے پانی سے وضو کرنا اور اس کو پینا جائز ہے یا نہیں؟"

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جس پانی کا ذکر ہے وہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے اور جاری کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اس کے اوصاف ثلاثہ یعنی رنگ، بو اور مزہ میں سے کوئی ایک تبدیل نہ ہو جائے تو وہ پاک ہے اس سے وضو کرنا اور اس کا استعمال کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ عالمگیری میں اس کی صراحت ہے "ماء النهر او القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر ما لم يتغير طعمه او لونه او ريحه" (عالمگیری ۱/۱۷)

لما في مجمع الانهر (۱/۳۸): وقدر ان يكون الماء جاريا او راكدا فان كان جاريا ان كانت النجاسة غير مرئية فانه لا يتنجس ما لم يتغير طعمه الخ.

وفي قاضيخان (۱/۳): وماء النهر او القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر ما لم يتغير طعمه او لونه او ريحه بالنجاسة.

وفي عالمگیری (۱/۱۷): وفي الكتاب والفتوى في الماء الجاري انه لا يتنجس ما لم يتغير طعمه او لونه او ريحه من النجاسة.

وان كانت العذرة على السطح في مواضع متفرقة ولم تكن على راس الميزاب لا يكون نجسا وحكمه حكم الماء الجاري

ماء النهر او القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر ما لم يتغير طعمه او لونه او ريحه

(۱۸۹) ایسے تالاب سے وضو کرنا جس میں گندگی کے اثرات ظاہر ہوں

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک تالاب ہے جس میں لوگ جانوروں کو پانی پلاتے ہیں، پانی پیتے وقت جانور اس میں پیشاب وغیرہ بھی کرتے ہیں لیکن یہ سب ایک طرف ہوتا ہے دوسری طرف سے کوئی پانی بھرتا ہے تو پانی بچا ہے اور پیشاب وغیرہ کرتا ہے البتہ اس طرف بھی گندگی کے اثرات پائے جاتے ہیں مثلاً پانی میں بدبو وغیرہ کیا ایسے تالاب سے وضو کرنا جائز ہے؟ اس تالاب کی لمبائی تقریباً چالیس فٹ اور چوڑائی تیس فٹ ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر پانی کے تین اوصاف (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک وصف نجاست کی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ناپاک شمار ہوتا ہے اگرچہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو لہٰذا مذکورہ تالاب کا پانی ناپاک ہے اس سے وضو

کرنا جائز نہیں ہے۔

لما في الهندية (١/١٩): الماء الراكد اذا كان كثيرا فهو بمنزلة الجاري لا يتنجس جميعه بوقوع النجاسة في طرف منه الا ان يتغير لونه او طعمه او ريحه وعلى هذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشائخ كذا في المحيط.

وفي الدر المختار (١/١٨٥): (وبتغير احد اوصافه) من لون او طعم او ريح (ينجس) الكثير ولو جاريا اجماعا، اما القليل فينجس وان لم يتغير.

(۱۹۰) اگر لائن کے پانی میں سخت بدبو آرہی ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گذشتہ روز ہمارے گھر جو لائن کا پانی آیا وہ دیکھنے میں تو صاف ہے لیکن اس میں سے گٹر کے پانی کی سخت بو آرہی ہے، ہمارے گھر گذشتہ ایک ہفتے سے یہی پانی آرہا ہے، تو اب ہم اس پانی کو پینے اور استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر اس پانی کے بارے میں آپ کا غالب گمان یہ ہے کہ اس پانی میں گٹر کا پانی مل گیا ہے جیسا کہ گٹر کے پانی کا پینے کے پانی کی لائن کے ساتھ مل جانا ممکن بھی ہو اور اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں تو پھر یہ پانی ناپاک ہے اس کا استعمال درست نہیں ہے، اور اگر اس پانی کے ساتھ گٹر کے پانی کے مل جانے کا غالب گمان نہیں ہے بلکہ محض شک ہے تو پھر یہ پانی پاک ہے اور اس پانی کا استعمال ہر طرح سے درست ہے اور اس شک کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ پانی میں اصل طہارت ہے لہذا جب تک اس کے ناپاک ہونے کا یقین یا غالب گمان نہ ہو اسے ناپاک نہیں کہا جائے گا اور اس پانی کے بارے میں مزید تحقیق وتجسس کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

لما في الولوالجية (١/٣٩): الماء اذا انتن وهو كثير ان علم بوقوع النجاسة او جيفة فيه يتنجس الماء

وفي رد المحتار (١/١٨٦): (قوله لا لو تغير الخ) اي لا ينجس لو تغير فهو عطف على قوله وينجس لا على قوله بموت فافهم منحة (قوله فلو علم الخ) صرح به لزيادة التوضيح والا فهو داخل تحت قول المصنف وبتغير احد اوصافه ينجس (قوله ولو شك الخ) اي ولا يلزم السؤال بحر وفيه عن المنتقى بالنون وبرؤية آثار اقدام الوحوش عند الماء القليل لا يتوضأ به ولو مر سبع بالركية وغلب على ظنه شربه منها تنجس والا فلا اه. وينبغي حمل الاول على ما اذا غلب على ظنه ان الوحوش شربت منه بدليل الفرع الثاني والا فمجرد الشك لا يمنع لما انه الاصل انه يتوضأ من الحوض الذي يخاف قذرا ولا يتيقنه وينبغي حمل التيقن المذكور على غلبة الظن والخوف على الشك او الوهم كما لا يخفى اهـ

﴿فصل فی احکام الجنب والمعذور﴾

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۹۱) حالت جنابت میں کھانے پینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو غسل جنابت کی حاجت ہو اور وہ غسل نہ کر سکے اسی حالت میں کھاتا پیتا رہے تو کیا ایسی حالت میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جنابت کی حالت میں کھانا پینا جائز ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھ دھوئے اور کلی کرلے۔

لما فی الهندیة (۱/۱۶): وان اراد ان یاکل او یشرب فینبغی ان یتمضمض ویغسل یدیه

وفی رد المحتار (۱/۱۷۵): (قوله بعد غسل ید وفم) اما قبله فلا ینبغی لانه یصیر شاربا للماء المستعمل وهو مکروه تنزیها ویده لاتخلو عن النجاسة فینبغی غسلها ثم یاکل. بدائع وفی الخزانة وان ترک لایضره

(۱۹۲) حالت جنابت یا ہمبستری میں بچے کو دودھ پلانا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص عورت سے ہمبستری کررہا تھا کہ اچانک بچے نے رونا شروع کردیا عورت نے اسی حالت میں بچے کو دودھ پلانا شروع کردیا تو کیا شرعاً جماع کی حالت میں بچے کو دودھ پلانا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: درست ہے۔

لما فی المبسوط للسرخسی (۱/۶۰): (واذا عرق الجنب او الحائض فی ثوب لم یضره)... لانه لیس علی بدن الانسان الجنب والحائض نجاسة عینیة فهو واعضاء المحدث سواء.

وفی رد المحتار (۱/۲۹۲): ولا یکره طبخها ولا استعمال ماسته من عجین او ماء او نحوهما.

(۱۹۳) جنبی کیلئے بال اور ناخن کاٹنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ جس کے اوپر غسل فرض

ہو اس کو حالت جنابت میں ناخن اور بال نہیں کاٹنے چاہئیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے یا اس حالت میں ناخن بال کاٹنے کی گنجائش ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً جس آدمی پر غسل واجب ہو اس کیلئے ناخن اور بال کاٹنا جائز ہے، البتہ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ طہارت کی حالت میں ان امور سے فارغ ہو جانا چاہیے۔

لما فی البخاری (۱/۴۲): قال عطاء: یحتجم الجنب ویقلم أظفاره ویحلق راسه وان لم یتوضأ

وفی الھندیۃ (۵/۳۵۸): حلق الشعر حالة الجنابة مکروه وکذا قص الاظافیر کذا فی الغرائب.

وفی معارف السنن (۱/۴۰۰): ویجوز للجنب جمیع المعاملات التی یفعلھا الطاھر الغیر الجنب ماعدا دخول المسجد والطواف وقراءۃ القرآن.

(۱۹۴) ناپاکی کی حالت میں دعا وتسبیح کرنا

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو احتلام ہو جائے تو ناپاکی کی حالت میں نیند سے بیدار ہونے کی دعا، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... حالت جنابت (خواہ وہ احتلام کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے) میں ہر طرح کی دعا پڑھنا، ذکر کرنا، تسبیح پڑھنا جائز ہے، البتہ باوضو ہو کر ذکر وتسبیح کرنا افضل ہے خواہ حالت جنابت ہو یا نہ ہو۔

لما فی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۰۵): قال فی البحر وأما الاذکار فالمنقول اباحتھا مطلقا ویدخل فیھا اللھم اھدنا واللھم انا نستعینک علی ماعلیه الفتوی وفی الھدایة وغیرھا استحباب الوضوء لذکر اللہ تعالیٰ وترکه خلاف الاولی وھو مرجع کراھة التنزیه۔

وفی الدر المختار (۱/۲۹۳): (ولاباس) لحائض وجنب (بقراءة ادعیة ومسھا وحملھا وذکر اللہ تعالیٰ وتسبیح)۔

(۱۹۵) ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو چھونا

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک امام صاحب سے ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو ہاتھ لگانے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ناپاکی کی حالت میں قرآن پاک کے الفاظ کو ہاتھ لگانا جائز نہیں لیکن خالی جگہ اور جلد کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ کیا امام صاحب کی بات صحیح ہے؟ بصورت دیگر صحیح مسئلہ بتا کر میری رہنمائی فرمائیں میں کافی الجھن میں مبتلا ہوں۔

سے وجوب کا حکم ساقط ہوکر ایک حقیقی میت والا غسل دیا جائے گا۔

لما في المحيط البرهاني (۲/۱۵۵): هما يقولان: الغسل الواجب بالجنابة سقط بالموت، لأن الغسل كان واجب عليه، لسقط بالموت لعجزه.

وفي الدر المختار (۲/۱۹۵): (وإن زاد عليها أو نقص جاز) إذ الواجب مرة (ولا يعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه) لأن غسله ما وجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت كسائر الحيوانات الدموية إلا أن المسلم يطهر بالغسل كرامة.

وفي الشامية تحته: (قوله وإن زاد) أي عند الحاجة لكن ينبغي أن يكون وترا. ذكره في شرح مختصر... (قوله جاز) أي صح وكره بلا حاجة لأنه إسراف أو تقتير.

(۱۹۷) طہارت وغیرہ سے معذور شخص کے وضو اور نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک جاننے والے بہت زیادہ بیمار ہیں انہیں ہر وقت میں لگا ہوا ہوتا ہے اور پیشاب کیلئے تھیلی بھی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ کئی بیٹے ہیں جو کہ مالی لحاظ سے بہت بہتر ہیں مگر کوئی بھی خیال نہیں رکھتے انہیں نماز پڑھنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ براہ کرم اس حالت میں ان کیلئے نماز پڑھنے کا طریقہ بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں دو شقیں ہیں:

پہلی شق معذور شخص کی نماز پڑھنے کے بیان میں ہے: ایسا شخص جسے پیشاب کے قطرے تسلسل کے ساتھ آتے ہوں کہ فرض نماز کا پورا وقت اس میں گزر جائے یا جس کا پیٹ جاری ہوجائے یا کوئی اور زخم جو مستقل رستا رہے۔ شریعت کی اصطلاح میں معذور کہلاتا ہے۔ اور صورت مسئولہ میں مریض شخص جسے پیشاب کی تھیلی لگی ہوئی ہے۔ شرعاً یہ بھی معذوری کے حکم میں ہے اور اس قسم کے معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی نماز کیلئے ابتداء دخول وقت میں وضو کرلیا جائے اور اسی حالت میں نماز پڑھ لیں۔ کپڑے وغیرہ دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر تھیلی دور کرنے میں مشقت زیادہ ہو تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے۔

دوسری شق نماز پڑھنے کے طریقے کے بیان میں ہے: اگر مریض وضو کرنے پر قادر ہو یا کوئی اور شخص معاونت کرنے والا موجود ہو جیسے خادم وغیرہ یا ان کی اولاد وغیرہ تو یہ لوگ مریض کو وضو کرائیں اور پھر مریض قبلہ رخ بیٹھ کر یا اس کے پاؤں قبلہ رخ ہوں سر کے اشارے سے نماز پڑھ لے۔ اگر بیٹھنا ممکن نہ ہو تو کمر کے پیچھے تکیہ وغیرہ رکھ کر تھوڑا سا اونچا کردیں۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دائیں کروٹ پر لیٹ کر کے چہرہ قبلہ کی طرف ہو نماز پڑھ لے۔ اور اگر زیادتی مرض کی وجہ سے مریض وضو پر قادر نہ ہو تو تیمم کرکے نماز اسی مذکورہ بالا طریقے پر پڑھ لے۔ اور تیمم کی نیت مریض پر لازم ہوگی۔

لما في الهندية (۱/۱۳۶): وإن تعذر القعود أومأ بالركوع والسجود مستلقيا على ظهره وجعل رجليه

نماز پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۰۶): (وان سال علی ثوبه)فوق الدرهم (جاز له ان لا یغسله ان کان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله هو المختار للفتوی.

وفی الدر المختار (۱/۳۰۵): (ان استوعب عذره تمام وقت صلوة مفروضة) (ولو حکما) لان الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم (وهذا شرط) العذر (فی حق الابتداء وفی) حق (البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت) ولو مرة (وفی) حق الزوال یشترط (استیعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقیقة) لانه الانقطاع الکامل۔

وفی الدر المختار (۱/۳۰۷، ۳۰۸): یجب رد عذره او تقلیله بقدر قدرته ولو بصلاته مومیا وبرده لا یبقی ذا عذر.

(۱۹۹) سجدہ کرنے سے اگر خون نکلے تو کیا ایسا شخص معذور ہے؟

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے گھٹنے میں پھوڑا ہے وہ جب بھی سجدے کیلئے گھٹنہ نیچے لگاتا ہے اس پھوڑے سے خون نکلنا شروع ہوجاتا ہے ایسی حالت میں نماز پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے، کیا ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل ہے کہ ایک وضو سے مکمل نماز پڑھ لے ورنہ تو نماز پڑھنا بہت مشکل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ جیسا کہ سوال سے معلوم ہو رہا ہے کہ خون صرف سجدے میں گھٹنہ ٹیکنے سے نکلتا ہے ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل نہیں ہوتا بلکہ آپ بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھیں اور اگر دوران نماز کسی وجہ سے خون جاری ہو گیا تو دوبارہ نئے سرے سے وضو کرنا ہوگا۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۰۷، ۳۰۸): یجب رد عذره او تقلیله بقدر قدرته ولو بصلاته مومیا وبرده لا یبقی ذا عذر.

(۲۰۰) سلس البول (پیشاب کے قطرے) والے مریض کیلئے طہارت کا حکم

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصے سے پیشاب کرنے کے بعد وقفے وقفے سے قطرے آتے ہیں کیا میں ہر مرتبہ وضو کیا کروں اور کپڑوں کو پاک کروں یا شریعت کی طرف سے اس میں کچھ چھوٹ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ اگر آپ کو یہ قطرے اس تسلسل سے آرہے ہیں کہ درمیان میں اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ ایک وقت کی فرض نماز ادا کرسکیں، تو اس صورت میں آپ معذورین میں شامل ہیں۔ جن کا حکم یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے وقت وضو کرلیا کریں۔ اور پھر اس وضو سے

آپ ایک وقت میں جتنے چاہیں فرائض ہوں یا نوافل ادا کریں اور تلاوت قرآن کریم کریں۔ (اس ایک وقت کے دوران میں جتنے بھی قطرے آجائیں آپ پاک ہی رہیں گے۔ بشرطیکہ کوئی اور سبب وضو توڑنے کا نہ پایا جائے) یہاں تک کہ وقت ختم ہو جائے گا تو جیسے ہی اس فرض نماز کا وقت ختم ہوگا تو آپ کا وضو بھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر اگلی نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

اور اگر یہ قطرے کپڑوں پر گرے ہوئے ہوں تو اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ مسلسل نکل رہے ہیں۔ اگر اتنا بھی وقت نہ ملے کہ اگر یہ کپڑے دھو کر نماز شروع کرنے سے پہلے پہلے دوبارہ پھر دوران نماز وہ قطرے اسی طرح کپڑوں پر نکل آئیں۔ تو اس صورت میں آپ پر ان قطروں کا دھونا واجب نہ ہوگا اگرچہ یہ قطرے مقدار درہم سے تجاوز ہی کیوں نہ کر جائیں۔ اور اگر آپ کو یہ گمان ہے کہ ان قطروں کو دھونے کے بعد یہ دوران نماز دوبارہ نہیں نکلیں گے۔ تو اس صورت میں ان کا دھونا واجب ہے۔ اور اگر ان قطروں کے نکلنے میں تسلسل نہیں ہے تو آپ معذورین میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کا وضو ان قطروں سے ٹوٹ جائے گا۔ اور کپڑے بھی ناپاک ہو جائیں گے اور ان کا دھونا (جبکہ وہ مقدار درہم سے تجاوز کر جائیں) واجب ہوگا۔

وفي تنوير الأبصار مع الدر (١/٣٠٥): (وصاحب عذر من به سلس) بول لا يمكنه إمساكه .. (وإن استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لا يجد في جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلي فيه خاليا عن الحدث (ولو حكما) لأن الانقطاع اليسير ملحق بالعدم..... (وحكمه الوضوء) لا غسل ثوبه ونحوه (لكل فرض) اللام للوقت كما في لدلوك الشمس (ثم يصلي) به (فيه فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالأولى (فإذا خرج الوقت بطل) أي ظهر حدثه السابق .... (وإن سال على ثوبه) فوق الدرهم (جاز له أن لا يغسله إن كان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها) أي الصلاة (وإلا) يتنجس قبل فراغه (فلا) يجوز ترك غسله هو المختار للفتوى.

وفي الهندية (١/٤١): المستحاضة ومن به سلس البول ... يتوضؤن لوقت كل صلاة ويصلون بذلك الوضوء في الوقت ما شاؤا من الفرائض والنوافل ... ويبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضة بالحدث السابق ... إذا كان به جرح سائل وقد شد عليه خرقة فأصابها الدم أكثر من قدر الدرهم أو أصاب ثوبه إن كان بحال لو غسله يتنجس ثانيا قبل الفراغ من الصلاة جاز أن لا يغسله وصلى قبل أن يغسله وإلا فلا هذا هو المختار.

(۲۰۱) پیشاب کرنے کے آدھے گھنٹے بعد تک قطرے آنے والے مریض کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کے بعد آدھا گھنٹہ قطرے آتے ہیں بسا اوقات نماز جماعت سے نکل جاتی ہے اور بسا اوقات نماز کا وقت بھی نکل جاتا ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟

(۲) اسی طرح ایک دوسرے شخص کو ہر وقت پیشاب کے قطرے آتے ہیں جس کی وجہ سے شلوار وغیرہ ناپاک ہوجاتی ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً (۱) اگر پیشاب کے قطرے اتنے وقفے سے آتے رہتے ہیں کہ آدمی کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وضو کرکے فرض نماز پڑھ لے تو پھر یہ شخص معذور ہے، اور معذور ہر فرض نماز کے وقت نیا وضو کرے گا اور وقت نکلتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور بعد میں ہر فرض نماز کے وقت میں ایک دفعہ عذر کا پایا جانا ضروری ہے اگر مکمل وقت بغیر عذر کے گزر گیا تو پھر اس کا عذر بھی ختم ہوگیا۔ صورت مسئولہ میں یہ شخص آخری وقت تک انتظار کرے اگر پھر بھی قطرے ختم نہیں ہوئے تو وقت نکلنے سے پہلے وضو کرے اور نماز پڑھے اگر دوسرا پورا وقت بغیر عذر کے گزر گیا یعنی اس کو دوسرے پورے وقت میں قطرے نہیں آئے تو یہ شخص پڑھی ہوئی نماز اور وضو کا اعادہ کرے گا اور اگر دوسرے وقت میں بھی اس کو قطرے آگئے تو نماز صحیح ہوگئی اعادہ لازم نہیں۔

(۲) اگر کسی شخص نے پیشاب کے قطروں سے ناپاک شلوار وغیرہ اس لئے نہیں دھوئی کہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک ہوجائے گی تو اگر اسی کپڑے شلوار وغیرہ میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہوگی۔ اور اگر شلوار وغیرہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک نہ ہوتی ہو تو اس کو ہر نماز کیلئے دھونا ضروری ہے اور اگر نہیں دھوئی اور اسی ناپاک کپڑے میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح نہیں ہوگی، بشرطیکہ نجاست درہم کی مقدار سے زیادہ ہو۔

وفی الدر المختار (۱/۳۰۵، ۳۰۶): (وصاحب عذر من به سلس) بول لایمکنه امساکه ... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث ... (وهذا شرط) العذر (فی حق الابتداء وفی) حق (البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت) ولو مرة (وفی) حق الزوال یشترط (استیعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقیقة) لانه الانقطاع الکامل (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض) ... (ثم یصلی) به (فیه فرضا ونفلا) ... (فاذا خرج الوقت بطل) ای ظهر حدثه السابق، حتی لو توضأ علی الانقطاع ودام الی خروجه لم یبطل بالخروج مالم یطرأ حدث آخر او یسیل (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جاز له ان لایغسله ان کان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله، هو المختار.

وفی الشامیة (۱/۳۰۵): (قوله فی حق الابتداء) ای فی حق ثبوته ابتداء (قوله فی جزء من الوقت) ای من کل وقت بعد ذالک الاستیعاب ... (قوله وفی حق الزوال) ای زوال العذر وخروج صاحبه عن کونه معذوراً (قوله تمام الوقت حقیقة) ای بأن لایوجد العذر فی جزء منه اصلا فیسقط العذر من اول الانقطاع، حتی لو انقطع فی اثناء الوضوء او الصلاة ودام الانقطاع الی آخر الوقت الثانی یعید، ولو عرض بعد دخول وقت فرض انتظر الی آخره فان لم ینقطع یتوضأ ویصلی ثم ان انقطع فی اثناء

الوقت الثاني يعيد لتمكن الصلاة، وإن استوعب الوقت الثاني لا يعيد لثبوت العذر حينئذ من وقت المفروض اهـ وذكر في البحر عن السراج انه لو انقطع بعد الفراغ من الصلاة او بعد القعود قدر التشهد لا يعيد لزوال العذر بعد الفراغ

(۲۰۲) پیشاب کے بعد کچھ دیر تک قطرے آنے سے معذور شمار نہیں ہوتا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ کو پیشاب کے بعد قطرے آتے ہیں تقریباً آدھ گھنٹہ اٹھوں یا بیٹھوں تو قطرے خارج ہو جاتے ہیں علاج بھی کرایا ایک سال لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا لہٰذا شریعت میں میرے لئے اب کیا حکم ہے؟ یا کوئی وظیفہ وغیرہ بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: جس شخص کو پیشاب کے قطرے آتے ہوں چاہے پیشاب کرنے سے پہلے ہوں یا پیشاب کے بعد ہوں۔ یہ پیشاب کی بیماری تصور کی جاتی ہے۔ لیکن یہ شخص شرعاً معذور اس وقت شمار ہوگا جبکہ ایک مرتبہ فرض نماز پڑھنے کا وقت بھی اسی عذر کے ساتھ گزرے۔ اور صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کو تقریباً پیشاب کے بعد آدھا گھنٹہ تک پیشاب کے قطرے آتے ہیں۔ اس کے بعد بند ہو جاتے ہیں لہٰذا آپ شرعاً معذور نہیں ہیں۔ آپ نماز سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے پیشاب کے قطروں کے خارج ہونے تک انتظار کریں، جب قطرے بند ہو جائیں اور آپ کو اطمینان حاصل ہو جائے تو پھر اس کے بعد وضو کر کے نماز ادا کریں۔

كما في الهندية (١/٤٠): شرط ثبوت العذر ابتداء ان يستوعب استمراره وقت الصلوة كاملا وهو الاظهر كالانقطاع لا يثبت ما لم يستوعب الوقت كله.

وفيه ايضاً (١/٤٠): المستحاضة ومن به سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الريح او رعاف دائم او جرح لا يرقأ يتوضؤن لوقت كل صلوة ويصلون بذلك الوضوء في الوقت ما شاؤا من الفرائض والنوافل هكذا في البحر الرائق.

وإن توضأ على السيلان وصلى على الانقطاع وتم الانقطاع باستيعاب الوقت الثاني اعاد كذا في شرح منية المصلي لابراهيم الحلبي وكذا اذا انقطع في خلال الصلوة وتم الانقطاع هكذا في المضمرات.

ويبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضة بالحدث السابق هكذا في الهداية وهو الصحيح هكذا في المحيط في نواقض الوضوء ... متى قدر المعذور على رد السيلان برباط أو حشو أو كان لو جلس لا يسيل ولو قام سال وجب رده ويخرج برده عن ان يكون صاحب العذر بخلاف الحائض اذا منعت الدرور فانها حائض كذا في البحر الرائق.

﴿فصل فی الحیض والنفاس﴾

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۰۳) عادت سے پہلے ماہواری آنے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت ہے کہ مجھے ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے جو بارہ تاریخ سے شروع ہو کر اٹھارہ تاریخ تک عام طور پر رہتا ہے لیکن اس مرتبہ آٹھ تاریخ سے شروع ہو گیا ہے تو کیا یہ ماہواری خون ہوگا اور ان دنوں میں نماز وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　یہ ماہواری خون ہی شمار کیا جائے گا بشرطیکہ وہ تین دن سے کم نہ ہو، کیونکہ ان دونوں ماہواری کے درمیان پندرہ دن سے زائد کا فاصلہ ہے، اور پاکی کی اقل مدت پندرہ دن ہے تو آٹھ تاریخ سے شروع ہونے والا خون بھی حیض کا خون ہی شمار کیا جائے گا ان دنوں میں نماز وغیرہ ذمہ سے ساقط ہو جائے گی۔

لما فی الہندیۃ (۱/ ۳۷): اذا کان الطہر خمسة عشر یوماً أو أکثر یعتبر فاصلاً فیجعل کل واحد من الدمین او احدهما بانفراده حیضاً حسب ما امکن من ذلک. (ص ۳۸): (منها) ان یسقط عن الحائض والنفساء الصلوة فلا تقضی هکذا فی الکفایة ..... ومنها ان یحرم علیهما الصوم فتقضیانه هکذا فی الکفایة

وفی الدر المختار (۱/ ۲۸۵): (واقل الطهر) بین الحیضتین أو النفاس والحیض (خمسة عشر یوماً) ولیالیها اجماعاً. (ص ۲۸۴): فیه تترک الصلوة ولو مبتدأة فی الأصح، لان الاصل الصحة والحیض دم صحة شمنی.

وفی الشامیة (۱/ ۲۸۴): (قوله فیه) ای فی البروز تترک الصلوة وتثبت بقیة الأحکام، ولکن هذا مادام مستمرا لما سیأتی من انه لو انقطع تتوضأ وتصلی.

(۲۰۴) "بلوغت کے بعد صرف ڈیڑھ دن خون آیا" ایسی خاتون کی ماہواری کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ابھی تک صرف ایک دو دفعہ ایک ڈیڑھ دن تک کیلئے

ماہواری کا خون آیا ہے جبکہ میری عمر تیس سال ہے، میرے لئے ماہواری کا کیا حکم ہے؟ اور جو دو دفعہ خون آیا تو کیا وہ ماہواری شمار ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر ماہواری کا خون تین دن سے کم ہو تو وہ حیض شمار نہیں ہوتا لہٰذا آپ کو جو ایک دو دفعہ خون آیا ہے وہ تین دن سے کم ہے، وہ حیض شمار نہیں ہوگا، اور جب تک خون نہ آئے آپ پاک ہیں اور پاکی کی حالت کے جو احکامات ہیں وہی سب آپ کے لئے ہوں گے۔

وفي رد المحتار (۱/۲۸۵): الأولى ان تبلغ بالسن وتبقى بلا دم طول عمرها فتصوم وتصلي ويأتيها زوجها وغير ذلك ابداً　الثانية ان ترى الدم عند البلوغ او بعده اقل من ثلاثة ايام ثم يستمر انقطاعه وحكمها كالاولى.

(۲۰۵) تین دن سے کم خون آنا حیض شمار نہیں ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک عورت جس کی عمر تقریباً پینتیس (۳۵) سال ہے اور اسے ہر ماہ صرف دو دن خون آتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ خون حیض شمار ہوگا یا نہیں؟ اور جن دنوں میں یہ خون آتا ہے ان دنوں میں عورت کیلئے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح دیگر احکامات مثلاً تلاوت وغیرہ کرنا قرآن پاک چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: شریعت میں حیض کی کم سے کم مدت تین دن تین رات اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن دس رات ہے جو خون تین دن تین رات سے کم یا دس دن دس رات سے زیادہ آئے تو وہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا وہ استحاضہ کا خون ہے اور استحاضہ کا حکم پاکی کا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ عورت جس کو ہر ماہ صرف دو دن خون آتا ہے یہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا لہٰذا یہ عورت جس طرح پاکی کے ایام میں فرائض (نماز، روزہ وغیرہ) ادا کرتی ہے اسی طرح ان دنوں میں بھی فرائض ادا کرے گی اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا یا ہاتھ سے چھونا سب اس کے لیے جائز ہوگا، البتہ اس پر معذور کے احکامات آئیں گے۔

کما في بدائع الصنائع (۱/۲۸۸): ولنا ما روى ابو امامة الباهلي رضي الله عنه عن النبي ﷺ انه قال اقل ما يكون الحيض للجارية الثيب والبكر جميعا ثلاثة ايام واكثر ما يكون من الحيض عشرة ايام وما زاد على العشرة فهو استحاضة وهذا حديث مشهور وروي عن جماعة من الصحابة رضي الله عنهم　واما الثاني فذكر ظاهر الرواية ان اقل الحيض ثلاثة ايام ولياليها.

وفي الدر المختار (۱/۲۸۳): واقله ثلاثة ايام ولياليها) الثلاث، فالاضافة لبيان العدد المقدر بالساعات الفلكية لا للاختصاص. فلا يلزم كونها ليالي تلك الايام وكذا قوله (واكثره عشرة) بعشر ليال كذا رواه الدار قطني وغيره.

(۲۰۶) ماہواری کے دنوں میں خون رکنے کا حکم اور اس وقت میں اعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اٹھارہ تاریخ سے خون شروع ہو کر تیئیس تاریخ تک جاری رہتا ہے تین درمیان میں کبھی ایک گھنٹے کیلئے کبھی دو گھنٹے اور کبھی ایک آدھ دن کیلئے رک کر پھر جاری ہو جاتا ہے جس وقت خون بند ہو جاتا ہے اتنا وقت پاک شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس وقت نماز پڑھنا اور تلاوت کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ایام ماہواری کے بعض اوقات میں خون تو رک جاتا ہے وہ ایام ماہواری ہی کے شمار ہوتے ہیں اس لئے آپ کا ماہواری کے دنوں میں ان اوقات میں بھی نماز پڑھنا تلاوت کرنا درست نہیں۔

لما فی البحر الرائق (۱/۳۵۸): وقال محمد رحمہ اللہ: الطهر المتخلل ان نقص عن ثلاثة ايام ولو ساعة لا يفصل اعتباراً بالحيض فان كان ثلاثة فصاعداً فان كان مثل الدمين او اقل فكذلك تغليباً للمحرمات لان اعتبار الدم يوجب حرمتها واعتبار الطهر يوجب حلها فغلب الحرام الحلال وان كان اكثر فصل ثم ينظر ان كان في احد الجانبين ما يمكن ان يجعل حيضا فهو حيض والآخر استحاضة وان لم يكن فالكل استحاضة۔

وفی الشامیۃ (۱/۲۸۹): ثم اعلم ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان خمسة عشر يوماً فاكثر يكون فاصلا بين الدمين في الحيض اتفاقا فما بلغ من كل من الدمين نصابا جعل حيضا۔

وانه اذا كان اقل من ثلاثة ايام لا يكون فاصلاً وان كان اكثر من الدمين اتفاقا۔

فلو رأت مبتدأة يوما دماً ويومين طهراً ويوما دما فالاربعة حيض لان الطهر المتخلل دون ثلاث وهو لا يفصل اتفاقا۔

(۲۰۷) تین دن ماہواری آکر دس دن کے بعد پھر آنے والے خون کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو رمضان المبارک میں حیض تین دن تک رہا پھر وہ پاک ہوگئی پھر اس نے دس روزے رکھے پھر حیض شروع ہوگیا اور ایک دن رہا اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ حیض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ایک مہینے میں دو مرتبہ حیض کس طرح آیا؟ اگر استحاضہ ہے تو پھر جو روزے رکھے ہیں وہ ہوگئے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مذکورہ عورت کو جب مکمل تین دن رات خون (حیض) آیا پھر وہ پاک ہوگئی تو اس کا حیض ختم ہوگیا۔ دس روزے رکھنے کے بعد جو خون آیا وہ حیض نہیں بلکہ استحاضہ ہے اور جو دس روزے اس نے رکھے ہیں وہ بھی ہوگئے ہیں لہٰذا عورت نے اگر استحاضہ کے دوران نمازیں نہیں پڑھیں تو روزوں کی قضا کے ساتھ ساتھ نمازوں کی قضا بھی کرے۔

لما في خلاصة الفتاوى (١/٢٣٣): الفاصل بين الدمين الطهر اذا كان اقل من خمسة عشر يوما لا يعتبر ولا يصير فاصلا بين الدمين ويصير كالدم المتوالي عند ابي يوسف واذا كان خمسة عشر يوما او اكثر يعتبر فاصلا.

وفي الهندية (١/٣٦): اقل الحيض ثلاثة ايام وثلاث ليال في ظاهر الرواية هكذا في التبيين واكثره عشرة ايام ولياليها كذا في الخلاصة (١/٣٧) وروى ابو يوسف عن ابي حنيفة ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان اقل من خمسة عشر يوما لم يفصل وكثير من المتاخرين افتوا بهذه الرواية لانها اسهل على المفتي والمستفتي والاخذ بهذا ايسر كذا في الهداية وعليه استقر راي الصدر الشهيد حسام الدين وبه يفتى كذا في المحيط.

وفي الدر المختار (١/٢٨٤-٢٨٥): (والحيض دم صحة شمي) (واقله ثلاثة ايام بلياليها).

(واكثره عشرة) بعشر ليال (والناقص) عن اقله (والزائد) على اكثره ... (استحاضة) (واقل الطهر) بين الحيضتين او النفاس والحيض (خمسة عشر يوما) ولياليها اجماعا (ولا حد لاكثره).

وفي كتاب الفقه (١/١٢٩): فلو حاضت المرأة ثم انقطع حيضها بعد ثلاثة ايام مثلا واستمر منقطعا الى اربعة عشر يوما او اقل ثم رأت الدم لا يكون حيضا.

وفيه ايضا (١/١٣٠): وحكم الاستحاضة انها لا تمنع شيئا من الاشياء التي يمنعها الحيض والنفاس الخ.

(۲۰۸) ماہواری کے بعد سفیدی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاتون کو جب ماہواری آتی ہے تو سات دن سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے اس کے بعد سفیدی آتی ہے آیا یہ سفیدی حیض شمار ہوگی اس کے ہوتے ہوئے نماز روزے کا کیا حکم ہوگا۔ نیز اگر یہ سفیدی کپڑوں پر لگ جائے یا بدن پر لگ جائے تو کپڑے یا بدن نجس ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سات دن جو سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے یہ حیض ہے اس کے بعد جو سفیدی آتی ہے یہ حیض شمار نہیں ہوگی بلکہ یہ حیض ختم ہونے کی علامت ہے اس کے بعد نماز روزہ لازم ہے۔ البتہ اس سفیدی کے کپڑوں یا بدن پر لگ جانے سے کپڑے یا بدن ناپاک ہوجاتے ہیں ان کا دھونا ضروری ہے۔

لما في المحيط البرهاني (١/٢٠٤): واذا وضعت الكرسف في اول الليل وهي حائض ونامت فنظرت الى الكرسف حين اصبحت فرأت البياض الخالص فعليها قضاء العشاء للتيقن بطهرها من حين وضعت الكرسف

اور تلاوت بھی کر سکتی ہیں، لیکن اگر وضو کے بعد دوبارہ خون نکل آیا تو وضو ٹوٹ جائے گا اس لئے اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وضو کر کے آپ زیادہ نہ چلیں اور اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی وجہ سے بھی خون جاری ہو جاتا ہے تو پھر بیٹھ کر نماز پڑھیں۔

سات مرتبہ سورۃ الفاتحہ اس کے اول و آخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھ کر پانی پر دم کر کے پئیں اور شفاء پانی کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھیں، انشاء اللہ تعالیٰ جلد صحت یابی عطا فرمائیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نیک صالح فرزند اولاد عطا فرمائے، آمین۔

لما في مشكوة المصابيح(۱/۵۶): عن النبي ﷺ انه قال في المستحاضة تدع الصلوة أيام اقرائها التي كانت تحيض فيها ثم تغتسل وتتوضأ عند كل صلوة وتصوم وتصلي.

وفي ترمذي(۲/۲۶): عن ابي سعيدؓ قال بعثنا رسول الله ﷺ في سرية فنزلنا بقوم فسألناهم القرى فلم يقرونا فلدغ سيدهم فاتونا فقالوا هل فيكم من يرقي من العقرب قلت نعم انا ولكن لا ارقيه حتى تعطونا غنما قالوا فانا نعطيكم ثلاثين شاة فقبلنا فقرأت عليه الحمد سبع مرات فبرأ وقبضنا الغنم قال فعرض في انفسنا منها شيء فقلنا لا تعجلوا حتى تاتوا رسول الله ﷺ قال فلما قدمنا عليه ذكرت له الذي صنعت قال وما علمت انها رقية اقبضوا الغنم واضربوا لي معكم بسهم.

وفي الفتاوى الهندية(۱/۳۸): لو رأت الدم بعد أكثر الحيض والنفاس في أقل مدة الطهر فما رأت بعد الاكثر إن كانت مبتدأة وبعد العادة ان كانت معتادة استحاضة .. وكذا ما تراه الحامل ابتداء أو حال ولادتها قبل خروج الولد كذا في الهداية... (ص۳۰) (ودم الاستحاضة) كالرعاف الدائم لايمنع الصلاة ولا الصوم ولا الوطي.

وفي الشامية(۱/۲۹۸): (قوله وقتاً كاملاً) ظرف لقوله دائم، الأولى عدم ذكر هذا القيد: أي قيد الدوام لانه في حكمه في الصوم وعدمه (قوله لا يمنع صوماً الخ) اي ولا قراءة ومس مصحف ودخول مسجد، وكذا لا تمنع عن الطواف اذا امنت من اللوث.

(۲۱۴) دوران حمل آنے والے خون اور اس حالت میں پڑھی جانے والی نمازوں کا حکم

سوال: .. کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ڈیڑھ ماہ کا حمل ساقط ہو گیا ہے۔ بچے کے اعضاء نہیں بنے تھے، بس گوشت ہی گوشت تھا، اب چالیس دن تک یا اس سے کم جو خون آئے گا اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، اس مسئلے کا جواب لکھ دیں۔ اور جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آ رہا تھا تو اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، دونوں کے جواب الگ الگ لکھ دیں، جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آنے لگا تھا تو میں نے لیٹے لیٹے نمازیں ادا کیں تھیں میری وہ نمازیں ہوئیں یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً۔ (۱)۔ صورت مسئولہ میں اگر خون ماہواری کی مقدار تک آیا ہو تو یہ ماہواری کا خون شمار ہوگا، اس دوران نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور قرآن کی تلاوت وغیرہ کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر خون مقدار حیض سے کم یا زیادہ آنے لگے، اسی طرح دوران حمل جو خون آتا رہا تو یہ سب خون استحاضہ کے حکم میں ہے، یعنی اس دوران آپ کو نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا ضروری ہے اور قرآن کی تلاوت وغیرہ اعمال بھی آپ کر سکتی ہیں۔

(۲)۔ جو نمازیں آپ نے لیٹے لیٹے ادا کیں ہیں اگر آپ کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہیں تھیں تو وہ نمازیں ہو گئیں، ورنہ ان کا اعادہ کرنا آپ پر لازم ہے۔

لما في الهندية (١/٣٧): (والدم الذي تراه الحامل ابتداء أو حال ولادتها قبل خروج الولد استحاضة) وإن كان ممتداً.

وفي الهندية (١/٣٧): والسقط إن ظهر بعض خلقه من أصبع أو ظفر أو شعر ولد فتصير به نفساء هكذا في التبيين، وإن لم يظهر شيء من خلقه فلا نفاس لها فإن أمكن جعل المرئي حيضاً يجعل حيضاً وإلا فهو استحاضة.

وفي الشامية (٢/٩٧): لو قدر على بعض القيام دون تمامه أو كان يقدر على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائماً ويقرأ ما قدر عليه ثم يقعد إن عجز وهو المذهب الصحيح لا يروى خلافه عن أصحابنا، ولو ترك هذا خفت أن لا تجوز صلاته.

(۲۱۳) تین ماہ کا حمل ضائع ہونے کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کا حمل تین مہینے کے بعد ضائع ہو جائے یا ضائع کر دیا جائے تو آیا اس کے بعد آنے والا خون حیض سے شمار ہوگا یا نفاس سے شمار کیا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔ اگر کسی عورت کا حمل تین ماہ کے بعد ضائع ہو جائے یا ضائع کر دیا جائے تو اگر اس حمل کے اعضاء (مثلاً ہاتھ، پیر وغیرہ) ظاہر ہو گئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون نفاس شمار ہوگا اور اگر اس حمل کے اعضاء وغیرہ کچھ ظاہر نہ ہوئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون اگر کم از کم تین روز تک آیا ہو اور اس سے پہلے ایک طہر تام (پندرہ دن کا دورانیہ) گزر چکا ہو تو پھر یہ حیض (ماہواری) ہے اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو پھر یہ خون نہ نفاس ہے اور نہ حیض بلکہ استحاضہ (بیماری) کا خون ہوگا۔

لما في الهندية (١/٣٧): والسقط إن ظهر بعض خلقه من أصبع أو ظفر أو شعر ولد فتصير به نفساء هكذا في التبيين.

وفي الدر المختار (١/٣٠٢): (وسقط) مثلث السين أي مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد أو رجل) أو

اصبع او ظفر او شعر ولا يستبين خلقه الا بعد مائة وعشرين يوما (ولد) حكما (فتصير) المرأة (به نفساء والامة ام ولد ويحنث به) في تعليقه وتنقضي به العدة فان لم يظهر له شيء فليس بشيء والمرئي حيض ان دام ثلاثا وتقدمه طهر تام والا استحاضة.

وفي الفقه الاسلامي (١/٤٢١): ويعد الدم عند هؤلاء دم النفاس بخروج أكثر الولد ولو متقطعا عضوا عضوا ولو سقطا استبان فيه بعض خلقة الانسان كاصبع او ظفر ... فان رأت دما بعد القاء نطفة او علقة فليس بنفاس.

(۲۱۴) ماہواری میں تعلیم قرآن کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنی ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں گھر میں۔ ماہواری کے ایام میں چھٹی کرتی ہوں تو بچوں کے حق کا حرج ہوتا ہے اور اگر چھٹی نہ کروں تو دوران ماہواری تلاوت کا مسئلہ ہے ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: عورت کا ماہواری کے ایام میں تلاوت کرنا ناجائز ہے البتہ معلمہ ہونے کی صورت میں اس قدر گنجائش ہے کہ ہر آیت کے کلمات کو علیحدہ علیحدہ کرکے پڑھائے مثلاً "الحمدللہ" میں "الحمد" کو علیحدہ اور "للہ" کو علیحدہ پڑھائے تو گنجائش ہے۔ البتہ قرآن مجید کو یاد رکھنے کے لئے دل میں دہرانا جائز ہے۔

وفي الدر المختار (١/١٧٢، ١٧٣): (و) يحرم به (تلاوة قرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء او الثناء او افتتاح امر او التعليم ولقن كلمة كلمة حل في الأصح.

(۲۱۵) ماہواری میں خواتین کیلئے تلاوت قرآن کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری چھوٹی بچی ماشاءاللہ اب بڑی ہو گئی ہے۔ وہ پہلے آپ کے مدرسہ میں ہی حفظ کررہی تھی اب گھر کے قریب ایک مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔ اسی کے متعلق مسئلہ یہ دریافت کرنا تھا کہ ماہواری کے دنوں میں وہ قرآن کریم کی تلاوت اور اسباق کی پابندی کیسے کرے گی؟ نیز کیا ان دنوں میں خواتین دل ہی دل میں قرآن پاک کی تلاوت کرسکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: عورتوں کا حالت حیض میں قرآن کریم کو چھونا اور زبان سے اس کی تلاوت کرنا جائز نہیں۔ اور حدیث شریف میں حائضہ عورتوں کے لیے جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ قرآن کریم کی تلاوت کے متعلق ہے کہ حائضہ عورت قرآن کریم نہ پڑھے اور چونکہ

توبہ کریں اللہ بخشنے والا مہربان ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ اگر شروع ایام میں وطی کی ہو تو ایک دینار اور آخر ایام میں کی ہو تو نصف دینار کی بقدر قیمت صدقہ بھی کر دیں۔

لما فی الدر المختار مع الشامیۃ (۱/۲۹۷، ۲۹۸): (و) وطؤها (یکفر مستحله) کما جزم به غیر واحد وکذا مستحل وطء الدبر عند الجمهور (وقیل لا یکفر) فی المسألتین وهو الصحیح خلاصۃ (وعلیه المعول) لانه حرام لغیره (قوله (و) وطؤها) ای الحائض قال فی الشرنبلالیۃ ولم ار حکم وطء النفساء من حیث التکفیر اما الحرمۃ فمصرح بها ... ثم هو کبیرۃ لو عامداً مختاراً عالماً بالحرمۃ لا جاهلاً او مکرهاً او ناسیاً فتلزمه التوبۃ. ویندب تصدقه بدینار او نصفه، ومصرفه کزکاۃ وهل علی المرأۃ تصدق قال فی الضیاء: الظاهر لا. (قوله ثم هو) ای وطء الحائض (قوله لا جاهلاً الخ) هو علی سبیل اللف والنشر ... والظاهر ان الجهل انما ینفی کونه کبیرۃ لا اصل الحرمۃ اذ لا عذر بالجهل بالاحکام فی دار الاسلام ... (قوله ویندب الخ) لما رواه احمد وابو داؤد والترمذی والنسائی عن ابن عباس مرفوعاً فی الذی یاتی امرأته وهی حائض قال: یتصدق بدینار او نصف دینار" ثم قیل ان کان الوطء فی اول الحیض فبدینار او اخره فبنصفه.

وفی سنن النسائی (۱/۴۳): عن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم فی الرجل یاتی امرأته وهی حائض یتصدق بدینار او بنصف دینار.

(۲۱۷) ماہواری کے دوران فضائل اعمال پڑھنا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنے مخصوص ایام میں فضائل اعمال ہاتھ میں پکڑ کر پڑھ سکتی ہے جبکہ اس میں بعض اوقات قرآن کی آیات یا ان کا ترجمہ اور عام طور پر احادیث مقدسہ ہوتی ہیں، اس صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بصورت مسئولہ میں عورت کا ماہواری کے ایام میں فضائل اعمال یا اس جیسی دوسری اسلامی کتابوں کا ہاتھ میں لینا، پڑھنا جائز ہے جن میں دوسرے کلام کے ساتھ قرآن کی آیات بھی لکھی ہوئی ہوں، بشرطیکہ قرآن کی آیات پر ہاتھ نہ لگایا جائے۔

لما فی الدر المختار (۱/۲۹۱): (و) یمنع حل (دخول مسجد)..... (۱/۲۹۳) (وقراءۃ قرآن) بقصده (ومسه) ولو مکتوباً بالفارسیۃ فی الأصح (الا بغلافه) المنفصل.

وفی الشامیۃ (۱/۲۹۳): (ومسه) ای القرآن ولو فی لوح أو درهم أو حائط لکن لا یمنع الا من مس المکتوب بخلاف المصحف فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه.

(۲۱۸) گولیاں کھا کر ماہواری کا خون بند کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی کو ہر ماہ آٹھ تاریخ سے سترہ (۱۷) تاریخ تک خون آتا ہے اور میں گھر سے پندرہ گھنٹے کے فاصلے پر ایک اسکول میں ملازم ہوں ہفتے کے بعد گھر آتا ہوں اور دو راتیں ٹھہر کر واپس چلا جاتا ہوں اس مرتبہ جب آیا تو بیوی کو ماہواری کا خون آ رہا تھا میں نے کہا چلو اگلے ہفتے ہمبستری کر لیں گے اس نے کہا معمول کو ترک کرنا اچھا نہیں ہے خود کہا آپ جمعرات بند ہو جائے گی تب ابھی بندوبست کر لیتی ہوں اس نے گولیاں کھالیں جن سے خون بند ہو گیا اب حیض کے ایام میں خون کو گولیوں کے ذریعے بند کر کے ہمبستری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً... خون بند کرنے والی گولیاں اگر حیض شروع ہونے سے پہلے کھائی جائیں اور پھر مقررہ ایام میں خون جاری نہ ہو تو عورت کے مقررہ ایام پاکی کے شمار ہوں گے اور اگر حیض ہونے کے بعد کھائی جائیں تو اگر تین دن سے پہلے پہلے خون بند ہو گیا ہے اور اس کے بعد دس دن تک دوبارہ خون نہیں آیا تو پاکی کے احکام جاری ہوں گے اور جماع کرنا بھی جائز ہوگا اور اگر تین دن کے بعد خون بند ہوا ہے تو عورت کی جو عادت ہوگی اس وقت تک جماع کرنا جائز نہیں ہوگا اور عادت کے بعد بھی اس وقت جائز ہوگا جب عورت غسل کرلے۔ اس صورت مسئولہ میں عورت نے حیض شروع ہونے کے بعد گولیاں کھائی تھیں پھر اگر تین دن خون جاری رہنے کے بعد کھائی تھیں تو اس پر خون بند ہونے کے باوجود پاکی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے اور جماع کرنا بھی جائز نہیں تھا لہٰذا آپ دونوں نے جماع کرکے گناہ کا ارتکاب کیا، توبہ واستغفار لازم ہے۔

لما في فتاوى اللجنة الدائمة (۴۰۰): يجوز أن تستعمل المرأة أدوية في رمضان لمنع الحيض إذا قرر أهل الخبرة الأمناء من الدكاترة ومن في حكمهم أن ذلك لا يضرها ولا يؤثر على جهاز حملها وخير لها أن تكف عن ذلك وقد جعل الله لها رخصة في الفطر إذا جاءها الحيض في رمضان.

وفي اعلاء السنن (طبع بيروت ۱/۳۴۰): وفي الثالث: وهو ما إذا انقطع لدون العادة لا يقربها وإن اغتسلت مالم تمض عادتها. وفي الثالثة لا يجوز قربانها قبل الغسل وبعده مالم تمض عادتها وهذا بالإجماع.

وفي عالمگيري (۱/۳۹): لو انقطع دمها دون عادتها يكره قربانها وإن اغتسلت حتى تمضي عادتها وعليها أن تصلي وتصوم للاحتياط هكذا في التبيين.

(۲۱۹) اسقاط حمل کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک عزیزہ کا پانچ ماہ کا حمل خود بخود ساقط ہو گیا، ڈاکٹر نے

حمل ساقط ہونے کے بعد صفائی وغیرہ کی اس کے بعد صرف دو دن خون آیا۔ اب یہ دو دن آنے والا خون نفاس کا شمار ہوگا؟ اور اس کی نماز معاف ہوگی یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں یہ خون نفاس کا ہے لہٰذا آپ کی عزیزہ پر ان دنوں کی نماز معاف ہے۔

وفي الدر المختار (۳۰۲/۱): (وسقط) مثلث السين أي مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد أو رجل) أو إصبع أو ظفر أو شعر، ولا يستبين خلقه إلا بعد مائة وعشرين يوماً (ولد) حكماً (فتصير) المرأة (به نفساء والأمة أم ولد)

(۲۲۰) بذریعہ آپریشن ولادت ہو تو بعد میں آنے والے خون کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر آپریشن کے ذریعے بچہ پیدا ہو تو بعد میں آنے والے خون کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں آپریشن کے بعد آنے والا خون، اگر زخم سے نہ نکل رہا ہو بلکہ رحم سے آ رہا ہو تو نفاس کا ہوگا، ورنہ نہیں۔

وفي الهندية (۳۷/۱): ولو ولدت من قبل سرتها بأن كان ببطنها جرح فانشقت وخرج الولد منها، تكون صاحبة جرح سائل لا نفساء هكذا في الظهيرية والتبيين: إلا إذا خرج من الفرج دم عقيب خروج الولد من السرة فإنه حينئذ يكون نفاساً هكذا في التبيين.

وفي الدر المختار (۲۹۹/۱): فلو ولدته من سرتها، إن سال الدم من الرحم فنفساء، وإلا فذات جرح، وإن ثبت له أحكام الولد.... وحكمه، كالحيض في كل شيء إلا في سبعة ذكرتها في الخزائن.

وفي اللجنة الدائمة (۴۱۹/۵): سؤال: بعض النسوة تعسر عليهن الولادة فيضطر إلى توليدهن بطريقة العملية الجراحية، وربما يحصل من جراء ذلك خروج الولد عن طريق غير الفرج، فما حكم أمثال هؤلاء النسوة في الشرع من ناحية دم النفاس؟ وما حكم غسلهن شرعاً؟

جواب: حكمها حكم النفساء، إن رأت دماً جلست حتى تطهر، وإن لم تر دماً فإنها تصوم وتصلي كسائر الطاهرات.

(۲۲۱) معتادہ کا خون نفاس میں عادت سے تجاوز کر جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کی عادت ہو کہ اس کو نفاس کا خون پانچ دن

آتا ہے لیکن اب اس کو تیس دن تک خون جاری رہا تو کیا یہ سارا خون نفاس کا شمار ہوگا یا پانچ دن نفاس کا شمار ہوگا اور باقی استحاضہ کا خون سمجھا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر عورت معتادہ (جس کی عادت مقرر) ہو اس کا خون عادت (مثلاً پانچ دن) سے تجاوز کر کے چالیس دن کے اندر (مثلاً تیس دن پر) بند ہو جائے تو وہ نفاس کا خون شمار ہوگا اور سمجھا جائے گا کہ اس کی عادت بدل گئی ہے پہلے پانچ دن تھی اور اب تیس دن ہوگئی ہے۔ اور اگر چالیس دن سے بھی تجاوز کر جائے تو اس کی عادت برقرار رہے گی اور اس کی عادت کے بعد جو خون آئے گا وہ استحاضہ کا شمار ہوگا۔ یعنی پہلے پانچ دن صرف نفاس اور باقی دن استحاضہ کے ہوں گے۔

وفی التاتارخانیۃ (۱/۳۹۱): ولو کانت المرأۃ لها عادۃ معروفۃ فی النفاس وهی التی ولدت غیر مرۃ فکلما رأت من الدم ولم یجاوز الاربعین فذلک کله نفاس بالاجماع.

وفی الهندیۃ (۱/۳۰): وکذا النفاس فان رأت لاعلی العادۃ ولم یجاوز الاربعین انتقلت. هکذا فی المحیط.

وفی الشامیۃ (۱/۳۰۱): فان جاوز الدم الاربعین فالعادۃ باقیۃ ترد الیها والباقی استحاضۃ وان لم یجاوز انتقلت العادۃ الی ما رأته والکل نفاس.

(۲۲۲) جس عورت کے چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوئے اس کے نفاس کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ہ خاتون کے پیٹ میں دو بچے تھے اس نے ایک کو جنم دیا ہے دوسرا پیٹ میں موجود ہے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک ماہ بعد پیدا ہوگا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا نفاس کب سے سمجھا جائے گا؟ اگر پہلے بچے سے شروع ہے تو دوسرے بچے کے بعد آنے والا خون نفاس ہوگا یا استحاضہ؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کسی عورت کو چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوں تو شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عورت کا نفاس پہلے بچے کے پیدا ہونے کے بعد شمار ہوگا۔ یہی قول راجح ہے پس اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے اندر مثلاً تیس دن بعد ہوا تو اس کے بعد دس دن تک نفاس کے شمار ہوں گے تاکہ نفاس کی مدت چالیس دن پوری ہو جائے اور اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد آنے والا خون استحاضہ کا ہوگا۔ لہٰذا زیدہ خاتون کا نفاس پہلے بچے سے شروع ہو گیا ہے اگر دوسرا بچہ ایک ماہ بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد دس دن نفاس کے شمار ہوں گے اور اس کے بعد والا خون استحاضہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

لما فی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۵۴): قوله من الاول لانه بالولد الاول ظهر انفتاح الرحم فکان المرئی عقبه نفاساً وهو المعتمد وافاد المصنف ان مارأته عقب الثانی ان کان قبل الاربعین فهو نفاس للاول لتمامها واستحاضۃ بعد تمامها فتغتسل وتصلی کما وضعت الثانی وهو الصحیح کذا فی البحر.

وفي الدر المختار مع شرحه (۱/ ۳۰۱): (والنفاس لام توأمين من الاول) هما ولدان بينهما دون نصف حول وكذا الثلاثة ولو بين الاول والثالث اكثر منه في الاصح (و) انقضاء (العدة من الاخير وفاقاً) لتعلقه بالفراغ۔

وفي الشامية تحته: قوله من الاول والمرئي عقيب الثاني ان كان في الاربعين فمن نفاس الاول والا فاستحاضة وقيل اذا كان بينهما اربعون يجب عليها نفاس من الثاني والصحيح هو الاول هداية وبحر ثم ما ذكره المصنف قولهما وعند محمد وزفر النفاس من الثاني قوله لتعلقه بالفراغ: اي لتعلق انقضاء العدة بفراغ الرحم وهو لا يفرغ الا بخروج كل ما فيه۔

(۲۲۳) نفاس کے بعد کب تک نماز معاف ہے؟

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد جو خون آتا ہے اس میں کتنے دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے؟ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ چالیس دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کیا یہ بات ٹھیک ہے؟ نیز اگر خون چالیس دن کے بعد بھی بند نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ صورت مسئولہ میں اگر خون چالیس دن تک بند نہ ہو تو چالیس دن تک نماز کی ادائیگی معاف ہے اور اگر چالیس دن سے پہلے بند ہو جائے تو اسی دن سے نماز پڑھنی لازم ہو جاتی ہے چالیس دن کا انتظار نہیں کیا جائے گا، مثلاً پندرہ دن کے بعد ظہر کی ابتداء میں خون بند ہو گیا تو ظہر کے آخر وقت تک انتظار کریں اگر خون نہ آئے تو غسل کر کے نماز پڑھنی واجب ہوگی۔ اور اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہے تو اس میں دو صورتیں ہیں، اول اس عورت کی پہلے سے کوئی عادت ہے یا نہیں اگر پہلے سے کوئی عادت ہے تو وہی نفاس ہوگا باقی استحاضہ (استحاضہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ خون کسی بیماری کی وجہ سے ہے، اس حالت کے سارے احکام ایسے ہوں گے جیسے پاکی کے ہوتے ہیں) شمار ہوگا، اور اگر پہلے سے کوئی عادت نہیں ہے تو چالیس روز تک نفاس ہوگا باقی استحاضہ شمار ہوگا۔

لما في الدر المختار (۱/ ۳۰۰، ۳۰۱): (واكثره اربعون يوما) ۔۔۔۔ (والزائد) على اكثره (استحاضة) لو مبتدأة اما المعتادة فترد لعادتها وكذا الحيض فان انقطع على اكثرهما او قبله فالكل نفاس۔

(۲۲۴) حیض ونفاس سے پاکی کب شمار ہوتی ہے؟

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیض ونفاس سے عورتیں کب پاک ہوتی ہیں وہ کب سے نماز روزہ اور حقوق زوجیت کے قابل ہوتی ہیں؟ خاص طور پر وہ عورتیں جن کے ہاں بچے کی ولادت ہوتی ہے، وہ کب سے نماز روزہ شروع کریں گی؟ عام رواج کے اعتبار سے چالیس دن تک ایسی عورتیں ناپاک شمار ہوتی ہیں۔ نیز ان ایام کے روزے اور نمازیں

قضا ہوں گی یا معاف ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں حیض کا حکم یہ ہے کہ جب عورت کی ماہواری رک جائے، یا دس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جاتی ہے اور اس پر نماز وروزہ کی ادائیگی فرض ہو جاتی ہے۔ اور حقوق زوجیت کے حلال ہونے کیلئے دیکھا جائے گا کہ اگر ماہواری دس دن سے پہلے ختم ہوئی تھی تو عورت غسل کرلے یا ایک نماز کا وقت گزر جائے، اور اگر ماہواری دس دن تک رہے تو خون کے بند ہوتے ہی حقوق زوجیت ادا کر سکتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کر لیا جائے۔

اور نفاس کا حکم یہ ہے کہ جب اس کا خون عادت پر بند ہو جائے، یا چالیس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جائے گی اس پر تمام حقوق وفرائض لازم ہوں گے، یاد رہے کہ نفاس میں چالیس دن پورے کرنا لازم نہیں بلکہ اگر چالیس دن سے پہلے خون بند ہو جائے تو بھی اسی دن سے وہ پاک ہو جائے گی اس پر فرائض کی ادائیگی لازم ہوگی، ہاں اگر چالیس دن یا چالیس دن کے بعد بھی جاری ہو تو پھر چالیس دن کے بعد سے فرائض کی ادائیگی لازم ہوگی، ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ نفاس سے پاکی چالیس دن کے بعد ہوتی ہے چاہے خون پہلے ہی کیوں نہ بند ہو جائے یہ صحیح نہیں ہے۔

اور نفاس کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی کیلئے دیکھا جائے گا کہ نفاس کا خون اس کی عادت کے موافق اور چالیس دنوں سے پہلے بند ہوا ہے یعنی عام طور پر جتنے دنوں میں خون بند ہوتا ہے اتنے ہی دنوں میں بند ہوا ہے تو غسل کے بعد یا ایک نماز کا وقت گزر جانے کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہوگی، اور اگر اس کی عادت سے پہلے خون بند ہو جائے تو جب تک عادت کے دن پورے نہ ہو جائیں اس وقت تک حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح نہیں، اور اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بند ہوا ہے تو پھر بغیر غسل کے حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہے البتہ غسل کر لینا بہتر ہے۔

وفي الهندية (۱/۳۸): (منها) ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضي هكذا في الكفاية (ومنها) ان يحرم عليهما الصوم فتقضيانه هكذا في الكفاية.

وفي الدر المختار (۱/۲۹۴،۲۹۵): (ويحل وطؤها اذا انقطع حيضها لاكثره) بلا غسل وجوباً بل ندباً (وان) انقطع لدون اقله تتوضأ وتصلي في آخر الوقت وان (لاقله) فان لدون عادتها لم يحل، وتغتسل وتصلي وتصوم احتياطاً وان لعادتها فان كتابية حل في الحال والا (لا) يحل (حتى تغتسل) (او يمضي عليها زمن يسع الغسل) ولبس الثياب (والتحريمة) يعني من آخر وقت الصلاة وفي الشامية (ص۲۹۴): (اذا انقطع حيضها لاكثره) مثله النفاس.

(۲۲۵) مستحاضہ کے کپڑوں اور بدن کی پاکی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ماہواری کے ایام عادت ہیں جو (۹) تاریخ سے

شروع ہو کر سولہ (۱۶) تاریخ تک رہتے ہیں۔ اب میرے ساتھ یہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ عام ایام میں بھی آگے کے راستے سے پانی کی طرح ایک رطوبت بہتی رہتی ہے، اس رطوبت کا کیا حکم ہوگا؟ اگر یہ کپڑے یا جسم پر لگ جائے تو اس کو دھونا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ہر وہ عورت جس کو ایام مخصوصہ کے علاوہ بھی جریان اور سیلان الدم اور رطوبت کا سلسلہ لاحق ہو، وہ عورت مستحاضہ کہلاتی ہے اور مستحاضہ معذور کے حکم میں ہوتی ہے اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے وضو کرے گا اور جب نماز کا وقت نکل جائے تو خروج وقت سے خود بخود اس کا وضو ٹوٹ جائے گا البتہ اس کے بدن اور کپڑوں کی طہارت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ زخم اس طرح ہے کہ اگر اس کی نجاست کو دھویا جائے تو پوری نماز طہارت کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہو تو اس صورت میں اس خون اور رطوبت کو دھونا ضروری ہے اور اگر پوری نماز طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جا سکتی ہو (یعنی دوران نماز دوبارہ وہ خون وغیرہ کپڑوں اور بدن کو لگے گا) تو اس صورت میں اس نجاست کو دھونا ضروری نہیں لہذا آپ مستحاضہ ہیں اور نماز آپ کے اوپر فرض ہے البتہ بہنے والی رطوبت کو کسی روئی یا کپڑے کے ذریعے روک دیں تاکہ دوران نماز آپ کے بدن اور کپڑے پاک رہیں اور اگر مذکورہ تدبیر کے باوجود بھی رطوبت کپڑوں یا بدن کو لگ جائے تو پھر اس کا دھونا ضروری نہیں۔

لما فی فتاوی الولوالجیۃ (۱/۲۳): کل ما یخرج من بدن الحیوان (الانسان) فھو نجس،

وفی الشامیۃ (۱/۳۹۸): بان رطوبۃ الفرج نجسۃ

وفیہ (مجمع الانہر (۱/۳۰۵)): (وحکمہ الوضوء) لاغسل ثوبہ ونحوہ (لکل فرض) اللام للوقت (الی ان قال) (وان سال علی ثوبہ) فوق الدرھم (جاز لہ ان لا یغسلہ ان کان لو غسلہ تنجس قبل الفراغ منھا) ای الصلاۃ (والا) یتنجس قبل فراغہ (فلا) یجوز ترک غسلہ، ھو المختار للفتوی، (قولہ وحکمہ) ای العذر، او صاحبہ (قولہ الوضوء) ای مع القدرۃ علیہ والا فالتیمم (قولہ لاغسل ثوبہ) ای ان لم یفسد کما یاتی متناً (قولہ ونحوہ) کالبدن والمکان ط (الی ان قال) (قولہ ھو المختار للفتوی) وقیل لا یجب غسلہ اصلاً، وقیل ان کان مفیداً بان لا یصیبہ مرۃ اخری یجب، وان کان یصیبہ المرۃ بعد الاخری فلا واختارہ السرخسی بحر

قلت بل فی البدائع انہ اختیار مشائخنا وھو الصحیح اھ فان لم یمکن التوفیق بحملہ علی مافی المتن فھو اوسع علی المعذورین ویؤید التوفیق مافی الحلیۃ عن الزاھدی عن البقالی لو علمت المستحاضۃ انھا لو غسلتہ یبقی طاھراً الی ان تصلی یجب بالاجماع وان علمت انہ یعود نجساً غسلتہ عند ابی یوسف دون محمد۔ (الی ان قال) لکن ھذا قول ابن مقاتل الرازی فانہ یقول یجب غسلہ فی وقت کل صلاۃ قیاساً علی الوضوء۔

﴿فصل فی المسح الخفین والجبیرۃ﴾

(موزوں اور پٹی وغیرہ پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۲۶) موزے پہننے کی حالت میں دونوں پیروں میں سے ہر ایک پر کم از کم مسح کی مقدار کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے۔ کیا اس طرح مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مسح علی الخفین میں ہر پیر پر کم از کم تین انگلیوں کے بقدر مسح کرنا ضروری ہے اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پیر پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس کا مسح درست نہ ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۳۳): ولو مسح على رجل قدر اصبعين وعلى أخرى قدر خمسة لم يجز.

وفي الدر المختار (۱/۲۷۲): (وفرضه) عملاً (قدر ثلاث اصابع (اليد) اصغرها طولاً وعرضاً من كل رجل.

وفي الشامية تحته: (قوله من كل رجل) أي فرضه هذا القدر كائنا من كل رجل على حدة قال في البحر حتى لو مسح على احدى رجليه مقدار اصبعين وعلى الاخرى مقدار خمس اصابع لم يجز.

(۲۲۷) عذر شرعی کی صورت میں موزوں پر مسح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں ایک سال کیلئے نکلا ہوں۔ ہماری جماعت میں ایک بوڑھا شخص ہے جس کی ہر وقت ہوا خارج ہوتی رہتی ہے اور وہ موزوں پر مسح کرنا چاہتا ہے مگر مسح کرنے کیلئے شرط یہ ہے کہ وضو کی حالت میں پہنے ہوئے ہوں لیکن یہ شخص اس شرط کو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ چند منٹ کے بعد ہوا خارج ہوتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ شخص ایسی حالت میں موزوں پر مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورت واقعہ یہ بوڑھا شخص نمازوں کے اوقات کے اندر تو موزوں پر مسح کر سکتا ہے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کر سکتا۔ مثلاً ظہر کی نماز کیلئے وضو کر کے موزے پہن لئے، اب ظہر کے وقت کے اندر اس کو حدث (اس حدث کے علاوہ جس میں یہ مبتلا ہے) لاحق ہوتا ہے تو یہ شخص وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کر سکتا ہے ظہر کے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کر سکتا چنانچہ عصر کی نماز کیلئے وضو

کرتے وقت پاؤں دھوئے گا۔

لما في الهندية (۱/۳۳): المعذور إذا كان عذره غير موجود وقت الوضوء ولبس الخفين يجوز له المسح إلى المدة كالأصحاء بخلاف ما إذا وجد العذر مقارنا للوضوء وللبس أحدهما يجوز المسح في الوقت لا خارجه هكذا في البحر الرائق.

وفي الشامية (۱/۲۷۱): ثم انه لا يخلو إما أن يكون العذر منقطعاً وقت الوضوء واللبس معاً أو موجوداً فيهما، أو منقطعاً وقت الوضوء موجوداً وقت اللبس أو بالعكس فهي رباعية، ففي الأول حكمه كالأصحاء لوجود اللبس على طهارة كاملة تمنع سراية الحدث للقدمين، وفي الثلاثة الباقية يمسح في الوقت فقط، فإذا خرج نزع وغسل كما في البحر.

(۲۲۸) جوتوں اور نائیلون کے موزوں پر مسح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل موزہ زیادہ تر نائیلون کا ہوتا ہے کیا اس پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ کیا جوتے کے اوپر سے بھی مسح ہو سکتا ہے اگر اجازت ہے تو کن شرائط کے ساتھ؟

الجواب حامداً ومصلیاً: شریعت مطہرہ میں جن موزوں پر مسح کرنا جائز ہے ان میں مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ٹخنوں سمیت پاؤں کو ڈھانپنے والے ہوں۔ ان میں مسلسل چلا جا سکے۔ بغیر رکاوٹ کے پاؤں پر ٹکے رہیں۔ اور ان میں سے پاؤں تک پانی نہ پہنچے۔ لہذا مروجہ نائیلون کے موزوں پر ان شرائط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے مسح درست نہیں۔ نیز جوتوں میں بھی اگر یہ شرائط پائی جائیں تو ان پر بھی مسح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

لما في المحيط البرهاني (۱/۳۴۳): وأما المسح على الجوارب فلا يخلو: إما إن كان الجوارب رقيقا غير منعل، وفي هذا الوجه لا يجوز المسح بلا خلاف، وإما إن كان ثخينا منعلاً ففي هذا الوجه يجوز المسح بلا خلاف، لأنه يمكن قطع السفر، وتتابع المشي عليه، فكان بمعنى الخف. والمراد من الثخين: أن يستمسك على الساق من غير أن يشد بشيء، ولا يسقط، فأما إذا كان لا يستمسك ويسترخي، فهذا ليس بثخين، ولا يجوز المسح عليه.

وفي الشامية (۱/۲۶۱): (قوله شرط مسحه) أي مسح الخف المفهوم من الخفين، وأل فيه للجنس الصادق بالواحد والاثنين، ولم يقل مسحهما لأنه قد يكون واحد الذي رجل واحدة (قوله ثلاثة أمور إلخ) زاد الشرنبلالي: لبسهما على طهارة، وخلو كل منهما عن الخرق المانع، واستمساكهما على الرجلين من غير شد، ومنعهما وصول الماء إلى الرجل، وأن يبقى من القدم قدر ثلاثة أصابع.

(۲۲۹) کون سی جراب پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل بازار میں بہت موٹی جرابیں ہیں جن میں نفوذ بالکل بھی نہیں ہوتی تو کیا ہم ان جرابوں پر مسح کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر جرابیں ایسی ہوں کہ بغیر کسی چیز کے سہارے کے پنڈلی پر ٹھہری رہتی ہیں اور ان کو پہن کر لگاتار چلا جا سکتا ہو، خواہ وہ اتنی موٹی ہوں کہ پانی قدم تک نہ پہنچتا ہو تو ان جرابوں پر مسح کرنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لما فی الهندیة (۱/۳۲): ویمسح علی الجورب المجلد وهو الذی وضع الجلد علی اعلاه واسفله هكذا فی الكافی والمنعل وهو الذی وضع الجلد علی اسفله كالنعل للقدم هكذا فی السراج الوهاج. والثخین الذی لیس مجلدا ولا منعلا بشرط ان یستمسک علی الساق بلا ربط ولا یری ما تحته وعلیه الفتوی كذا فی النهر الفائق.

وفی الشامیة (۱/۲۶۹): (قوله علی الثخینین) ای اللذین لیسا مجلدین ولا منعلین نهر وهذا القید مستفاد من عطف ما بعده علیه وبه یعلم أنه نعت للجوربین فقط كما هو صریح عبارة الكنز (قوله بحیث یمشی فرسخا) ای فاكثر كما مر وفاعل یمشی ضمیر یعود علی الجورب والاسناد الیه مجازی ...... (قوله بنفسه) ای من غیر شد (قوله ولا یشف) من شف الثوب رق ..... (قوله الا ان ینفذ) ای من البلل.

(۲۳۰) گرم موسم میں موزوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موزوں پر مسح کرنا پہلے زمانے میں سخت حالات کی وجہ سے جائز تھا کہ سردی کے موسم میں گرم پانی نہیں ملتا تھا، خیمہ وغیرہ لیکن آجکل یہ مشکلات ختم ہوگئی ہیں تو کیا آجکل بھی موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟ نیز اگر کوئی شخص کسی بیماری یا کسی اور وجہ سے گرم موسم میں بھی موزے استعمال کرے تو کیا اس وقت بھی اس کے لیے مسح کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قیامت تک کیلئے ضابطہ حیات بنا کر بھیجا ہے لہٰذا احکامات بھی ایسے نازل کیے جو قیامت تک کیلئے قابل فہم اور قابل عمل ہوں صرف اس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر احکامات نازل نہیں کیے گو تھوڑے بہت ایسے احکامات نازل بھی ہوئے اور بعد میں منسوخ کر دیے گئے اسی طرح مسح بھی انہی احکامات میں سے ہے جن کی مشروعیت قیامت تک کیلئے ہے لہٰذا موزوں پر مسح نہ صرف اس زمانے میں جائز تھا بلکہ اس کا جواز آج بھی باقی ہے۔ نیز موزوں پر مسح کرنا مطلقاً جائز ہے چاہے سردی

کا موسم ہو یا گرمی کا، چاہے بیماری کی حالت میں ہو یا عام صحت کی حالت میں۔

لما فی الصحیح للبخاری (۱/۳۳)، عن عروۃ بن المغیرۃ عن ابیہ المغیرۃ بن شعبۃ (رضی اللہ عنہ) عن رسول اللہ ﷺ انہ خرج لحاجتہ فاتبعہ المغیرۃ باداوۃ فیہا ماء فصب علیہ حین فرغ من حاجتہ فتوضأ ومسح علی الخفین.

وفی الھندیۃ (۱/۳۲): المسح علی الخفین رخصۃ ولو اتی بالعزیمۃ بعد ما رای جواز المسح کان اولیٰ.

(۲۳۱) تیمم کی حالت میں پہنے گئے موزوں پر مسح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے تیمم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں جب وہ وضو کرے تو کیا ان موزوں پر مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... جس نے تیمم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں پانی مل جائے اور پانی کے استعمال پر قدرت بھی ہو تو اس کیلئے وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں بلکہ پاؤں دھونا ضروری ہے۔

لما فی الخانیۃ علی الھندیۃ (۱/۵۰): المحدث اذا تیمم عند عدم الماء ولبس الخف ثم وجد ماء فانہ ینزع خفیہ ویغسل رجلیہ لان المتیمم عند وجود الماء یصیر محدثا بالحدث السابق.

وفی الدر المختار (۱/۲۶۰): (ملبوسین علی طہر) فلو أحدث ومسح بخفیہ أو لم یمسح فلبس موقہ لایمسح علیہ (تام) خرج الناقص حقیقۃ کلمعۃ أو معنی کتیمم ومعذور.

وفی الشامیۃ تحت: (قولہ کتیمم) ای أن اللبس لو کان بعد التیمم فوجد بعدہ الماء لایجوز المسح علی الخف بل یجب الغسل.

(۲۳۲) پھٹے ہوئے موزوں اور موٹی جرابوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال: ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس موزے ہیں جو کچھ پھٹے ہوئے ہیں میں ان پر مسح کر سکتا ہوں یا نہیں؟ نیز آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر موزے پاؤں کی تین چھوٹی انگلیوں کے بقدر پھٹے ہوں تو ایسی صورت میں ان پر مسح کرنا جائز نہیں۔ اگر اس سے کم پھٹے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

نیز یاد رہے کہ یہ مقدار ایک موزے کے اعتبار سے ہے یعنی اگر ایک موزہ اتنی مقدار میں پھٹا ہوا ہو تو مسح جائز نہیں ورنہ ان پر مسح کرنا

جاتا ہے۔

آج کل جو سوتی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز نہیں اس لئے کہ ان میں پانی سرایت کر جاتا ہے۔

كما في التاتارخانية (١/٢٧١): وإذا كان في الخف خرق فإن كان يسيرا لا يمنع جواز المسح، وإن كان كثيرا يمنع. والحد الفاصل بين اليسير والكثير أن الخرق إذا كان قدر إصبع أو إصبعين فهو يسير وإن كان قدر ثلاث أصابع فهو كثير ...... ثم على روايات الزيادات اعتبر ثلاث أصابع من أصغر أصابع الرجل وفي الهداية هو الصحيح (في ص٢٧٢) ويجمع الخروق في خف واحد ولا يجمع في خفين.

وفي الشامية (١/٢٦٩): (قوله أو جوربيه) الجورب لفافة الرجل (قوله ولو من غزل أو شعر) دخل فيه الجوخ كما حققه في شرح المنية وقال وخرج عنه ما كان من كرباس بالكسر وهو الثوب من القطن الأبيض ويلحق بالكرباس كل ما كان من نوع المخيط كالكتان والإبريسم ونحوهما وتوقف ح في وجه عدم جواز المسح عليه إذا وجد فيه الشروط الأربعة التي ذكرها الشارح يدل عليه ما في كافي النسفي حيث علل عدم جواز المسح على الجورب من كرباس بأنه لا يمكن تتابع المشي عليه فإنه يفيد أنه لو أمكن جاز ويدل عليه أيضا ما في ط عن الخانية أن كل ما كان في معنى الخف في إدمان المشي عليه وقطع السفر به ولو من لبد رومي يجوز المسح عليه (قوله على الثخينين) أي اللذين ليسا مجلدين ولا منعلين (قوله بنفسه) أي من غير شد (قوله ولا يشف) بتشديد الفاء من شف الثوب رق (قوله إلا أن ينفذ) أي من البلل (وفي ص٢٧٠) وأما الثخين فهو قولهما وعنه أنه رجع إليه وعليها الفتوى.

وفيه أيضا (ص٢٧٣): (وتجمع الخروق) (قوله لا فيهما) أي لو كان في كل واحد من الخفين خروق غير مانعة لكن إذا جمعت تكون مثل القدر المانع لا تمنع فيصح المسح.

(۲۳۳) موزوں میں پانی چلے جانے سے مسح ٹوٹنے اور تھوڑی پھٹن سے مسح نہ ٹوٹنے میں فرق

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو تو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے اور علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ جن موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم یا دو انگلیوں کی مقدار کے برابر پھٹن ہو تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے اور اسی طرح اگر کم مقدار میں موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس میں بھی مسح نہیں ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں صورتوں میں پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی روشنی میں ان دونوں کے مابین فرق

واضح فرمایئے کہ موزے کے اندر پانی کے داخل ہونے سے مسح ٹوٹتا ہے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو۔ اور موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو یا موزے کی کم مقدار پاؤں سے نکل جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے حالانکہ ان صورتوں میں بھی پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے چاہے کم ہو یا زیادہ۔ لہٰذا واضح فرمایئے۔

الجواب حامداً ومصلياً صورت مسئولہ میں جو مسئلہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں تو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے یہ بات آپ کی درست نہیں ہے کیونکہ اکثر فقہاء کرام نے اس بات کو صراحتاً ذکر فرمایا ہے کہ اگر موزے میں پانی تین انگلیوں کی مقدار یا اس سے کم مقدار میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا۔ جیسا کہ اگر موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا اور اسی طرح اگر اکثر قدم سے کم موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس سے بھی مسح نہیں ٹوٹتا۔ یعنی دونوں صورتوں میں کم مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے البتہ تیسری صورت میں قدم کے اکثر حصے سے کم کا اعتبار کیا گیا ہے یعنی اگر موزہ پاؤں کے اکثر حصے سے کم مقدار میں نکلتا ہے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔ اب اگر موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہے یا موزہ پاؤں سے کم مقدار میں نکل گیا تو اس میں اگر پانی چلا جائے تو کم مقدار میں ہی جائے گا جو کہ ناقض مسح نہیں ہے۔ بلکہ بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تک اتنا پانی موزے میں نہ چلا جائے کہ اس سے ایک پاؤں کا اکثر حصہ تر نہ ہو جائے تب تک مسح نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا تین انگلیوں سے کم مقدار کی پھٹن اور کم مقدار میں موزے کا پاؤں سے نکلنے کی صورت میں اگرچہ پانی کے جانے کا امکان ہے لیکن وہ کم مقدار میں ہی جانے کا امکان ہے اور کم مقدار میں اگر پانی موزوں میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔

لما في الشامية(۱/۲۷۲): فلو اصاب موضع المسح ماء او مطر قدر ثلاث اصابع جاز، وكذا لو مشى في حشيش مبتل بالمطر وكذا بالطل في الاصح

وفيه ايضاً(۱/۲۷۳): (قوله وهو قدر ثلاث اصابع) يعني طولاً وعرضاً، فلو سقطت جلدة مقدار ثلاث اصابع وعرضها كذا في حاشية يعقوب باشا على صدر الشريعة فليحفظ

(قوله اصابع القدم الاصاغر) صححه في الهداية وغيرها واعتبر الاصاغر للاحتياط . (قوله بكمالها) هو الصحيح خلافاً لما رجحه السرخسي من المنع بظهور الانامل وحدها. شرح المنية. والانامل رؤوس الاصابع، وهو صادق بما اذا كانت الاصابع تخرج منه بتمامها لكن لا يبلغ هو قدرها طولاً وعرضاً (قوله اعتبر الثلاث) اي التي وقعت في مقابلة الخرق لأن كل اصبع اصل في موضعها فلا تعتبر بغيرها، حتى لو انكشف الابهام مع جارتها وهما قدر ثلاث اصابع من اصغرها يجوز المسح وان كان مع جارتيها لا يجوز

وفي الشامية(۱/۲۷۶): (وخروج اكثر قدميه) من الخف الشرعي (قوله وكذا اخراجه) تصريح بما فهم من الخروج بالاولى، لأن في الاخراج خروجاً مع زيادة وهي القصد (قوله في الاصح)

صححه في الهداية وغيرها، وبه جزم في الكنز والملتقى.

(۲۳۴) کیا عورتوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مردوں کیلئے تو موزوں پر مسح کرنا جائز ہے لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ کیونکہ اسلام آباد اور مری میں رہتے ہیں جہاں کبھی برف باری بھی ہو جاتی ہے اور وہاں آج کل سخت سردی ہے، اگر میری امی موزے پہن لے تو اس کیلئے موزوں پر مسح جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے لئے اسلام آباد اور مری کی سردی برداشت کرنا کافی مشکل ہے۔ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری اس مشکل کا حل فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً: جس طرح مردوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح عورتوں کیلئے بھی جائز ہے لہذا آپ کی والدہ موزوں پر مسح کر سکتی ہیں۔

لما في الهندية (۱/۳۴): المرأة في المسح على الخفين بمنزلة الرجل لاستوائهما في المعنى المجوز للمسح.

(۲۳۵) موزوں پر برائے تعلیم مسح کرنے سے مسح کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا، بوقت مسح اس شخص کی نیت موزوں پر مسح کی تعلیم دینا مقصود تھی نہ کہ طہارت حاصل کرنا، آیا اس طرح مسح علی الخفین درست ہوگیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً: صورت مسئولہ میں جب وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا اور نیت تعلیم کی تھی نہ کہ طہارت کی تب بھی مسح درست ہوگیا۔

لما في الهندية (۱/۳۴): فلو توضأ ومسح على الخفين ونوى التعليم دون الطهارة يصح الخ.

وفي الخلاصة الفتاوى (۱/۲۸): ولو توضأ ومسح على الخف ونوى به التعليم دون الطهارة يصح بناء على مسئلة النية في الوضوء اهـ.

(۲۳۶) زخم کی پٹی پر مسح کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جسم کا کوئی حصہ زخمی ہو جائے تو اس پر باندھی جانے والی پٹی عام طور پر زخم سے زائد ہوتی ہے، کیا اس زائد پٹی پر مسح کرنا صحیح ہے یا پھر پٹی کھول کر زخمی حصہ پر مسح کرنا اور باقی حصہ کو دھونا ضروری ہے؟ نیز یہ مسح غسل کی ضرورت کے وقت بھی کافی ہوگا یا غسل میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

﴿فصل في المسائل الجديدة والمتفرقة المتعلقة بالطهارة﴾

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

(۲۳۸) بیت الخلاء میں ایسی چیز لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں ایسی چیز ساتھ لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بیت الخلاء جاتے وقت حکم یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کا نام ہو یا کوئی قرآنی آیت وغیرہ لکھی ہوئی ہو تو اس کو باہر رکھ کر اندر داخل ہونا چاہئے اور ایسی کوئی چیز کسی کپڑے وغیرہ میں لپٹی ہوئی ہو تو اس کے اندر لے جانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر کوئی ایسی چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا کسی نبی کا یا قرآنی آیت یا اور کوئی معظم نام جیسے احمد، محمد وغیرہ لکھا ہوا ہو کسی چیز وغیرہ میں لپٹی ہوئی نہ ہو بلکہ ظاہر ہو تو اس کو بیت الخلاء میں ساتھ اندر لے جانا مکروہ ہے۔

في الهندية (۱/۵۰): ويكره أن يدخل في الخلاء ومعه خاتم عليه اسم الله تعالى أو شيء من القرآن.

وفي رد المحتار (۱/۳۴۴) وتحته: إذا أراد أن يدخل الخلاء ينبغي أن يقوم قبل أن يغلبه الخارج ولا يصحبه شيء عليه اسم معظم ولا حاسر الرأس.

(۲۳۹) قضائے حاجت کے وقت دعاء (تعوذ) کا محل

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے جو تعوذ پڑھا جاتا ہے کیا وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھا جاتا ہے یا بیت الخلاء میں داخل ہونے کے بعد پڑھا جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بیت الخلاء میں جاتے وقت جو دعا (تعوذ) پڑھی جاتی ہے وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھنی چاہئے اور اگر کھلے میدان میں قضائے حاجت کر رہا ہے تو ستر (شرمگاہ) کھولنے سے پہلے دعا پڑھے اور بھول جانے کی صورت میں صرف دل میں پڑھے زبان سے نہ پڑھے۔

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح (ص ۳۰): (قبل دخوله) الأولى التفصيل وهو إن كان المكان معدا لذلك يقول قبل الدخول وإن كان غير معد كالصحراء ففي أوان الشروع كتشمير

ایک درہم ۱۴ قیراط

ایک قیراط ۵ جو (۰٫۲۱۸۷ ملی گرام)

(ایک درہم) چودہ قیراط ۳٫۰۶۱۸ گرام

۲۶۰ درہم × ۳٫۰۶۱۸ = ۷۹۶٫۰۶۸ گرام ایک مد کا وزن

(تولہ)

ایک درہم چودہ قیراط

ایک قیراط ۱٫۸ رتی

۱٫۸ رتی × ۱۴ قیراط = ۲۵٫۲ رتی

۲۵٫۲ × ۲۶۰ (درہم) = ۶۵۵۲ رتی (ایک مد)

ایک ماشہ ۸ رتی

(رتی) ۶۵۵۲ ÷ ۸ = ۸۱۹ (ماشہ)

ایک تولہ ۱۲ ماشہ

(ماشہ) ۸۱۹ ÷ ۱۲ = ۶۸٫۲۵ تولہ ایک مد کی

ایک مد	۲ رطل	۸۱۹ ماشہ	۶۵۵۲ رتی	۶۸٫۲۵ تولہ	۷۹۶٫۰۶۸ گرام

تکملہ فتح الملہم (۳/۱۵۳): ان المدّین الحجازی والعراقی وکذا الصاعین کانا مستعملین فی عہد النبی ﷺ الا ان الشائع الغالب فی الاستعمال فی عہدہ ﷺ کان العراقی من الامداد وہو رطلان.

وفی عمدۃ القاری (۳/۹۳): والمد اختلفوا فیہ ... وقیل ہو رطلان وبہ یقول ابو حنیفۃ وفقہاء العراق

وفی الشامیۃ (۲/۳۶۵): اعلم ان الصاع اربعۃ امداد والمد رطلان والرطل نصف من والمن بالدراہم مائتان وستون درہماً وبالاستار اربعون والاستار بکسر الہمزۃ بالدراہم ستۃ ونصف بالمثاقیل اربعۃ ونصف ... فالمد والمن سواء کل منہما ربع صاع مائۃ وثلاثون درہماً وفی الزیلعی والفتح اختلف فی الصاع فقال الطرفان ثمانیۃ ارطال بالعراقی وقال الثانی خمسۃ ارطال وثلث قیل لا خلاف لان الثانی قدرہ برطل المدینۃ لانہ ثلاثون استاراً والعراقی عشرون واذا قابلت ثمانیۃ بالعراقی بخمسۃ وثلث بالمدنی وجدتہما سواء وہذا ہو الاشبہ

ثم اعلم ان الدرہم الشرعی اربعۃ عشر قیراطاً.

کتاب الصلوٰۃ

(نماز کا بیان)

(النساء: ۱۰۳) ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتاً

(ترجمہ) "بیشک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔"

مذکورہ دونوں آیت کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر اجمالاً دلالت کرتی ہیں۔ (طبری ۱۹۹/۱)

(الروم: ۱۷) فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون

(ترجمہ) "سو تم اللہ کی تسبیح کیا کرو شام کے وقت اور صبح کے وقت۔"

مذکورہ آیت کریمہ فسبحان اللہ حین تمسون سے مغرب کی نماز اور وحین تصبحون سے فجر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ (تفسیر طبری ۲۱/۹)

(الروم: ۱۸) ولہ الحمد فی السموات والارض وعشیا وحین تظہرون

(ترجمہ) "تمام آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور بعد زوال اور ظہر کے وقت"۔ مذکورہ آیت کریمہ میں وعشیا سے عصر کی نماز وحین تظہرون سے ظہر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ (تفسیر طبری ۲۱/۹)

(الاسراء: ۷۸) اقم الصلاۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقران الفجر

(ترجمہ) "آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے اور صبح کی نماز بھی۔

مذکورہ آیت کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر تفصیلاً دلالت کرتی ہے۔

لما فی البدائع الصنائع (۱/۳۵۵): اما فرضیتھا فثابتۃ بالکتاب، والسنۃ، والاجماع، والمعقول، اما الکتاب فقولہ تعالیٰ فی غیر موضع من القرآن "اقیموا الصلاۃ" وقولہ "ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا ـــــــ" وقولہ تعالیٰ "حافظو علی الصلوات والصلاۃ الوسطی"۔

ومطلق اسم الصلاۃ ینصرف الی الصلوات المعہودۃ وھی التی تؤدی فی کل یوم و لیلۃ (وقولہ تعالیٰ اقم الصلوۃ طرفی النہار الایۃ یجمع الصلوات الخمس لان صلاۃ الفجر تؤدی فی احد طرفی النہار، وصلاۃ الظہر والعصر یؤدیان فی الطرف الآخر، اذالنہار قسمان، غداۃ وعشی والغداء اسم لاول النہار الی وقت الزوال، وما بعدہ العشی، حتی ان حلف لایاکل العشی فاکل بعد الزوال یحنث، فدخل فی طرفی النہار ثلاث صلوات ودخل فی قولہ وزلفا من اللیل المغرب والعشاء لانہا یؤدیان فی زلف من اللیل وھی ساعتہ

وفیہ ایضاً (ص ۳۵۶) وقولہ تعالیٰ "اقم الصلاۃ لدلوک الشمس ـــــــ" قیل دلوک الشمس زوالہا، "غسق اللیل" اول ظلمتہ فیدخل فیہ صلاۃ الظہر والعصر وقولہ تعالیٰ وقرآن الفجر وھو صلاۃ الفجر، فثبت فرضیۃ ثلاث صلوات بہذہ الایۃ وفرضیۃ صلاۃ المغرب والعشاء ثبت بدلیل

الخبر روی عن ابن عباسؓ انه قال حين تمسون المغرب والعشاء وحين تصبحون الفجر وعشيا العصر وحين تظهرون الظهر، ذكر التسبيح واراد به الصلاة اى صلوا لله اما لان التسبيح من لوازم الصلاة: او لانه تنزيه: والصلاة من اولها الى آخرها تنزيه الرب عز وجل لما فيها من اظهار الحاجات اليه، واظهار العجز والضعف وفيه وصف له بالجلال والعظمة والرفعة والتعالى عن الحاجة قوله تعالىٰ وسبح بحمد ربك الخ قيل فى تاويل قوله تعالىٰ فسبح اى فصل قبل طلوع الشمس هو صلاة الصبح، وقبل غروبها هو صلاة الظهر والعصر، ومن آناء الليل صلاة المغرب والعشاء، قوله واطراف النهار على التكرار والاعادة تاكيداً كما فى قوله تعالىٰ حافظوا على الصلوات والصلاة الوسطى الآيه ان ذكر الصلاة الوسطى على التاكيد لدخولها تحت اسم الصلوات كذا هها.

ولقوله تعالىٰ فى بيوت اذن الله الخ قيل الذكر التسبيح ههنا الصلاة وقيل الذكر سائر الاذكار والتسبيح الصلاة، وقوله تعالىٰ بالغدو صلاة الغداة وقوله تعالىٰ الآصال صلاة الظهر والعصر والمغرب والعشاء وقيل الآصال هو صلاة العصر ويحتمل العصر والظهر لانهما يؤديان فى الاصيل وهو العشى وفرضية المغرب والعشاء عرفت بدليل آخر۔

(۳) صبح کاذب کیا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ صبح کاذب جس کا احادیث میں ذکر ہے، روشنی ہی ہے (جو سال بھر میں صرف دو ماہ وسط اگست سے وسط اکتوبر میں ہی نظر آ سکتی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں رمضان المبارک میں آئی ہی نہیں) جبکہ دوسرا شخص اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح کاذب شافیؒ کے حوالے کے مطابق وہ روشنی ہے جو صبح صادق شروع ہونے سے تین درجے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ سے ان دونوں اقوال میں سے کون سا قول درست ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور درست قول ہے تو اس کو بتلا دیا جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: واضح رہنا چاہئے کہ شرعی احکامات کا تعلق مشاہدے سے ہے۔ کسی سائنس یا ریاضی کے حسابات سے نہیں ہے۔ اور چونکہ روزے کی ابتداء اور نماز فجر وغیرہ کے تمام شرعی احکامات کا تعلق صبح صادق سے ہے جو کہ ہر جگہ پورے سال نظر آتی ہے۔ جبکہ صبح کاذب سے کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس جگہ یہ نظر آجائے اس کی وجہ سے صبح صادق کا دھوکہ نہ ہو جائے، اس لئے حدیث میں اس کی مخصوص نشانیاں بتلا دی گئی ہیں مثلاً:

(۱)۔ یہ صبح صادق سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے۔

(۲)۔ اس کی روشنی صبح صادق کی طرح عرضاً نہیں بلکہ طولاً ہوتی ہے۔

چونکہ دیہات میں رہتے ہیں وہاں غروب آفتاب جلدی ہوتا ہے، غروب آفتاب کے بعد اذان ہوتی ہے کہ ہم مغرب کی نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن جون جولائی کے مہینے میں مغرب کے بعد عشاء کے لئے ڈیڑھ گھنٹے کا انتظار کرنے سے پورے دو گھنٹے یعنی ایک گھنٹہ رات سے انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے سے کافی رات گزر جاتی ہے اور لوگ حرج میں مبتلا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چارٹ شہر کے لئے ہے، دیہات والوں کے لئے یہ نہیں ہے۔

(۱)۔اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہم جون جولائی کے مہینے میں بھی دوسرے مہینوں کی طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرکے نماز عشاء ادا کریں گے یا مغرب کی نماز کے بعد سے حساب کرکے جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ ہوجائے عشاء کی نماز ادا کریں گے۔

(۲)۔مغرب اور عشاء کے درمیان کتنی دیر وقفہ کرنا ضروری ہے۔

(۳)۔آیا اس شہر والے نقشہ کی اتباع کرنا ہمارے لئے ضروری ہے یا دیہات کیلئے کوئی الگ حکم ہے۔

اس بارے میں ہمارے علاقے کے لوگوں میں بہت اختلافات پیدا ہوچکے ہیں اس کشیدگی کی وجہ سے اکثر لوگ گھروں میں نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ براہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں مفصل اور تسلی بخش جواب دے کر لوگوں میں اس نزاع کو ختم فرماکر عنداللہ ماجور و مستحق ہوجائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت شفق ابیض کے غروب سے شروع ہوتا ہے یعنی جب افق پر موجود سرخی ختم ہوجائے اور پھر اس کے بعد پھیلنے والی سفیدی بھی ختم ہوجائے تو عشاء کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں جس چارٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں عشاء کا ذکر کردہ وقت اگر غروب شفق ابیض کے موافق ہے تو دیہات میں بھی اس چارٹ کا لحاظ کرنا ضروری ہے کیونکہ شہر کے مضافات میں بھی شہر کے اوقات کا اعتبار ہوتا ہے چونکہ عشاء کی نماز میں معیار غروب شفق ابیض ہے اور اس کی مقدار اہل تجربہ ڈیڑھ گھنٹہ بتاتے ہیں اور یہ مقدار بعض موسموں میں ۴،۵ منٹ زیادہ یا کم ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے سے کم فاصلہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ احتیاطاً پونے دو گھنٹہ کا فاصلہ کرنا چاہئے اور آپ کے مقامی علماء کرام کو چاہئے کہ نمازی حضرات کو سمجھائیں کہ وقت ہونے پر ہی نماز ادا کریں تاکہ سب حضرات مسجد میں باجماعت نماز ادا کریں۔

لما فی البحر الرائق (۱/۲۴۷): قولہ (وھو البیاض) ای الشفق ھو البیاض عند الامام ــــ وعندھما وھو روایۃ عنہ ھو الحمرۃ ــــ وصرح فی المجمع بان علیھا الفتوی وردہ المحقق فی فتح القدیر ورجحہ ایضاً تلمیذہ قاسم فی تصحیح القدوری۔ وقال فی آخرہ: فثبت ان قول الامام ھو الاصح اھ وبھذا ظھر انہ لایفتی ویعمل الا بقول الامام الاعظم ولا یعدل عنہ الی قولھما او قول احدھما او غیرھما الالضرورۃ ــــ وفی السراج الوھاج: فقولھما اوسع للناس وقول ابی حنیفۃ احوط.

وفی الھندیۃ (۱/۵۱): ووقت المغرب منہ الی غیبوبۃ الشفق وھو الحمرۃ عندھما وبہ یفتی ھکذا فی شرح الوقایۃ وعند ابی حنیفۃ الشفق ھو البیاض الذی یلی الحمرۃ ھکذا فی القدوری وقولھما

الجواب حامداً ومصلیاً: جن ممالک میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہو وہاں کے لوگ اپنے قریبی معتدل ملک کی نمازوں کے اوقات کے مطابق اندازاً اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کرکے پڑھیں گے۔

لما في الدر المختار (۱/۳۶۲، ۳۶۳): (وفاقد وقتهما) كبلغار فإن فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق في أربعينية الشتاء (مكلف بهما فيقدر لهما) ولا ينوي القضاء لفقد وقت الأداء، به أفتى البرهان الكبير واختاره الكمال وتبعه ابن الشحنة في ألغازه فصححه فزعم المصنف أنه المذهب.

وفي الشامية تحته: (قوله فيقدر لهما) هذا موجود في نسخ المتن المجردة ساقط من المنح ولم أر من سبقه إليه سوى صاحب الفيض حيث قال ولو كانوا في بلدة يطلع فيها الفجر قبل غيبوبة الشفق لا يجب عليهم صلاة العشاء لعدم السبب وقيل يجب ويقدر الوقت. بقي الكلام في معنى التقدير والذي يظهر من عبارة الفيض أن المراد أنه يجب قضاء العشاء بأن يقدر أن الوقت أعني سبب الوجوب قد وجد كما يقدر وجوده في أيام الدجال على ما يأتي لأنه لا يجب بدون السبب فيكون قوله ويقدر الوقت جواباً عن قوله في الأول لعدم السبب وحاصله أنا لا نسلم لزوم وجود السبب حقيقة بل يكفي تقديره كما في أيام الدجال، ويحتمل أن المراد بالتقدير المذكور هو ما قاله الشافعية من أنه يكون وقت العشاء في حقهم بقدر ما يغيب فيه الشفق في أقرب البلاد إليهم.

(۱۰) ضرورت کے وقت نمازِ عصر کو وقت سے پہلے پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فوجی اگر محاذِ جنگ میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھتے، تو کیا اس طرح ان کی نماز درست ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ظاہر الروایہ اور مفتیٰ بہ قول کے مطابق عصر کی نماز کو سایۂ اصلی کے علاوہ مثلین تک انتظار کرکے پڑھنا چاہئے، اس سے پہلے عام حالات میں نمازِ عصر پڑھنا درست نہیں ہے، ہاں اگر کسی ضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے جیسے کہ صورتِ مسئولہ میں ہے مثلین تک انتظار کرنے کی وجہ سے تنگی ہو تو اس وقت یعنی ایک مثل کے بعد پڑھ لے تو اختلافِ فقہاء کی وجہ سے گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لما في التاتارخانية (۱/۴۰۳): وأول وقت العصر عند أبي يوسف ومحمد إذا صار الظل قامة وزاد عليها وذكر أبو سليمان عن أبي يوسف أنه يعتبر الزيادة قال أبو الحسن الخلاف في آخر وقت الظهر هو خلاف في أول وقت العصر وفي الغياثية وأول وقت العصر إذا صار ظل كل شيء مثليه. وهو المختار.

وفي الدر المختار مع الشامية (۱/۳۵۹): وعنه مثله وهو قولهما وزفر والأئمة الثلاثة قال الإمام

الطحاوی وبه نأخذ وفي غرر الاذكار وهو المأخوذ به وفي البرهان وهو الاظهر لبيان جبريل وهو نص في الباب وفي الفيض وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتي (سوى فيني)

(قوله الى بلوغ الظل مثليه) هذا ظاهر الرواية عن الامام نهاية وهو الصحيح بدائع ومحيط وينابيع وهو المختار غياثية واختاره الامام المحبوبي وعول عليه النسفي وصدر الشريعة تصحيح قاسم واختاره اصحاب المتون وارتضاه الشارحون فقول الطحاوي وبقولهما نأخذ لا يدل على انه المذهب وما في الفيض من انه يفتي بقولهما في العصر والعشاء مسلم في العشاء فقط على ما فيه وتمامه في البحر (قوله وعليه عمل الناس اليوم) اي في كثير من البلاد والاحسن ما في السراج عن شيخ الاسلام ان الاحتياط ان لا يؤخر الظهر الى المثل وان لا يصلي العصر حتى يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلاتين في وقتهما بالاجماع وانظر هل اذا لزم من تأخيره العصر الى المثلين فوت الجماعة يكون الاولى التأخير ام لا والظاهر الاول بل يلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام تأمل.

(۱۱) نمازِ مغرب کو وقتِ عشاء سے پندرہ منٹ قبل ادا کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مرتبہ گلشن اپنے گھر جا رہا تھا راستے میں مغرب کی نماز میں نے ادا نہیں کی۔ جب مقام پر پہنچا تو ابھی عشاء کا وقت (بمطابق کیلنڈر) داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نماز مغرب ادا کرنے لگا تو میرے ساتھی نے کہا کہ مغرب کا وقت ختم ہو چکا ہے اب آپ قضاء نماز ادا کریں۔ تو کیا یہ نماز مغرب قضاء وقت میں شمار ہوگی یا ادا وقت میں؟ کیونکہ مغرب کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور تمام وقت مغرب "الشفق ابیض" (یعنی غروب آفتاب کے بعد مغربی جانب آسمان پر پھیلی ہوئی سفیدی) کے غائب ہونے پر ہے، اور نماز مغرب کے مجموعی وقت کا گھٹنا اور بڑھنا دنوں کے گھٹنے اور بڑھنے پر موقوف ہے۔ لہٰذا گرمی کے موسم میں نماز مغرب کا مجموعی وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اور سردی کے موسم میں سوا گھنٹہ ہے، لوگوں کی آسانی کے پیشِ نظر اسی پر فتویٰ ہے۔ ہماری مساجد میں عام طور پر آویزاں نمازوں کے نظام الاوقات کا دائمی نقشہ بھی مذہب احناف کے حساب سے مرتب ہے، اس نقشہ کے نظام الاوقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نمازوں کی ادائیگی کریں۔ آپ کی تحریر کردہ صورت کے مطابق کیونکہ عشاء کے وقت کے داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے تو ایسی صورت میں آپ کی نماز ادا ہی شمار ہوگی، لیکن نماز مغرب میں بلا کسی عذر کے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

لما في الصحيح لمسلم (۱/۲۲۳): عن عبد الله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال وقت الظهر اذا زالت الشمس وكان ظل الرجل كطوله ما لم تحضر العصر ووقت العصر ما لم تصفر الشمس

ووقت صلوة المغرب مالم يغب الشفق ووقت صلوة العشاء الى نصف الليل الاوسط ووقت صلوة الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس فاذا طلعت الشمس فامسك عن الصلوة فانها تطلع بين قرني الشيطان

وفي الهداية (۱/۸۰): وأول وقت المغرب اذا غربت الشمس وآخر وقتها مالم يغب الشفق ثم الشفق هو البياض الذي في الأفق بعد الحمرة عند أبي حنيفة وعندهما هو الحمرة.

وفي الشامية (۱/۳۶۱): (قوله واليه رجع الامام) اي الى قولهما الذي هو رواية عنه ايضا وصرح في المجمع بأن عليها الفتوى، ورده المحقق في الفتح بانه لايساعده رواية ولادراية الخ وقال تلميذه العلامة قاسم في تصحيح القدوري، ان رجوعه لم يثبت، لما نقله الكافة من لدن الأئمة الثلاثة الي اليوم من حكاية القولين ودعوى عمل عامة الصحابة بخلافه خلاف المنقول قال في الاختيار: الشفق البياض، وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل و عائشة رضي الله عنهم قلت: ورواه عبدالرزاق عن ابي هريرة وعن عمر بن عبدالعزيز ولم يرو البيهقي الشفق الاحمر الاعن ابن عمر وتمامه فيه واذا تعارضت الأخبار والآثار فلا يخرج وقت المغرب بالشك كما في الهداية وغيرها قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح، ومشي عليه في البحر مؤيدا له بما قدمناه عنه، من انه لايعدل عن قول الامام الاالضرورة من ضعف دليل او تعامل ... تنبيه قدمنا قريبا ان التفاوت بين الشفقين بثلاث درج كما بين الفجرين فليحفظ

(۱۴) سفر کی نمازوں کو پیشگی قصر کرنے کا حکم نیز کسی عذر کی وجہ سے دو وقتوں کی نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض لوگ مغرب ہونے سے پہلے ان وقتوں کی نمازیں بھی قصر پیشگی طور پر ادا کر لیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں اندیشہ ہے کہ وہ سفر میں ادا نہیں کر سکیں گے مثلاً اگر مغرب سے پہلے سفر شروع ہو اور رات گئے اپنی منزل پر پہنچنے کا امکان ہے تو یہ لوگ ظہر، عصر، مغرب کی نماز قصر پیشگی ادا کر لیتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا؟ اگر ایسا ہے تو اس بارے میں مسئلہ ضرور بیان فرمائیں۔

(۲) عرب ممالک میں بارش، آندھی وغیرہ کے دن اکثر دو وقتوں کی نماز ایک ساتھ جمع کر لی جاتی ہے اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ یوم عرفات میں مسجد میں ظہر اور عصر کی نماز جمع کی جاتی ہے سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص مسجد نہ جا سکا تو کیا وہ خیمہ میں نماز جمع کر سکتا ہے یا

تنہا یا مختصر جماعت کے ساتھ تو دونوں نمازیں جمع کرے گا یا پھر دونوں نمازوں کو اپنے اپنے وقت پر پوری پڑھے گا یا قصر پڑھے گا کیونکہ حج میں لوگ قصر ہی پڑھتے ہیں۔ تفصیلی جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً (۱) چونکہ اللہ تعالیٰ نے شریعت مطہرہ کو آسان بنایا ہے اسلئے لوگوں کی آسانی کیلئے مختلف حالتوں میں مختلف احکام دیئے ہیں انہی احکام میں سے حالت سفر میں نمازوں کی قصر کا حکم ہے۔ البتہ نمازوں کی قصر کیلئے ضروری ہے کہ سفر کی حالت ہو لہذا جب تک سفر شروع نہ ہوا ہو ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک قصر جائز نہیں ہے۔ لہذا جو لوگ سفر شروع کرنے سے پہلے گھروں ہی میں سفر میں آنے والی نمازوں کو قصر کرتے ہیں یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۲) اور رہا مسئلہ حالت سفر میں نمازوں کو جمع کرنے کا تو ائمہ اربعہ کا اس بارے میں اختلاف ہے احناف کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ لیکن یہ اختلاف جمع بین الصلاتین میں ہے یعنی دو نمازوں کو جمع کرنے کے بارے میں ہے اور وہ دو نمازیں یا تو ظہر و عصر کی نمازیں ہیں یا مغرب و عشاء کی تقدیماً یا تاخیراً۔ لیکن یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے کہ سب نمازوں کو ایک ہی وقت میں پڑھا جائے پس صورت مسئولہ میں اگر سفر شروع کرنے سے پہلے نمازوں کو جمع کرتے ہیں تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر سفر شروع کرنے کے بعد جمع کرتے ہیں پھر اگر ساری ہی نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں تو یہ بھی کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر دو نمازوں کو مثلاً ظہر و عصر یا مغرب و عشاء کو جمع کرتے ہیں تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے لیکن احناف کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۳) عرب ممالک میں چونکہ اکثر ائمہ ثلاثہ کے مقلدین رہتے ہیں اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بارش و آندھی وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز ہے اس لئے وہ حضرات بارش وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرتے ہیں۔ لیکن احناف کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

(۴) پھر عرفات میں جمع بین الصلاتین کیلئے احناف کے نزدیک صحیح قول کے مطابق یہ شرط ہے کہ خلیفہ وقت یا اس کے نائب کے پیچھے نماز باجماعت پڑھی جائے لہذا اگر کوئی شخص اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا کسی اور امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو تو اس کیلئے جمع بین الصلاتین جائز نہیں ہوگی بلکہ عصر کو اپنے وقت میں ہی پڑھے گا۔ اور لوگ عموماً حج میں مکہ مکرمہ میں اقامت کی نیت کر لیتے ہیں تو مکہ مکرمہ میں نمازیں پوری پڑھی جائیں گی البتہ عرفات میں چونکہ تھوڑے وقت کیلئے آتے ہیں اور وہاں مسافر ہوتے ہیں اس لئے قصر کرنا لازم ہوگا۔

لما في قوله تعالى (النساء ۱۰۳) إن الصلوة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً.

وفي الدر المختار (۲/۵۰۳) (صلى بهم الظهر والعصر بأذان وإقامتين) ولو أداه قراءة سرية ولم يصل بينهما شيئاً على المذهب ولا بعد أداء العصر في وقت الظهر (وشرط) لصحة هذا الجمع (الإمام الأعظم أو نائبه وإلا صلوا وحداناً)

وفي الشامية تحته (قوله وإلا صلوا وحداناً) يوهم جواز صلوة العصر في وقت الظهر وعدم جواز الجماعة لو صليت العصر في وقتها وليس مراداً فالأصوب قول الزيلعي صلوا كل واحدة منهما في

وفيها افاده ح اهـ.

وفي الفقه الاسلامي (۲/۱۳۷۲): يجوز عند الجمهور غير الحنفية الجمع بين الظهر والعصر تقديما في وقت الأولى وتاخيرا في وقت الثانية، والجمعة كالظهر الخ

وفي (صـ ۱۳۷۳): اتفق مجيزو الجمع تقديما وتاخيرا على جوازه في احوال ثلاثة هي السفر والمطر ونحوه.

(۱۳) رمضان میں افطاری کی خاطر نماز مغرب کو کچھ تاخیر سے پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان میں افطاری کے لئے نماز مغرب میں کچھ تاخیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کتب فقہ کی روشنی میں جواب دیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً افطار کیلئے جماعت مغرب میں پانچ دس منٹ تاخیر کی گنجائش ہے۔

لما في مراقي الفلاح (صـ ۱۰۳): فكان تاخيرها مكروها الا في يوم غيم والا من عذر سفر او مرض وحضور مائدة والتاخير قليلا لا يكره؟

وفي الشامية (۱/۳۷۰): اى المذكور في المتن بقوله يكره تاخير المغرب في رواية وفي اخرى لا مالم يغب الشفق والاصح الاول الا للعذر اهـ.

(۱۴) عذر کی بنا پر نماز کو وقت سے پہلے پڑھنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک اکیڈمی میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہوں پڑھائی کا وقت تین سے سات تک ہے مسلسل اسباق ہوتے ہیں درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا حتی کہ نماز کا وقفہ بھی نہیں ہے اس وجہ سے میری نماز رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے کیا تعلیم کی وجہ سے نماز چھوڑنا جائز ہے؟ نیز اس صورت کے پیش نظر میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اب میرے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً نماز کی فرضیت اوقات مقررہ میں ہر عاقل بالغ مسلمان مرد وعورت پر ہے اور اس کا ثبوت آیات قرآنیہ اور احادیث مشہورہ سے ہے اور بلا کسی عذر شرعی کے اس کا چھوڑنا جائز نہیں۔ لہٰذا آپ کی تعلیمی مصروفیات میں سے نماز کا وقت نکالنا آپ کے لئے ضروری ہے۔ اور کسی بھی نماز کو اپنے وقت سے پہلے پڑھنا جائز نہیں۔ اگر پڑھ بھی لی تو فرض ادا نہ ہوگا اور قضا لازم ہوگی۔

لما في رد المحتار على الدر المختار (۱/۳۷۰): يشترط لصحة الصلاة دخول الوقت واعتقاد دخوله كما في نور الايضاح وغيره، فلو شك في دخول وقت العبادة فاتى بها فبان انه فعلها في

الوقت لم یجزه.

وفي الدر المختار (۳۵۱/۱): سببها ترادف النعم ثم الخطاب ثم الوقت الخ.

وفي الشامية: (قوله سببها ترادف النعم الخ) يعني ان سبب الصلوة الحقيقي هو ترادف النعم على العبد، ولما كانت النعم واقعة في الوقت جعل الوقت سببا بجعل الله تعالى وخطابه حيث جعله سببا للوجوب لقوله تعالى اقم الصلوة لدلوك الشمس فكان الوقت هو السبب الظاهر

وفي الشامية أيضا (ص۳۵۲): وفي البحر عن الخلاصة غلام صلى العشاء ثم احتلم ولم ينتبه حتى طلع الفجر عليه اعادة العشاء هو المختار الى ان قال (قوله وانه الاصل) (قوله حتى يلزمهم) اى المجنون ومن ذكر معه وكذا غيرهم ممن خرج عليه الوقت ولم يصل فيه قوله هو الصحيح

﴿فصل فی الاذان﴾

(اذان واقامت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۵) اذان واقامت کے شرائط وآداب

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اذان واقامت کے شرائط کیا ہیں؟ اسی طرح اس کے آداب بھی بیان فرمادیں تاکہ ہم انکی رعایت کرسکیں نیز نابالغ بچہ یا عورت اذان دے سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کچھ شرائط مؤذن کیلئے ہیں اور کچھ اذان واقامت کیلئے لہٰذا دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔

مؤذن کی شرائط: اول مسلمان ہونا دوم مرد ہونا سوم عاقل ہونا۔

اذان واقامت کی شرائط: وقت میں ہونا عربی زبان میں ہونا کلمات میں ترتیب کا پایا جانا پے در پے ہونا یعنی درمیان میں بات چیت نہ کرنا۔

آداب: آواز بلند ہونا مؤذن کا نیک وصالح ہونا اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں رکھنا اذان کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر کہنا اقامت قدرے جلدی سے ادا کرنا قبلہ کی طرف منہ کرنا حی علی الصلاۃ میں دائیں جانب اور حی علی الفلاح میں بائیں جانب منہ پھیرنا اذان واقامت کہنے والے کا ایک ہونا۔

نیز عورت اور ناسمجھ بچے کی اذان درست نہیں لہٰذا اگر دونوں میں سے کسی نے بھی اذان دیدی تو اسکا اعادہ ضروری ہوگا البتہ اگر بچہ اتنا بڑا ہے کہ اسکو سمجھ بوجھ حاصل ہو تو اسکی اذان درست تو ہوجائیگی مگر بہتر یہ ہے کہ کوئی بالغ سمجھدار آدمی اذان دے۔

لما فی الشامیة (۱/۳۸۳): (قوله للرجال) اما النساء فیکره لهن الاذان وکذا الاقامة لما روی عن انس وابن عمر (رضی الله عنهما) من کراهتهما لهن ولأن مبنی حالهن علی الستر ورفع صوتهن حرام. امداد. ثم الظاهر انه یسن للصبی اذا اراد الصلاة کما یسن للبالغ وان کان فی کراهة اقامته لغیره کلام.

وفی (ص۳۸۹): (قوله اعادها فقط) کما لو قدم الفلاح علی الصلاة یعیده فقط ای ولا یستأنف الاذان من اوله ... (قوله ولو رد سلام) او تشمیت عاطس او نحوهما لا فی نفسه ولا بعد الفراغ علی الصحیح (وفی ص۳۹۳) (قوله وجزم المصنف) ای حیث قال فیما مر قیدنا بالمراهق لأن اذان

الصبی الذی لا یعقل غیر صحیح کالمجنون والمعتوہ لعدم فہمہم وهذا ذکرہ فی البحر بحثا فرجح
عند المصنف فجزم به ویؤیده ما فی شرح المنیة من انه یجب اعادة اذان السکران والمجنون
والصبی غیر العاقل لعدم حصول المقصود لعدم الاعتماد علی قولهم

(۱۴) حدودِ مسجد میں اذان نہ دینے کی وجہ کا بیان

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا کہ مسجد میں اذان نہیں دینی چاہئے آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ صحیح ہونے کی صورت میں اذان نہ دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے حالانکہ اذان میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور نماز کی طرف دعوت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے ایک قاری صاحب فرما رہے تھے کہ مسجد میں ہوں تو حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ نہیں کہنا چاہئے مسجد سے باہر کہنا چاہئے۔ قاری صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان بلند آواز سے بلند جگہ پر دی جائے تاکہ زیادہ دور تک آواز پہنچے جہاں تک مؤذن کی آواز پہنچے گی وہاں تک کی ہر چیز مؤذن کے حق میں گواہی دے گی مسجد کے اندر اذان نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سے آواز دور تک نہیں پہنچتی جس سے اذان کا اصل مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا اس لئے بلند جگہ اذان دینا مستحب ہے تاکہ آواز دور تک پہنچ جائے البتہ اگر مسجد کے اندر بھی ایسا انتظام ہو جس سے آواز دور تک پہنچے (جیسے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ) تو اس وقت مسجد کے اندر بھی اذان دے سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اذان کا جواب دینا مستحب ہے بعض علماء اذان کے جواب کو واجب کہتے ہیں مگر زیادہ معتمد یہی ہے کہ اجابت فعلی (اذان سن کر مسجد کی طرف جانا) واجب ہے اور اجابت قولی (اذان سن کر زبان سے جواب دینا) مستحب ہے حاضرین مسجد کیلئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ زبان سے جواب دیں۔ چنانچہ قاری صاحب کا یہ کہنا کہ "مسجد کے اندر "حی علی الصلاۃ" اور "حی علی الفلاح" کے جواب میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" نہیں کہنا چاہئے" صحیح نہیں اس لئے کہ حدیث میں اذان کے جواب دینے کے بارے میں مطلق آیا ہے اس میں مسجد کے اندر ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔

لما فی البخاری (۱/۸۶): عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما یقول المؤذن قال یحیی وحدثنی بعض اخواننا انه قال لما قال حی علی الصلاۃ قال لاحول ولاقوۃ الا باللہ وقال هکذا سمعنا نبیکم ﷺ یقول

وفیه ایضاً (۱/۸۶): ان ابا سعید الخدری قال له انی اراک تحب الغنم والبادیة فاذا کنت فی غنمک او بادیتک فاذنت للصلوٰۃ فارفع صوتک بالنداء فانه لا یسمع مدی صوت المؤذن جن ولا انس ولا شیء الا شهد له یوم القیمة قال ابو سعید سمعته من رسول اللہ ﷺ

وفی اعلاء السنن(۲/۱۳۰): فالذی یظہر ان المقصود ھو رفع الصوت والاعلام التام ایھما حصل فلا تعارض بینھما فان رفع الصوت قد حصل فی الموضعین لعدم المانع فیھما بخلاف صحن المسجد.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۸۸): (قولہ ولو کان بمسجد لا) فیہ ان اجابۃ اللسان مندوبۃ عندہ فالمانع من تحصیلھا فی المسجد.

وفی الدر المختار(۱/۳۹۸): (فیقطع قراءۃ القرآن لو) کان یقرأ (بمنزلہ، ویجیب) لو اذان مسجد کما یأتی (ولو بمسجد لا) لانہ اجاب بالحضور وھذا متفرع علی قول الحلوانی، واما عندنا فیقطع ویجیب بلسانہ مطلقا والظاھر وجوبھا باللسان لظاھر الامر فی حدیث اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مایقول.

وفی الفقہ الاسلامی وادلتہ(۱/۷۰۳): اما رفع الصوت فلیکون ابلغ فی اعلامہ واعظم لثوابہ کما ذکر حدیث ابی سعید اذا کنت فی غنمک ولما رواہ الخمسۃ الا الترمذی عن ابی ھریرۃ ان النبی ﷺ قال المؤذن یغفر لہ مد صوتہ ویشھد لہ کل رطب ویابس الخ

وفی فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء(۶/۷۵): ج: الاذان بمکبرات الصوت لتبلیغ من بعد وغیرہ لاحرج فیہ لمافی ذلک من المصلحۃ العامۃ.

(۱۷) ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو قریبی مساجد ہیں کیا دونوں میں اذان دینی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کسی مسجد میں اذان نہیں دی گئی تو کیا وہ گناہگار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔ اور ہر وہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے اس میں اذان مسنون ہے لہٰذا اگر دو قریبی مسجدیں ہوں تو ہر مسجد میں اذان دینا ضروری ہے۔ ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں۔ اگر کسی مسجد میں اذان نہ دی گئی تو وہ گنہگار ہوں گے۔

لمافی الھندیۃ(۱/۵۴): ویکرہ اداء المکتوبۃ بالجماعۃ فی المسجد بغیر اذان واقامۃ

وفی الدر المختار(۱/۳۹۵،۳۹۴): (وکرہ ترکھما) معا (لمسافر) ولو منفردا (وکذا ترکھا) لا ترکہ لحضور الرفقۃ (بخلاف مصل) ولو بجماعۃ (وفی بیتہ بمصر) او قریۃ لھا مسجد

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ ولو بجماعۃ) وعن ابی حنیفۃ: لو اکتفوا بأذان الناس اجزاءھم وقد أساءوا

فلا فرق بین الواحد والجماعۃ فی ھذہ الروایۃ بحر

(۱۸) مختلف جگہوں پر اذان پوری کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن کا مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر اذان پوری کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان میں سنت یہ ہے کہ ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر دی جائے کہ چاروں طرف آسانی آواز پہنچ جائے اور بہتر یہ ہے کہ حیعلتین پر بھی دائیں بائیں طرف منہ کرتے وقت قدم ایک ہی جگہ پر رہیں، ہاں ضرورت کی بناء پر تھوڑا بہت دائیں بائیں ہونے کی بھی گنجائش ہے جیسے منارہ پر بغیر آلہ مکبر الصوت کے اذان دی جائے لیکن آج کل چونکہ آلہ مکبر الصوت پر دی جاتی ہے اس میں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر اذان پوری کرنا ضروری ہے۔ اور ایک ہی اذان کا مختلف جگہوں پر اس طور پر دینا کہ اس میں چلنا ہو اور چلنے کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔

لما فی الھندیۃ (۱/۵۶): وان استدار فی صومعتہ عند اتساعھا فحسن ھکذا فی البدائع فیستدیر المؤذن فی المأذنۃ عند الحیعلتین ویخرج راسہ من الکوۃ الیمنی ویقول حیّ علی الصلوٰۃ مرتین ثم من الکوۃ الیسری ویقول حیّ علی الفلاح مرتین، وھذا اذا لم یتم الاعلام مع بقاء المؤذن فی مقامہ

وفی اللجنۃ الدائمۃ (۶/۵۸): یشرع للمؤذن الذی یؤذن فی غیر مکبر الصوت أن یلتفت یمینا وشمالا عند الحیعلۃ مع ثبوت قدمہ لان ذالک ثبت من فعل مؤذن رسول اللہ ﷺ بحضرتہ ولانہ ابلغ فی اسماع النداء للصلوٰۃ لمن بعد عن المسجد

(۱۹) لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر اذان دینا کیسا ہے جبکہ مسجد کے آس پاس تھوڑے سے گھر ہوں اور لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز ان گھروں تک پہنچ سکتی ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان سے مقصود اعلام ہوتا ہے لہٰذا اذان جتنی بلند آواز سے دی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اگرچہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے بستی والوں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے لیکن اگر لاؤڈ اسپیکر میں اذان دی جائے تو اذان کی آواز علی وجہ الکمال پہنچے گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز جائے گی تو وہاں تک کی ہر ہر چیز قیامت کے دن گواہی دے گی۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر میں اذان دینا بہتر ہے۔

لما فی الھندیۃ (۱/۵۵): والسنۃ ان یؤذن فی موضع عال یکون اسمع لجیرانہ ویرفع صوتہ ولا یجھد

بعینه

وفیه ایضاً (ص ۹۵) ویجعل اصبعیه فی اذنیه وان لم یفعل فحسن لانه لیس بسنة اصلیة وانما شرع لاجل المبالغة فی الاعلام.

وفی الشامیة (۱/۳۸۸): (ویجعل اصبعیه الخ) لقوله ﷺ لبلال رضی الله عنه اجعل اصبعیک فی اذنیک فانه ارفع لصوتک وان جعل یدیه علی اذنیه فحسن لان ابا محذورة ضم اصابعه الاربعة ووضعها علی اذنیه (قوله فاذانه الخ) تفریع علی قوله ندبا قال فی البحر والامر ای فی الحدیث المذکور للندب بقرینة التعلیل فلذا لو لم یفعل کان حسنا فان قیل ترک السنة کیف یکون حسنا؟ قلنا ان الاذان معه احسن فاذا ترکه بقی الاذان حسنا کذا فی الکافی

وفی اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء (۶/۶۵): الاذان بمکبرات الصوت لتبلیغ من بعد وغیره لاحرج فیه لما فی ذلک من المصلحة العامة

(۲۰) اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر پڑھنے کے طریقے

سوال: ...کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر کو پڑھنے کے صحیح طریقے دو (۲) ہیں۔

(۱) پہلے اللہ اکبر کی راء کو ساکن پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط نہ ہوگا۔

(۲) پہلے اللہ اکبر کی راء کو فتحہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (بنیت وقف) پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا۔ نیز پہلے اللہ اکبر کی راء کو ضمہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (ہمزہ ساقط کر کے) پڑھنا خلاف سنت ہے۔

لما فی الشامیة (۱/۳۸۶): والاصل فی اکبر تسکین الراء فحولت حرکة الف اسم الله الی الراء کما فی الم الله. وفی المغنی حرکة الراء فتحة وان وصل بنیة الوقف ثم قیل هی حرکة الساکن ولم یکسر حفظا لتفخیم الله وقیل نقلت حرکة الهمزة وکل هذا خروج عن الظاهر والصواب ان حرکة الراء ضمة اعراب ولیس لهمزة الوصل ثبوت فی الدرج فتنقل حرکتها وبالجملة فالفرق بین الاذان وبین الم الله ظاهر فانه لیس لمیم الم الله حرکة اعراب اصلا وقد کانت لکلمات الاذان اعرابا الا انه سمعت موقوفة

وحاصلها ان السنة ان یسکن الراء من الله اکبر الاول او یصلها بالله اکبر الثانیة فان سکنها کفی وان

وصلها سوی السکون فتحرک الراء بالفتحة فان ضمها خالف السنة لان طلب الوقف علی اکبر الاول صیره کالساکن اصالة فحرک بالفتح.

(۲۱) اذانِ فجر میں الصلوٰۃ خیرٌ من النوم کا اضافہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کب ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: احادیث مبارکہ کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ ہجرت کے پہلے سال اذان کی مشروعیت کے کچھ دنوں بعد ہوا ہے اس لئے کہ جن صحابی (حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ) کو اذان کا الہام کیا گیا ہے انہی سے الصلوٰۃ خیر من النوم کے اضافے سے متعلق ایک حدیث مروی ہے جس میں انہوں نے اذان کی مشروعیت کا واقعہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنا خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے پھر اذان دینے کا حکم دیا چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کیلئے بلانے آیا کرتے تھے ایک دن فجر کی نماز کیلئے بلانے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمارہے تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے با آواز بلند الصلوٰۃ خیر من النوم کہا اس حدیث کے راوی حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ یہ کلمات اس وقت سے فجر کی اذان میں داخل کئے گئے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ اذان کی مشروعیت کے کچھ ہی دنوں بعد ہوا ہے جبکہ اذان کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال ہوئی ہے۔

لما فی المسند الجامع (۸/۳۰۳): عن سعید بن المسیب عن عبداللہ بن زید بن عبدربه قال لما اجمع رسول اللہ ﷺ ان یضرب بالناقوس یجمع للصلاۃ الناس وهو له کاره لموافقته النصاری طاف بی من اللیل طائف وانا نائم رجل علیه ثوبان اخضران وفی یده ناقوس یحمله قال فقلت له یا عبداللہ اتبیع الناقوس؟ قال وما تصنع به؟ قلت ندعو به الی الصلوٰۃ قال افلا ادلک علی خیر من ذالک؟ قال قلت بلی قال تقول اللہ اکبر اللہ اکبر (الی ان قال) فاخبرته بما رأیت قال فقال رسول اللہ ﷺ ان هذه لرؤیا حق ان شاء اللہ ثم امر بالتأذین فکان بلال "رضی اللہ عنه" مولی ابی بکر یؤذن بذالک ویدعو رسول اللہ ﷺ الی الصلوٰۃ قال فجاءه فدعاه ذات غداۃ الی الفجر فقیل له ان رسول اللہ ﷺ نائم قال فصرخ بلال باعلی صوته الصلاۃ خیر من النوم قال سعید بن المسیب فادخلت هذه الکلمة فی التاذین الی صلاۃ الفجر۔

وفی الدر المختار (۱/۳۸۳): وسببه ابتداء اذان جبرئیل لیلة الاسراء واقامته حین امامته علیه الصلوٰۃ والسلام ثم رؤیا عبداللہ بن زید اذان الملک النازل من السماء فی السنة الاولی من الهجرة

(۴۲) فجر کی اذان میں ''الصلوۃ خیر من النوم'' رہ جائے تو کیا حکم ہوگا؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان فجر میں اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو کیا اذان دوبارہ دلوانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً فجر کی اذان میں ''الصلوۃ خیر من النوم'' کہنا مستحب ہے۔ لہٰذا اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو اذان کو دوبارہ دلوانے کی ضرورت نہیں۔

لما في الدر المختار (۱/۳۸۷): (ويقول) ندبا (بعد فلاح اذان الفجر الصلوة خير من النوم مرتين) لانه وقت نوم وفي الشامية تحته (قوله بعد فلاح الخ) فيه رد على من يقول ان محله بعد الاذان بتمامه.

وفي الفقه على المذاهب الاربعة (۱/۳۱۲): ثم يختم بقول لا اله الا الله الا في صلوة الصبح فانه يندب ان يقول بعد حي على الفلاح ''الصلوة خير من النوم'' مرتين واذا تركهما صح الاذان مع الكراهة.

(۴۳) بلا عذر بیٹھ کر اذان دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اذان کیلئے کھڑا ہونا ضروری ہے یا بیٹھ کر بھی اذان دی جاسکتی ہے؟ اگر بغیر عذر کے کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو کیا اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً اذان کے الفاظ کھڑے ہو کر ادا کرنا سنت ہے اور بلا عذر بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے البتہ اگر کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو دوبارہ دینا ضروری نہیں۔ البتہ ایک صورت میں بیٹھ کر اذان دینا بلا کراہت درست ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص تنہا نماز پڑھے۔

وفي الهندية (۱/۵۴): ويكره الاذان قاعدا وان اذن لنفسه قاعدا فلا باس به.

(۴۴) کیا مؤذن گواہ کے حکم میں ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن اذان میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتا ہے تو کیا اس کا یہ اذان دینا گواہی دینے کے حکم میں ہوگا؟ اور کیا مؤذن میں بھی ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو گواہ بننے کیلئے ہوتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اذان دینے سے مقصود اوقات صلوۃ کیلئے اعلان کرنا ہوتا ہے لہٰذا اذان دینا گواہی کے حکم میں نہیں اور نہ شرائط

والی اذان دینے کیلئے ضروری ہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ اذان دینے والا عادل، نیک و صالح ہو۔

لما فی الهندية (١/٥٤): ويكره اذان الفاسق ولا يعاد.

(۲۵) بچے کی اذان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ہماری مسجد میں ایک مرتبہ بارہ سال کے بچے نے اذان دی تو ایک شخص نے اذان کا اعادہ کیا یہ کہتے ہوئے کہ بچے کی اذان درست نہیں ہے، کیا اس آدمی کی بات درست ہے؟ بچے کی اذان پر اعادہ لازم ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بارہ سال کا بچہ چونکہ عاقل ہے اسلئے اسکی اذان درست ہے اسکا اعادہ نہیں کیا جائیگا، البتہ افضل یہ ہے کہ بالغ مکلف شخص اذان دیا کرے۔

لما فی الشامية (١/٣٩٢): واما من حيث اقامة الشعار النافية للاثم عن اهل البلدة فيصح اذان الكل سوى الصبي الذي لا يعقل لان من سمعه لا يعلم انه مؤذن بل يظنه يلعب بخلاف الصبي العاقل لانه قريب من الرجال ولذا عبر عنه الشارح بالمراهق.

(۲۶) کئی سالوں کی قضاء نمازوں کیلئے اذان واقامت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی کئی سال کی نمازیں قضاء ہو چکی ہیں اور اب وہ توبہ تائب بھی ہو چکا ہے، یہ شخص ظہر کی نماز پڑھنے سے پہلے یا بعد میں قضاء نماز پڑھے تو کیا اذان کے بغیر جبکہ اذان ہو چکی ہو پڑھ سکتا ہے؟ یہ شخص پہلے اپنی نمازوں کی قضاء بہتر ہے یا نوافل اور سنت مؤکدہ پڑھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی چونکہ کئی سال کی نمازیں فوت ہو چکی ہیں لہٰذا اسکو اختیار ہے کہ چاہے پہلے وقتی نماز پڑھے یا قضاء پڑھے، البتہ اگر وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ چند فوت شدہ نمازیں ادا سے پہلے پڑھ سکتا ہے تو پہلے قضاء نمازیں پڑھ لے اور اس وقت میں جتنی قضاء نمازیں پڑھیگا تو پہلی قضاء کیلئے اذان واقامت دونوں کہے گا باقی میں اسکو اختیار ہے چاہے تو اذان واقامت دونوں کہے یا صرف اقامت پر اکتفا کرے۔

نیز عام نوافل میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کہ پہلے قضاء نمازیں پڑھے البتہ سنن مؤکدہ وغیر مؤکدہ پڑھ لینی چاہئیں۔

لما فی مجمع الانهر (١/١١٣): (وكذا) يؤذن ويقيم (لأولى الفوائت وخير فيه للبواقي) ان شاء اذن واقام وان شاء اقام فقط هذا اذا كان في مجلس واحد وان كان في مجالس فانه يشترط كلاهما كما في المصفى.

وفی التاتارخانیة (۱/۷۷۰) وفی الحجة الاشتغال بقضاء الفوائت اولی واهم من النوافل الا السنن المعروفة وصلاة الضحی وصلاة التسبیح والصلوات التی رویت فی الاخبار

(۲۷) قضاء نماز پڑھتے وقت اذان واقامت کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قضاء نماز پڑھتے وقت اذان اور اقامت کہنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً — قضاء شدہ نماز اگر ایک ہے تو اس کو پڑھتے وقت اذان واقامت پوری کہنا مسنون ہے چاہے باجماعت پڑھی جائے یا اکیلے پڑھی جائے، اگر ایک سے زائد ہیں تو سب سے پہلی نماز کیلئے اذان واقامت دونوں کا کہنا مسنون ہے اور بقیہ میں اختیار ہے چاہے تو اذان واقامت دونوں کہے یا صرف اقامت پر اکتفاء کرے یہ اس وقت ہے جب ایک ہی مجلس میں ایک سے زائد نمازیں ادا کی جائیں البتہ اگر ہر ایک نماز الگ مجلس میں ادا کرے تو پھر ہر ایک کیلئے اذان واقامت کہنا مسنون ہے۔

لما فی الهندیة (۱/۵۵): ومن فاته صلاة فی وقتها فقضاها اذن لها واقام واحدا کان او جماعة هکذا فی المحیط وان فاته صلوات اذن للاولی واقام وکان مخیرا فی الباقی ان شاء اذن واقام وان شاء اقتصر علی الاقامة کذا فی الهدایة وان اذن واقام لکل صلاة فحسن — والتخییر فی البواقی انما هو اذا قضاها فی مجلس واحد اما اذا قضاها فی مجالس فیشترط کلاهما.

وفی الدر المختار (۱/۳۹۰): (و) یسن أن (یؤذن ویقیم لفائتة) — (وکذا) یسنان (لاولی الفوائت) لا الفاسدة (ویخیر فیه للباقی) لو فی مجلس وفعله اولی ویقیم للکل

(۲۸) میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً کیسا ہے جائز ہے یا بدعت؟ اگر بدعت ہے تو پھر نماز کے علاوہ اور مواقع میں کیوں جواز نقل کیا جاتا ہے ان میں کیا فرق کیا ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً — میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً درست نہیں، فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔ اور دیگر مقامات پر نماز کے علاوہ جو اذان کا جواز فقہاء نے نقل کیا ہے (مثلاً آندھی کے وقت، زلزلہ کے وقت، آگ لگ جانے کے وقت، جنات کی سرکشی کے وقت، کسی انسان یا جانور کی بدخلقی کے وقت، غمگین کے کان میں، مرگی کی بیماری کے وقت، غصہ کے وقت، نومولود بچہ کے کان میں) ان مقامات میں بعض تو منصوص ہیں مثلاً حزن کے وقت اور بچے کے کان میں اور جو غیر منصوص مقام ہیں ان میں بعض مقامات پر اذان سے

۔۔۔ نبی سے ثابت ہے مقصود ہوتی ہے اور بعض میں جلب منفعت اور ان مواقع پر اذان دینے کو عبادت بھی نہیں سمجھا جاتا اس کے برخلاف قبر پر اذان کو موجب اجر و عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت کے ثبوت کیلئے دلیل قاطع کا ہونا ضروری ہے اور یہاں دلیل معدوم ہے اس لئے فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔

تنبیہ: میت کو قبر میں اتارتے وقت احادیث مبارکہ میں یہ دعا منقول ہے "بسم الله وعلى ملة رسول الله" لہٰذا اس دعا کو پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

لما في الشامية (۲/ ۲۳۵): لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة وقال ومن ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب.

وفي اللجنة الدائمة (۹/ ۲۷): لا يجوز الأذان ولا الإقامة عند القبر بعد دفن الميت ولا في القبر قبل دفنه لأن ذلك بدعة محدثة.

(۲۹) شیعوں کا اذان میں "علی ولی اللہ" کا اضافہ کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شیعوں کا اذان میں "علی ولی اللہ" وغیرہ کا اضافہ کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: شیعوں کا اذان میں "علی ولی اللہ" وغیرہ کا اضافہ کرنا بدعت ہے کیونکہ حدیث مبارکہ، اقوال صحابہ اور ائمہ مجتہدین میں کسی سے بھی ان کلمات کا اضافہ کرنا ثابت نہیں، اور خود فقہاء شیعہ نے بھی اس کے عدم ثبوت کی صراحت اپنی کتابوں میں نقل کی ہے، لہٰذا اس سے بچنا لازم ہے۔ واللہ اعلم

لما في اللجنة الدائمة (۶/ ۹۲): س: كيف يضع بعض المسلمين اسم علي بن أبي طالب رضي الله عنه في الأذان والإقامة وهل فعل ذلك رسول الله ﷺ وأصحابه؟

ج: الأذان من العبادات والعبادات كلها توقيفية ولم يكن فيه ولا في الإقامة على عهد رسول الله ﷺ ولا على عهد خلفائه الراشدين ذكر اسم علي رضي الله عنه ولم يشرع ذلك. وإنما ابتدعه الرافضة كما هو شأنهم في الابتداع وأهل السنة لا يرون ذلك بل ينكرونه على فاعليه صيانة للتشريع الإسلامي عن البدع وحفظا له منها.

وفي الحدائق الناضرة (۷/ ۴۰۳): (تأليف: شيخ يوسف البحراني) قال شيخنا الصدوق في الفقيه بعد نقل خبر أبي بكر الحضرمي وكليب الأسدي. قال مصنف هذا الكتاب هذا هو الأذان

الصحیح لایزاد فیه ولا ینقص منه والمفوضة (لعنهم الله) قد وضعوا اخبارا وزادوا فی الاذان "محمد وآل محمد خیر البریة" مرتین وفی بعض روایاتهم بعد "اشهد ان محمدا رسول الله" "اشهد ان علیا ولی الله" مرتین ومنهم من روی بدل ذلک "اشهد ان علیا امیر المؤمنین حقا" مرتین ولاشک فی ان علیا ولی الله وانه امیر المؤمنین حقا وان محمدا وآل محمد (صلوات الله علیهم) خیر البریة ولکن لیس ذلک فی اصل الاذان وانما ذکرت ذلک لیعرف بهذه الزیادة المتهمون بالتفویض المدلسون انفسهم فی جملتنا

(۳۰) تہجد کی اذان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عرب ممالک میں عام طور سے تہجد کی اذان ہوتی ہے فجر سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے یہ کب سے شروع ہوئی یہ خلفائے راشدین کے وقت میں رائج تھی یا نہیں اگر یہ بعد میں شروع ہوئی تو کیا بدعت میں شمار ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تہجد کیلئے اذان احناف کے ہاں ثابت نہیں یہ اذان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شروع ہوئی تھی بعد میں نہیں رہی اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں بھی نہیں تھی جیسا کہ طحاوی میں حضرت علقمہؓ کے اثر سے معلوم ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تہجد کیلئے اذان دے تو یہ بدعت نہیں ہوگی کیونکہ اس کی اصل موجود ہے لیکن دینی نہیں چاہیے۔

لما فی الطحاوی (۱/۱۰۵) فهذا ابن عمر رضی الله عنهما یروی عن النبی ﷺ ما ذکرنا، وهو ممن قد روی عن رسول الله ﷺ انه قال ان بلالا ینادی بلیل فکلوا واشربوا حتی ینادی ابن ام مکتوم فثبت بذلک ان ما کان من ندائه قبل طلوع الفجر مما کان مباحا له، هو لغیر الصلوة وان ما انکره علیه اذ فعله قبل الفجر کان للصلوة (ص ۱۰۶) وقد روی عن علقمة من هذا شیء عن ابراهیم قال شیعنا علقمة الی مکة فخرج بلیل فسمع مؤذنا یؤذن بلیل فقال اما هذا فقد خالف سنة اصحاب رسول الله ﷺ لو کان نائما لکان خیرا له فاذا طلع الفجر اذن، فاخبر علقمة ان التاذین قبل طلوع الفجر خلاف لسنة اصحاب رسول الله ﷺ.

وفی الشامیة (۱/۳۸۵): (قوله کعید) ای ووتر وجنازة وکسوف واستسقاء وتراویح وسنن رواتب لانها اتباع للفرائض والوتر وان کان واجبا عنده لکنه یؤدی فی وقت العشاء فاکتفی باذانه لالکون الاذان لهما علی الصحیح کما ذکره الزیلعی بحر فافهم لکن فی التعلیل قصور لافتضائه سنیة الاذان لما لیس تبعا للفرائض کالعید ونحوه فالمناسب التعلیل بعدم وروده فی السنة تامل

(۳۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان دینے کا ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خود بھی اذان دی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جی ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر کے موقع پر خود بھی اذان دینا ثابت ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۴۰۴): الافضل کون الامام هو المؤذن وفی الضیاء انه علیه الصلاة والسلام اذن فی سفر بنفسه واقام وصلی الظهر وقد حققناه فی الخزائن

وفی الشامیة تحت: (قوله الافضل الخ) ای لقول عمر رضی الله عنه لولا الخلیفی لأذنت مع الامامة كما قدمناه وفی السراج ان ابا حنیفة كان یباشر الاذان والاقامة بنفسه (قوله وقد حققناه فی الخزائن) حیث قال بعد ما هنا هذا وفی شرح البخاری لابن حجر ومما یكثر السؤال عنه هل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسه وقد اخرج الترمذی انه علیه السلام اذن فی سفر وصلی باصحابه وجزم به النووی وقواه ولكن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه فامر بلالا فاذن فعلم ان فی روایة الترمذی اختصاراً وان معنی قوله اذن امر بلالا كما یقال اعطی الخلیفة العالم الفلانی كذا وانما باشر العطاء غیره

وفی تقریرات الرافعی (ص ۴۳): قوله (ولكن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه الخ) ذكر السندی ما نصه وفی السراج روی عقبة بن عامر قال كنت مع رسول الله ﷺ فی سفر فلما زالت الشمس اذن بنفسه واقام وصلی الظهر وقال السیوطی ظفرت بحدیث آخر مرسل اخرجه سعید بن منصور فی سننه قال اذن رسول الله ﷺ مرة فقال حی علی الصلاة وهذه روایة لاتقبل التاویل.

(۳۲) ”اذان کا جواب“ دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ کیا اذان کا جواب دینا واجب ہے؟ اگر واجب ہو تو کیا ہر مسجد کی اذان کا جواب دینا لازم ہوگا یا صرف اپنی مسجد کی اذان کا جواب دینا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان کا جواب بالقول مستحب ہے اور بالفعل واجب ہے یعنی جب اذان کی آواز کانوں میں پڑے تو زبان سے جواب دینا مستحب ہے اور اجابت بالفعل یعنی اذان سن کر نماز کے لیے جانا واجب ہے، جبکہ زبان سے جواب میں یہ تفصیل ہے کہ [illegible] اذان کا جواب دینا چاہیے، اگر کئی مسجدوں سے اذان سنی تو پہلی اذان کا جواب دے اور بہتر تمام اذانوں کا جواب دینا افضل ہے۔

وفي الشامية (۱/۳۹۶): (قوله قال الحلواني منها الخ) اي قال الحلواني ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هي الاجابة بالقدم

وفيه ايضا (۱/۳۹۷): (قوله ولو تكرر) اي بان اذن واحد بعد واحد اما لو سمعهم في ان واحد من جهات فسياتي (قوله اجاب الاول) سواء كان مؤذن مسجده او غيره ... اذا كان في المسجد اكثر من مؤذن اذنوا واحدا بعد واحد فالحرمة للاول.

(۴۳) جمعہ کی اذان ثانی کا جواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی اذان جو خطبہ کے وقت ہوتی ہے اس کا جواب دینا چاہئے یا خاموش رہنا چاہئے؟ اسی طرح اس اذان کے بعد دعا پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جمعہ کی دوسری اذان کا جواب زبان سے نہیں دینا چاہیے بلکہ دل ہی دل میں دے دینا کافی ہے، اسی طرح اس اذان کے بعد کی دعا کا ترک افضل ہے۔

لما في التاتارخانية (۲/۶۷): وفي الاوزجندي: اذا قال الخطيب: يايها الذين امنوا صلوا عليه الاية، في الخطبة فالاصح السكوت وفي الحجة ولو سكت فهو افضل تحقيقا للانصات والذي عليه عامة مشايخنا ان على القوم ان يستمعوا للخطبة من اولها الى اخرها وقال ابو حنيفة ومحمد: واذا ذكر الله والرسول في الخطبة يجب عليهم ان يستمعوا ولم يذكر الله تعالى بالثناء عليه ولم يصلوا على النبي ﷺ.

وفي الدر المختار (۱/۳۹۹): وينبغي ان لا يجيب بلسانه اتفاقا في الاذان بين يدي الخطيب وان يجيب بقدمه اتفاقا في الاذان الاول يوم الجمعة لوجوب السعي بالنص

(۴۴) چلتے ہوئے رک کر اذان کا جواب دینا بہتر ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پیدل چلتے وقت اگر اذان سنے تو چلتا ہوا جواب دے یا ٹھہر کر؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر پیدل چلتے وقت اذان سنائی دے تو اولیٰ وبہتر یہ ہے کہ ٹھہر کر جواب دے، لیکن اگر ٹھہرے بغیر چلتے چلتے جواب دے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

لما في الهندية (۱/۵۷): سمع الاذان وهو يمشي فالاولى ان يقف ساعة ويجيب

وفي الشامية (١/٢٩٧): (قوله بزازية) كذا نقله في النهر ولم أره فيها فلتراجع نسخة أخرى نعم رأيت فيها سمع وهو يمشي فالافضل أن يقف للاجابة ليكون في مكان واحد.

(۳۵) دورانِ وعظ یا تقریر اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دورانِ وعظ یا تقریر اذان شروع ہو جائے تو کیا جواب دینا لازم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر دورانِ وعظ یا تقریر اذان شروع ہو جائے تو جواب دینا لازم نہیں ہوگا کیونکہ وعظ اور تقریر کا مقصد مسلمانوں کو دین کی اہمیت اور دین کے احکامات سکھانا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ وعظ اور تقریر بند کر کے اذان کا جواب دیا جائے۔

لما في الهندية (١/٥٧): يجب على السامعين عند الأذان الإجابة ... ولا ينبغي أن يتكلم السامع في خلال الأذان والإقامة ولا يشتغل بقراءة القرآن ولا بشيء من الأعمال سوى الإجابة

وفي الشامية (١/٣٩٦): (قوله وتعليم علم) أي شرعي فيما يظهر ولذا عبر في الجوهرة بقراءة الفقه (قوله بخلاف قرآن) لأنه لا يفوت ... بخلاف التعلم فعلى هذا لو يقرأ تعلما أو تعليما لا يقطع.

(۳۶) اذان کے پورا ہو جانے کے بعد جواب دینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان پوری ہو جانے کے بعد اذان کا جواب دیا جا سکتا ہے؟

جواب حامداً ومصلیاً: مستحب یہ ہے کہ اذان کا جواب اذان کے ساتھ ساتھ دیا جائے اور اگر کوئی شخص اذان کے ساتھ اذان کا جواب نہ دے پایا ہو تو اذان کے بعد جواب دے سکتا ہے بشرطیکہ زیادہ وقت نہ گزرا ہو اور اگر اذان کے بعد وقت زیادہ ہو گیا ہو تو جواب دینا مستحب نہ ہوگا۔

لما في حاشية الطحطاوي على الدر (١/٢٠١): قال في النهر لم أره ثم اذا لم يجب حتى فرغ هل يتدارکه ان قصر الفصل

وفي الدر المختار (١/٣٩٩): ولو لم يجبه حتى فرغ لم أره وينبغي تداركه ان قصر الفصل.

وفي الشامية تحته: فلو سكت حتى فرغ كل الأذان ثم أجاب قبل فاصل طويل كما في أصل سنة الإجابة كما هو ظاهر

(۳۷) ریڈیو اور ٹی وی کی اذان کا جواب دینا ضروری نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر ریڈیو اور ٹی وی میں نماز کے وقت اذان نشر کی جاتی ہے اگر کوئی شخص یہ اذان سن لے تو اس پر اذان کا جواب دینا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اس اذان کا جواب دینا ضروری ہے جو سنت کے مطابق ہو سنت کے مطابق وہ اذان ہے جس میں اذان دینے والا سمجھدار ہو، چنانچہ اگر نا سمجھ بچہ اذان دیتا ہے تو اس کی اذان کا جواب دینا ضروری نہیں کیونکہ یہ سنت کے مطابق نہیں اور نہ لوگ اس کے کلام کا اعتبار کریں گے اس کی اذان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پرندوں کو اذان یا سجدہ تلاوت کی آیت سکھادے اور وہ پڑھے تو اس صورت میں نہ جواب دینا ضروری ہوگا اور نہ سجدہ تلاوت واجب ہوگا اسی طرح جو آواز ٹکرا کر واپس آتی ہے اس سے بھی سجدہ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس میں فقط نقل ہے یہی حال ریڈیو اور ٹی وی کی اذان کا ہے کہ اس میں فقط نقل ہے اس لیے اگر اذان یہاں آتی ہے تو اس کا جواب دینا ضروری نہیں۔

لما في نور الايضاح (صـ ۹): واذا سمع المسنون منه امسک وقال مثله وحوقل في الحيعلتين (حاشيه ـ ۱) وقيد بالمسنون من الاذان فافاد انه اذا كان على غير وجه السنة كاذان المرأة وغيره لاتجب له المتابعة.

وفي الشامية (۱/ ۳۹۳): وروى عن الامام انه تستحب اعادة اذان المرأة وعلى هذه الرواية مشى الزيلعي وذكر في البدائع ايضاً ان اذان الصبي الذي لا يعقل لايجزئ ويعاد لان ما يصدر لا عن عقل لايعتد به كصوت الطيور.

وفي الهندية (۱/ ۱۳۲): ولا تجب اذا سمعها من طير هو المختار

(۳۸) مرغ کی اذان پر نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قریب میں کوئی مسجد نہ ہو تو مرغ کی اذان پر نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مرغ کی آواز کو اذان سمجھنا اور صرف اسی پر اعتماد کرکے نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں اولاً اس لئے کہ مرغ کی آواز کو عرف میں اذان کہہ دیتے ہیں ورنہ حقیقت میں یہ اذان نہیں ہے۔ ثانیاً یہ بے وقت بھی بولتا ہے اس کو وقت کی تعیین نہیں ہوتی۔ البتہ اگر نماز کا وقت ہوجانے کا دوسرے قرائن سے بھی علم ہوجائے تو نماز پڑھنا صحیح ہے۔

اور اذان شرعی تو وہ مخصوص کلمات ہیں جو اذان کے وقت میں کہے جاتے ہیں اور ان کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے کہ اذان کوئی ایسا عاقل

آدمی دے کہ جس پر لوگ بھروسہ کرتے ہوں تاکہ اذان کا مقصد "اعلام" صحیح طور پر حاصل ہو سکے۔ اور اگر مذکورہ صورت میں مسجد قریب ہے تو وقت ہونے پر خود اذان دے کر نماز پڑھ لیجئے۔

لما في الهندية (١/٥٣): والعلية الاذان تعتمد بمعرفة القبلة والعلم بمواقيت الصلوة، كذا في فتاوى قاضي خان وينبغي ان يكون المؤذن رجلا عاقلا صالحا تقيا عالما بالسنة كذا في النهاية

وفيه ايضاً (١/٥٣): واذان الصبي الذي لا يعقل لا يجوز ويعاد وكذا المجنون هكذا في النهاية.

وفي الشامية (١/٣٩٢): وذكر في البدائع ايضاً أن اذان الصبي الذي لا يعقل لا يجزئ ويعاد، لأن ما يصدر لا عن عقل لا يعتد به كصوت الطيور.

(۳۹) دینی کتب کا مطالعہ کرتے وقت اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ دینی کتب کے مطالعے کے دوران اگر اذان کی آواز سنے تو کیا اذان کا جواب دے یا مطالعہ جاری رکھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ مطالعہ چھوڑ دے اور اذان کا جواب دے۔

لما في الهندية (١/٥٧): ولا ينبغي ان يتكلم السامع في خلال الاذان والاقامة ولا يشتغل بقراءة القرآن ولا بشيء من الاعمال سوى الاجابة ولو كان في القراءة ينبغي ان يقطع ويشتغل بالاستماع والاجابة

وفي الدر المختار (١/٣٩٦ تا ٣٩٨): (ويجيب) وجوبا وقال الحلواني ندباً والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) ولو جنبا لا حائضا ونفساء وسامع خطبة وفي صلاة جنازة وجماع ومستراح واكل وتعليم علم وتعلمه بخلاف القرآن (بان يقول) بلسانه (كمقالته) ان سمع المسنون منه وهو ما كان عربيا (ولو كان في المسجد حين سمعه ليس عليه الاجابة ولو كان خارجه اجاب) بالمشي اليه (بالقدم ولو اجاب باللسان لا به لا يكون مجيباً) (ويقطع قراءة القرآن لو كان يقرأ) بمنزله ويجيب.

(۴۰) اذان میں اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالہ کہنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف "جل جلالہ" کہنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　　اذان کے اندر ابتدائی تکبیر کے جواب میں صرف کلمات کہنا خلاف سنت ہے، اذان سننے والے کو بھی اذان کے کلمات دہرانے چاہئیں البتہ "حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح" کے جواب میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" اور "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے جواب میں "صدقت وبررت وبالحق نطقت" کہنا چاہئے۔

لما فی الهندية (١/٥٧): ويجب على السامعين عند الأذان الإجابة وهي أن يقول مثل ما قال المؤذن إلا في قوله حي على الصلوة حي على الفلاح فإنه يقول مكان حي على الصلوة لاحول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم　　وكذا في قول المؤذن الصلاة خير من النوم لا يقول السامع مثله ولكن يقول صدقت وبررت.

وفي الطحطاوي (١/٨٨): (قوله ويجيب وجوبا) على المعتمد للأمر به في قوله عليه السلام فقولوا مثل ما يقول (قوله ندبا) أي إجابة اللسان مندوبة (قوله والواجب) (قوله ولو جنبا) لأنه ليس بأذان.

وفي الشامية (١/٣٩٦): (قوله من سمع الأذان) يفهم منه أنه لو لم يسمع لصمم أو لبعد أنه لا يجيب وهو ظاهر الحديث الآتي (إذا سمعتم الأذان) حيث علق على السماع وقد صرح بعض الشافعية بأنه الظاهر وبأنه يجيب في جميعه إذا لم يسمع إلا بعضه.

(۴) اقامت میں "اشہد ان محمدا رسول اللہ" کے جواب میں "ﷺ" کہنا

سوال　　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اقامت میں اشہد ان محمدا رسول اللہ کے جواب میں صرف "صلی اللہ علیہ وسلم" کہنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　　اذان واقامت میں اشہد ان محمدا رسول اللہ کے جواب میں اشہد ان محمدا رسول اللہ ہی کہنا چاہئے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جیسے مؤذن کہے تم بھی ویسے کہو (بخاری شریف ۱/۸۶) اور حیعلتین کے جواب میں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) اور اقامت میں قد قامت الصلاۃ کے جواب میں (اقامها الله وادامها) کہو لہٰذا اشہد ان محمدا رسول اللہ کے جواب میں صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہنا صحیح نہیں۔ ہاں یوں کر سکتا ہے کہ جواب میں اشہد ان محمدا رسول اللہ کہہ کر تھوڑا سا توقف کرے اور پھر صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ سکے۔

لما في البخاري (١/٨٦): عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله ﷺ قال إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن

لما في الهندية (١/٥٧): ويجب على السامعين عند الأذان الإجابة وهي أن يقول مثل ما قال المؤذن

اسی طرح ابوداؤد (۱/۱۸۲) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے" عن طاؤس قال سئل ابن عمر عن الرکعتین قبل المغرب فقال ما رأیت احداً فی عہد رسول اللہ ﷺ یصلیھما"

(ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ نبی علیہ السلام کے عہد مبارک میں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ یہ دو رکعت پڑھتے)

فتح القدیر (۱/۳۳۹) میں علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے مسند الشامیین میں نقل کیا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ازواج مطہرات سے سوال کیا کہ کیا آپ نے نبی علیہ السلام کو مغرب سے پہلے رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے سب نے کہا نہیں صرف حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ علیہ السلام نے ایک مرتبہ میرے ہاں دو رکعت پڑھ لی، میں نے کہا یہ کونسی نماز ہے؟ آپ نے فرمایا: نسیت رکعتین قبل العصر صلیتھما الآن۔ (ترجمہ: عصر سے پہلے میں دو رکعت پڑھنا بھول گیا تھا وہ دو رکعت میں نے ابھی پڑھ لیں)۔

فتح الباری (۲/۸۹) میں حافظ صاحبؒ نے ابراہیم نخعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ خلفاء اربعہ مغرب سے پہلے دو رکعت نہیں پڑھتے تھے۔ حافظ صاحب نے اگرچہ اس طریق کو منقطع قرار دے کر اس کا اعتبار نہیں کیا لیکن مراسیل ابراہیم نخعی محدثین کے نزدیک قابل حجت ہیں، اسی طرح مسند بزار کی ایک روایت ہے" بین کل اذانین صلوٰۃ الا المغرب" (ترجمہ: ہر دو اذانوں (یعنی اذان، اقامت کے درمیان نماز ہے مغرب کے علاوہ) یعنی مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان نماز نہیں ہے، اس حدیث کی تخریج دار قطنی (۱/۲۶۴) نے بھی کی ہے، ان تمام نصوص، خلفاء اربعہ کے عمل اور صحابہ کرام کا ازواج مطہرات سے پوچھنا اور ان کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے رکعتیں پڑھنا مندوب نہیں بلکہ ان کو سنت سمجھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا، اس لئے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں بلا ضرورت تاخیر لازم آتی ہے جو کہ مکروہ ہے۔

(۲) مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ کرنا جس میں ایک آیت طویل کی تلاوت ہوسکے یا اس قدر جلسہ خفیفہ کرنا جو خطیب دو خطبوں کے درمیان کرتا ہے جائز ہے۔ لہٰذا اگر کسی عذر شرعی (لوگوں کی اکثریت کو مسبوق ہونے سے بچانے کیلئے) کی وجہ سے انتظامی اعتبار سے ایک دو منٹ کا وقفہ اذان مغرب اور اقامت کے درمیان رکھ دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی۔

لما فی خلاصۃ الفتاوی (۱/۴۹): ویقعد المؤذن بین الاذان والاقامۃ فی جمیع الصلوات الا فی المغرب فان وصل الاقامۃ بالاذان ولم یفصل بینھما یکرہ واجمع الفقھاء رحمھم اللہ ان المؤذن لا یفصل بین الاذان والاقامۃ فی المغرب بالصلوۃ ولکن یقوم ساکتا ساعۃ یسیرۃ ولا یجلس وعندھما یجلس جلسۃ خفیفۃ قدر ما یجلس الخطیب بین الخطبتین ویسکت عند ابی حنیفۃ قدر آیۃ طویلۃ او ثلث آیات قصار لو فعل کما قالا لا یکرہ عندہ ولو فعل کما قال لا یکرہ عندھما.

وفی الدر المختار (۱/۳۸۹): (ویجلس بینھما) بقدر ما یحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب (الا

وفی المشکوٰۃ المصابیح(صفحہ ۲۷): باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ. عن عائشۃ: قالت قال رسول الله ﷺ: "من أحدث فی أمرنا هذا ما لیس منه فهو رد" متفق علیه. وعن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ أما بعد فإن خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد وشر الأمور محدثاتها وکل بدعة ضلالة.

وفی البحر الرائق(۲۴۷/۱): وصحح فی التجنیس فی الإمام عدم الجواز إن کانوا ینتظرونه والأجاز.

وفی الشامیة(۲۰۷/۲): (مطلب فی صلاة الجنازة) وأما الشروط التی ترجع إلى المصلی فهی شروط بقیة الصلوات من الطهارة الحقیقیة بدناً وثوباً ومکاناً والحکمیة. وستر العورة والاستقبال والنیة سوى الوقت.

وفی الشامیة(۲۲۱/۱): (قوله: وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) أی ولو کان الماء قریباً. ثم اعلم أنه اختلف فیمن له حق التقدم فیها: فروى الحسن عن أبی حنیفة أنه لا یجوز للولی لأنه ینتظر ولو صلّوا له حق الإعادة، وصححه فی الهدایة والخانیة وکافی النسفی. وفی ظاهر الروایة: یجوز للولی أیضاً لأن الانتظار فیها مکروه، وصححه شمس الأئمة الحلوانی: أی سواء انتظروه أو لا. قال فی البرهان: ان روایة الحسن هنا أحسن لأن مجرد الکراهة لا یقتضی العجز المقتضی لجواز التیمم، لأنها لیست أقوى من فوات الجمعة والوقتیة مع عدم جوازه لهما، وتبعه شیخ مشایخنا المقدسی فی شرح نظم الکنز لابن الفصیح اهـ ملخصاً من حاشیة نوح أفندی.

(۴۵) دعاءِ وسیلہ میں "والدرجۃ الرفیعۃ" پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ اذان کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں "اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوٰة القائمة آت محمدا الوسیلة والفضیلة والدرجة الرفیعة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته وارزقنا شفاعته یوم القیامة انک لا تخلف المیعاد" آیا یہ دعا کہیں سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتابوں کے حوالہ جات کے ساتھ تحریر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: اذان کے بعد جو دعاءِ وسیلہ پڑھی جاتی ہے وہ صحیح بخاری وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

"اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوٰة القائمة آت محمدا الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته"

لما فی الدر المختار (۱/۳۹۶): (ویجیب) وجوبا وقال الحلوانی ندبا والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) وفی الشامیة (قوله وقال الحلوانی ندبا الخ) ای قال الحلوانی ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هی الاجابة بالقدم (ص۳۹۶) (قوله کمقالته) ای مثلها فی القول (ص۳۹۸) (قوله لم ار الخ) البحث لصاحب البحر، وصرح به ابن حجر فی شرح المنهاج حیث قال فلو سکت حتی فرغ کل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طویل کفی فی اصل سنة الاجابة کما هو ظاهر واستفید من هذا ان المجیب لا یسبق المؤذن بل یعقب کل جملة منه بجملة منه

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۲۷۱): والدلیل علی الاجابة: ماروی ابو سعید ان رسول الله ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل یقول المؤذن لکن قال المالکیة المتبادر من قوله سمعتم ولو البعض خصوصاً وقد قال فقولوا مثل ما یقول ولم یقل مثل ما قال وهذا فی تقدیری تعسف واضح فی التاویل والظاهر کما قال بعض المالکیة ان یحکی الاذان کله (ص۲۷۳) ویجیب المؤذن سواء سمع الاذان کله ام بعضه فان لم یسمع لبعد او صمم لا تسن له الاجابة.

(۴۷) شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنے کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ آج کل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب مؤذن اذان میں "اشهد ان محمدا رسول الله" کہتا ہے تو یہ لوگ انگوٹھے چومتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنا کیسا ہے؟ اس کا ثبوت کسی حدیث سے ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً — اذان میں مؤذن کے شہادتین کہتے وقت ہاتھوں کے انگوٹھے چومنا اور آنکھوں پر لگانا کسی روایت صحیحہ سے ثابت ہے اور نہ کسی معتبر کتاب میں ہے۔ لہٰذا اس کو عبادت سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔

لما فی فیض الباری (۲/۱۶۶): وکذالک لا اصل لتقبیل الابهامین عند الشهادتین کما شرع فی بلادنا الا اثر اخرجه القاری عن ابی بکر رضی الله عنه فی الموضوعات لکنه ضعیف یقرب المنکر

وفی المقاصد الحسنة للسخاوی (ص۳۸۴): وکذا ما اورده ابو العباس احمد بن ابی بکر الرداد الیمانی المتصوف فی کتابه "موجبات الرحمة وعزائم المغفرة" بسند فیه مجاهیل مع انقطاعه عن الخضر علیه السلام انه من قال حین سمع المؤذن یقول اشهد ان محمدا رسول الله، مرحبا بحبیبی وقرة عینی محمد بن عبدالله ﷺ ثم یقبل ابهامیه ویجعلهما علی عینیه لم یرمد ابدا

وفی الشامیة (۱/۳۹۸): یستحب ان یقال عند سماع الاولی من الشهادة: صلی الله علیک یا

ثم اخذہ بیسارہ وقال: اعتدلوا　　وفی روایۃ اعتدلوا فی صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظہری.

وفی الصحیح البخاری (۱۰۰)، حدثنا انس قال اقیمت الصلاۃ فاقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجہہ فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظہری.

﴿فصل فی شروط الصلاۃ وارکانھا واجباتھا وسننھا وآدابھا﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

(۵۵) نجاست غلیظہ والے کپڑوں کے ساتھ نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو رات کے وقت احتلام ہوگیا بیدار ہونے کے بعد اس نے غسل کیا اور شلوار کو دھولیا پھر نمازیں وغیرہ پڑھتا رہا دوسرے دن ظہر کی نماز سے کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا کہ شلوار کے کونے میں منی لگی ہوئی ہے تو کیا جتنی اس نے نمازیں ادا کی ہیں وہ صحیح ہوگئیں یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟ اگر لوٹانا ضروری ہے تو کیا صرف فرائض وواجبات لوٹائے جائیں گے یا سنت ونوافل بھی لوٹانا ضروری ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کپڑے پر نجاست غلیظہ اگر مقدار درہم سے زیادہ لگی ہو تو نماز نہیں ہوتی ہے اور اگر ایک درہم سے کم یا ایک درہم کے برابر لگی ہو تو اتنی مقدار معاف ہے۔ نماز ہو جاتی ہے مگر پھر بھی نجاست کا دھونا ضروری ہے پس صورتِ مسئولہ میں اگر درہم کی مقدار سے کم یا درہم کے برابر منی لگی ہوئی تھی تو نماز ہوگئی اعادے کی ضرورت نہیں اور اگر ایک درہم سے زیادہ لگی ہوئی تھی تو نماز نہیں ہوئی کیونکہ کپڑوں کا پاک ہونا نماز کی شرائط میں سے ہے اور مذکورہ بالا صورت میں فرائض وواجبات کا لوٹانا ضروری ہے سنت ونفل کا لوٹانا ضروری نہیں۔

لما فی الشامیۃ (۱/۳۱۴): نجاسۃ المنی عندنا مغلظۃ.

وفی الدر المختار مع الشامیۃ (۱/۳۱۶): (وعفا) الشارع (عن قدر درہم) وان کرہ تحریما فیجب غسلہ وما دونہ تنزیہا فیسن وفوقہ مبطل

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وان کرہ تحریما) اشار الی ان العفو عنہ بالنسبۃ الی صحۃ الصلاۃ بہ فلا ینافی الاثم کما استنبطہ فی البحر من عبارۃ السراج

وفی الھندیۃ (۱/۴۳): فلو صلی مع ھذا الثوب صلوات ثم ظھر ان النجاسۃ فی الطرف الاخر یجب علیہ اعادۃ الصلوات التی صلی مع ھذا الثوب کذا فی الخلاصۃ

(۵۶) جن کپڑوں کو کیچڑ لگ جائے ان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کے دنوں میں جب ہم چلتے ہیں تو کپڑوں کو مٹی،

کپڑے وغیرہ پر لگ جاتی ہے تو کیا ان کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر کپڑوں پر کیچڑ وغیرہ لگ جائے تو بوجہ عموم بلوی اور ضرورت شدیدہ کے حضرات فقہاء کرام نے جس کے اندر گنجائش لکھی ہے کہ ان ہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ البتہ اگر کپڑوں کو کوئی ایسی نجاست لگی ہو جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا واجب ہوگا نیز یاد رہے کہ یہ اجازت جواز اس صورت میں ہے کہ اس وقت ضرورت شدیدہ ہو ورنہ عدم ضرورت کے وقت ایسا نہ کرنا چاہیے بلکہ احتیاط کرلی چاہیے۔

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۱۱): والطین المسرقن والردغة فی الطریق فیها نجاسة طاهرة إلا إذا رأى عین النجاسة محروقه دخان النجاسة وفی البحر ماء المطر إذا مر علی العذرات لا ینجس إلا أن تكون العذرة أكثر من الأرض الطاهرة أو تكون العذرة عند المیزاب

وفی الشامیة (۱/۳۲۴، ۳۲۵): والحاصل: أن الذی ینبغی أنه حیث كان العفو للضرورة وعدم إمكان الاحتراز أن یقال بالعفو وإن غلبت النجاسة ما لم یر عینها لو أصابه بلا قصد وكان ممن یذهب ویجیء وإلا فلا ضرورة. وقد حكی فی القنیة أیضاً قولین فیما لو ابتلت قدماه مما رش فی الأسواق الغالبة النجاسة ثم نقل أنه لو أصاب ثوبه طین السوق أو السكة ثم وقع الثوب فی الماء تنجس.

(۵۷) ناپاک گھاس پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایسی گھاس یا صحن میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جس کو پہلے پیشاب لگا ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر پیشاب خشک ہو جائے اور اس کے اثرات وہاں سے زائل ہو گئے ہوں تو نماز پڑھنا درست ہے البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم گھاس میں اس وقت ہے جب گھاس زمین پر لگی ہوئی ہو اگر گھاس کاٹ دی گئی اور بعد میں ناپاک ہوئی تو اسے پاک کرنے کیلئے دھونے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

لما فی الهندیة (۱/۴۴): ومنها الجفاف وزوال الأثر الأرض تطهر بالیبس وذهاب الأثر للصلاة لا للتیمم ولا فرق بین الجفاف بالشمس والنار والریح والظل ویشارك الأرض فی حكمها كل ما كان ثابتاً فیها كالحیطان والأشجار والكلأ والقصب ما دام قائماً علیها فإذا قطع الحشیش والخشب والقصب وأصابته النجاسة لا یطهر إلا بالغسل

(۵۸) بھینسوں کے باڑے پر نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بھینسوں کا باڑہ ہے ہم نے اس کے اندر دری بچھا دیے ہیں تاکہ اس پر نماز پڑھیں گے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں آپ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔

لما في الصحيح للإمام البخاري (۱/۶۱): عن انس بن مالك قال كان النبي ﷺ يصلي في مرابض الغنم ثم سمعته بعد يقول كان يصلي في مرابض الغنم قبل ان يبنى المسجد

وفي عمدة القاري (۴/۱۹۲): (فان قلت) مرابض البقر هل تلحق بمرابض الغنم او بمرابض الابل (قلت) ذكر ابوبكر بن المنذر انها ملحقة بمرابض الغنم فلا تكره الصلاة فيها (فان قلت) في حديث عبدالله بن عمرو من مسند احمد الحاقها بالابل كما تقدم (قلت) في اسناده عبدالله بن لهيعة والكلام فيه مشهور.

وفي الدر المختار (۱/۴۰۲-۴۰۳): ثم الشرط لغة العلامة اللازمة. وشرعا ما يتوقف عليه الشيء ولا يدخل فيه (وهي) ستة (طهارة بدنه) الخ (ومكانه) اي موضع قدميه او احداهما ان رفع الاخرى وموضع سجوده اتفاقا في الاصح لا موضع يديه وركبتيه على الظاهر الا اذا سجد على كفه كما سيجيء (من الثاني) اي الخبث لقوله تعالى: وثيابك فطهر. فبدنه ومكانه اولى.

(۵۹) باریک دوپٹہ میں نماز کی ادائیگی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت باریک دوپٹہ میں نماز پڑھے جس سے سر کے بال نظر آتے ہوں تو ایسے دوپٹہ کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ اس میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں ایسے باریک دوپٹہ میں نماز درست نہیں ہے البتہ نماز کے علاوہ ایسا دوپٹہ استعمال کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تنہائی میں یا محارم اور مسلمان خواتین کے سامنے اوڑھے تو جائز ہے اس کے علاوہ جائز نہیں۔

لما في الهندية (۱/۵۸): والثوب الرقيق الذي يصف ما تحته لا تجوز الصلاة فيه كذا في التبيين

وفي الشامية (۱/۴۰۴): ثم ان الظاهر ان المراد بما يجب ستره في الخلوة خارج الصلاة هو ما بين السرة والركبة فقط حتى ان المرأة لا يجب عليها ستر ما عدا ذلك وان كان عورة. يدل عليه ما في باب الكراهية من القنية حيث قال: وفي غريب الرواية يرخص للمرأة كشف الرأس في

منزلها وحدها فالاولى لها لبس خمار رقيق يصف ما تحته عند محارمها.

(۶۰) سگریٹ اور نسوار کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز کیلئے آتے ہیں تو سگریٹ کی ڈبی (پیکٹ) جیب سے نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں، پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ نشہ والی اشیاء جیب میں ہوں تو نماز نہیں ہوتی۔ کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بو والی چیز جو کسی بھی مخلوق کیلئے ایذا رسانی کا سبب بنے اگرچہ وہ فی نفسہ مباح ہی ہو اس کا استعمال کر کے اجتماع گاہوں میں آنا جائز نہیں ہے اس پر سخت وعیدیں مذکور ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان اشیاء کا استعمال ترک کر دیا جائے یا کم از کم نماز سے قبل ان کے استعمال سے گریز کیا جائے، تاکہ اور لوگ پاس نہ بھی ہوں فرشتے تو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں تاکہ ان کو بھی تکلیف نہ ہو، البتہ اگر ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز ادا کر لی جائے تو فقہاء کرام نے اس میں گنجائش رکھی ہے کہ نماز درست ہو جائے گی لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ خیال کرنا کہ ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی یہ خیال غلط ہے۔

لما في الدر المختار (٦/٤٦٠): (الاصل الاباحة او التوقف) ..... قلت فيفهم منه حكم النبات الذي شاع في زماننا المسمى بالتتن فتنه وقد كرهه شيخنا العمادي في هديته الحاقا بالثوم والبصل بالاولى فتدبر

وفي الشامية تحته: فقول الشارح الحاقا بالثوم والبصل فيه نظر اذ لا يناسب كلام العمادي نعم الحاقه بما ذكر هو الانصاف قال ابو السعود فتكون الكراهة تنزيهية والمكروه تنزيها يجامع الاباحة وقال ط ويؤخذ منه كراهة التحريم في المسجد للنهي الوارد في الثوم والبصل وهو ملحق بهما

(۶۱) وقت کے اندر تاخیر سے پڑھنے سے نماز کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں فجر کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھاتے ہیں کہ جیسے ہی امام سلام پھیر لیتا ہے اس کے چند منٹ بعد ہی سورج طلوع ہوتا ہے۔ کیا اتنی تاخیر سے نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... نماز فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر سورج طلوع ہونے تک ہوتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں اتنی تاخیر سے پڑھی ہوئی نماز درست ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک نماز فجر اتنی تاخیر سے پڑھنا افضل ہے کہ اگر نماز پڑھنے کے بعد کسی وجہ سے نماز کو لوٹانا پڑے تو اسے مسنون قرأت (چالیس سے ساٹھ آیات پڑھنے) کے ساتھ لوٹا سکے تاہم اتنی تاخیر کرنا مناسب نہیں کہ دوران نماز

وكلما دارت السفينة يحول وجهه إليها ولو ترك تحويل وجهه إلى القبلة وهو قادر عليه لا يجزيه.

وفي الدر المختار (٢/١٠١): (صلى الفرض في فلك) جاز (قاعدا بلا عذر صح) لغلبة العجز (وأساء) وقالا لا يصح إلا بعذر وهو الأظهر. برهان (ص١٠١) ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت.

وفي الشامية (٢/١٠٢): (قوله ويلزم استقبال القبلة) أي في فروضها ونفلها. بحر. وإن عجز عنه يمسك عن الصلاة. إمداد عن مجمع الروايات وتمسه يمسك مثله بحث خروج الوقت لما تقرر من أن قبلة العاجز جهة قدرته. وهذا كذلك وإلا فما الفرق فتأمل. وإنما لزمه الاستقبال لأنها في حقه كالبيت حتى لا تطوع فيها موميا مع القدرة على الركوع والسجود بخلاف راكب الدابة. كذا في الكافي شرح المنية

(٢٥) بیت اللہ سے کس قدر انحراف جائز ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کی حالت میں قبلہ سے کتنے انحراف کی گنجائش ہے؟ اگر کوئی شخص سعودی عرب میں نماز پڑھنا چاہے تو کعبہ کے بالکل مقابل میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے یا تھوڑا بہت انحراف ہو جائے تو بھی نماز ہو جائیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر بیت اللہ بالکل سامنے ہو تو سمت کعبہ کی صحت ضروری ہے اور اگر سامنے نہ ہو تو عین دائرہ سے جو انحراف کی گنجائش ہے اگر اتنی مقدار جہت سے منحرف ہو کر نماز پڑھی تو نماز درست ہوگی۔

لما في معارف السنن (٣/٢٤٩): ثم إنه قدر تلك السعة في الجهة بقدر ربع الدائرة وصرحوا بفساد صلاة من خرج عن مقدار الربع وأدنى يحتمل الانحراف في الجهة عن الكعبة نفسها نحو خمس وأربعين درجة كما حققه الغزالي وغيره من المحققين

(٢٦) مسجد سے متصل مکان کی چھت پر نماز میں امام کی اقتداء کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا مکان مسجد سے متصل ہے لیکن صحن مسجد سے باہر متصل ہے اور وہاں سے چھت پر کھڑے ہو کر امام کی اقتداء کرتے ہیں امام کی حرکات ان پر مشتبہ بھی نہیں ہوتی تو کیا یہ اقتداء درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مذکورہ میں اس شخص کی اقتداء صحیح نہیں کیونکہ چھت اگرچہ مسجد کے ساتھ متصل ہے لیکن مکان مختلف ہے اور مکان مختلف ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لما في الهندية (١/٨٨): وان قام على سطح داره المتصل بالمسجد لايصح اقتداءه وان كان لا يشتبه عليه حال الامام

وفي الدر المختار (١/٥٨٦): ولو اقتدى من سطح داره المتصلة بالمسجد لم يجز لاختلاف المكان

(٦٧) ایسے شخص کی نماز کا حکم جو بعض حروف کی ادائیگی پر قادر نہ ہو

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو، الرحیم کی جگہ الرہیم پڑھے، کیا ایسے شخص کی نماز درست ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً — جو شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو تو اس کے نماز پڑھنے کی دو صورتیں ہیں، یا تو وہ شخص امام ہوگا یا منفرد، اگر امام ہے تو وہ اپنے جیسے لوگوں کی تو امامت کر سکتا ہے لیکن ان لوگوں کی امامت نہیں کر سکتا جو الفاظ درست طریقے سے پڑھتے ہوں، اور اگر وہ تنہا نماز پڑھتا ہے تو چونکہ وہ الفاظ درست طریقے سے ادا کرنے پر قادر نہیں تو ایسی صورت میں اس کی اپنی نماز اسی طرح پڑھنا جائز ہے۔

لما في الهندية (١/٧٩): ان ذكر حرفا مكان حرف ولم يغير المعنى بان قرأ ان المسلمون ان الظالمون وما اشبه ذلك لم تفسد صلاته وان غير المعنى فان امكن الفصل بين الحرفين من غير مشقة كالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مكان الصالحات تفسد صلاته عند الكل وان كان لايمكن الفصل بين الحرفين الا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين والطاء مع التاء اختلف المشائخ قال اكثرهم لاتفسد

وفي الشامية (١/٦٣٣): (قوله او بدله باخر) هذا اما ان يكون عجزا كالالثغ وقدمنا حكمه في باب الامامة، واما ان يكون خطاء، وحينئذ فاذا لم يغير المعنى فان كان مثله في القران نحو ان المسلمين لايفسد، والا نحو قيامين بالقسط، وكما قال الشارح لاتفسد عندهما وتفسد عند ابي يوسف، وان غير فسدت عندهما ...... (قوله الامايشق الخ) قال في الخانية والخلاصة الاصل فيما اذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى ان امكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد والايمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال اكثرهم لاتفسد وفي خزانة الاكمل قال القاضي ابو عاصم ان تعمد ذلك تفسد وان جرى على لسانه او لا يعرف التميز لاتفسد وهو المختار

(۶۸) رکوع اور سجدہ پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی کمر کی شدید بیماری میں مبتلا ہے اور یہ آدمی نماز اس طریقے سے پڑھتا ہے کہ کسی تکیہ وغیرہ کو ٹیک لگا کر اشارہ کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں حالانکہ رکوع اور سجدہ کرنے میں تکلیف زیادہ نہیں ہوتی تو کیا رکوع اور سجدے پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز ہے اگر جائز ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے والا رکوع اور سجدہ کس طرح ادا کرے گا؟ جو بھی طریقہ شرعاً جائز ہو، مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً — اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کے جواز کیلئے ضروری ہے کہ مریض کسی بھی طرح سے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو اگر وہ رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر ہو تو اشارہ کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا اس کیلئے جائز نہیں البتہ اگر رکوع اور سجدہ کرنے سے اس کی تکلیف کی زیادتی یا مرض کے بڑھ جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اشارہ سے رکوع اور سجدہ کر سکتا ہے البتہ سجدہ میں بنسبت رکوع کے زیادہ جھکے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ مذکورہ شخص کی تکلیف اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ رکوع اور سجدہ نہ کر سکے۔ اس لئے اس کیلئے اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز نہیں۔

لما فی المحیط البرھانی (۲۶/۳): الأصل فی ھذا الفصل: أن المریض اذا قدر علی الصلاۃ قائما برکوع وسجود فانہ یصلی المکتوبۃ قائماً برکوع وسجود ولا یجزئہ غیر ذلک، لأنہ لما قدر علی القیام والرکوع والسجود کان بمنزلۃ الصحیح، والصحیح لا یجزئہ أن یصلی المکتوبۃ الا قائما برکوع وسجود کذلک ھذا، وان عجز عن القیام وقدر علی القعود فانہ یصلی المکتوبۃ قاعدا برکوع وسجود ولا یجزئہ غیر ذلک لانہ عجز عن نصف القیام وقدر علی النصف فما قدر علیہ لزمہ وما عجز عنہ سقط.

وفی الھندیۃ (۱۳۶/۱): وان عجز عن القیام والرکوع والسجود وقدر علی القعود یصلی قاعدا بایماء ویجعل السجود اخفض من الرکوع کذا فی فتاوی قاضیخان.

وفی الشامیۃ (۹۷/۲): لو قدر علی بعض القیام دون تمامہ او کان یقدر علی القیام لبعض القراءۃ دون تمامھا یؤمر بان یکبر قائما ویقرأ ما قدر علیہ ثم یقعد ان عجز وھو المذھب الصحیح لایروی خلافہ عن اصحابنا، ولو ترک ھذا خفت أن لا تجوز صلاتہ، وفی شرح القاضی فان عجز عن القیام مستویا قالوا یقوم متکئا لایجزئہ الا ذلک وکذا لو عجز عن القعود مستویا قالوا یقعد متکئا لا یجزئہ الا ذلک.

(۶۹) دورانِ سفر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ ایک مرتبہ ہم سفر میں تھے ایک ساتھی نے گاڑی میں سیٹ پر بیٹھے ہوئے نیت باندھی اور اشارے سے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی، بعد میں جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کس طرح نماز پڑھا جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ نوافل پڑھ سکتے ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نوافل کا حکم صرف سفر کے ساتھ خاص ہے یا گاؤں شہر کے اندر بھی اگر کہیں جانا ہو تو گاڑی میں اس طرح نوافل پڑھ سکتے ہیں؟ نیز اسی طرح چاہے سفر ہو یا حضر گاڑی میں نوافل کے علاوہ سنتوں وغیرہ کی نیت باندھی جا سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جب کوئی شخص شہری حدود سے باہر نکلے (مقیم ہو یا مسافر) تو اس کے لئے دورانِ سفر بس کی سیٹ پر بیٹھ کر فجر کی سنتوں کے علاوہ دیگر سنتیں اور نوافل پڑھنا درست ہے۔

وفي الشامية (۲/۴۸): (قوله ويتنفل المقيم راكبا الخ) اي بلا عذر اطلق النفل فشمل السنن المؤكدة الا سنة الفجر.

(۷۰) بحری جہاز میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بحری جہاز میں سفر کر رہا ہو تو اسے نماز کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی کیونکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے تو کیا ہر صورت میں کھڑا ہونا ضروری ہے اگر نہ ہو سکے تو کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر بحری جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مشکل یا متعذر ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

کما في الشامية (۲/۱۰۱): (قوله وهو الاظهر) وفي الحلبة بعد سوق الادلة: والاظهر ان قولهما انه فلا جرم ان في الحاوي القدسي وبه ناخذ... (قوله والا فكالواقفة) اي ان لم تحركها الريح شديدا بل يسيرا فحكمها كالواقفة فلا تجوز الصلاة فيها قاعدا مع القدرة على القيام كما في الامداد.

(۷۱) چارپائی اور گدے پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چارپائی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے، کیا بعض دفعہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی تو موٹے گدے وغیرہ والی جگہ پر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: چارپائی پر نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے بشرطیکہ وہ مضبوط ہو، نیز اونچی جگہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ

چار رکعات کی تھی اور غلطی سے دو رکعات کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں چار رکعات سنتیں ہی ادا ہوں گی، یوں ہی شروع کرتے وقت دل ہی سے دو رکعات کی نیت کی تھی تو پھر دو ہی سنتیں پڑھیگا۔ اور چار رکعات دوبارہ پڑھیگا، اسی طرح اگر سنت کی نیت ہی یا ظہر کے نماز کی نیت کی اور چار رکعات پڑھ لیں تو بھی ظہر کی سنتیں ادا ہو جائیں گی۔

لما فی الدر المختار (۱/۴۱۴): (و) الخامس (النیة) بالاجماع (وهی الارادة) المرجحة لاحد المتساویین ای ارادة الصلاة لله تعالی علی الخلوص، وفی (ص۴۱۵) فلاعبرة للذکر باللسان ان خالف القلب لانه کلام لانیة،

وفی الشامیة تحته: (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهوا اجزأه.

وفی الدر المختار (۱/۴۱۷): (وکفی مطلق نیة الصلاة) وان لم یقل لله (لنفل وسنة) راتبة (وتراویح) علی المعتمد.

(۷۵) واجباتِ نماز کی تعداد، اور قومہ اور جلسہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چھوٹی کتابوں (نماز حنفی، تعلیم الاسلام وغیرہ) میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ واجبات نماز چودہ ہیں جن کے اندر انہوں نے قومہ اور جلسہ بھی شمار کیا، جناب ہم کنز الدقائق پر پہنچے تو اس میں واجبات بارہ لکھے، قومہ اور جلسہ کو سنن صلوٰۃ میں شمار کیا، عبارت یہ ہے: وسننها رفع الیدین للتحریمة ... والقومة والجلسة آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے واجبات نماز کتنے ہیں، اور قومہ، جلسہ واجب ہے یا مسنون؟ اور صاحب کنز نے ان کو سنن کے اندر کس لئے ذکر کر دیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: عام طور پر فقہ کی کتابوں میں واجبات کی تعداد ۱۴ بتائی جاتی ہے اور یہ وہ واجبات ہیں جن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ورنہ واجبات اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ قومہ اور جلسہ کے بارے میں مذہب مشہور تو یہ ہے کہ یہ دونوں مسنون ہیں۔ لیکن محققین فقہاء کرام (جیسا کہ علامہ ابن ہمام اور ان کے شاگرد ابن امیر حاج، علامہ طحاوی، علامہ حصکفی اور علامہ شامی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک وجوب راجح ہے۔ صاحب کنز نے بناء بر مذہب مشہور کے ان (یعنی قومہ اور جلسہ) کو سنن میں ذکر کیا ہے۔

لما فی البحر الرائق (۱/۵۲۳): قید بالطمانینة فی الارکان ای الرکوع والسجود لان الطمانینة فی القومة والجلسة سنة عند ابی حنیفة ومحمد بالاتفاق وعند ابی یوسف فرض کما تقدم وفی شرح الزاهدی مایدل علی وجوبها عندهما کوجوبها فی الارکان فانه قال وذکر صدر القضاة وتمامه الرکوع واکمال کل رکن واجب عند ابی حنیفة ومحمد وعند ابی یوسف والشافعی فرض۔ کذا رفع الراس من الرکوع والانتصاب والقیام والطمانینة فیه فیجب ان یکمل الرکوع حتی یطمئن کل

ہے لیکن اگر کسی شخص کو اس میں حرج ہو تو جتنی مقدار میں نماز میں خشوع و خضوع باقی رہ سکے اتنی دوری مستحب ہے بشرطیکہ پاؤں بالکل کھلے نہ ہوں اور نہ بالکل جڑے ہوں۔

نیز پاؤں رکھنے کا صحیح اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں ورنہ مکروہ ہے۔

لما في الشامية (۱/۴۴۴): وينبغي ان يكون بينهما مقدار اربع اصابع اليد لانه اقرب الى الخشوع هكذا روي عن ابي نصر الدبوسي انه كان يفعله كذا في الكبرى

وفي الدر المختار (۱/۴۰۵): (ويستقبل باطراف اصابعه رجليه القبلة ويكره ان لم يفعل) ذالك.

وفي الشامية تحته (قوله ويكره ان لم يفعل ذالك) وقال الرملي في حاشية البحر ظاهره انه سنة وبه صرح في زاد الفقير.

(۷۷) حالت نماز میں نگاہ کہاں رکھی جائے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نماز میں نظر ایک جگہ نہیں رکھتے ادھر ادھر گھماتے رہتے ہیں کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہو جائے گی نیز نماز کی حالت میں نگاہ کہاں رکھنی چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً حالت قیام میں نگاہ سجدہ گاہ میں رکھنا اور حالت رکوع میں اپنے پاؤں پر رکھنا اور حالت سجدہ میں اپنے ناک پر رکھنا اور حالت قعود میں اپنی گود میں رکھنا اور پہلے سلام کے وقت دائیں کندھے پر اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے پر رکھنا مستحب ہے خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں خشوع اور خضوع مستحب ہے اگر نماز میں خشوع اور خضوع نہ ہو اور نگاہ ادھر ادھر گھمائے تو اس کو حدیث میں اختلاس شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی شیطان کا نماز میں سے چوری کرنا قرار دیا گیا ہے اور اگر نماز میں التفات ہو اور خشوع اور خضوع میں خلل نہ ہو تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔

لما في البخاري (۱/۱۰۴): حدثنا مسدد قال حدثنا ابو الاحوص قال حدثنا اشعث بن سليم عن ابيه عن مسروق عن عائشة قالت سألت رسول الله ﷺ عن الالتفات في الصلوة فقال هو اختلاس يختلسه الشيطان من صلوة العبد

وفي بدائع الصنائع (۱/۲۱۷): فينبغي ان يرمي ببصره الى موضع سجوده في حالة القيام، وفي حالة الركوع الى رؤس اصابع رجليه وفي حالة السجود الى ارنبة انفه، وفي حالة القعدة الى حجره لان هذا كله تعظيم وخشوع

وفي الهندية (۱/۷۲): (وادابها) نظره الى موضع سجوده حال القيام والى ظهر قدميه حالة الركوع

غير جائزة على القادر به يفتى

وفي الشامية تحته: (قوله التي لاتصح بدونها) صفة كاشفة اذ لاشئ من الفروض ما تصح الصلاة بدونه بلا عذر (قوله التحريمة) سميت بها لتحريمها الاشياء المباحة قبل الشروع بخلاف سائر التكبيرات

وفي الدر المختار (۱/۴۷۴، ۴۷۵): (وسننها) ترك السنة لايوجب فسادا ولا سهوا بل اساءة لو عامدا غير مستخف.

وفي حاشية الطحطاوي على المراقي (۱/۲۵۴): ترك السنة لايوجب فسادا ولا سهوا بل اساءة لو عامدا غير مستخف. وملاما على تركها مع لحوق اثم يسير اھ.

(۸۱) تکبیر تحریمہ کے وقت "اللہ اکبر" کہنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت "اللہ اکبر" کہنا واجب ہے یا سنت، ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیر تحریمہ کے وقت "اللہ اکبر" کہنا واجب ہے لہٰذا "اللہ اکبر" کے علاوہ کسی ایسے لفظ سے اگر تکبیر کہی گئی جس سے تعظیم حاصل ہو جیسے "اللہ اجل" وغیرہ تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔

لما في الهندية (۱/۷۳): والذكر ان كان وجب للصلاة فانه يجهر به كتكبيرة الافتتاح

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح (ص ۲۰۳): (قوله ويكره الشروع بغيره) اي تحريماً لانه لترك الواجب

(۸۲) قومہ وجلسہ اور اس میں طمانیت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو وہ رکوع کے بعد سیدھے کھڑے نہیں ہوتے جلدی سے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی قومہ صحیح نہیں کرتے، اسی طرح ایک سجدہ کرنے کے بعد سیدھے نہیں بیٹھتے اس سے پہلے دوسرے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی جلسہ بھی صحیح نہیں کرتے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ قومہ اور جلسہ کا کیا حکم ہے؟ اس میں طمانینت ضروری ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو اس کا خیال نہیں کرنے والوں کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نماز کے تمام ارکان رکوع، سجدہ وغیرہ کی تعدیل تو واجب ہے لیکن قومہ اور جلسہ نماز کے رکن نہیں ہیں اس لئے مشہور مذہب میں یہ سنت کہلاتے ہیں لیکن علامہ شامی اور طحطاوی کی تصریحات کے مطابق قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ [illegible]

قومہ و جلسہ بھی واجب ہے، علامہ ابن الہمام نے بھی نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینت قومہ و جلسہ کے وجوب کو اختیار کیا ہے۔ طمانینت (تعدیل) یہ ہے کہ مصلی ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار ٹھہرا ہو جائے اور تمام اعضاء اپنی جگہ پر ٹھہر جائیں، لہٰذا نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار طمانینت بھی قومہ اور جلسہ میں ضروری ہے اگر کسی سے بھول کر چھوٹ جائے تو سجدہ سہو واجب ہوگا، اور سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز درست ہو جائے گی اور جو لوگ جان بوجھ کر قومہ اور جلسہ نہیں کرتے وہ سخت گناہگار اور مکروہ تحریمی کے مرتکب ہیں ان کی اس طرح پڑھی گئی تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں۔

لما في الدر المختار مع الشامية (۱/ ۴۶۴): وتعديل الاركان اي تسكين الجوارح قدر تسبيحة في الركوع والسجود وكذا في الرفع منهما على ما اختاره الكمال لكن المشهور ان مكمل الفرض واجب ومكمل الواجب سنة، قال ابن عابدين رحمه الله تعالى تحت قوله وتعديل الاركان هو سنة عندهما في تخريج الجرجاني وفي تخريج الكرخي واجب حتى تجب سجدتا السهو بتركه كذا في الهداية، وجزم بالثاني في الكنز، والوقاية والملتقى وهو مقتضى الادلة كما ياتي قال في البحر: وبهذا يضعف قول الجرجاني (قوله وكذا في الرفع منهما) اي يجب التعديل ايضا في القومة من الركوع والجلسة بين السجدتين، وتضمن كلامه وجوب نفس القومة والجلسة ايضاً لانه يلزم من وجوب التعديل فيهما وجوبهما، (قوله على ما اختاره الكمال): قال في البحر ومقتضى الدليل وجوب الطمانينة في الاربعة اي في الركوع والسجود وفي القومة والجلسة، ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذلك كله وللامر في حديث المسيء صلاته، ولما ذكره قاضي خان من لزوم سجود السهو بترك الرفع من الركوع ساهياً وكذا في المحيط فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذلك لان الكلام فيهما واحد، والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال انه الصواب وقال في شرح المنية ولا ينبغي ان يعدل عن الدراية اي الدليل اذا وافقتها رواية على ما تقدم عن فتاوى قاضي خان، ومثله ما ذكر في القنية من قوله: وقد شدد القاضي الصدر في شرحه في تعديل الاركان جميعها تشديداً بليغاً فقال: واكمال كل ركن واجب عند ابي حنيفة ومحمد وعند ابي يوسف والشافعي رحمهما الله فريضة، فيمكث في الركوع والسجود وفي القومة بينهما حتى يطمئن كل عضو منه، هذا هو الواجب عند ابي حنيفة ومحمد رحمه الله حتى لو تركها او شيئاً منها ساهياً يلزمه السهو ولو عمداً يكره اشد الكراهة، ويلزمه ان يعيد الصلوة وتكون معتبرة في حق سقوط الترتيب ونحوه كمن طاف جنباً تلزمه الاعادة، والمعتبر هو الاول كذا هذا، والحاصل ان الاصح رواية ودراية وجوب تعديل

کو دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر کولھوں پر بیٹھنا۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱۱۴/۱)، حضرت وائل بن حجر اور حضرت عباس بن سہل رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۶۵)، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بحوالہ [illegible] (۱/۱۴۱) حضرت خالد بن اللجلاج کی روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۳۲)۔

(۱۰) درود شریف پڑھنا۔ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۴۷۷)۔

(۱۱) درود شریف کے بعد دعا پڑھنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۲/۱۱۵۰)۔

(۱۲) سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں والوں کی نیت کرنا۔ حضرت جابر بن سمرہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہما کی روایات بحوالہ اعلاء السنن (۳/۱۸۲)۔

(۱۳) سلام کے وقت دائیں بائیں رخ پھیرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۴۰)۔

نوٹ: حضرات فقہائے کرام نے کتب فقہ میں مزید سنتیں بھی ذکر کی ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

(۸۶) آستین چڑھا کر یا صرف ناف سے گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ آستین چڑھا کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح بغیر قمیص صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں آستین کہنیوں سے اوپر چڑھا کر یا بغیر قمیص صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن کو چھپا کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اگرچہ نماز ہو جائیگی۔

وفي الهندية (۱/۱۰۶): ولو صلى مع السراويل والقميص عنده يكره كذا في الخلاصة وفي الفتاوى العتابية تكره الصلاة مع البرنس ولا يكره لبسه في الحرب كذا في التاتارخانية ولو صلى رافعا كميه الى المرفقين كره كذا في فتاوى قاضي خان.

(۸۷) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ تکبیر کہتے وقت اٹھانے چاہئیں یا تکبیر سے بعد یا پہلے؟ نیز بعض لوگ اپنی ہتھیلیوں کا رخ چہرے کی طرف رکھتے ہیں آیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کے تینوں طریقے درست ہیں البتہ تکبیر سے پہلے ہاتھ اٹھانا مستحب ہے اور مرد ہاتھوں کو اتنا اٹھائے کہ انگوٹھوں کے پورے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں جبکہ عورت اپنے ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے کیونکہ اسمیں ستر زیادہ ہے، نیز ہتھیلیوں کا رخ چہرہ کی طرف کرنا بھی جائز ہے لیکن بہتر اور مستحب یہ ہے کہ ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف

ہوتا ہے۔

لما فی الہندیۃ (۱/۷۳): قال الفقیہ ابو جعفر یستقبل ببطون کفیہ القبلۃ وینشر اصابعہ ویرفعہما فاذا استقرتا فی موضع محاذاۃ الابہامین شحمتی الاذنین یکبر قال شمس الائمۃ السرخسی علیہ عامۃ المشائخ کذا فی المحیط والرفع قبل التکبیر ھو الاصح واللہ اعلم بالصواب

(۸۸) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی انگلیوں کی حالت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین میں انگلیاں کس حالت میں رکھی جائیں، کھلی رکھے یا ملا کر؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیر تحریمہ کے وقت انگلیوں کو نہ ملانے کی کوشش کرے نہ کھولنے کی، بلکہ اصل حالت پر رکھ کر انگوٹھوں کو کانوں کی لو سے لگائے اور ہتھیلیوں کو قبلہ رخ کرے۔

لما فی البحر الرائق (۱/۳۰۲): قولہ (ونشر اصابعہ) وکیفیتہ ان لا یضم کل الضم ولا یفرج کل التفریج بل یترکہا علی حالہا منشورۃ کذا ذکرہ الشارح والظاہر ان المراد بالنشر عدم الطی بمعنی انہ لیس لہ ان یرفعہما منصوبتین لا مضمومتین حتی تکون الاصابع مع الکف مستقبلۃ القبلۃ ومن السنن ان لا یطاطئ رأسہ عند التکبیر کما فی المبسوط

وفی الدر المختار (۱/۴۷۴): (ورفع الیدین للتحریمۃ) فی الخلاصۃ ان اعتاد ترکہ اثم (ونشر الاصابع) ای ترکہا بحالہا.

قال الشامی رحمہ اللہ تحتہ: (قولہ ای ترکہا بحالہا) قال فی الحلیۃ ظن بعضہم انہ اراد بالنشر تفریج الاصابع وھو غلط بل اراد بہ النشر عن الطی بمعنی یرفعہما منصوبتین لا مضمومتین حتی تکون الاصابع مع الکف مستقبلۃ للقبلۃ ثم لا یخفی انہ لا تتوقف السنۃ علی ضم الاصابع اولاً بل لو کانت منشورۃ غیر منفرجۃ کل التفریج ولا مضمومۃ کل الضم ثم رفعہا کذلک مستقبلاً بہما القبلۃ فقد اتی بالسنۃ.

(۸۹) تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نیت کرتے وقت ہاتھ کہاں تک اٹھانا مسنون ہے؟ اور کہاں باندھنا مسنون ہے؟ نیز اقامت کے دوران یا رکوع کے بعد قومہ میں کسی چیز کے سامنے ہاتھ باندھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں دونوں کانوں تک اٹھائے یہاں تک کہ دونوں انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں اسکے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھوں پشت پر رکھ کر ناف کے نیچے ہاتھ باندھ لے۔ قیام کے دوران اقامت اور رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا ثابت نہیں ہے، جبکہ کسی بڑے کے سامنے ہاتھ تعظیماً باندھ کر کھڑا ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اسلئے کہ تعظیماً ہاتھ باندھنا عبادت کیلئے ہوتا ہے جیسے نماز میں، اور غیر اللہ کی اس طرح پر تعظیم جائز نہیں۔

لما في الهندية (۷۳/۱): وكيفيتها اذا اراد الدخول في الصلاة كبر ورفع يديه حذاء اذنيه حتى يحاذي بابهاميه شحمتي اذنيه وبرؤس الاصابع فروع اذنيه.... (ووضع يده اليمنى على اليسرى تحت السرة) كما فرغ من التكبير وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كما في تكبيرات العيدين فالسنة فيه الارسال كذا في النهاية وهو الصحيح. كذا في الهداية ويرسل اتفاقا في قومة الركوع اذا لم تكن سنة الانتقال لا القومة.

وفيه ايضا (۳۶۹/۵): والتواضع لغير الله حرام.. تجوز الخدمة لغير الله تعالى بالقيام واخذ اليدين والانحناء، ان قبل يد عالم او سلطان عادل لعلمه وعدله لا بأس به وان قبل يد غير عالم وغير السلطان العادل ان اراد به تعظيم المسلم واكرامه فلا بأس به وان اراد به عبادة له او لينال منه شيأ من عرض الدنيا فهو مكروه.

(۹۰) تکبیر تحریمہ کہکر ہاتھ باندھے بغیر فوراً رکوع میں چلے جانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو کہ پنج وقتہ نمازی ہیں کہ جب وہ نماز کیلئے مسجد میں آئے تو امام صاحب رکوع میں تھے، ان صاحب نے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور بغیر باندھے رکوع میں چلے گئے کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور شرعاً ایسی صورت میں کیا کرنا بہتر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص نے تکبیر تحریمہ قیام کی حالت میں کہی ہے اس لئے اس کی نماز درست ہے تکبیر تحریمہ کا قیام یا قیام کے قریب حالت میں کہنا فرض ہے نیز تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنا مسنون ہے البتہ اگر نمازی کو تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہونے کی صورت میں رکعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ہاتھ باندھے بغیر اور ثناء کو چھوڑ کر امام کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔

لما في الهندية (۹۱/۱): وان ادرك الامام في الركوع او السجود يتحرى ان كان اكبر رأيه انه لو اتى به ادركه في شيء من الركوع او السجود يأتي به قائماً والا يتابع الامام ولا يأتي به واذا لم يدرك الامام في الركوع او السجود لا يأتي بهما وان ادرك الامام في القعدة لا يأتي بالثناء بل يكبر

للافتتاح ثم للاحتياط ثم يقعد.

وفي الدر المختار (۱/۴۸۰): ويشترط كونه (قائماً) فلو وجد الامام راكعا فكبر منحنيا ان الى القيام اقرب صح.

(۹۱) تکبیر اولیٰ کی فضیلت کب تک حاصل ہوسکتی ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر اولیٰ کا ثواب کب تک رہتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیر اولیٰ کا ثواب راجح قول کے مطابق پہلی رکعت کے حاصل ہونے تک رہتا ہے۔

لما في الهندية (۱/۶۹): أما فضيلة تكبيرة الإفتتاح فتكلموا في وقت إدراكها والصحيح أن من أدرك الركعة الأولى فقد أدرك فضيلة تكبيرة الافتتاح

وفي الشامية (۱/۵۲۶): وتظهر فائدة الخلاف في وقت إدراك فضيلة تكبيرة الإفتتاح فعنده بالمقارنة، وعندهما إذا كبر في وقت الثناء وقيل بالشروع قبل قراءة ثلاث آيات لو كان المقتدي حاضراً وقيل سبع، لو غائبا وقيل بادراك الركعة الأولى، وهذا أوسع وهو الصحيح اهـ وقيل بادراك الفاتحة، وهو المختار. خلاصة

(۹۲) ناف سے نیچے ہاتھ باندھنے اور عدم رفع یدین کے ثبوت پر ایک تفصیلی فتویٰ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے؟ اور کیا کسی حدیث میں عدم رفع یدین ثابت ہے؟ احادیث سے مسئلہ کو واضح فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: جی ہاں احادیث مبارکہ میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (۳/۳۲۰ طبع ادارۃ القرآن) میں ہے: عن علقمة بن وائل بن حجر عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ وضع يمينه على شماله في الصلوة تحت السرة.

(ترجمہ) حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

اسی طرح مسند امام احمد (۱/۱۱۰) میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو سنن دارقطنی (۱/۲۸۶) اور بیہقی (۲/۳۱) اور ابوداؤد [illegible] (۲/۳۳) اور التعلیق المغنی [illegible] شرح ابوداؤد (۲/۱۹۳، حدیث [illegible]) اور الدارقطنی [illegible] (۱/۲۸۶) [illegible] (۳/۳۲۷) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۳/۳۲۳) اسی طرح حضرت ابوہریرہ کی روایت ابوداؤد [illegible] (۲/۳۳) [illegible]

کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نماز کے اختتام تک نہیں اٹھاتے تھے۔

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل موطا (صفحہ ۹۳) پر منقول ہے: عن عبدالعزیز بن حکیم قال رأیت ابن عمر رضی اللہ عنہ یرفع یدیہ حذاء اذنیہ فی اول تکبیرۃ افتتاح الصلوٰۃ ولم یرفعھما فیما سوی ذلک۔ یعنی عبدالعزیز بن حکیم فرماتے ہیں میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا آپ فقط تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے علاوہ کہیں بھی نہیں اٹھاتے تھے۔ اس کو امام طحاوی نے بھی بطور رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا (۱/۱۶۳) اور یہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۶۷) میں بھی مذکور ہے۔

یہ بطور نمونہ کے چند صحابہ سے احادیث نقل کر دی ہیں اس کے علاوہ تابعین و تبع تابعین اور فقہاء و محدثین میں جماعت کثیرہ کا یہی مسلک ہے جو احناف کا ہے یعنی رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہے اس کے علاوہ نہیں۔ چنانچہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۲/۲۷۲ مصریہ) میں چند صحابہ تابعین اور محدثین کے اسماء گرامی ذکر کیے مثلاً

سفیان ثوری، ابراہیم نخعی، ابن ابی لیلیٰ، علقمہ بن قیس اور اسود بن یزید، عامر شعبی، ابو اسحاق سبیعی، مغیرہ، وکیع، عاصم بن کلیب اور زفر رحمہم اللہ وغیرہم حضرات۔

جن میں اکثر کا ذکر شرح معانی الآثار (۱/۱۶۳) مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۶۷) و مصنف عبدالرزاق (۲/۷۱) وغیرہ میں ہے۔ اس کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۶۷) میں مذکور ہے کہ عن ابی اسحاق قال: کان اصحاب عبداللہؓ و اصحاب علیؓ لا یرفعون ایدیھم الا فی افتتاح الصلوٰۃ قال وکیع ثم لا یعودون۔ یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی اور شاگرد صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے۔ شیخ الاسلام ابوبکر بن عیاش (جو کہ امام ابوداؤد اور احمد بن حنبل کے استاذ ہیں) فرماتے ہیں میں نے کسی فقیہ کو تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین کرتے نہیں دیکھا شرح معانی الآثار (۱/۱۶۵)۔

یہ حضرات صحابہ کرام جن میں خلفاء راشدین بھی شامل ہیں اور محدثین اور تابعین کی جماعت جو رفع یدین رکوع اور سجود کے وقت ترک کر رہے ہیں یقیناً ان کے ہاں نسخ ثابت ہو چکا ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی عالم اسلام کو تو انہوں نے رفع یدین عند الرکوع کرتے دیکھا ہو لیکن خود عمل اس کے خلاف کریں صحابہ کرام کے بارے میں اس طرح کا گمان کہاں ہے۔

نیز اصول حدیث کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ راوی جب اپنی روایت کی ہوئی حدیث کے خلاف عمل کرے تو اس کی روایت کو منسوخ مانا جاتا ہے (حسامی صفحہ ۷۶، توضیح ۲/۲۸۹) یہی عبداللہ بن عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم جو رفع یدین بوقت رکوع نقل کرتے ہیں اور ان حضرات کا عمل اس کے خلاف ہے تو رفع یدین بوقت رکوع کا منسوخ ہونا اس اصول کی روشنی میں ثابت ہو گیا۔

نیز امام نسائی رحمہ اللہ کے صنیع سے بھی رفع یدین عند الرکوع کا نسخ ثابت ہوتا ہے چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ نے اولاً باب رفع الیدین للرکوع قائم کیا اس کے بعد عنوان قائم کیا "ترک ذلک" یعنی رفع الیدین بوقت رکوع ثابت ہے لیکن اس کا ترک بھی ثابت ہے۔ نسخ کی ایک اور دلیل جس کو امام ابوداؤد نے (۱/۱۰۸) میں نقل فرمایا: عن میمون المکی انہ رای عبداللہ بن الزبیر وصلی بھم یشیر بکفیہ حین یقوم وحین یرکع وحین یسجد وحین ینھض للقیام فیقوم فیشیر بیدیہ فانطلقت الی ابن عباس فقلت انی رأیت ابن الزبیر

وفی الشامیۃ (۱/۵۶۳) واما الاقتداء بالمخالف فی الفروع کالشافعی فیجوز مالم یعلم منہ مایفسد الصلاۃ علی اعتقاد المقتدی علیہ الاجماع　ذهب عامۃ مشایخنا الی الجواز اذا کان یحتاط فی مواضع الخلاف والا فلا والمعنی انہ یجوز فی المراعی بلا کراہۃ وفی غیرہ معہا ثم المراعی المهملۃ للمراعاۃ ان یتوضأ من الفصد والحجامۃ والقیء والرعاف ونحو ذلک لافیما هو سنۃ عندہ مکروہ عندنا کرفع الیدین فی الانتقالات وجهر البسملۃ واخفائها

(۹۶) حالت رکوع میں ”الصاق کعبین“ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسئلہ کے بارے میں متردد ہوں وہ یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ کی حالت میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کے ملا کر رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اب اس کے متعلق فتاویٰ شامیہ میں یہ عبارت پڑھی ہے۔

(تنبیہ) تقدم فی الرکوع انہ یسن الصاق الکعبین ولم یذکروا ذلک فی السجود وقدمنا انہ ربما یفهم منہ ان السجود کذلک اذا لم یذکروا تفریجهما بعد الرکوع فالاصل بقاؤهما هنا کذلک تامل. شامی (۱/۵۰۴)

اسی طرح طحطاوی میں ہے ”ویسن الصاق الکعبین فی الرکوع والسجود“ (طحطاوی علی المراقی ۲۲۰)

اب مذکورہ بالا عبارت سے رکوع اور سجدہ میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملا کر رکھنا مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن آج تک کسی معتبر عالم دین سے یہ مسئلہ نہیں سنا تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ الصاق الکعبین سنت ہے یا نہیں ہے؟ مذکورہ بالا عبارات کے مطابق فتویٰ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ براہ مہربانی میرے اشکال کو حل فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　بصورت مسئولہ میں ذکر کی گئی عبارت سے اگرچہ رکوع وسجود میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملا کر رکھنا مسنون معلوم ہوتا ہے لیکن درج ذیل وجوہ کی بنا پر ان عبارت کے مطابق فتویٰ نہیں دیا جائے گا لہٰذا راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ رکوع میں ”الصاق کعبین“ مسنون نہیں ہے۔

(۱)　پہلی وجہ الصاق الکعبین کے مسنون نہ ہونے کی یہ ہے کہ جمہور فقہاء کرام نے اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں کیا چونکہ متون وشروح کی معتبر کتب جیسے قدوری، کنز، ہدایہ، بنایہ، فتح القدیر وغیرہ اسی طرح دیگر کتب معتبرہ میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

(۲)　صرف متاخرین کی چند کتب میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر ملتا ہے ان کے بارے میں بھی یہ صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے صاحب قنیہ کی اتباع میں لکھا ہے اور اس مسئلے کو فقہاء نے صاحب قنیہ کے اوہام میں سے قرار دیا ہے۔

(۳)　متاخرین کی کتب میں اعلاء السنن (۳/۴۴۰) میں رکوع وسجود دونوں میں الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا قول نقل کیا

ہے جیسا کہ خود مصنف نے امداد الاحکام (۱/۲۰۰) میں فتویٰ اس کے برعکس دیا ہے یعنی الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلے پر کوئی صحیح وصریح روایت دال نہیں ہے۔ لہٰذا جب مصنف کا اپنا فتویٰ روایت کے مخالف ہے تو امداد الفتاویٰ والی عبارت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۴) امام طحاوی نے شرح معانی الآثار (صفحہ ۱۱۶) میں بذریعہ نظر کے الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کی تردید کی ہے۔

(۵) جب تطبیق بین الرکبتین بالاتفاق منسوخ ہو گئے تو اب الصاق الکعبین کو مسنون قرار دینا بظاہر بہت مشکل ہے اور خشوع کے خلاف ہے اسی بات کی طرف طحطاوی علی الدر میں اشارہ کیا گیا ہے اس عبارت میں قوله والصاق كعبيه حالة الركوع هذا فيه عسر له ولا تكيف تيسير له على الظاهر (طحطاوی ۱/۲۱۳) الغرض مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر راجح یہی ہے کہ الصاق الکعبین رکوع وسجود میں مسنون نہیں ہے۔

لما في الصحيح للبخاري (۱/۱۰۹): عن ابي يعفور قال سمعت مصعب بن سعد صليت الى جنب ابي فطبقت بين كفي ثم وضعتهما بين فخذي فنهاني ابي وقال كنا نفعله فنهينا عنه وامرنا ان نضع ايدينا على الركب.

وفي مصنف ابن أبي شيبة (۲/۱۱۰): عن ابي عبيدة قال خرج عبد الله من داره الى المسجد واذا رجل يصلي صافاً بين قدميه فقال عبد الله اما هذا فقد اخطأ السنة ولو راوح بين قدميه كان احب الي

وفي تقريرات الرافعي (۱/۲۰): (قول الشارح ويسن ان يلصق كعبيه) قال الشيخ ابو الحسن السندي الصغير في تعليقه على الدر هذه السنة انما ذكرها من ذكرها من المتأخرين تبعاً للمجتبى وليس لها ذكر في الكتب المتقدمة كالهداية وشروحها وكان بعض مشايخنا يرى أنها من اوهام صاحب المجتبى ولم نرد في السنة على ما وقفنا عليه وكأنهم توهموا ذالك مما ورد أن الصحابة كانوا يهتمون بسد الخلل في الصفوف حتى يضمون الكعاب والمناكب ولا يخفى ان المراد هنا الصاق كعبه بكعب صاحبه لا كعبه مع كعبه الآخر.

قلت ولعل الشيخ أبا الحسن لم يلحظ الى الآثار الواردة في ان التراوح بين القدمين في الصلوة معللة الفصل من الصف فيهما اھ.

(۹۷) اگر امام جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو پھر کیا کرے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی امام رکوع میں جاتے وقت یا سجدہ سے اٹھتے وقت جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو اب وہ مقتدیوں کو کس طرح متنبہ کرے گا آیا دوبارہ تکبیر کہے گا یا کوئی اور طریقہ اپنایا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورتِ مسئولہ میں امام صاحب کو چاہئے کہ جب بھولی ہوئی تکبیر یاد آجائے تو مقتدیوں کو بتلانے کے لیے دوبارہ جہراً تکبیر کہہ لے۔

لما فی التاتارخانیة (۱/۵۰۳): ولو ترک تکبیرات الرکوع والسجود وتسبیحاتهما فلا سهو فیهما

وفی الهندیة (۱/۱۲۶): ولا یجب بترک التعوذ والبسملة فی الاولی والثناء وتکبیرات الانتقالات

وفی رد المحتار (۲/۱۲۶): (قوله وتکبیر انتقال) ای الی رکوع أو سجود او رفع منه (قوله وتسمیع) ای اذا ترکه الامام لایترک المؤتم التحمید.

(۹۸) "سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد" کے ساتھ کچھ کلمات بڑھا کر پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک امام جو فرض نماز میں رکوع کے بعد قیام میں سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کے بعد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ پڑھتا ہے تو ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ یہ صحیح نہیں ہے اس طرح کرنے سے ایک رکن کی زیادتی ہوتی ہے اور اس پر سجدہ سہو لازم ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں اور اس امام کا اس طرح کرنے سے نماز میں کوئی اثر تو واقع نہیں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سوال میں مذکورہ کلمات حدیث سے ثابت ہیں۔ احناف کے ہاں یہ نفل میں پڑھتے ہیں، لہٰذا امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے یہ کلمات نہ پڑھے۔ البتہ اگر یہ کلمات پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

فما فی شرح الکبیر (ص۳۱۰): (وان کان المصلی مقتدیا) فانه یاتی بالتحمید بان یقول اللهم ربنا ولک الحمد او اللهم ربنا لک الحمد او ربنا ولک الحمد او ربنا لک الحمد وافضلها علی ترتیبها کذا فی الکافی.

وفیه ایضا (ص۳۱۳): (ولا ینبغی للامام ان یطیل التسبیح) أو غیره (علی وجه یمل به القوم) اذا اتی بقدر السنة (لانه) ای التطویل المذکور (سبب التنفیر) عن الجماعة (وانه) ای التنفیر عن الجماعة (مکروه) لانه مؤد الی حرمان المسلمین الثواب الموعود علی الصلوة بالجماعة

وفی الدر المختار (۱/۵۶۴): ویکره تحریما (تطویل الصلاة) علی القوم زائدا علی قدر السنة فی قراءة وأذکار رضی القوم أو لا لاطلاق الأمر بالتخفیف نهر وفی الشرنبلالیة ظاهر حدیث معاذ انه لایزید علی صلاة أضعفهم مطلقا ولذا قال الکمال إلا لضرورة ... اھ

(۹۹) رکوع سجدہ میں تسبیح پڑھنے کی مسنون مقدار نیز نماز میں درود ابراہیمی کی جگہ کوئی دوسرا مختصر درود پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ نماز کے رکوع اور سجدہ میں عام طور پر کم از کم تین بار سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا جاتا ہے اگر کوئی شخص جلدی میں ہو تو کیا وہ صرف ایک بار یہ تسبیح پڑھ سکتا ہے کیا اس کی نماز ہو جانے گی؟ نماز میں زیادہ سے زیادہ کتنی بار تسبیح پڑھی جائے گی؟ نمازی آخری رکعت میں نمازی سلام پھیرنے سے پہلے تین دعائیں پڑھتا ہے جیسے التحیات پھر درود ابراہیمی اور آخر میں ایک دعاء۔

(i) کیا آخر میں جو دعا پڑھتا ہے وہ مخصوص ہے یا علماء نے جو چند بتائی ہیں ان میں سے کوئی ایک پڑھ سکتا ہے؟

(ii) اگر ایک شخص جلدی میں ہے تو نماز مختصر کرنے کی نیت سے وہ آخری دعا نہیں پڑھتا اور درود ابراہیمی کے بعد سلام پھیر لیتا ہے کیا اس کی نماز درست ہے؟

(iii) اگر کوئی شخص جلدی کی وجہ سے پورا درود ابراہیمی کے بجائے صرف اللھم صل علی محمد وبارک وسلم پڑھ لے تو اس کی نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: رکوع اور سجدے میں تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے سے سنت ادا ہو جاتی ہے جبکہ منفرد جیسے حالت ہو بہتر یہ ہے کہ رکوع اور سجدے میں تسبیح سات یا نو دفعہ پڑھے، البتہ امام تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے پر اکتفا کرے اگر مقتدیوں کے اکتا جانے کا اندیشہ ہو، نیز رکوع یا سجدے میں اگر کوئی شخص ایک ہی دفعہ تسبیح پڑھتا ہے تو ایسا کرنا مکروہ ہے لیکن نماز ہو جائے گی۔

(i) آخری قعدہ میں درود شریف پڑھنے کے بعد ہر ماثور دعا پڑھ سکتے ہیں جو کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو کوئی خاص دعا متعین نہیں ہے تاہم وہ دعا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی جو کہ صحیح بخاری شریف (۱۱۵/۱) میں بھی موجود ہے اس کے پڑھنے کا معمول بنا لینا بہتر ہے وہ دعا یہ ہے: اللّٰھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرۃ من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔

(ii) آخری قعدہ میں تشہد کا پڑھنا واجب ہے جبکہ درود شریف اور اس کے بعد دعا کا پڑھنا مسنون ہے، آخری دعا کا ترک کرنا مکروہ ہے لیکن نماز ہو جائے گی تاہم اگر کوئی عذر ہو جیسا کہ بیماری وغیرہ تو پھر کوئی حرج نہیں۔

(iii) مذکورہ درود شریف پڑھ لے تو بھی نماز ہو جائے گی البتہ درود ابراہیمی پڑھنا بہتر ہے جو کہ صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے۔

کما فی الشامیۃ (۴۹۴/۱): (قولہ کرہ تنزیھا) ای بناء علی ان الامر بالتسبیح للاستحباب بحر

والحاصل أن في تثليث التسبيح في الركوع والسجود ثلاثة أقوال عندنا، أرجحها من حيث الدليل الوجوب تخريجا على القواعد المذهبية، فينبغي اعتماده كما اعتمد ابن الهمام ومن تبعه رواية وجوب القومة والجلسة والطمأنينة فيهما كما مر، وأما من حيث الرواية فالأرجح السنية لأنها المصرح بها في مشاهير الكتب وصرحوا بأنه يكره أن ينقص عن الثلاث وأن الزيادة مستحبة بعد أن يختم على وتر خمس أو سبع أو تسع مالم يكن اماما فلا يطول وقدمنا في سنن الصلاة عن أصول أبي اليسر أن حكم السنة أن يندب الى تحصيلها ويلام على تركها مع حصول اثم يسير، وهذا يفيد أن كراهة تركها فوق التنزيه وتحت المكروه تحريما، وبهذا يضعف قول البحر ان الكراهة هنا للتنزيه لأنه مستحب وان تبعه الشارح وغيره فتدبر.

وفي الهداية (۱۰۵/۱) ودعا بما يشبه الفاظ القرآن والادعية المأثورة لما روينا من حديث ابن مسعودؓ

وفي الهندية (۷۶/۱) ومن الادعية المأثورة ماروی عن أبي بكر رضي الله عنه انه قال لرسول الله ﷺ علمني دعاء أدعو به في صلاتي فقال قل اللهم اني ظلمت نفسي ظلما كثيرا وانه لا يغفر الذنوب الا انت فاغفرلي مغفرة من عندك وارحمني انك أنت الغفور الرحيم.

وفي الشامية (۴۵۳/۱) (قوله وترك كل سنة ومستحب) السنة قسمان سنة هدى وهي المؤكدة. وسنة زوائد والمستحب غيره وهو المندوب، أو هما قسمان وقد يطلق عليه سنة، وقدمنا تحقيق ذلك كله في سنن الوضوء قال في البحر عند قوله وعلى بساط فيه تصاوير: الحاصل أن السنة ان كانت مؤكدة قوية لايبعد كون تركها مكروها تحريما، وان كانت غير مؤكدة فتركها مكروه تنزيها، وأما المستحب أو المندوب فينبغي أن يكره تركه أصلا الخ

وفي الشامية (۵۱۲/۱) (قوله وصلى على النبي ﷺ) قال في شرح المنية: والمختار في صفتها مافي الكفاية والقنية والمجتبى قال: سئل محمد عن الصلاة على النبي ﷺ فقال يقول: اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد، وبارك على محمد وعلى آل محمد كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد وهي الموافقة لما في الصحيحين وغيرهما الخ.

(۱۰۰) سجدہ میں زمین پر پاؤں رکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ سجدہ میں ساتھ

اعضاء کا زمین پر ٹکنا ضروری ہے جن میں پاؤں بھی شامل ہیں۔ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سجدہ کی حالت میں ان کے دونوں پاؤں زمین سے اٹھے ہوتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً جن حضرات کے حالت سجدہ میں دونوں پاؤں زمین سے اٹھے ہوتے ہیں ان کی نماز درست نہیں ہوتی کیونکہ وضع القدمین واجب ہے البتہ دونوں پاؤں میں سے کسی ایک کا کوئی جز بقدر تسبیح واحد رکھنا صحت صلوۃ کے لئے کافی ہے اگر پورے سجدہ میں بقدر ایک تسبیح کے دونوں پاؤں میں سے کسی کا کوئی جز زمین پر رکھا گیا تو واجب ادا ہو جائے گا اگر اتنی مقدار بھی نہیں رکھا تو ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ واضح رہے کہ صرف ایک قدم کو زمین پر رکھنا بلا عذر مکروہ ہے۔

لما في شرح العيني (۱/۳۰): الخامس السجود لقوله تعالىٰ اركعوا واسجدوا وفي حاشية العيني والسجود بجبهته وقدميه ووضع اصبع واحدة شرط

السادس تعديل الاركان وهو تسكين الجوارح في الركوع والسجود حتى تطمئن مفاصله وادناه مقدار تسبيحة وفي حاشية العيني اي تسكين الجوارح في الركوع والسجود مقدار تسبيحة

وفي فتح القدير (۱/۳۰۵): وأما افتراض وضع القدم فلأن السجود مع رفعهما بالتلاعب أشبه منه بالتعظيم والاجلال، ويكفيه وضع أصبع واحدة وفي الوجيز وضع القدمين فرض فإن وضع إحداهما دون الاخرى جاز ويكره.

وفي الشامية (۱/۴۴۷): لو لم يضع شيئاً من القدمين لم يصح السجود.

وفي الدر المختار (۱/۴۶۴): (وتعديل الاركان) اي تسكين الجوارح قدر تسبيحة في الركوع والسجود وكذا في الرفع منهما.

وفي الشامية (۱/۵۰۳): وان ابن امير حاج رجح في الحلبة الثانية وصرح هنا بأن توجيه الاصابع نحو القبلة سنة فتبين ماقدمناه من ان الخلاف السابق في اصل الوضع لافي التوجيه وان التوجيه سنة عندنا قولاً واحداً ويؤيد ماقلناه ان المحقق ابن الهمام قال في زاد الفقير ومنها اي من سنن الصلاة توجيه اصابع رجليه الى القبلة الخ.

(۱۰۱) مقتدی نے ابھی رکوع یا سجدہ کی تسبیحات ختم نہیں کیں کہ امام نے سر اٹھا لیا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی نے ابھی تین تسبیحات پوری نہیں پڑھی تھیں کہ امام نے رکوع سے یا سجدے سے سر اٹھا لیا۔ تو مقتدی ساتھ ہی سر اٹھائے یا تین تسبیحات پوری کرنے کے بعد اٹھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً بصورت مسئولہ میں مقتدی پر تین تسبیحات پوری کرنی ضروری نہیں بلکہ امام کی متابعت ضروری ہے اس لئے امام

کی متابعت فرض ہے۔

لما فی قاضیخان (۱/۸۷): ولو رفع الامام رأسه من الرکوع او السجود قبل ان یسبح المقتدی ثلاثا تکلموا فیه والصحیح انه یتابع الامام لأن متابعة الامام فرض فلا یترکها بالسنة ... الخ

وفی الهندیة (۱/۹۰): ولو رفع الامام رأسه من الرکوع او السجود قبل ان یسبح المقتدی ثلاثا الصحیح انه یتابع الامام ... الخ.

(۱۰۲) فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورت ملانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر نمازی فرض میں تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اگر کوئی سورۃ ملالے تو آیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: فرض نماز کی تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملانے کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لما فی الهندیة (۱/۱۲۶): ولو قرأ فی الأخریین الفاتحة والسورة لایلزمه السهو وهو الأصح.

وفی الدر المختار (۱/۵۱۱): (واکتفی) المفترض (فیما بعد الأولیین بالفاتحة) فإنها سنة علی الظاهر ولو زاد لابأس به.

وفی الشامیة تحته: (قوله ولو زاد لابأس) أی لو ضمّ الیها سورة لابأس به لأن القراءة فی الأخریین مشروعة من غیر تقدیر.

(۱۰۳) قعدہ اولیٰ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قعدہ اولیٰ میں بیٹھنا واجب ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگایا ہے وہ کہتا ہے کہ سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قعدہ اولیٰ واجب ہے۔ آپ کے دوست کو مغالطہ ہوا ہے اور اس طرح بلا تحقیق شرعی احکام کو بیان نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے معاشرے میں دینی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

وفی الهندیة (۱/۷۱): وتجب القعدة الاولیٰ قدر التشهد اذا رفع رأسه من السجدة الثانیة فی الرکعة الثانیة فی ذوات الاربع والثلاث هو الاصح هکذا فی الظهیریة.

وفی الدر المختار (۱/۴۶۵): (والقعود الاول) ولو فی نفل فی الأصح وکذا ترک الزیادة فیه علی التشهد واراد بالأول غیر الاخیر

(۱۰۴) تشہد میں اشارہ بالسبابہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک امام صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... نماز کے اندر تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

لما فی سنن ابی داؤد (۱/۱۴۲): عن عبداللہ بن الزبیر انہ ذکر ان النبی ﷺ کان یشیر باصبعہ اذا دعا ولا یحرکھا.

وفی الدر المختار (۱/۵۰۸،۵۰۹): وشیخ الاسلام الجد وغیرھم انہ یشیر لفعلہ علیہ الصلاۃ والسلام ونسبوہ لمحمد والامام بل فی متن درر البحار وشرحہ غرر الاذکار المفتی بہ عندنا انہ یشیر باسطا اصابعہ کلھا وفی الشرنبلالیۃ عن البرھان الصحیح انہ یشیر بمسبحتہ وحدھا یرفعھا عند النفی ویضعھا عند الاثبات واحترز بالصحیح عما قیل لایشیر لانہ خلاف الدرایۃ والروایۃ ویقولنا بالمسبحۃ عما قیل یعقد عند الاشارۃ وفی العینی عن التحفۃ الاصح انھا مستحبۃ.

وفی الشامیۃ (۱/۵۰۹): وفی القھستانی: وعن اصحابنا جمیعاً انہ سنۃ فیحلق ابھام الیمنی ووسطھا ملصقا راسھا براسھا ویشیر بالسبابۃ فھذہ النقول کلھا صریحۃ بان الاشارۃ المسنونۃ انما ھی علی کیفیۃ خاصۃ الخ.

(۱۰۵) ”اشارہ بالمسبابہ فی الصلوۃ“ عندالاحناف مکروہ ہے یا سنت؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ احادیث مبارکہ سے نماز کے اندر تشہد کی حالت میں انگلی سے اشارہ کرنے کا جواز بلکہ سنیت واضح طور پر ثابت ہے اور احناف رحمہم اللہ بھی اس کے قائل ہیں لیکن احناف پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ”خلاصہ کیدانی“ والے نے اس کو مکروہ لکھا ہے، مگر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف معلوم نہیں لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ فتاویٰ سراجیہ نے بھی ”اشارہ بالسبابہ“ کو مکروہ لکھا ہے، چنانچہ لکھا ہے (صفحہ ۱۱): ویکرہ ان یشیر بالسبابۃ فی الصلوۃ عند قولہ ”اشھد ان لا الٰہ الا اللہ“ وھو المختار.

اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ کیا احناف کی دیگر کتابوں میں بھی اس طرح حوالہ ملتا ہے یا نہیں، اگر ہے جیسا کہ فتاویٰ سراجیہ میں ہے تو احناف کی دیگر کتابوں نے اس کا کوئی جواب یا رد لکھا ہے یا نہیں؟ فقط واللہ تعالیٰ

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں تشہد میں ... کے علماء واحناف کی بعض کتابوں میں تشہد کے اندر ... انگلی سے اشارہ کرنے کی کراہت کا قول موجود ہے لیکن اس اختلاف کے متاخرین حضرات (علامہ محقق علامہ ابن ہمام، علامہ ... علامہ شامی رحمہم اللہ) اس کے رد میں فرماتے ہیں کہ کراہت کا قول روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں مفتیٰ بہ جواز اور سنت کا ہے۔

لما في حاشية الطحطاوي على المراقي (ص۲۹۹): (و) تسن (الاشارة في الصحيح) لانه ﷺ رفع اصبعه السبابة وقد أحناها شيء ومن قال انه لا يشير أصلا فهو خلاف الرواية والدراية

وقال الطحطاوي رحمه الله تحته: (قوله فهو خلاف الرواية) لانه روي عن عدة اخبار منها ما أخرجه ابن السكن في صحيحه عن ابن عمر (قوله والدراية) لان الفعل يوافق القول فكما ان القول فيه النفي والاثبات يكون الفعل كذلك

وفي الشامية (۱/۵۰۹): وعن كثير من المشائخ لايشير اصلا وهو خلاف الدراية والرواية فعن محمد ان ما ذكر في كيفية الاشارة قول أبي حنيفة ومثله في فتح القدير. وفي القهستاني وعن اصحابنا جميعا انه سنة وهذا ما اعتمده المتاخرون لثبوته عن النبي ﷺ بالاحاديث الصحيحة ولصحة نقله عن ائمتنا الثلاثة فلذا قال في الفتح ان الأول خلاف الدراية والرواية

وفي الموطا للامام محمد (ص۱۰۲): عن علي ابن عبدالرحمن المعاوي انه قال رآني عبد الله ابن عمر وانا اعبث بالحصى في الصلوة فلما انصرفت نهاني وقال اصنع كما كان رسول الله ﷺ يصنع فقلت كيف كان رسول الله ﷺ يصنع قال كان رسول الله ﷺ اذا جلس في الصلوة وضع كفه اليمنى على فخذه اليمنى وقبض اصابعه كلها واشار باصبعه التي تلي الابهام ووضع كفه اليسرى على فخذه اليسرى قال محمد وبصنيع رسول الله ﷺ ناخذ وهو قول ابي حنيفة رحمه الله.

وفي حاشية للامام الهمام ابي الحسنات محمد عبدالحي اللكنوي.

(قوله وهو قول ابي حنيفة) وقد ذكر ابن الهمام في فتح القدير والشمني في شرح النقاية وغيرهما انه ذكر ابو يوسف رحمه الله في الامالي مثل ما ذكر محمد فظهر ان اصحابنا الثلثة اتفقوا على تجويز الاشارة لثبوتها عن النبي ﷺ واصحابه بروايات متعددة وطرق متكثرة لا سبيل الى انكارها ولا الى ردها وقد قال به غيرهم من العلماء حتى قال ابن عبدالبر انه لا خلاف في ذلك والى الله المشتكى من صنع كثير من اصحابنا من اصحاب الفتاوى كصاحب الخلاصة والبزازية والكبرى والعتابية والغياثية والولوالجية وعمدة المفتي والظهيرية وغيرها حيث ذكروا ان المختار

عن عدم الاشارة بل ذكر بعضهم انها مكروهة والذي حملهم على ذلك سكوت ائمتنا عن هذه المسألة في ظاهر الرواية ولم يعلموا انه قد ثبت عنهم بروايات متعددة ولا انه ورد في احاديث متكثرة فالحذر الحذر من الاعتماد على قولهم في هذه المسألة مع كونه مخالفا لما ثبت عن النبي ﷺ واصحابه بل وعن ائمتنا ايضاً بل لو ثبت عن ائمتنا التصريح بالنفي وثبت عن رسول الله ﷺ واصحابه الاثبات لكان فعل الرسول واصحابه احق والزم بالقبول فكيف وقد قال به ائمتنا ايضاً

(۱۰۶) تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ

سوال　کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ تشہد میں انگلی اٹھانے کی کیفیت، طریقہ اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بعد از اٹھانے رہنا چاہئے یا نہیں؟ نیز کب اٹھانا چاہئے اور کب رکھنا چاہئے؟ آخر میں یہ بھی بتادیں کہ یہ طریقہ کس حدیث شریف میں مذکور ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نمازی کلمہ شہادت پر پہنچتے وقت چھنگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی بند کرے اور درمیانی انگلی کا انگوٹھے کے ساتھ حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی "لا الٰہ" پر اٹھائے اور "الا اللہ" پر جھکا دے، پھر حلقہ کی ہیئت کو آخر تک باقی رکھے۔　مذکورہ بالا طریقہ سنت ہے اور یہ طریقہ ابن ماجہ کی حدیث (ص ۶۵) اور ابوداؤد کی حدیث (۱/۱۴۲) میں مذکور ہے۔ نیز انگلی کو اٹھانے کے بعد ہلاتے رہنا مکروہ ہے، چونکہ نماز کے اندر سکون ووقار کے خلاف ہے جبکہ نماز میں سکون مطلوب ہے۔

لما في سنن ابي داؤد (۱/۱۴۲): عن عبدالله بن الزبير انه ذكر ان النبي ﷺ كان يشير باصبعه اذا دعا ولا يحركها.

وفي اعلاء السنن (۳/۱۴۱): قال الطحطاوي في حاشيته على مراقي الفلاح: قوله ويسن الاشارة اي من غير تحريك فانه مكروه عندنا

وفي رسائل ابن عابدين (۱/۱۳۴): والصحيح المختار عند جمهور اصحابنا انه يضع كفيه على فخذيه ثم عند وصوله الى كلمة التوحيد يعقد الخنصر والبنصر ويحلق الوسطى والابهام ويشير بالمسبحة رافعا لها عند النفي وواضعا لها عند الاثبات ثم يستمر على ذلك الخ.

(۱۰۷) تشہد میں انگلیوں کا حلقہ کب تک بنائے رکھا جائے؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے یہ کس وقت تک رکھنا چاہئے۔ اشهد ان محمدا عبده ورسوله پر ختم کردینا چاہئے یا آخر سلام تک رکھنا چاہئے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

پڑھتے ہیں تو پیچھے والے درود تک پڑھتے ہیں اور امام صاحب سلام پھیر دیتے ہیں یہ پورا کرنا چاہئے یا امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔ اس صورت میں آپ کو امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے۔

وفی الهندیة (۱/۹۰): ولو سلم الامام قبل ان یفرغ المقتدی من الدعاء الذی یکون بعد التشهد أو قبل أن یصلی علی النبی ﷺ فانه یسلم مع الامام.

(۱۱۰) مقتدی کا التحیات کے شروع میں اور ہر رکن میں بسم اللہ پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل عشاء کی نماز میں میرے برابر ایک مقتدی نمازی تھے۔ جب امام صاحب نے قعدۂ اولیٰ کیا تو انہوں نے التحیات الخ پڑھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی، کیا اس طرح کرنے سے نماز میں کچھ حرج تو نہیں ہوتا؟ اور ہر رکن میں اگر بسم اللہ پڑھی جائے تو شرعاً یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔ مذکورہ صورت میں مذکور شخص کی نماز درست ہے اور اس پر مقتدی ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو بھی نہیں البتہ رکوع، سجود اور تشہد کے شروع وغیرہ میں جو قرآت کا محل نہ ہو قرآت نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے تاخیر واجب یا تاخیر رکن لازم آتا ہے جس سے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ بسم اللہ صرف ہر رکعت کے شروع میں سنت ہے اور ہر رکن میں اس کا پڑھنا کہیں بھی ثابت نہیں لہذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

لما فی الهندیة (۱/۱۲۷): وذکر هناک اذا بدأ فی موضع التشهد بالقراءة ثم تشهد فعلیه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقراءة فلا سهو علیه.

وفی الشامیة (۲/۸۱): (قوله وتاخیر قیام الخ) أشار إلی أن وجوب السجود لیس لخصوص الصلاة علی النبی ﷺ بل لترک الواجب وهو تعقیب التشهد للقیام بلا فاصل حتی لو سکت یلزمه السهو کما قدمناه فی فصل اذا أراد الشروع، قال المقدسی وکما لو قرأ القرآن هنا أو فی الرکوع یلزمه السهو مع أنه کلام الله تعالیٰ، وکما لو ذکر التشهد فی القیام مع أنه توحید الله تعالیٰ.

(۱۱۱) نماز کے درود میں لفظِ سیدنا کا اضافہ اور مختلف ارکان میں دعائیں پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ محمد سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا درست ہے؟ نیز دعائیں ماثورہ جو کہ مختلف ارکان میں پڑھی جاتی ہیں کیا فرضوں میں ان کا پڑھنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔ نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ "محمد" اور لفظ "ابراہیم" (علیہما الصلاۃ والسلام) سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا افضل ہے اور ادعیہ ماثورہ فرض نماز کے مختلف ارکان میں امام کو نہ پڑھنا چاہئے اس لئے کہ امام کو تخفیف (ہلکی) نماز

پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے، لہذا مقتدی حضرات کیلئے اس امر کا خیال رکھ کر نماز کے مختلف ارکان میں پڑھنا درست ہے چاہے نماز فرض ہو یا نفل۔

لمافي الهندية (۱/۹۰): وينبغي للامام أن لايطول بهم الصلاة بعد القدر المسنون وينبغي له أن يراعي حال الجماعة هكذا في الجوهرة النيرة.

وفي الطحطاوي (۱/۲۲۹): (قوله وندب) يحتمل أن يقرأ بصيغة المصدر عطفاً على فاعل صح أو بصيغة المجهول وظاهر الشرح طلبها في نبينا و أبيه الخليل عليهما الصلاة والسلام لاشتراكهما فيها وصيغة الصلاة على هذا "اللهم صل على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما صليت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انك حميد مجيد وبارک على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما باركت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد وترحم على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما ترحمت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد ولا يخفى أن هذه الزيادة مستحبة حلبي بزيادة (قوله لان زيادة الاخبار) الاولى حذف زيادة (قوله نقله الرملي) فيه أنه ليس من أهل المذهب.

وفي الدر المختار (۱/۵۱۳، ۵۱۴): وندب السيادة لأن زيادة الاخبار بالواقع عين سلوک الأدب فهو افضل من تركه ذكره الرملي الشافعي وغيره ومانقل لا تسودوني في الصلاة فكذب و قولهم لا تسيدوني بالياء لحن أيضا والصواب بالواو.

وفي الشامية تحته : (قوله ذكره الرملي الشافعي) اى في شرحه على منهاج النووى ونصه: والأفضل الاتيان بلفظ السيادة كما قاله ابن ظهيرة وصرح به جمع وبه أفتى الشارح لأن فيه الاتيان بما أمرنا به وزيادة الاخبار بالواقع الذي هو ادب فهو أفضل من تركه وإن تردد في أفضليته الأسنوي، وأما حديث "لاتسيدوني في الصلوة" فباطل لا أصل له كما قاله بعض متأخري الحفاظ وقول الطوسي إنها مبطلة غلط واعترض بأن هذا مخالف لمذهبنا لمامر من قول الامام من انه لوزاد في تشهده أو نقص فيه كان مكروها قلت فيه نظر فإن الصلاة زائدة على التشهد ليست منه نعم ينبغي على هذا عدم ذكرها في واشهد أن محمداً عبده ورسوله وانه يأتي بها مع ابراهيم عليه السلام (قوله لحن أيضاً) اى مع كونه كذبا (قوله والصواب بالواو) لانه واوى العين من ساد يسود.

(۱۱۳) نماز میں سلام پھیرنے کی کیفیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ نماز میں سلام پھیرتے وقت چہرہ قبلہ کی

جانب ہو اور دلیل میں "تلقاء وجہہ" والی روایت پیش کرتا ہے۔ آیا زید کا یہ قول درست ہے یا نہیں؟ نیز سلام پھیرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ نماز میں سلام کی ابتداء چونکہ قبلہ رخ ہی ہوتی ہے اور یہی حال دوسرے سلام کا ہے، باقی روایت میں سلام کو تلقاء وجہہ سے تعبیر کرنا بیان حال کیلئے ہے کہ عموماً جیسے پہلا سلام کرتے وقت رخ قبلہ جانب ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے سلام میں بھی "السلام علیکم" کے وقت عموماً رخ خود بخود قبلہ جانب ہو جاتا ہے۔ نیز تکلفات میں پڑنا مشکلات کا باعث بن سکتا ہے، خصوصاً عوام الناس کیلئے اور یہ ایسا اختلافی مسئلہ بھی نہیں کہ صحت وفساد صلاۃ اس پر موقوف ہوں۔ لہٰذا بحث ومباحثہ سے گریز کرنا بہتر ہے۔

لما في معارف السنن (۳/ ۱۰۱): وتأول فيه بعض المتأولين بأن البداءة كان به من تلقاء الوجه ممتداً به إلى اليمين ومثله ذكره في الكوكب الدري، ولا أدري لم هو؟ ولعله يريد أن المقصود بيان كيفية السلام هكذا لا بيان العدد، والكيفية هذه من ابتداء تلقاء الوجه والانتهاء في جانب اليمين، ذكره في المجموع والمغني وهو المعمول به عندنا.

(۱۱۳) دعا کرتے وقت ہاتھ کیسے اور کہاں تک اٹھانے چاہئیں؟

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ مطلقاً دعا کرتے وقت خواہ نماز کے بعد ہو یا تلاوت کے بعد جب بھی کوئی دعا مانگے تو ہاتھ کاندھوں تک سیدھے سامنے رکھے اور دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملالے، یہی طریقہ مسنون ہے، اس کے برعکس عمر کہتا ہے کہ ہتھیلیوں کو ملائے نہ رکھے بلکہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تین انگل کا فاصلہ رکھے کونسا طریقہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ بوقت دعا دونوں ہتھیلیوں کے درمیان فاصلہ مستحب اور راجح ہے لیکن دونوں ہاتھ ملا کر بھی دعا کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ دونوں طریقے منقول ہیں۔ ہم دونوں طریقوں سے متعلق احادیث ذکر کرتے ہیں۔

حسب ذیل احادیث سے بوقت دعا دونوں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی تائید ہوتی ہے۔

لما في مجمع الزوائد (۱۰/ ۱۲۹): عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال رفع رسول الله ﷺ يديه بعرفة يدعو فقال أصحاب النبي ﷺ هذا الابتهال ثم حاصت الناقة ففتح احدى يديه فأخذها وهو رافع الأخرى رواه البزار والطبراني في الأوسط بنحوه إلا أنه قال فرفع يديه فسقط زمام الناقة فتناوله ورفع يديه وزاد هذا الابتهال والتضرع ورجال البزار رجال الصحيح غير أحمد بن يحيى الصوفي وهو ثقة ولكن لأعمش لم يسمع من أنس رضي الله تعالى عنه.

وعن سلمان رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ما رفع قوم أكفهم إلى الله عز وجل يسئلونه شيئاً إلا كان حقاً على الله أن يضع في أيديهم ما سألوا قلت له حديث في السنن غير هذا رواه الطبراني ورجاله رجال الصحيح

وفي مرقاة المصابيح(۵/۷۳): وقد ورد انه ﷺ في الدعا يوم عرفة جمع بين كفيه وجعلهما مقابل صدره كاستطعام المسكين (قال الحافظ نور الدين رحمه الله عليه في مجمع الزوائد: رواه الطبراني في الاوسط وفيه الحسين بن عبدالله بن عبيد الله وهو ضعيف" قال ملا علي قاري في مرقاة (۵/۳۲) ان الضعيف حجة في الفضائل اتفاقا.

حسب ذیل عبارات سے فرجۃ بین الیدین کے استحباب کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

في حاشية الطحطاوي على المراقي(ص۲۵۰): وفي النهر من فعل كفيه المستحبة ان يكون بين الكفين فرجة وان قلت الخ. لكن في شرح الحصن الحصين والظاهر ان من الادب ايضا ضم اليدين وتوجيه اصابعهما نحو القبلة وفي شرح المشكوة وروده ﷺ يوم عرفة جمع بين كفيه في الدعاء وان اريد بالضم في الكلام القرب التام لا ينافي وجود الفرجة القليلة، واما قوله جمع بين كفيه لا ينافيه ايضاً لان المعنى جمع بينهما في الرفع ولم يفرد احدهما به.

وفي الهندية(۵/۳۱۸): والافضل في الدعاء ان يبسط كفيه ويكون بينهما فرجة وان قلت.....
والمستحب ان يرفع يديه عند الدعاء بحذاء صدره كذا في القنية.

وفي الشامية(۱/۵۰۷): (فيبسط يديه) حذاء صدره (نحو السماء) لانها قبلة الدعاء ويكون بينهما فرجة" وايضاً في رد المحتار (قوله ويكون بينهما فرجة) اي وان قلت قنية.

(۱۱۴) مردوں اور عورتوں کی نمازوں میں فرق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک قاری صاحب فرماتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے طریقہ نماز کی طرح نماز پڑھ سکتی ہیں۔ تو کیا اس قاری صاحب کی بات درست ہے؟ یا عورتوں اور مردوں کے طریقہ نماز میں فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: احادیث مبارکہ اور عبارات فقہ کی رو سے مردوں اور عورتوں کی نمازوں میں مکمل طور پر یکسانیت نہیں ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر عورتوں کی نماز مردوں سے مختلف ہے۔ مثلاً (۱)۔ تکبیر تحریمہ کے وقت عورتیں کاندھوں تک ہاتھ اٹھائیں گی۔ جبکہ مرد کانوں تک اٹھاتے ہیں۔ (۲)۔ عورتیں سینے پر ہاتھ باندھیں گی، جبکہ مرد زیر ناف باندھتے ہیں۔ (۳)۔ رکوع میں عورتوں کیلئے مکمل جھکنا ضروری نہیں جبکہ مرد خوب جھکتے ہیں۔ (۴)۔ سجدے میں عورتوں کیلئے رانوں کو پیٹ سے اور بازوؤں کو بغلوں سے ملانے کا حکم ہے جبکہ مرد جدا رکھتے ہیں۔ (۵)۔ قعدہ میں عورتیں سرین کے بل بیٹھیں گی جبکہ مرد بائیں پاؤں پر بیٹھتے ہیں۔ (۶)۔ اسی طرح عورتیں الگ جماعت نہیں کرا سکتیں اگر کرالیں تو ان کی امام وسط صف ان کے بیچ میں ہی کھڑی ہوگی۔

الحاصل ... عورتیں نماز میں وہ طریقہ اختیار کریں گی کہ جو حالت ستر کے زیادہ قریب ہو۔

لما فی الشامیۃ (۱/۵۰۴): (قولہ وعرزنا فی الخزائن الخ) وذلک حیث قال تنبیہ ذکر الزیلعی انہا تخالف الرجل فی عشر وقد زدت اکثر من ضعفہا۔ ترفع یدیہا حذاء منکبیہا، ولا تخرج یدیہا من کمیہا۔ وتضع الکف علی الکف تحت ثدیہا۔ وتنحنی فی الرکوع قلیلا ولا تعتمد ولا تفرج فیہ اصابعہا بل تضمہا وتضع یدیہا علی رکبتیہا ولا تحنی رکبتیہا۔ وتنضم فی رکوعہا وسجودہا۔ وتفترش ذراعیہا۔ وتتورک فی التشہد وتضع فیہ یدیہا تبلغ رؤوس أصابعہا رکبتیہا۔ وتضم فیہ أصابعہا۔ واذا نابہا شیئ فی صلاتہا تصفق ولا تسبح۔ ولا تؤم الرجال وتکرہ جماعتہن ویقف الامام وسطہن ویکرہ حضورہا الجماعۃ وتؤخر مع الرجال ولا جمعۃ علیہا۔ لکن تنعقد بہا۔ ولا عید ولا تکبیر تشریق۔ ولا یستحب أن تسفر بالفجر ولا تجہر فی الجہریۃ بل لو قیل بالفساد بجہرہا لا مکن بناء علی ان صوتہا عورۃ۔

(۱۱۵) عورتوں کی نماز کا طریقے کا احادیث سے ثبوت

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ حنفی عورتیں جس طرح نماز پڑھتی ہیں اس کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر اس طریقے کا ثبوت احادیث سے ہے تو ان احادیث کو پیش کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... بعض لوگوں کا حنفی عورتوں کی نماز کے طریقے پر اعتراض کرنا کہ یہ طریقہ احادیث سے ثابت نہیں درست نہیں ہے اس لئے کہ حنفی عورتوں کی نماز کا طریقہ احادیث طیبہ سے ثابت ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ عورتیں نماز میں ہاتھ سینے کے برابر اٹھاتی ہیں جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۱۱) میں امام نے روایت ذکر کی ہے: عن عبد ربہ بن زیتون قال رأیت ام الدرداء ترفع یدیہا حذو منکبیہا حین تفتتح الصلوۃ　الخ اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اعلاء السنن کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے اور صراحتاً اس سے ہاتھوں کا سینے تک برابر اٹھانا ثابت ہو رہا ہے: عن وائل بن حجر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ یا ابن حجر اذا صلیت فاجعل یدیک حذاء اذنیک والمرأۃ تجعل یدیہا حذاء ثدییہا (اعلاء السنن ۱۸۱/۲، بحوالہ مجمع الزوائد للطبرانی)

اسی طرح عورت کی نماز میں سب سے زیادہ ستر کا خیال رکھا جاتا ہے لہٰذا جو طریقہ سب سے زیادہ ستر کا باعث ہو اسی کے مطابق پڑھے یہ طریقہ کنز العمال کی روایت سے ثابت ہے: عن ابن عمرؓ مرفوعاً اذا جلست المرأۃ فی الصلوۃ وضعت فخذہا علی فخذہا الاخری فاذا سجدت الصقت بطنہا فی فخذیہا کاستر مایکون لہا۔ (کنز العمال، ۷/۵۴۹) یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس طریقہ کے مطابق نماز میں ستر زیادہ ہو عورت اسی طرح سے نماز پڑھے اس وجہ سے نماز میں ہاتھ باندھتے

ہئیت میں اس کا خوب خیال رکھا جائے گا، اور ایسی صورت میں ممکن ہے کہ عورت سینے کے اوپر ہاتھ رکھے چنانچہ صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں: فقلنا به في هذه الحالة في حق الرجل بخلاف المرأة فانها تضع على صدرها لانه استر لها فيكون في حقها أولى ... الخ (اعلاء السنن ۲/ ۱۹۹) لہٰذا اس صورت میں استر یہ ہے کہ عورت حالت قیام میں ہاتھ سینے پر رکھے مذکورہ روایت پر اسی صورت میں عمل کرنا ممکن ہے نیز مذکورہ روایت کی تائید روایت تصفیق سے بھی ہوتی ہے جس میں عورت کو تصفیق کا حکم ہے جیسے کہ جامع الترمذی کی صحیح روایت میں ہے: عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ التسبيح للرجال والتصفيق للنساء ... الخ (الجامع الترمذي ۱/ ۸۵) اس حکم کی علت اور بنا ستر پر ہے کہ عورت ہر حال میں ستر کا لحاظ کرے اسی سے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ حالت رکوع میں بھی اسی علت کی وجہ سے عورت زیادہ نہ جھکے گی اس لئے کہ زیادہ جھکنے کی صورت میں ستر کا لحاظ نہیں ہوتا لہٰذا رکوع میں صرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھے گی اور انگلیاں مردوں کی طرح کھول کر نہیں رکھے گی۔ قال العلامة ابن عابدين: (والصاق كعبيه) أي حيث لا عذر (قوله للرجل) اي سنة للرجل فقط وهذا قيد للأخذ والتفريج لان المرأة تضع يديها على ركبتيها وضعا ولا تفرج أصابعها (رد المحتار ۱/ ۴۹۳ ط ايچ ايم سعيد) اس عبارت سے عورت کے رکوع کی کیفیت صراحةً معلوم ہوتی ہے۔ کنز العمال کی روایت میں بھی صراحت کے ساتھ منقول ہے: عن ابن عمرؓ ... اذا سجدت ... كأستر مايكون لها اس بنا پر اس کو استر طریقے سے نماز کی پابندی کا حکم ہے۔

اسی طرح سجدہ بھی اس طریقے سے کرے گی جس سے زیادہ ستر پوشی ہو مثلاً عورت اپنے پورے جسم کو سمیٹ لے اور جسم کے بعض اعضاء کو دوسرے اعضاء کے ساتھ ملائے، کہنیوں کو پہلوؤں کے ساتھ اور رانوں کو پیٹ کے ساتھ ملا لے اور مرد کی طرح سجدہ نہ کرے جیسا کہ ابو داؤد کی روایت میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے: عن يزيد بن ابي حبيب رضي الله عنه ان النبي ﷺ مر على امرأتين تصليان فقال اذا سجدتما فضما بعض اللحم الى الأرض فان المرأة ليست كالرجل (مراسيل أبي داؤد ص ۸) اسی طرح روایت مصنف ابن ابی شیبہ اور اعلاء السنن میں وارد ہے: عن الحارث عن علي رضي الله عنه قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها (مصنف ابن ابي شيبة ۲/ ۳۰۵، اعلاء السنن ۳/ ۳۰) ان روایات سے معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے سے پہلے عورت اپنے کو پوری طرح سے سمیٹ لے گی اور پھر سجدہ کرے گی لیکن سجدہ کرنے سے پہلے دائیں ران کو بائیں ران پر رکھ کر پیروں کو ایک طرف نکال کر سجدہ کرے گی جیسا کہ کنز العمال کی روایت میں ابن عمرؓ سے مرفوعاً ثابت ہے: اذا جلست المرأة في الصلوة وضعت فخذها على فخذها الاخرى فاذا سجدت الصقت بطنها في فخذيها كأستر مايكون لها (كنز العمال ۷/ ۵۴۹) اور اسی مسئلہ پر امام اعظم رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے: ابو حنيفة عن نافع عن ابن عمر رضي الله عنه أنه سئل كيف كن النساء يصلين على عهد رسول الله ﷺ قال كن يتربعن ثم امرن أن يحتفزن (مسند الامام اعظم ۱/ ۴۲) اس سے ماقبل والے مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ عورت خوب سمٹ کر پردے کے ساتھ نماز پڑھے اور پھر حالت تشہد میں عورت کو مرد کی طرح بیٹھنے کا حکم نہیں بلکہ اپنے پاؤں دونوں دائیں طرف نکال کر بائیں سرین پر بیٹھ جائے جس طرح کی

روایت میں مذکور ہے: عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ صاحب النبی ﷺ عن النبی ﷺ انہ قال وکان یامر الرجال أن یتجافوا فی سجودھم ویامر النساء ینخفضن فی سجودھن وکان یامر الرجال أن یفرشوا الیسری وینصبوا الیمنی فی التشھد ویامر النساء أن یتربعن ۔۔ الخ (السنن الکبری للامام البیہقی، ۲/۲۲۲)
اس روایت میں عورت و مرد سے مختلف نماز پڑھنے کا حکم ہے اور اسی ہم معنی روایت مصنف ابن ابی شیبہ کی ہے عن خالد بن اللجلاج قال کن النساء یؤمرن أن یتربعن اذا جلسن فی الصلاۃ ولا یجلسن جلوس الرجال علی اوراکھن یتقی ذلک علی المرأۃ مخافۃ أن یکون منھا الشیء (مصنف ابن ابی شیبہ، ۲/۵۰۶) ان احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ عورت حالت تشہد میں بائیں سرین پر بیٹھے گی اور پیروں کو دائیں طرف نکالے گی یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورت کی نماز کا فرق جو اختلاف کرتے ہیں روایات سے ثابت ہے اور ان لوگوں کا یہ کہنا کہ عورت کی نماز کا یہ طریقہ کسی حدیث سے ثابت نہیں غلطی پرمبنی ہے جیسا کہ اوپر کی روایات سے معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

لما فی اعلاء السنن (۳/۳۰): عن علیؓ قال اذا سجدت المرأۃ فلتحتفز ولتضم فخذیھا .

وقال رحمہ اللہ فی اعلاء السنن فی شرح حدیث علی رضی اللہ عنہ والقیاس ایضا یقتضی مخالفۃ ھیئۃ المرأۃ فی جلوسھا وسجودھا عن ھیئۃ الرجال لکون مبنی احوالھن علی التستر والاحادیث المذکورۃ مؤیدۃ لہ ۔۔ الخ.

وفی الھندیۃ (۱/۷۵): والمرأۃ لا تجافی فی رکوعھا وسجودھا وتقعد علی رجلیھا وفی السجدۃ تفترش بطنھا علی فخذیھا. الخ.

وفی الدر المختار (۱/۵۰۳): (والمرأۃ تنخفض) فلا تبدی عضدیھا (وتلصق بطنھا بفخذیھا) لانہ استر وحررنا فی الخزائن انھا تخالف الرجال فی خمسۃ وعشرین ....

وفی الشامیۃ: وتضع یدیھا علی رکبتیھا ولا تحنی رکبتیھا وتنضم فی رکوعھا وسجودھا وتفترش ذراعیھا وذکر فی البحر انھا لا تنصب اصابع القدمین.....الخ

(۱۱۶) ٹوپی کیسی ہو؟ آپ ﷺ سے ٹوپی پہننے کا ثبوت اور بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز اور غیر نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوپی پہننا ثابت ہے یا نہیں؟ ٹوپی کس قسم کی ہونی چاہیے؟ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنا یعنی ننگے سر نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً حضور اقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز اور غیر نماز میں ٹوپی اور عمامہ جس کو پگڑی کہا جاتا ہے پہننا ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپیاں تین طرح کی تھیں ایک وہ تھی جو سر کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تھی دوسری

وہ بھی زور سے کسی قدر اونچی ہوتی تھی تیسری بڑی ٹوپی تھی جس میں کان بھی ڈھک جاتے تھے اور بغیر ٹوپی کے ننگے سر نماز پڑھنا خلاف سنت ہے اس لئے ٹوپی پہننے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

كما في شمائل الترمذي (ص ٨): عن جابر قال دخل النبي ﷺ مكة يوم الفتح وعليه عمامة سوداء

وفي الصحيح للبخاري (١/٥٦): وقال الحسن كان القوم يسجدون على العمامة والقلنسوة ويداه في كمه.

وفي كنز العمال (٧/٤١): كان يلبس قلنسوة بيضاء (طب عن ابن عمر).

كان يلبس القلانس تحت العمائم وبغير العمائم ويلبس العمائم بغير القلانس وكان يلبس القلانس اليمانية وهي البيض المضربة ويلبس ذوات الآذان في الحرب وكان ربما نزع قلنسوته فجعلها سترة بين يديه وهو يصلي الخ.

وفي بذل المجهود (٥/٦٢): وفي الشيخ عن ابن عباس كان لرسول الله ﷺ ثلث قلانس الحديث.

(۱۱۷) مسجد میں رکھی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ ٹوپی نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں پڑی ہوئی ٹوپی کا استعمال یا چھوٹا رومال سر پر رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے؟ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ان دونوں صورتوں سے بہتر ہے کہ ننگے سر نماز پڑھ لی جائے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ٹوپی نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی کو استعمال کرنا یا چھوٹا رومال سر پر رکھنا درست ہے البتہ اسکی عادت نہ بنائی جائے اور آپ کے دوست کی بات درست نہیں ہے کیونکہ سر ڈھانپنا نماز کے آداب میں سے ہے۔

كما في الشامية (١/٦٤١): (قوله ولا بأس به للمتذلل) قال في شرح المنية: فيه اشارة الى أن الأولى أن لا يفعله وأن يتذلل ويخشع بقلبه فإنهما من أفعال القلب وتعقبه في الإمداد بما في التجنيس من أنه يستحب له ذلك لأن مبنى الصلاة على الخشوع.

(۱۱۸) ننگے سر نماز پڑھنے سے متعلق کراہت تنزیہی اور تحریمی کی تحقیق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ کچھ لوگ جب نماز کو آتے ہیں تو ٹوپی نہیں پہن کر آتے بلکہ مسجد میں جو پلاسٹک کی ٹوپیاں یا تنکے کی بنی ہوئی ٹوپی رکھی ہوتی ہے وہ پہن لیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ تو جیب سے ناک صاف کرنے والا رومال باندھ لیتے ہیں کیا اس صورت میں نماز ہو جاتی ہے کیونکہ میں نے کسی دینی کتاب میں یہ بات پڑھی تھی کہ ان ٹوپیوں میں نماز نہیں ہوتی۔ براہ کرم جلد از جلد قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: سب سے پہلے چند امور قابل ذکر ہیں۔

(۱)۔ اکثر فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو مطلق مکروہ کہا ہے۔

(۲)۔ جب بھی مطلق کراہت کا ذکر ہو تو اس سے مراد کراہت تحریمی ہوتی ہے الا یہ کہ کراہت تنزیہی کی کوئی دلیل وہاں موجود ہو جیسا کہ الشامیہ (۱/۲۲۳) پر مذکور ہے کہ "الکراهة حیث اطلقت فالمراد منها التحریم"

(۳)۔ بعض فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو ازار واحد میں نماز پڑھنے پر قیاس کیا ہے جیسا کہ البحر الرائق (۲/۲۳) پر مذکور ہے "وان صلّٰی فی ازار واحد یجوز ویکره. وکذا مکشوف الرأس للتهاون والتكاسل" اور ازار واحد میں نماز (باوجود قمیص یا چادر وغیرہ پر قدرت کے) مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ حاشیہ الطحطاوی (صفحہ ۳۲۹) پر مذکور ہے "وصلاته فی السراویل اوفی ازار مع قدرته علی لبس القمیص. لما فیه من التهاون والتكاسل وفی شرحه (لما فیه من التهاون هذا یفید کراهة التحریم" لہٰذا قمیص (ننگے سر نماز پڑھنا) بھی مکروہ تحریمی ہوگا۔

(۴)۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے الشامیہ (۱/۶۵۳) میں فرمایا ہے کہ اگر سنت، سنت مؤکدۃ قویہ ہو تو اس کا ترک مکروہ تحریمی ہے اور سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ ملتقی الابحر (۱/۱۰۸۔۱۰۹) پر ملا علی قاری رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام کے علاوہ کبھی بھی ننگے سر نماز ادا نہیں فرمائی لہٰذا اس سے بھی ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہی ثابت ہوتا ہے۔

(۵)۔ بعض فقہاء کی عبارات میں اس کی صراحت ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے جیسا کہ شرح الوقایہ (۱/۱۶۸) کے حاشیہ پر اور الفقہ الاسلامی وادلتہ (۲/۹۷۴) میں مذکور ہے۔ لہٰذا عبارات مذکورہ کے پیش نظر اگر کبھی کبھار کسی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی گئی تو مکروہ تنزیہی ہوگی اور اگر ننگے سر نماز پڑھنے کو مستقل عادت بنالیا گیا ہو تو اس صورت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا نیز ٹوپی اچھی اور صاف ہونی چاہئے اور ٹوپی نہ ہو تو مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز ادا کرنا درست ہے البتہ رومال وغیرہ سے سر باندھنے میں سر کا درمیانی حصہ چھپانا ضروری ہے ورنہ اس صورت میں بھی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

لما فی شرح الوقایة (۱/۱۶۸): وصلاته حاسرا راسه للتكاسل او للتهاون بها. لیس المراد بالتهاون الاهانة بالصلاة فانها كفر بل المراد قلة رعایتها ومحافظة حدودها. وفی حاشیة (صلاته حاسرا راسه) والظاهر ان الكراهة ههنا تنزیهیة.

وفی فتاوی سراجیة (ص ۱۱): اذا صلی حاسر الرأس كره.

وفی الشامیة (۱/۱۳۲): اذا ذكروا مكروهاً فلا بد من النظر فی دلیله فان كان نهیا ظنیا یحكم بكراهة التحریم الا لصارف النهی عن التحریم الی الندب فان لم یكن الدلیل نهیا بل كان مفیداً للترك الغیر الجازم فهی تنزیهیة.

وفی الشامیة (۱/۲۲۳): واعلم ان المكروه اذا اطلق فی كلامهم فالمراد منه التحریم الا ان ینص

علی کراهة التنزیه. لقد قال المصنف فی المصفی: لفظ الکراهة عند الاطلاق یراد بها التحریم.

قال ابو یوسف قلت لابی حنیفة: اذا قلت فی شئ اکرهه فما رأیک فیه؟ قال: التحریم.

وفی الشامیة (۶۵۲/۱): (والاعتجار) لنهی النبی ﷺ عنه، وهو شد الرأس او تکویر عمامته علی راسه وترک وسطه مکشوفاً ... (کراهته تحریمیة.

وفی الشامیة (۶۵۳/۱). ان السنة ان کانت مؤکدة قویة لا یبعد کون ترکها مکروهاً تحریماً وان کانت غیر مؤکدة فترکها مکروه تنزیهاً. واما المستحب او المندوب فینبغی ان یکره ترکه اصلاً.

(۱۱۹) سلام کا کتنا لفظ کہنے سے نماز سے خارج ہو جائے گا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز سے خروج کے لئے السلام علیکم کہنا واجب ہے تو قابل دریافت امر یہ ہے کہ پورا سلام کہنے سے نماز سے خارج ہو جاتا ہے یا نصف سلام یا اس سے بھی کم الفاظ کہنے سے نماز سے خارج ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بائیں طرف سلام کرتے وقت لفظ "السلام" کے میم کے ختم ہوتے ہی نمازی نماز سے خارج ہو جاتا ہے۔

لما فی الطحطاوی علی الدر (۲۱۰/۱): لفظ السلام مرتین فالثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور وعلیه الشافعیة.

وفی الدر المختار (۴۶۸/۱): (ولفظ السلام) مرتین (فالثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور عندنا وعلیه الشافعیة

قال الشامی تحته: (قوله وتنقضی قدوة بالاول) ای بالسلام الاول قال فی التجنیس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل و اقتدی به قبل ان یقول علیکم لایصیر داخلاً فی صلاته.

﴿فصل فی الامامۃ والجماعۃ﴾

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۲۰) نابالغ کی امامت کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹے بچے بڑوں کی امامت کر سکتا ہے یا نہیں، نیز چھوٹا بچہ اگر چھوٹے بچوں کی امامت کرے تو اسکا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً نابالغ بچے کی امامت بڑوں کیلئے مطلقاً ناجائز ہے چاہے فرائض ہوں یا نوافل بڑوں کی نماز نہ ہوگی البتہ اگر بچہ بچوں کی امامت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

لما فی الشامیۃ (۱/۵۵۰): وشروط الامامۃ للرجال الاصحاء ستۃ اشیاء الاسلام والبلوغ والعقل والذکورۃ والقراءۃ والسلامۃ من الاعذار… واحترز بالرجال الاصحاء… عن الصبیان فلا یشترط فی امامهم البلوغ.

(۱۲۱) نابالغ بچہ کا نابالغ بچوں کی امامت کرنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مدارس میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ بچوں کو جب چھٹی ہوتی ہے تو ان میں سے ایک نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی جماعت کراتا ہے شرعی طور پر یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی امامت کرا سکتا ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/۵۷۸): وصح لو توضأ علی الانقطاع وصلی کذلک کاقتداء بمفتصد أمن خروج الدم وکاقتداء امرأۃ بمثلها وصبی بمثله ومعذور بمثله الخ.

وفی الهندیۃ (۱/۸۵): وامامۃ الصبی المراهق لصبیان مثله یجوز کذا فی الخلاصۃ اھ.

وفی الشامیۃ (۱/۵۷۸): واما غیر البالغ فان کان ذکراً تصح امامته لمثله من ذکر وانثی وخنثی اھ.

(۱۲۲) ۱۶ سالہ لڑکے کی امامت کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد کا امام ہوں اور الحمدللہ پانچوں وقت

پابندی سے نماز پڑھتا ہوں، میرا ایک بیٹا (عبدالحمید) ہے جس کی عمر بیس سال ہے اور وہ حافظ قرآن بھی ہے۔ کبھی کبھی میری عدم موجودگی میں وہ نماز پڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے رمضان میں آخری دنوں میں تراویح بھی اس نے پڑھائی تھی۔ ہماری مسجد کے بعض نمازی حضرات اس کی امامت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ابھی یہ بچہ ہے۔ آپ حضرات سے شریعت کی روشنی میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا یہ میرا بیٹا فرض نماز وغیرہ میں میری عدم موجودگی میں امامت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس پر اعتراض درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے بیٹے (عبدالحمید) کو نماز کے ضروری مسائل سے بخوبی واقفیت ہے اور امامت سے متعلق کوئی قابلِ اعتراض بات اس میں نہیں پائی جاتی تو شرعاً اس کے لئے نماز کی امامت کرانا درست ہے اور نمازیوں کا بلاوجہ اس کی امامت پر اعتراض کرنا شرعاً درست نہیں۔

لما في الهندية (۱/ ۸۶ - ۸۷): رجل أم قوما وهم له كارهون إن كانت الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالإمامة يكره له ذلك وإن كان هو أحق بالإمامة لا يكره هكذا في المحيط

وفي الشامية (۱/ ۵۶۲): (قوله وكذا تكره خلف أمرد) الظاهر أنها تنزيهية أيضاً والظاهر أيضاً كما قال الرحمتي أن المراد به الصبيح الوجه لأنه محل الفتنة ... سئل العلامة الشيخ عبد الرحمن بن عيسى المرشدي عن شخص بلغ من السن عشرين سنة وتجاوز حد الإنبات ولم ينبت عذاره فهل يخرج بذلك عن حد الأمردية وخصوصا قد نبت له شعرات في ذقنه تؤذن بأنه ليس من مستديري الملتحي، فهل حكمه في الإمامة كالرجال الكاملين أو لا. أجاب: سئل العلامة الشيخ أحمد بن يونس المعروف بابن الشلبي من متأخري علماء الحنفية عن هذه المسألة فأجاب بالجواز من غير كراهة وناهيك به قدوة.

(۱۴۳) غیر شادی شدہ شخص کی امامت کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ہے جس کا تعلق اچھے خاندان سے ہے اور وہ دینی مدارس میں پڑھتے ہیں اور ان کے والد کا تعلق علماء اور مشائخ کے ساتھ ہے اور وہ عالم ایک بڑی جامع مسجد کے امام بھی ہیں لیکن وہ غیر شادی شدہ ہیں جس کی وجہ سے اکثر مقتدی اعتراض کرتے ہیں تو اس صورت میں ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً شریعت میں امامت کیلئے امام کا علم والا ہونا ضروری ہے (یعنی نماز کے مسائل پر عبور ہو کہ صحت نماز کیلئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں اور کن چیزوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے وغیرہ) اسی طرح امام کا فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے لہذا صورتِ مسئولہ میں جیسا کہ واضح ہے کہ مذکورہ امام دینی مدارس کے طالب علم ہیں تو یقیناً صرف نماز کے مسائل پر بلکہ دیگر مسائل پر بھی

الگو عبور حاصل ہوگا اور بظاہر وہ نیک و صالح بھی ہوں گے لہٰذا ایسے شخص کا نمازیں پڑھانا اور امامت کے منصب پر فائز ہونا جائز ہے اور مقتدیوں کا صرف "غیر شادی شدہ" ہونے کی بناء پر مذکورہ امام پر اعتراض کرنا صحیح نہیں۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۵۵): عن اوس بن ضمعج قال سمعت ابا مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ یقول قال رسول اللہ ﷺ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب اللہ فان کانوا فی القراءۃ سواء فاعلمھم بالسنۃ فان کانوا فی السنۃ سواء فاقدمھم ھجرۃ فان کانوا فی الھجرۃ سواء فاکثرھم سنا ولا یؤم الرجل فی سلطانہ ولا یجلس علی تکرمتہ فی بیتہ الا باذنہ۔

وفی الھندیۃ(۱/۸۳): الاولی بالامامۃ اعلمھم باحکام الصلاۃ ھکذا فی المضمرات وھو الظاھر ھکذا فی البحر الرائق ھذا اذا علم من القراءۃ قدر ما تقوم بہ سنۃ القراءۃ ھکذا فی التبیین ولم یطعن فی دینہ کذا فی الکفایۃ وھکذا فی النھایۃ ویجتنب الفواحش الظاھرۃ وان کان غیرہ اورع منہ کذا فی المحیط وھکذا فی الزاھدی وان کان متبحرا فی علم الصلاۃ لکن لم یکن لہ حظ فی غیرہ من العلوم فھوا ولی کذا فی الخلاصۃ۔

وفی الشامیۃ(۱/۵۵۷): (والاحق بالامامۃ) ـــــ (الاعلم باحکام الصلاۃ) فقط صحۃ وفسادا بشرط اجتنابہ للفواحش الظاھرۃ وحفظہ قدر فرض(قولہ باحکام الصلاۃ فقط) ای وان کان غیر متبحر فی بقیۃ العلوم وھوا ولی من المتبحر کذا فی زاد الفقیر عن شرح الارشاد (قولہ بشرط اجتنابہ الخ) کذا فی الدرایۃ عن المجتبی وعبارۃ الکافی وغیرہ: الاعلم بالسنۃ اولی الا ان یطعن علیہ فی دینہ لان الناس لا یرغبون فی الاقتداء بہ ـــــ وفی (ص۵۵۹) (ولو ام قوما وھم لہ کارھون، ان) الکراھۃ (لفساد فیہ او لانھم احق بالامامۃ منہ کرہ) لہ ذلک تحریما لحدیث ابی داؤد "لایقبل اللہ صلاۃ من تقدم قوما وھم لہ کارھون (وان ھو احق لا) والکراھۃ علیھم۔

(۱۲۴) جس امام کی قرأت صحیح نہ ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قرآن غلط سلط پڑھ رکھا تھا لیکن اللہ کی توفیق سے چار ماہ لگائے اس میں قرآن بھی سیکھا جب واپس کالونی کی مسجد میں آیا تو اب امام صاحب کا قرآن غور سے سنا تو ان کی قرأت درست نہ تھی مثلاً اللہ اکبر کو (اَللّٰھُوْ اَکْبَرْ) کہتے ہیں اور الحمد للہ رب العلمین ۝ الرحمن الرحیم ۝ درمیان میں نہ وقف کرتے ہیں اور نہ ملا کر پڑھتے ہیں بلکہ ایک سانس میں پڑھتے ہیں اور الرحمٰن الف پر زبر کو ظاہر کرتے ہیں اور العٰلَمِیْنَ کا زیر جو نون پر ہے کھا جاتے ہیں۔ کیا اس سے نماز میں خلل آتا ہے یا نہیں؟ ہم تو ۱۸ سال سے ان کے پیچھے نمازیں پڑھ رہے ہیں گذشتہ نمازوں کا کیا

حکم ہے؟ مہربانی فرمائی جائے کہ بندہ بہت زیادہ پریشان ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً امام ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو بقدر ضرورت تجوید (وقف، وصل، تشدید، تخفیف وغیرہ) کو جانتا ہو اور قرآن پاک کو صحیح پڑھ سکتا ہو۔ صورت مسئولہ میں جس امام صاحب کے پیچھے اب تک آپ نے نمازیں پڑھی ہیں وہ تو ٹھیک ہیں، ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امام صاحب نے ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے نماز فاسد ہو جائے۔ البتہ آئندہ کیلئے ان امام کے بجائے کسی ایسے امام کو مقرر اور متعین کرنا چاہیے جو بقدر ضرورت تجوید سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کو بھی صحیح پڑھ سکتا ہو۔

لما في حاشية الطحطاوي (ص۲۰۹): قوله: (بلا مد) الحاصل ان المد في التكبير إما ان يكون في لفظ الله او في لفظ اكبر، فان كان في لفظ الله فاما ان يكون في اوله او في وسطه او في آخره وان كان في آخره بان اشبع حركة الهاء فهو خطأ من حيث اللغة ولا تفسد به الصلاة، وكذا تسكينها كذا في الحلبي.

وفي الهندية (۱/۸۱): (ومنها الوقف والوصل والابتداء في غير موضعها) اذا وقف في غير موضع الوقف أو ابتدأ في غير موضع الابتداء، ان لم يتغير به المعنى تغيرا فاحشا لا تفسد بالاجماع بين علمائنا هكذا في المحيط. وكذا ان وصل في غير موضع الوصل كما لو لم يقف عند قوله أصحاب النار بل وصل بقوله الذين يحملون العرش لاتفسد ..

وفي الدر المختار (۱/۴۸۰): (واذا أراد الشروع في الصلاة كبر) (بلاامد) (بالحذف) اذ مد همزة الله مفسد وتعمده كفر وكذا الباء في الاصح. وفي الشامية تحته اعلم ان المد ان كان في الله فاما في اوله اووسطه او آخره .. وان كان في آخره فهو خطأ ولا يفسد ايضا، وقياس عدم الفساد فيهما صحة الشروع بهما

وفي الشامية (۱/۶۳۲): تحت (قوله أو بوقف وابتداء) قال في البزازية الابتداء ان كان لا يغير المعنى تغيرا فاحشا لايفسد

وفي الهندية (۱/۸۳): الاولى بالامامة اعلمهم باحكام الصلوة هكذا في المضمرات وهو الظاهر هكذا في البحر الرائق، هذا اذا علم من القرائة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين فان تساووا فاقرؤهم اى اعلمهم بعلم القراءة يقف في موضع الوقف ويصل في موضع الوصل ونحو ذالك من التشديد والتخفيف وغيرهما كذا في الكفاية.

(۱۴۵) تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک کرنے والے کی امامت کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ میں ایک امام صاحب ہیں جو تعویذ گنڈے

اور جھاڑ پھونک کرتے ہیں ان کے پاس عورتیں تعویذات کیلئے آتی رہتی ہیں اس امام صاحب کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ کثرت روکنے کے باوجود اس کام سے باز نہیں آرہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً . . جائز طریقہ سے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جائز طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذریعے یا ایسے کلام کے ذریعے کیا جائے جس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں اور وہ عربی زبان میں ہو یا ایسی زبان میں ہو جس کے معنی معلوم ہوں اور اس کو مؤثر بالذات سمجھنے کا اعتقاد نہ ہو بلکہ اعتقاد یہ ہو کہ مؤثر حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور تعویذ گنڈہ دوسرے اسباب کی طرح ایک سبب ہے جو نفع ونقصان دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا محتاج ہے۔ لہٰذا جو امام صاحب جائز طریقہ سے تعویذ گنڈے کرتے ہوں ان کی امامت درست ہے البتہ نامحرم عورتوں کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ بھی کیوں نہ ہو، براہ راست تعویذ نہ دینا چاہئے، بلکہ ان کے کسی محرم یا خاوند کے ذریعے ان کو تعویذ دینا چاہئے۔

وفي الدر المختار (۶/ ۳۶۳): (فرع) في المجتبى: التميمة المكروهة ما كان بغير العربية.

(وفي الشامية تحته): ولا بأس بالمعاذات اذا كتب فيها القرآن او اسماء الله تعالى ويقال رقاه الراقي رقيا ورقية اذا عوذه ونفث في عوذته قالوا وانما تكره العوذة اذا كانت بغير لسان العرب، ولا يدرى ما هو ولعله يدخله سحر أو كفر أو غير ذالك، واما ما كان من القرآن او شيء من الدعوات فلا بأس به اهـ.

(۱۲۶) بریلویوں کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں بریلویوں کی مساجد ہیں دیوبندیوں کی زیادہ دور ہیں، تو کیا ہم بریلویوں کی مساجد میں ان کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا محلے سے دور دیوبندیوں کے پیچھے جا کر نماز پڑھیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً . . ایسا مبتدع امام جس کے عقائد کفریہ ہوں تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ اور اگر اس کے عقائد غیر کفریہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر بریلوی ایسے ہیں کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں تو ان کی اقتداء میں نماز نہیں ہوتی اور اگر ان کے عقائد کفریہ نہیں تو ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا بریلویوں کی مساجد کے علاوہ دوسری مساجد (دیوبندیوں کی) جو ہیں ان میں جا کر نماز پڑھنا چاہئے۔ البتہ اگر آپ (کسی عذر کی وجہ سے) وہاں نہیں جا سکتے تو اکیلے نماز پڑھنے سے (ان بریلویوں کے پیچھے جن کے عقائد کفریہ نہیں) کے پیچھے نماز پڑھنا بہتر ہے۔

لما في خلاصة الفتاوى (۱/ ۱۵۰): والفاسق اذا كان يؤم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم يقتدى به في الجمعة ولا تترك الجماعة بامامة وفي غير الجمعة يستقبل من ان يتحول الى مسجد

آخر ولا يأثم بذلك ولو صلى خلف مبتدع او فاسق فهو محرز ثواب الجماعة. لكن لاينال مثل ما ينال خلف تقي

وفي الهندية (۱/۸۶): الفاسق اذا كان يؤم يوم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم يقتدى به في الجمعة ولا تترك الجمعة بامامته وفي غير الجمعة يجوز ان يتحول الى مسجد آخر ولا يأثم به.

(۱۲۷) غیر مقلد کی امامت کا شرعی حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں سفر پر جا رہا تھا تو راستے میں ہم نے ایک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جو غیر مقلد نے پڑھائی تھی تو کیا ہماری نماز غیر مقلد کے پیچھے صحیح ہوگی یا دوبارہ اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً فقہائے کرام نے مخالف مذہب والے امام کی اقتداء کے بارے میں تمام کتب معتبرہ ومتعددہ میں یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر مخالف مذہب والا امام (مثلاً غیر مقلد) ان مسائل میں جو ہمارے علماء کا اختلاف اور ان کے مابین مختلف فیہا ہوں ان میں ہمارے اصول کی رعایت رکھتا ہو مثلاً غیر سبیلین سے کسی شے کے خارج ہونے پر وضو کرتا ہو، کپڑوں پر بقدر درہم منی لگ جانے پر دھوتا ہو، شرمگاہ کے چھونے پر وضو کرتا ہو تو اس صورت میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر رعایت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور آج کل کے غیر مقلدین کا ان مسائل میں ہمارے اصول کی رعایت نہ کرنا روز روشن کی طرح عیاں ہے لہٰذا اب ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور احتیاطاً واجب الاعادہ ہے۔ لہٰذا آپ نے جو نماز غیر مقلد امام کی اقتداء میں ادا کی ہے احتیاطاً اس نماز کا اعادہ کر لیجئے۔

لما في الشامية (۱/۵۶۳): وأما الاقتداء بالمخالف في الفروع كالشافعي فيجوز مالم يعلم منه مايفسد الصلاة على اعتقاد المقتدي عليه الاجماع، انما اختلف في الكراهة اهـ فقيد بالمفسد دون غيره كما ترى في رسالة [الاهتداء في الاقتداء] لملا علي القاري: ذهب عامة مشايخنا إلى الجواز اذا كان يحتاط في موضع الخلاف والا فلا. والمعنى أنه يجوز في المراعي بلا كراهة وفي غيره معها ثم المواضع المهملة للمراعاة ان يتوضأ من الفصد والحجامة والقيء والرعاف ونحو ذلك لا فيما هو سنة عنده مكروه عندنا كرفع اليدين في الانتقالات وجهر البسملة واخفائها فهذا وأمثاله لايمكن فيه الخروج عن عهدة الخلاف فكلهم يتبع مذهبه ولا يمنع مشربه اهـ

وفي الفتاوى الكبرى لابن تيمية (۲/۲۸۵): يكونون في وقت يقلدون من يفسده وفي وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوى ومثل هذا لايجوز باتفاق الامة.

(۱۲۸) جو شخص مرغ لڑاتا، نسوار اور سگریٹ استعمال کرتا ہو، اس کی امامت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نسوار کھاتا ہے اور سگریٹ کثرت سے پیتا ہے اور مرغ لڑاتا ہے تو ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں جبکہ وہ قاری ہے اور منزل بھی یاد ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... اگر کوئی امام نسوار یا سگریٹ استعمال کرتا ہو تو اس کو چاہئے کہ انکا استعمال ترک کر دے اور اگر اس کے لئے ان چیزوں کا ترک کرنا مشکل ہو تو پھر جب بھی مسجد آئے تو نسوار اور سگریٹ کی بدبو کو زائل کر کے آئے کیونکہ حدیث میں بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر امام مرغ لڑاتا ہو تو اس کو اس سے بچنا چاہئے کیونکہ مرغ لڑانا ناجائز ہے اور اسی طرح مرغ لڑانے پر جوا لگانے سے اس فعل کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے مرغ لڑانے اور اس پر جوا لگانے سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

لمافي الشامية(۱/۵۵۹): (ويكره تنزيها الخ) لقوله في الاصل امامة غيرهم احب الي، بحر عن المجتبى والمعراج ثم قال فيكره لهم التقدم ويكره الاقتداء بهم تنزيها فان امكن الصلوة خلف غيرهم فهو افضل والا فالاقتداء اولى من الانفراد ...... (ص ۵۶۰) (قوله و فاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني و آكل الربا ونحو ذلك كذا في البرجندي اسمعيل وفي المعراج قال اصحابنا لاينبغي ان يقتدى بالفاسق الا في الجمعة لانه في غيرها يجد اماما غيره اه قال في الفتح وعليه فيكره في الجمعة اذا تعددت اقامتها في المصرى على قول محمد المفتي به لانه بسبيل الى التحول.

(۱۲۹) داڑھی پر سیاہ خضاب لگانے والے کی امامت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص داڑھی پر سیاہ خضاب لگاتا ہو تو اس کو امام بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... داڑھی پر سیاہ خضاب لگانا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا مرتکب فاسق ہے اور فاسق کا امام بنانا مکروہ ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اس فعل کو چھوڑ کر توبہ نہیں کرتا تو اس کو امامت سے ہٹایا جائے بلکہ کسی متقی شخص کو امامت کیلئے منتخب کرنا چاہئے۔

لمافي الهندية(۵/۳۵۹): أما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلك من الغزاة ليكون اهيب في عين العدو فهو محمود منه اتفق عليه المشايخ ومن فعل ذلك ليزين نفسه للنساء وليحبب نفسه اليهن فذلك مكروه وعليه عامة المشايخ وبعضهم جوز ذلك من غير كراهة. وروى عن أبي يوسف أنه

العلوم فهو أولى كذا في الخلاصة فان تساووا فاقرءهم أى اعلمهم بعلم القراءة.

وفي تنوير الابصار مع الدر (۱/۵۵۷): (والأحق بالامامة) تقديما بل نصبا مجمع الانهر (الأعلم باحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض وقيل واجب وقيل سنة (ثم الاحسن تلاوة) وتجويداً (للقراءة ثم الاورع) الاكثر اتقاء للشبهات والتقوى اتقاء المحرمات (ثم الاسن) اى الاقدم اسلاما فيقدم شاب على شيخ اسلم وقالوا يقدم الاقدم ورعا وفي النهر عن الزاد وعليه يقاس سائر الخصال فيقال يقدم الدم علما ونحوه وحينئذ فقلما يحتاج للقرعة (ثم الاحسن خلقا) بالضم الفة بالناس (ثم الاحسن وجها).

وفي الدر المختار (۱/۴۰۰): ولاية الاذان والاقامة لباني المسجد مطلقا وكذا الامامة لو عدلا

وفي الشامية تحته: (قوله مطلقا) اى عدلا أولا. وفي الأشباه: ولد الباني وعشيرته اولى من غيرهم اهـ

(۱۳۲) حضورﷺ سے وتر کی امامت کا ثبوت اور مسبوق کا اپنی چھوٹی ہوئی رکعت کو پورا کرنے کا ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نماز میں رکوع تاخیر سے پہنچا اور اس کی ایک رکعت امام کے پیچھے چھوٹ گئی تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کر لیتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ کب سے شروع ہوا کیا یہ طریقہ جو آجکل معمول ہے حدیث میں آیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے اسے مدینہ منورہ میں شروع کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا پھر رائج کیا؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۲)۔ کیا وتر کی امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مسبوق کی نماز کا طریقہ اصل میں سنت سے ثابت ہے البتہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اکثر رکعت رہ جاتی تھی ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا کہ وہ اپنی فوت شدہ نماز پوری کر رہے ہیں تو آپ علیہ السلام نے تاکید کے طور پر فرمایا کہ تم میں سے جب کسی کی رکعت چھوٹ جائے تو تم بھی ایسا ہی کر لیا کرو جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کر رہے ہیں۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر کی امامت ثابت نہیں ہے کیونکہ آپ علیہ السلام وتر ہمیشہ گھر میں پڑھا کرتے تھے البتہ صحابہ کرام سے صرف رمضان المبارک میں وتر باجماعت پڑھنا ثابت ہے اس لئے فقہاء کرام نے غیر رمضان میں وتر باجماعت نہ پڑھنے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

لما في مسند امام احمد بن حنبل (۶/۳۲۶): حدثنا عبدالله ... عن معاذ بن جبل قال احيلت الصلوة

ثلاثة احوال　　قال وكانوا يأتون الصلوة وقد سبقهم ببعضها النبي ﷺ قال فكان الرجل يشير الى الرجل ان جاء كم صلى فيقول واحدة أو اثنتين فيصليها ثم يدخل مع القوم في صلاتهم قال: فجاء معاذ فقال لا اجده على حال ابدا الا كنت عليها ثم قضيت ما سبقني قال فجاء وقد سبقه النبي ﷺ ببعضها قال فثبت معه فلما قضى رسول الله ﷺ صلاته قام فقضى فقال رسول الله ﷺ انه قد سن لكم معاذ فهكذا فاصنعوا

وفي اعلاء السنن (۶/۳۳): وروى ابن مسعود مرفوعا قال رسول الله ﷺ وتر الليل ثلاث كوتر النهار صلاة المغرب، واسناده حسن كما سيأتي. (ص ۳۴) ولان عائشة كانت ترى وتره ﷺ اكثر مما يراه ابن عمر لانه ﷺ كان يوتر في بيته دائما وفي آخر الليل غالبا.

وفيه ايضا (۶/۳۶): حدثنا ابو النضر . عن عائشة ان رسول الله ﷺ كان اذا صلى العشاء دخل المنزل ثم صلى ركعتين ثم صلى بعدهما ركعتين اطول منهما ثم اوتر بثلاث لايفصل بينهن.

وفي الهداية (۱/۱۵۸): ولا يصلى الوتر بجماعة في غير شهر رمضان عليه اجماع المسلمين.

(۱۳۳) فجر اور ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فجر اور ظہر کی نمازیں جماعت سے جلدی کراتے ہیں اور جلدی سے فجر کی سنت ادا کئے بغیر نماز پڑھاتے ہیں جبکہ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ فجر و ظہر کی سنتیں پڑھنے سے پہلے امامت کرانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: فجر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرانا مکروہ ہے کیونکہ فرض کے بعد وقت کے اندر ان کی قضا نہیں ہو سکتی، اس لئے سنت زیادہ مؤکدہ ہے البتہ ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرانا جائز ہے لیکن بلا عذر ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

ففي الترمذي (۱/۹۷): عن عائشة ان النبي ﷺ كان اذا لم يصل اربعا قبل الظهر صلاهن بعدها.

وفي اعلاء السنن (۷/۷): عن عائشة رضي الله عنها قالت لم يكن النبي ﷺ على شيء من النوافل اشد تعاهدا منه على ركعتي الفجر. قوله عن عائشة رضي الله عنها الخ، قال المؤلف دلالته على تاكيد سنة الفجر ظاهرة.

(۱۳۴) فجر کی سنت ادا کئے بغیر امامت کرانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے امام صاحب کو اکثر فجر کی جماعت کے وقت

پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے تو وہ بغیر سنت پڑھے نماز فجر پڑھا دیتے ہیں۔ میں نے کسی سے سنا ہے کہ فجر کی سنت پڑھے بغیر نہ پڑھی ہو ان سے فجر کے فرض پڑھانا مکروہ ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ براہِ کرم صحیح بات سے مجھے جلد از جلد مطلع فرما دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ——— فجر کی سنت تمام سنتوں میں مؤکد ترین اور اقویٰ سنت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پڑھنے پر مداومت فرمائی ہے۔ اور سفر وحضر، صحت وبیماری کسی حال میں ترک نہیں فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کا ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر کسی نے عذر کی بناء پر چھوڑ دی تو اس پر گناہ نہیں۔

صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب کو جماعت کے وقت پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے اور وہ سنت پڑھے بغیر فجر کی نماز پڑھا دیں تو نماز پڑھانا درست ہے۔ البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا خلاف سنت ہے۔

لمافی البخاری (۱/۱۵۶): عن عائشة قالت لم يكن النبي ﷺ على شئ من النوافل اشد تعاهدا منه على ركعتي الفجر.

وفي الفتاوى التاتارخانية (۱/۲۳۱): يجب ان يعلم ان التطوع قبل الفجر ركعتان اتفقت الآثار عليهما وانهما من اقوى السنن، وفي المنافع: سنة الفجر اقوى السنن حتى لو انكرها يخشى عليه الكفر، ولا يجوز ان يصليها قاعدا مع القدرة على القيام، ولهذا قيل انها قريب من الواجب،

وفيه ايضاً (۱/۲۳۳): وفي النوازل: اذا ترك السنن ان تركها بعذر فهو معذور، وان تركها بغير عذر لايكون معذورا فيها ويسأل الله تعالى يوم القيامة عن تركها. (وفي الصفحة ۲۲۶) وفي الكافي: وقالوا لو كان العالم مرجعا للفتوى له ترك سائر السنن لحاجة الناس اليه الاسنة الفجر.

(۱۳۵) اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں؟ اور امام کب تکبیر تحریمہ کہے؟

سوال ——— کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں موجود ہے کہ جماعت کے وقت امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں اور امام قد قامت الصلوٰۃ کے وقت نماز شروع کر دے۔ عبارت یہ ہے والقيام حين قيل حي على الفلاح وشروع الامام مذقيل قد قامت الصلوة كنز الدقائق (۱/۲۳) آج کل ہماری مساجد میں اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے کہ امام اور مقتدی اقامت سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اقامت ختم ہو جانے کے بعد امام نماز شروع کرتا ہے۔ آیا ہماری مساجد میں یہ عمل خلاف سنت ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس عبارت کا کیا مقصد ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا معمول تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ——— امام اور مقتدی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱)۔ کہ مقتدی مسجد میں ہوں اور امام خارج مسجد سے داخل ہو رہا ہو۔ اگر امام سامنے محراب کی طرف سے داخل ہو رہا ہو، تو مقتدی ان کو دیکھتے ہی نماز کیلئے کھڑے ہو جائیں۔ (۲)۔ اگر امام صف کے پیچھے سے آ رہا ہو تو امام جس صف سے گزرتا جائے اس صف والے مقتدی کھڑے ہوتے جائیں۔ (۳)۔ امام اور مقتدی مسجد کے اندر ہوں۔

تو اس بارے میں ہماری کتب میں جو تصریح ہے، جیسے کنز الدقائق (۱/۳۳) پر ہے "والقیام حین قد قیل حی علی الفلاح" اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد امام اور مقتدی نہ بیٹھے جیسا کہ البحر الرائق (۱/۵۲۱) میں اس کی علت یہ بیان کی ہے "لانہ امر فیستحب المسارعۃ الیہ" تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بیٹھنا مسارعت الی الطاعت کے خلاف ہے، نہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا بلکہ اس میں مسارعت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور یہی فیض الباری کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا تعامل بھی یہی تھا کہ ابتدا اقامت سے کھڑے ہوتے تھے۔ لہذا ہماری مساجد میں ائمہ اور مقتدیوں کا اقامت کی ابتداء سے کھڑا ہونا خلاف سنت نہیں ہے اور امام کے شروع فی الصلوٰۃ کے بارے میں امام ابو یوسف کا قول یہ ہے کہ جب مؤذن اقامت سے فارغ ہو جائے تو امام تکبیر کہے تاکہ مؤذن امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ اور امام کے ساتھ نماز شروع کرنے کی فضیلت سے محروم نہ ہو جائے۔

ل۔ في الصحيح لمسلم (۱/۲۲۰): عن أبي هريرة أن الصلوة كانت تقام لرسول الله ﷺ فيأخذ الناس مصافهم قبل أن يقوم النبي ﷺ مقامه.

وفي فيض الباري (۲/۱۸۷): باب متى يقوم الناس "ويعلم من بعض الأحاديث أنهم كانوا يقومون لما سمعوا تمام الإقامة ومن بعضها أنهم كانوا يقومون في خلالها وهكذا في كتبنا. والمسألة في أن الإمام إن كان خارج المسجد ينبغي للمقتدين أن يقوموا لتسوية الصفوف إذا دخل في المسجد، وإن كان في المسجد فالمعتبر قيامه من موضعه وكيف ما كان ليست المسألة من نفس الصلاة بل من الآداب فإن قام أحد قبله لا يكون عاصياً.

"فلا تقوموا حتى تروني" قال العلماء إن بلالاً رضي الله عنه كان يراقب النبي ﷺ فإذا رآه أقام وأما سائر الناس فكانوا لا يرونه إلا بعد أن يصل إلى الصف وكان المسجد من بيته بحيث لو خرج لقدمه منها وقع في المسجد فكان بلال رضي الله عنه يقيم إذا خرج فإذا وصل موضع الإقامة وجد الصفوف قد سويت والإقامة قد تمت

وفي البحر الرائق (۱/۵۲۱) قوله: (والقيام حين قيل حيّ على الفلاح) لأنه أمر به فيستحب المسارعة إليه أطلقه فشمل الإمام والمأموم إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صف ينتهي إليه الإمام وهو الأظهر (وشروع الإمام مذ قيل قد قامت الصلاة) عند أبي حنيفة ومحمدٌ وقال أبو يوسفٌ يشرع إذا فرغ من الإقامة محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة للمؤذن على الشروع معه ولهما أن المؤذن أمين وقد أخبر بقيام الصلاة فيشرع عنده صوناً لكلامه عن الكذب وفيه مسارعة إلى المناجات وقد تابع المؤذن في الأكثر فيقوم مقام الكل على أنهم قالوا المتابعة في الأذان دون الإقامة كذا ذكره الشارح وفيه نظر لما نقلناه في باب الأذان أن اجابة الإقامة مستحبة

وفی الظهيرية: ولو أخر حتى يفرغ المؤذن من الاقامة لا بأس به في قولهم جميعا والله أعلم.

وفی الهندية(۱/۵۷): وإن كان المؤذن غير الإمام وكان القوم مع الإمام في المسجد فإنه يقوم الإمام والقوم إذا قال المؤذن حيّ على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح ☆ فاما إذا كان الإمام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذلك الصف واليه مال شمس الائمة الحلوانی والسرخسی وشيخ الإسلام خواهرزاده وإن كان الإمام دخل المسجد من قدامهم يقومون كما رأوا الامام وإن كان المؤذن والإمام واحدا فإن أقام في المسجد فالقوم لا يقومون مالم يفرغ من الإقامة وإن أقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا على أنهم لا يقومون مالم يدخل الإمام المسجد.

وفی الدر المختار(۱/۴۷۹): (قوله وشروع الإمام) في الصلوة (مذقيل قد قامت الصلوة) ولو أخر حتى اتمها لا بأس به إجماعاً وهو قول الثاني والثلاثة. وهو أعدل المذاهب كمافي شرح المجمع لمصنفه وفي القهستاني معزيا للخلاصة وهو الأصح (وتحته في الشامية) ـــ (قوله لا بأس به إجماعاً) أي لأن الخلاف في الأفضلية فنفي البأس اي الشدة ثابت في كلا القولين وإن كان الفعل أولى في أحدهما (قوله وهو) اي التأخير المفهوم من قوله أخر (قوله انه الأصح) لأنه فيه محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة له على الشروع مع الإمام.

(۱۳۶) امام کا محراب میں کھڑے ہونے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کو محراب میں کس جگہ کھڑا ہونا چاہئے۔ اگر کوئی امام محراب سے بالکل باہر کھڑا ہو، لیکن سجدہ محراب میں ادا کرتا ہو، کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: محراب اگر اتنی چھوٹی ہو کہ اس میں امام کے کھڑے ہونے سے اُس کی حالت مقتدیوں پر مشتبہ ہوتی ہو تو مکروہ ہے، البتہ اگر اتنی بڑی محراب ہو کہ اس میں کھڑے ہونے سے امام کی حالت مقتدیوں پر مشتبہ نہ ہوتی ہو تو امام کا محراب میں کھڑا ہونا بلا کراہت جائز ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده في الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا في التبيين وإذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلابأس بأن يقوم في الطاق كذا في الفتاوى البرهانية.

وفی الطحطاوی تحته (قوله لاشتباه الحال على القوم) فان انتفى الاشتباه انتفت الكراهة وهذا

العلماء لجماعة منهم الفقيه أبو جعفر الهندواني.

وفي الشامية (۱/۶۴۵): وحاصله أنه صرح محمد في الجامع الصغير بالكراهة ولم يفصل، فاختلف المشايخ في سببها، فقيل كونه يصير ممتازا عنهم في المكان لأن المحراب في معنى بيت آخر وذلك صنيع أهل الكتاب، واقتصر عليه في الهداية واختاره الامام السرخسيّ وقال إنه الأوجه، وقيل اشتباه حاله على من في يمينه ويساره فعلى الاول يكره مطلقا وعلى الثاني لايكره عند عدم الاشتباه، وأيد الثاني في الفتح بأن امتياز الامام في المكان مطلوب، وتقدمه واجب وغايته اتفاق الملتين في ذلك، وارتضاه في الحلية وأيده لكن نازعه في البحر بأن مقتضى ظاهر الرواية الكراهة مطلقا، وبأن امتياز الامام المطلوب حاصل بتقدمه بلا وقوف في مكان آخر ولهذا قال في الولوالجية وغيرها إذا لم يضق المسجد بمن خلف الامام لاينبغي له ذلك لأنه يشبه تباين المكانين.........

قلت: أي لأن المحراب إنما بني علامة لمحل قيام الامام ليكون قيامه وسط الصف كما هو السنة، لا لأن يقوم في داخله فهو وإن كان من بقاع المسجد لكن أشبه مكانا آخر فأورث الكراهة.

(۱۳۷) امام اور مقتدیوں میں تعداد رکعات میں اختلاف کی صورت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر امام اور مقتدی میں تعداد رکعات پر اختلاف ہو جائے تو کس کا قول معتبر ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں جب امام اور مقتدیوں کو تعداد رکعات میں اختلاف ہو جائے۔ مثلاً مقتدی کہیں کہ تین رکعات پڑھائی ہیں۔ جبکہ امام کہتا ہو کہ میں نے پوری چار رکعات پڑھائی ہیں۔ تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین ہے تو اس صورت میں امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۲) اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین تو نہیں ہے مگر مقتدیوں میں سے کوئی ایک بھی اس کا حامی ہے تو اس صورت میں بھی امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۳) امام کو اپنی بات کا پورا یقین بھی نہیں ہے، اور تمام مقتدی بھی اس کی رائے کے مخالف ہیں تو اس صورت میں مقتدیوں کا قول معتبر ہوگا، اور نماز دوبارہ لوٹائی جائے گی۔

لما في الهندية (۱/۱۳۲): إذا شك الإمام فأخبره عدلان يأخذ بقولهما رجل صلى وحده أو صلى بقوم. فلما سلم، أخبره رجل عدل، إنك صليت الظهر ثلاث ركعات. قالوا إن كان عند المصلي أنه صلى أربع ركعات لايلتفت إلى قول المخبر.

وفی الدر المختار(۲/۹۲): ولو اختلف الامام والقوم فلو الامام علی یقین لم یعد والا اعاد بقولھم

وفی الطحطاوی(۱/۳۱۷): (قولہ ولو اختلف الامام والقوم) ای کل القوم، اما لو اختلف القوم وقال بعضھم صلی ثلاثا وقال بعضھم صلی أربعا. والامام مع أحد الفریقین یؤخذ بقول الامام وان کان معہ واحد

(۱۳۸) گرمی کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جماعت کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک مسجد ہے جس میں رمضان المبارک میں ماشاء اللہ تراویح مع ختم قرآن ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات موسم گرما میں نماز عشاء اور تراویح وغیرہ مسجد کی چھت پر پڑھی جاتی ہے۔ خصوصا جب بجلی موجود نہ ہو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ تو کیا جماعت خانہ خالی ہوتے ہوئے مسجد کی چھت پر نماز عشاء وتراویح ادا کرنا مکروہ ہے یا جائز؟ حالانکہ مسجد کی چھت تو مسجد ہی کے حکم میں ہوا کرتی ہے۔ جیسے معتکف اگر مسجد کی چھت پر چڑھ جائے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر جماعت خانہ کے خالی ہوتے ہوئے نماز عشاء وتراویح ادا کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مسجد کے ہال کو چھوڑ کر چھت پر بغیر عذر نماز عشاء یا تراویح کی جماعت مکروہ ہے۔ اور فقہاء کرام کی عبارات گرمی کی وجہ سے چھت پر باجماعت نماز کی کراہت پر واضح ہیں۔ لہٰذا گرمی کوئی ایسا عذر نہیں جس کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ دیا جائے البتہ مسجد کے صحن میں نماز ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

جہاں تک معتکف کی بات ہے، معتکف کے چھت پر چڑھنے کی وجہ سے اعتکاف اس لئے نہیں ٹوٹتا کہ چھت مسجد کے حکم میں ہے اور جماعت اس لئے مکروہ ہے کہ چھت جماعت خانے کے حکم میں نہیں ہے اسلئے اگر کسی مسجد کی دو منزلیں ہیں تو دوسری منزل میں ہال کو چھوڑ کر نماز با جماعت بلا کراہت جائز ہے کیونکہ وہ جماعت خانے کے حکم میں ہے۔

لما فی کبیری(ص۳۹۲): وفی القنیۃ امام یصلی التراویح علی سطح المسجد اختلف فی کراھتہ والاولی ان لایصلی فیہ عند العذر فکیف بغیرہ.

وفی التاتارخانیۃ(۱/۷۷۰): وکذا اذا غلبہ النوم یکرہ لہ أن یصلی مع القوم بل ینصرف حتی یستیقظ وکذا لو صلی علی السطح من شدۃ الحر.

وفی الھندیۃ(۵/۳۲۲): الصعود علی سطح کل مسجد مکروہ لھذا اذا اشتد الحر یکرہ ان یصلوا بالجماعۃ فوقہ الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لا یکرہ الصعود علی سطحہ للضرورۃ.

وفی الشامیۃ(۱/۶۵۶): ثم رأیت القھستانی نقل عن المفید کراھۃ الصعود علی سطح المسجد اھ ویلزمہ کراھۃ الصلاۃ ایضاً فوقہ. فلیتامل(قولہ لانہ مسجد) علۃ لکراھۃ ماذکر فوقہ قال الزیلعی:

ولهذا يصح الاقتداء من على سطح المسجد بمن فيه اذا لم يتقدم على الامام ولا يبطل الاعتكاف بالصعود اليه

(۱۳۹) بیمار کی تیمارداری کیلئے جماعت کی نماز چھوڑنے کا حکم

سوال:..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام، مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر والوں کی طبیعت سخت خراب ہو، ان کے پاس گھر میں کوئی اور ان کی تیمارداری کرنے والا نہ ہو، اور مسجد میں نماز پڑھنے جانے کی صورت میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہو، تو کیا ایسی صورت میں جماعت کی نماز چھوڑنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:..... اگر بیمار آدمی کے ساتھ تیمارداری کرنے والا کوئی اور نہ ہو، اور مسجد میں چلے جانے کی صورت میں بیمار کو تکلیف ہوتی ہو تو اس صورت میں جماعت چھوڑنا درست ہے۔

لما فی الهندية (۱/۸۳): تسقط الجماعة بالاعذار حتی لاتجب علی المریض ..... أن تفوته قافلة أو كان قيما لمريض الخ

وفی الشامية (۱/۵۵۶): (قوله وقيامه بمريض) أی يحصل له بغيبته المشقة والوحشة

(۱۴۰) فرض نماز کا "جماعت سے" اور "مسجد میں جاکر" پڑھنا الگ الگ واجب ہے

سوال:..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام، مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے؟ یا مسجد کی طرف جماعت کی نماز پڑھنے کیلئے جانا بھی واجب ہے؟ جبکہ علامہ طحطاوی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے "الأصح أن اقامتها فی البيت كاقامتها فی المسجد وان تفاوتت الفضيلة (ص ۲۸۶)" اور اعلاء السنن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے مسجد کی طرف جانا بھی واجب ہے "قلت ان اتيان المسجد ايضا واجب كوجوب الجماعة (اعلاء السنن، ۴/۱۷۲)" اب ان دونوں قولوں میں سے راجح کون سا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کی طرف جانا جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے اگر واجب ہو، تو پنج وقتہ نماز کیلئے جانا واجب ہے، یا اکثر اوقات، یا بعض اوقات جانا واجب ہے، اور بعض اوقات جانے سے وجوب ساقط ہو جائے گا جیسا کہ علامہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ "فالواجب الحضور احيانا (الشامية، ۱/۵۵۲)" کبھی کبھی جانے سے وجوب ساقط ہو جائے گا۔ قول فیصل بیان فرما کر مشکور فرمائیں۔ نیز یہ کہ بعض حضرات سے سنا ہے، کہ اگر کسی شخص نے تین نمازیں با جماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا۔ آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــــ فرض نمازوں کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا مستقل طور پر واجب ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کیلئے مسجد میں آنا یہ الگ واجب ہے۔ اور ہر ایک کے ترک کرنے پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ چند جوانوں سے کہوں کہ بہت سا ایندھن اکٹھا کرکے لائیں میں پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو بلا عذر گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور جا کر ان کے گھروں کو جلا دوں اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہے یعنی مسجد میں اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمہارے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو تم نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کے چھوڑنے والے ہو گے اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے اور جو شخص اچھی طرح وضو کرے اس کے بعد مسجد کی طرف جائے تو ہر ہر قدم پر ایک ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک ایک درجہ بلند ہوگا اور ایک ایک خطا معاف ہوگی اور ہم تو اپنا یہ حال دیکھتے تھے کہ جو شخص کھلا منافق ہو وہ تو جماعت سے رہ جاتا تھا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عام منافقوں کی بھی جماعت چھوڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی یا کوئی سخت بیمار ہو ورنہ جو شخص دو آدمیوں کے سہارے سے گھسٹتا ہوا جا سکتا تھا وہ بھی صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

رہی یہ بات کہ صاحب حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی نے صاحب قنیہ کے حوالے سے جو مطلقاً لکھا ہے الاصح ان اقامتھا فی البیت کاقامتھا فی المسجد وان تفاوتت الفضیلۃ اس کے متعلق صاحب اعلاء السنن نے تصریح کی ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اصحاب مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں اور صاحب قنیہ کی نقل ضعیف ہے اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے اور جہاں تک علامہ شامی کا قول ہے "فالواجب الحضور احیانا" تو یہ اس صورت پر محمول ہو سکتا ہے جب کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت رہ گئی ہو، ورنہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ بغیر عذر کے کبھی کبھار بھی گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بدعت اور مکروہ ہے۔ اور بعض حضرات سے سنی ہوئی بات کہ "اگر کسی شخص نے تین نمازیں باجماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا" درست نہیں ہے۔

لما فی اعلاء السنن (۱۸۶/۴): قلت دلالتہ علی الجزء الاول ظاھرۃ حیث بولغ فی تھدید من تخلف عنھا وحکم علیہ بالنفاق ومثل ھذا التھدید لا یکون الا فی ترک الواجب ولا یخفی ان وجوب الجماعۃ لو کان مجردا عن حضور المسجد لما ھم رسول اللہ ﷺ باحرام البیوت علی المتخلفین لاحتمال انھم صلوھا بالجماعۃ فی بیوتھم فثبت ان اتیان المسجد ایضا واجب کوجوب الجماعۃ فمن صلاھا بجماعۃ فی بیتہ اتی بواجب وترک واجبا اخر

وفیہ ایضاً (۱۸۸/۴): قلت: وھذا صریح فی ان وجوب الجماعۃ انما یتادی بجماعۃ المسجد لا

لمافی ترمذی (۱/۳۰): عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ صلوٰۃ الجماعۃ تفضل علی صلوۃ الرجل وحدہ بسبع وعشرین درجۃ۔

وفی الشامیۃ (۱/۳۹۶): الراجح عند اھل المذھب وجوب الجماعۃ وانہ یأثم بتفویتھا اتفاقاً: وحینئذ یجب السعی بالقدم لا لاجل الاداء فی اول الوقت او فی المسجد بل لاجل اقامۃ الجماعۃ والا لزم فوتھا اصلاً او تکرارھا فی مسجد ان وجد جماعۃ اخری وکل منھا مکروہ۔

(۱۴۲) بار بار وضو ٹوٹنے، ٹانگوں میں درد جیسے عذر کی بنا پر مسجد میں آ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سال پہلے اپنی مقامی مسجد (جامع مسجد گول مارکیٹ) میں وضو کے بعد اچانک پیر پھسلنے کے بعد گر پڑا اور اس حادثے کے بعد سے مستقل طور پر بیمار آدمی کی زندگی گزار رہا ہوں، اس حادثے کے کچھ عرصے بعد جسم کے بائیں طرف فالج کا حملہ ہوا اور حالت مزید خراب ہوگئی۔ اب اللہ کے فضل سے بذریعہ علاج کچھ افاقہ ہوا۔ میری روٹین کچھ اس طرح ہے کہ میں عصر کی نماز میں باجماعت شریک ہو جاتا ہوں اور پھر تلاوت کرنے مغرب باجماعت پڑھ کر لوٹتا ہوں۔ مسلسل گرم دواؤں کے استعمال سے مجھے قبض اور گیس کی شکایت رہتی ہے۔ میں عصر کی جماعت کیلئے گرم پانی کا وضو بنا کر گھر سے چلتا ہوں مگر وضو دامنِ یا آدھا گھنٹے میں ٹوٹ جاتا ہے یا کبھی نماز شروع کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھنڈے پانی سے ہی جو بھی میسر ہو دوبارہ وضو بنانا پڑتا ہے۔ مسجد میں گرم پانی ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا لہٰذا مجبوراً ٹھنڈے پانی سے وضو بنانے پر میری انگلیوں پر اور پیروں میں کھچاؤ اور تکلیف ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر نے رمضان کے روزے رکھنے اور نماز پڑھنے سے بھی منع کیا ہے۔ اب اس مسئلے کے حل کی جتنی بھی شرعی صورتیں ہو سکتی ہیں بیان فرما دیں۔ ان میں سے مناسب اور آسان صورت کو اختیار کر لوں گا۔ مسجد منٹ کی مسافت پر ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ نہیں چلا جاتا۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورتِ مسئولہ میں اگر بار بار وضو کرنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہو اور گھر سے وضو کر کے مسجد تک جاتے جاتے یا نماز شروع ہوتے ہوتے وضو ٹوٹ جاتا ہو یا بڑھاپے کی وجہ سے مسجد تک چلنے میں تکلیف ہوتی ہو تو ایسی صورت میں اگر آپ جماعت میں شریک ہونے کی بجائے گھر میں ہی وضو کر کے جلدی جلدی نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کیلئے شرعاً اجازت ہے کہ آپ گھر میں ہی پڑھ لیں۔ کذا فی نفع المفتی والسائل بحوالہ فتاوی رحیمیہ (۱/۱۹۵)۔ کیونکہ بیماری اور ایسے بڑھاپے میں جس کی وجہ سے مسجد تک چلنا مشکل ہو جائے اس سے جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔

دوسری صورت آپ کیلئے یہ ہے کہ اگر پانی کے استعمال سے بیماری میں اضافہ ہونے یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں آپ تیمم کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ خوف غلبہ ظن یا تجربہ یا کسی مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب کی خبر سے معلوم ہو سکتا ہے۔

یا ڈاکٹر کا روزہ رکھنے سے منع کرنا تو اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے بیماری میں اضافہ ہونے کا یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو، دونوں

مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب آپ کو روزہ نہ رکھنے کا مشورہ دے تو آپ کو شرعاً روزے فی الحال نہ رکھنے کی اجازت ہے البتہ بعد صحت قضاء کرنا ضروری ہوگا۔

رہا نماز کا مسئلہ تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہو، اور بیماری میں اضافہ یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو بیٹھ کر ہی رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر رکوع وسجدہ میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو اشارہ کر کے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو لیٹ کر اشارتاً رکوع وسجدہ کرتے ہوئے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے اشارہ کرنے پر بھی قادر نہ ہوں تو فی الحال نماز کو موخر کر دیں۔

لما فی الهندیة (۱/۸۳): وتسقط الجماعة بالاعذار حتی لا تجب علی المریض والمقعد والزمن ومقطوع الید والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذی لا یستطیع المشی والشیخ الکبیر العاجز والاعمی عند ابی حنیفة رحمه الله تعالی.

وفی الطحطاوی (ص۲۹۸): قوله وشیخوخة، مصدر شاخ یشیخ اذا اسنان منه السن قاموس. ای اذا صار شیخا کبیرا لایستطیع المشی سقطت عنه الجماعة.

وفی الهندیة (۱/۲۸): ولو کان یجد الماء الا انه مریض یخاف ان استعمل الماء اشتد مرضه او ابطأبرءه یتیمم ــــــــ ویعرف ذلک الخوف اما بغلبة الظن عن امارة او تجربة او اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاهر الفسق کذا فی شرح منیة المصلی لابراهیم الحلبی.

(۱۴۳) راستوں وغیرہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) محلہ کی مسجد میں جماعت ثانی ہیئت اولیٰ کی تبدیلی کے باوجود درست نہیں ہے آیا یہ حکم صرف محلہ والوں کے لئے ہے یا مسافر بھی اس میں داخل ہیں مثلاً تبلیغی جماعت والے محلہ کی مسجد میں اس وقت آئے جبکہ محلہ والے جماعت سے نماز پڑھ چکے تھے آیا یہ تبلیغی جماعت والے یعنی کوئی بھی مسافر ہیئت اولیٰ بدل کر مسجد میں جماعت ثانی کرواسکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) راستے کی مساجد مثلاً جو بس اسٹاپ پر، ریلوے اسٹیشن پر یا سڑک کے کنارے پر بنی ہوئی ہوتی ہیں ان مساجد میں امام ومؤذن متعین ہوں جو پانچ وقت اذان دیتا ہو، اور نماز پڑھاتا ہو تو کیا اس صورت میں اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں جماعت ثانی کروانا درست ہے یا نہیں درست ہونے کی صورت میں ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟ یا اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں اس وقت جماعت ثانی کروانا درست ہوگی جب ان مساجد میں امام ومؤذن متعین نہ ہوں کیا اس صورت میں بھی ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟

(۳) تبلیغی جماعت والوں کی تشکیل مثلاً سندھ یا پنجاب کے کسی دیہات میں ایک مہینے کی ہوئی وہاں بستی قریب قریب ہوتی ہیں مثلاً دو یا

تین کلو میٹر کے فاصلے پر۔ دیہاتوں میں ہوتا یوں ہے کہ جس کی زمین ہوتی ہے وہ وہاں گھر بنا کر رہنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہی علاقے میں کئی بستیاں وجود میں آ جاتی ہیں تو پوچھنا یہ ہے کہ یہ جماعت والے بستیوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں گے یا دیہات کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے؟ جیسے بالفرض جماعت والوں کی تشکیل ایک مہینے کی نوابشاہ کے دیہاتوں میں ہوئی وہ نوابشاہ کے اتنے قریب ہیں یعنی شرعی فاصلہ نہیں ہے اور آپس میں بھی دو یا تین کلو میٹر کے فاصلہ پر ہیں تو اس صورت میں جماعت والے نوابشاہ کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا دیہاتوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں گے؟

(۴)۔ جیسے کراچی کے چار ضلع ہیں جماعت والوں کی تشکیل بیس دن کی ایک ضلع میں ہوئی اب یہ تشکیل کے دوران دوسرے ضلع میں جاتے ہیں تو اس صورت میں جماعت والے کراچی شہر کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا اس کے ضلع کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمائیں اللہ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً　　(۲،۱)۔ مسجد محلہ جس میں امام ومؤذن مقرر ہوں اس میں جماعت ثانی مکروہ ہے۔ اور یہ حکم صرف محلہ والوں کے لئے نہیں ہے بلکہ جو بھی جماعت ہو جانے کے بعد آئیں وہ سب اس حکم میں شامل ہیں۔ لہٰذا جو بعد میں آئیں اور اگر وہ جماعت ثانی کرانا چاہتے ہیں تو کسی ایسی جگہ میں جو مسجد کی حدود سے خارج ہو وہاں جماعت کرا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان مساجد میں بھی جماعت ثانی مکروہ ہے جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہوں، البتہ وہ مساجد جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین نہ ہوں تو ان میں جماعت ثانی مکروہ نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بس اڈے، ریلوے اسٹیشن اور سڑک کے کنارے جو مساجد ہیں اگر ان میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہیں تو ان مساجد میں جماعت ثانی مکروہ ہوگی اور اگر معین نہیں ہیں تو جماعت ثانی جائز ہوگی۔

(۳)۔ اقامت کی نیت کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے یہ ہے کہ ایک ہی جگہ میں پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کی اقامت کی نیت کریں اور اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ سفر کو منقطع کریں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے پنجاب یا نوابشاہ ہوئی، اب اگر انہوں نے وہاں ایک ہی جگہ میں پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت کی اب اس کے بعد اگر وہ اڑتالیس میل کے اندر اندر دن کو جاتے ہیں اور رات کو واپس آتے ہیں یا کبھی کبھار رات بھی گزارتے ہیں تو اس صورت میں وہ پوری نماز پڑھیں گے قصر نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ اور اگر جماعت والے ایک جگہ پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت نہیں کرتے ہیں بلکہ دو تین دن ایک بستی میں رہتے ہیں، دو تین دن دوسری بستی میں تو اس صورت میں مسافر شمار ہوں گے اور قصر نماز پڑھیں گے۔

(۴)۔ پورے شہر کا حکم ایک ہوتا ہے چاہے کتنا ہی بڑا ہو لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے کراچی شہر میں ہو جائے تو وہ پورے کراچی شہر میں جہاں چاہے جس ضلع میں جائیں نماز پوری پڑھیں گے۔

لما فی الدر المختار (۱/۵۵۲): ویکرہ تکرار الجماعۃ باذان واقامۃ فی مسجد محلۃ لا فی مسجد طریق او مسجد لا إمام لہ ولا مؤذن. وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ یکرہ) ای تحریما لقول الکافی لایجوز، والمجمع لایباح، وشرح الجامع الصغیر انہ بدعۃ کما فی رسالۃ السندی (قولہ باذان و

اقامة الخ: يكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان وإقامة إلا إذا صلى بهما فيه أولا غير أهله أو أهله لكن بمخافتة الأذان، ولو كرر أهله بدونهما أو كان مسجد طريق جاز إجماعاً كما في مسجد ليس له إمام ولا مؤذن ويصلي الناس فيه فوجا فوجا، فإن الأفضل أن يصلي كل فريق بأذان وإقامة على حدة كما في أمالي قاضيخان ونحوه في الدرر، والمراد بمسجد المحلة ما له إمام وجماعة معلومون كما في الدرر وغيرها. قال في المنبع: والتقييد بالمسجد المختص بالمحلة احتراز من الشارع، وبالأذان الثاني احتراز عما إذا صلى في مسجد المحلة جماعة بغير أذان حيث يباح إجماعاً. وأما مسجد الشارع فالناس فيه سواء لا اختصاص له بفريق دون فريق.

وفي المحيط البرهاني (٢/٢٠٢): خراساني قدم بغداد وعزم على الإقامة بها خمسة عشر يوما، ومكي قدم الكوفة وعزم على الإقامة بها خمسة عشر يوما، ثم خرج كل واحد منهما من وطنه يريد قصر ابن هبيرة، فيلتقي صاحبه بالقصر، فإنهما يصليان أربعا في الطريق وبالقصر لأنهما كانا متوطنين أحدهما ببغداد والآخر بالكوفة، ولم يقصدا مسيرة مدة السفر، لأن من بغداد إلى الكوفة مسيرة أربع ليال، والقصر هو المنتصف فكان كل واحد منهما قاصداً مسيرة ليلتين، وبهذا لا يصير مسافراً.

وفي الشامية (٢/١٢٦): (قوله كما لو نوى مبيته بأحدهما) فإن دخل أولا الموضع الذي نوى المقام فيه نهارا لا يصير مقيما، وإن دخل أولا ما نوى المبيت فيه يصير مقيما ثم بالخروج إلى الموضع الآخر لا يصير مسافرا لأن موضع إقامة الرجل حيث يبيت به.

(۱۴۴) بدعتیوں کی جماعت کے بعد جماعت ثانی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد میں جب اہل بدعت میں سے مثلاً بریلوی عقیدہ والا شخص جماعت کرائے تو کیا اس مسجد میں دوبارہ صحیح عقیدہ شخص جماعت کر سکتے ہیں یا نہیں اور یہ تکرار جماعت میں داخل ہوگا یا نہیں؟ اور دوسری جماعت کا کیا حکم ہے آیا درست ہے یا نہیں یا مکروہ ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہو تو دوسری جماعت کرانی بلا کراہت درست ہے: لان تكرار الجماعة في مسجد واحد مكروه عندنا على المعتمد الا اذا كانت الجماعة الاولى غير اهل ذلك المسجد او ادت الجماعة على وجه مكروه. (شامية: ١/٣٩٥)

الجواب: اہل بدعت کی جماعت کا کیا حکم ہے؟

۲)۔ جب ایک دفعہ بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کروادے تو کیا دوسری جماعت اسی مسجد میں کروائی جا سکتی ہے یا نہیں؟

۳)۔ دوسری جماعت میں کراہت تو نہیں ہوگی؟ وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... جب محلے والے اپنی مسجد میں اذان اور اقامت کے ساتھ ایک مرتبہ نماز ادا کرلیں تو وہاں جماعت ثانیہ کو ادا شرعاً مکروہ ہے۔ جماعت ثانیہ کا ادا کرنا چونکہ جماعت اولیٰ کی سستی کا سبب ہے اور لوگوں کے دلوں سے فوت جماعت کا خوف نکل جانے کا سبب ہے اس لئے جماعت ثانی مکروہ ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بریلویوں کی جماعت بشرطیکہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں کراہت کے ساتھ جائز ہے اس لئے اگر ایک دفعہ بریلویوں نے جماعت کرالی تو دوسری جماعت اسی مسجد میں کرانا جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یہ مراد نہیں کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہو تو دوسرے لوگ دوسری جماعت کرا سکتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی ایسے فعل میں کراہت ہے جس کا تعلق ماہیت صلوۃ کے ساتھ ہے تو اس جماعت کا اعادہ واجب ہے۔

لما فی الکبیری (ص ۵۱۴): یکرہ تقدیم المبتدع ایضا لانہ فاسق من حیث الاعتقاد وھو اشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانہ فاسق ویخاف ویستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من یعتقد شیئاً علی خلاف ما یعتقدہ اھل السنۃ والجماعۃ وانما یجوز الاقتداء بہ مع الکراھۃ اذا لم یکن مایعتقدہ یودی الی الکفر عند اھل السنۃ اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز اصلاً.

وفی الشامیۃ (۱/۴۵۷): فیخالف تلک القاعدۃ الا ان یدعی تخصیصھا بان مرادھم بالواجب والسنۃ التی تعاد بترکہ ما کان من ماھیۃ الصلاۃ واجزائھا فلا یشمل الجماعۃ لانھا وصف لھا خارج عن ماھیتھا.

وفی اعلاء السنن (۴/۲۳۲): عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار انہ دخل علی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ وھو محصور، فقال: انک امام عامۃ، ونزل بک ما تری، ویصلی لنا امام فتنۃ، ونتحرج، فقال: الصلاۃ احسن ما یعمل الناس، فاذا احسن الناس فاحسن معھم، واذا اساؤوا فاجتنب اساء تھم اخرجہ البخاری (۱/۹۶)

قولہ عن عبید اللہ بن عدی الخ. دلالتہ علی صحۃ الصلاۃ خلف الفاسق من قول عثمان رضی اللہ عنہ، ظاھرۃ، والمراد بامام الفتنۃ ھو کنانۃ بن بشر البلوی احد رؤوس المصریین، فان سیف بن عمر روی حدیث الباب فی کتاب الفتوح من طریق اخری عن الزھری بسندہ فقال فیہ: دخلت علی عثمان وھو محصور وکنانۃ یصلی بالناس فقال: کیف تری؟ الحدیث.

كذا قال الحافظ في الفتح(۲/ ۱۹۰) وفيه دليل على كراهة الصلاة خلفه ايضاً لما فيه من قول عبيد الله بن عدي: "ونتحرج" ولما في رواية سيف بن عمر من قول يوسف الانصاري "كره الناس الصلاة خلف الذين حصروا عثمان" ولكن عثمان رضي الله عنه، انما حثهم على الصلاة خلفهم لما علم من عجز القوم عن عزلهم وبذلك تزول الكراهة عمن يقتدى به.

(۱۲۵) اہل حق کی مسجد نہ ہونے کی صورت میں بدعتیوں کے پیچھے نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے رشتہ دار کراچی کے ایک علاقہ میں رہتے ہیں وہاں قریب میں کوئی مسجد اہل حق کی نہیں ہے بلکہ تمام مساجد بدعتیوں کی ہیں۔ اب نماز کا کیا حکم ہے گھر میں پڑھ لیں یا ان کی اقتداء میں مسجد جا کر پڑھیں نیز بندہ کا وہاں بھی کبھی جانا ہوتا ہے تو بندہ کیلئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بندہ آخری سال کا طالب علم ہے۔ تفصیلاً وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: بہتر یہ ہے کہ اہل حق کی مساجد میں نماز ادا کی جائے اور اگر اہل حق کی مساجد وہاں قریب میں نہیں ہیں تو اس صورت میں اکیلے نماز پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ بدعتیوں کی مساجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں۔

لما في كنز العمال(۹/ ۵۴، ۱۵۸۲۸): صلوا خلف كل بر وفاجر.

وفي نصب الراية(۲/ ۲۸): قال عليه السلام: ((من صلى خلف عالم تقي، فكانما صلى خلف نبي)).

وفي الدر المختار(۱/ ۵۶۲): وفي النهر عن المحيط، صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة، وفي الشامية(قوله نال فضل الجماعة) افاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع.

(۱۲۶) تبلیغی جماعتوں کا بریلوی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تبلیغی حضرات کی جماعتیں جب سہ روزہ یا چلہ وغیرہ کیلئے نکلتی ہیں تو مسجد میں دن گزارتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ جماعتیں بریلوی حضرات کی مسجدوں میں چلی جاتی ہیں تو وہاں پر جماعت کے ساتھ فرض نمازیں ان کے پیچھے باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اس وجہ سے کہ جوڑ پیدا ہو اور اگر علیحدہ اپنی نماز ادا کریں تو توڑ پیدا ہو۔ اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ یہ شرک وبدعات کا ارتکاب کرتے ہیں اس کے باوجود بھی وہ شخص ان کے پیچھے نماز ادا کرے تو اس شخص کو چاہیے کہ دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدید نکاح کرے تو آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــــ بدعتی آدمی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جبکہ اس کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں اور لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر ہوں لیکن اگر لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر نہیں اور اس مسجد کے علاوہ کوئی دوسری مسجد بھی گاؤں اور نزدیک میں نہیں ہے تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر بدعتی کے عقائد کفر تک پہنچے ہوں تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ لہٰذا بصورت مسئولہ تبلیغی حضرات کی نمازیں بریلوی ائمہ کے پیچھے کراہت کے ساتھ ادا ہو جائیں گی بشرطیکہ اس بریلوی کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں لیکن تجدید نکاح اور دوبارہ کلمہ پڑھنے کا قول کرنا درست نہیں۔

لما فی اعلاء السنن (۴/۲۳۳): کرہ الناس الصلاۃ خلف الذین حصروا عثمان، ولکن عثمان رضی اللہ عنہ إنما حضھم علی الصلاۃ خلفھم لما علم من عجز القوم عن عزلھم وبذالک نزول الکراھۃ عمن یقتدی بہ.

وفی البحر الرائق (۱/۲۱۱): وأطلق المصنف فی المبتدع فشمل کل مبتدع ھو من أھل قبلتنا، وقیدہ فی المحیط والخلاصۃ والمجتبیٰ وغیرھا بان لا تکون بدعتہ تکفرہ فان کانت تکفرہ فالصلاۃ خلفہ لا تجوز.

وفی الدر المختار (۱/۵۶۲): وفی النھر عن المحیط: صلی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعۃ

قال فی الشامیۃ (قولہ نال فضل الجماعۃ) أفاد أن الصلاۃ خلفھما أولیٰ من الانفراد لکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع، لحدیث "من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف نبی".

وفی کبیری (ص۴۷۹): ویکرہ تقدیم المبتدع ایضاً لانہ فاسق من حیث الاعتقاد وھو أشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانہ فاسق ویخاف ویستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من یعتقد شیئاً علی خلاف ما یعتقدہ أھل السنۃ والجماعۃ ــــــ اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز أصلاً کالغلاۃ من الروافض.

(۱۴۷) بدعتی اور فاسق کے پیچھے پڑھی گئی نماز کے بارے میں فقہائے کرام کے اقوال (مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی) میں تطبیق

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ بدعتی، فاسق، فاجر مثلاً شرابی، زانی، ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے، صحابی، بلاوجہ دوسرے پر لعن طعن کرنے والے، سود خور

الغرض کسی بھی قسم کے گناہ کبیرہ میں مبتلا شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ مکروہ تحریمی یا تنزیہی؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے تو ذمہ سے فرضیت صلوٰۃ ساقط ہوگی یا واجب الاعادہ ہے؟ اگر واجب الاعادہ نہیں تو فقہاء کرام کی اس عبارت کا کیا مطلب "وكل صلاة اديت مع كراهة التحريم تعاد" (الدر المختار، ۹۳/۲) نیز کتب فقہاء کی عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات میں ہے کہ:

قال (ويجوز امامة الاعمى والاعرابى ــــ والفاسق، وغيرهم احب الى) (المبسوط للسرخسى: ۴۰/۱)

فالحاصل انه يكره لهولاء التقدم ويكره الاقتداء بهم كراهة تنزيهة الخ. (البحر الرائق، ۲۱۱/۱)

(ويكره) تنزيها (امامة عبد) ــــ (وفاسق واعمى) الخ. (الدر المختار، ۵۵۹/۱، ۵۶۰)

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء احناف نے ان حضرات مذکورہ کے پیچھے نماز پڑھ لینے کو جائز قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی نہیں جیسا منقول ہے: باب امامة المفتون والمبتدع، وقال الحسن صل، وعليه بدعته ــــ عن عبيد الله بن عدى بن الخيار انه دخل على عثمان بن عفان وهو محصور فقال انك امام عامة، ونزل بك ماترى! ويصلى لنا امام فتنة، ونتحرج فقال الصلوة ــــ الخ. (صحيح البخارى، ۹۶/۱)

ويكره تقديم العبد ــــ والفاسق ــــ فان تقدموا جاز. (مختصر القدورى ص۳۵)

ويكره تقديم العبد ــــ والفاسق ــــ وان تقدموا جاز. (الفقه النافع، ۲۱۵/۱)

حتى تجوز امامة العبد والاعرابى ــــ والفاسق وهذا قول عامة العلماء. (بدائع الصنائع، ۳۸۶/۱)

قال اما الفاسق فتجوز الصلاة خلفه لقوله عليه السلام "صلوا خلف كل بر وفاجر". (المحيط البرهانى، ۱۸۷/۲)

قال المرغينانى: تجوز الصلاة خلف صاحب هوى وبدعة. (تبيين الحقائق، ۳۴۵/۱)

قوله: (ويكره تقديم العبد والاعرابى) ــــ قوله (والفاسق) ــــ (فان تقدموا جاز) لقوله عليه السلام صلوا خلف كل بر و فاجر. (الجوهرة النيرة، ۱۵۹/۱)

وفى الفتاوى لو صلى خلف فاسق او مبتدع ينال فضل الجماعة الخ. البحر الرائق (۲۱۰/۱)

الصلاة خلف اهل الهواء والبدعة ان كان هوى لايكفر ــــ وهو من اهل ملتنا يجوز. (الفتاوى الولوالجية، ۱۲۰/۱)

ويصح الاقتداء باهل الهواء الخ. (الخانية على هامش الهندية، ۹۱/۱)

الاقتداء باهل الهواء جائزة الخ. (خلاصة الفتاوى، ۱۴۹/۱)

اذا صلى رجل خلف فاسق او مبتدع ينال فضل الجماعة الخ. (كتاب التجنيس والمزيد، ۳/۲)

الصلوٰة خلف المبتدع تجوز الافی روایة عن ابی حنیفة (الفتاوی السراجیة ص۱۵)
والمصلی خلف مبتدع او فاسق ینال ثواب الجماعة. (البزازیة علی هامش الهندیة: ۱/۵۵)
قال المرغینانی تجوز الصلاة خلف صاحب هوی وبدعة. (الهندیة المعروف بالفتاوی العالمگیریة: ۱/۸۴)
ان مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق، بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور جماعت کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے اگرچہ مکروہ ہے، پس اس کراہت کو کراہت تنزیہیہ پر محمول کرنا چاہئے ورنہ اگر مکروہ تحریمی پر محمول کیا جائے گا تو ''کل صلاۃ ادیت مع کراھة التحریم تعاد'' کے خلاف ہونا لازم آئے گا، کیونکہ نماز کا واجب الاعادہ ہونا بظاہر جواز الصلاۃ خلف الفاسق کے منافی معلوم ہوتا ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے عمدۃ الرعایۃ علی شرح الوقایۃ حاشیہ نمبر ۸ صفحہ نمبر ۱۵۲ پر فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ قوله کره: الکراهة فی تقدیم الفاسق تحریمیة، وکذا المبتدع فانه اشد من الفاسق من حیث العمل الخ. (شرح الوقایة مع عمدة الرعایة، ۱/۱۵۲) اور علامہ طحطاوی نے بھی اسی کے موافق لکھا۔
(فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة) تبع فیه الزیلعی ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة. (حاشیة الطحطاوی، ص۳۰۳، طبع قدیمی کتب خانه)
الحاصل: حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی وعلامہ طحطاوی رحمہما اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، پس اگر اس قول کو لیا جائے تو قاعدہ ''وکل صلاۃ ادیت مع کراھة التحریم تعاد'' کے مطابق نماز واجب الاعادہ ہونی چاہئے، نیز یہ کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ناجائز ہو اور فضیلت جماعت بھی حاصل نہ ہو۔
باقی دیگر فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، بناء بریں ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز بھی ہوگا اور فضیلت جماعت بھی حاصل ہوجائے گی، اب آپ یہ بتائیں کہ ان میں کونسا قول درست ہے؟ اگر نماز مکروہ تحریمی ہے تو واجب الاعادہ ہے یا نہیں، اگر نہیں تو مذکورہ قاعدہ ''وکل صلاۃ ادیت الخ'' کا کیا مطلب ہے؟
(۲) فرض کو مجازاً واجب، اور واجب کو مجازاً فرض کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟
الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ فقہاء کرام کی عبارات پر آپ کے پیش کردہ اشکالات بادی النظر میں تو درست معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر کچھ غور وفکر کریں اور تمام عبارتوں پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کی عبارتوں میں حقیقتاً کوئی تعارض نہیں ہے۔
دفع تعارض اول: ـــــ جہاں فقہاء کرام نے فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز کے مکروہ تحریمی ہونے کا قول کیا ہے وہاں فقہاء کرام نے لفظ ''تقدیم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے کسی فاسق و بدعتی کو امامت کیلئے آگے کرے، جس سے معلوم ہوا کہ کراہت تحریمی ''تقدیم'' کی صورت میں ہے اور جہاں مکروہ تنزیہی کا قول کیا ہے وہاں لفظ ''اقتداء یا تقدم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پہلے سے فاسق و بدعتی امام موجود ہو یا خود ہی آگے بڑھ جائے جس کو ہٹانے میں فتنہ و فساد کا خوف ہو، اور پھر اس کی اقتداء میں نماز پڑھی جائے، جس سے واضح ہوا کہ کراہت تنزیہی محض ''اقتداء'' کی صورت میں ہے تو دونوں صورتیں الگ ہیں جس کی وجہ

سے دونوں کا حکم بھی الگ ہے فلا تعارض بینھما۔

دفع تعارض ثانی: ـــ فقہاء کرام نے جس مکروہ تحریمی کی وجہ سے اعادہ صلوۃ کا حکم دیا ہے اس کے بارے میں علامہ شامی علیہ الرحمہ نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب کراہت ماہیت صلوۃ میں ہو، اور جماعت ماہیت صلوۃ میں داخل نہیں ہے لہٰذا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے میں جو کراہت تحریمی آئی ہے وہ ماہیت صلوۃ میں داخل نہیں ہے (دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی مسجد کی جماعت بلا عذر ترک کرکے انفرادا پڑھے تو مکروہ تحریمی ہے اس کے باوجود فقہاء نے اس کے اعادہ کا حکم نہیں دیا جس سے واضح ہوا کہ جماعت ماہیت صلوۃ میں داخل نہیں ہے) لہٰذا فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کی صورت میں اعادہ بھی واجب نہیں ہے اگرچہ مکروہ تحریمی ہے۔ فاندفع الاشکال۔

(۲) فرض کو واجب کی جگہ اور واجب کو فرض کی جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔

لما في الشامية (۱/۵۶۰): بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا قال: ولذا لم تجز الصلاة خلفه أصلاً عند مالك ورواية عن أحمد.

وفي الشامية (۱/۴۵۷): أقول: وقد ذكر في الامداد بحثا ان كون الإعادة بترك الواجب واجبة لا يمنع أن تكون الإعادة مندوبة بترك سنة ـــ بل قال في فتح القدير: والحق التفصيل بين كون تلك الكراهة كراهة تحريم فتجب الإعادة أو تنزيه فتستحب. بقي هنا شيء وهو أن صلاة الجماعة واجبة على الراجح في المذهب أو سنة مؤكدة في حكم الواجب كما في البحر وصرّحوا بفسق تاركها وتعزيره وأنه يأثم ومقتضى هذا أنه لو صلى منفرداً يؤمر بإعادتها بالجماعة وهو مخالف لما صرّحوا به في باب ادراك الفريضة من أنه لو صلى ثلاث ركعات من الظهر ثم اقيمت الجماعة يتم ويقتدي متطوعاً، فإنه كالصريح في أنه ليس له إعادة الظهر بالجماعة مع أن صلاته منفرداً مكروهة تحريماً أو قريبة من التحريم فيخالف تلك القاعدة إلا أن يدعى تخصيصها بأن مرادهم بالواجب والسنة التي تعاد بتركه ما كان من ماهية الصلاة وأجزائها فلا يشمل الجماعة لأنها وصف لها خارج عن ماهيتها. أو يدعى تقييد قولهم يتم ويقتدي متطوعاً بما إذا كانت صلاته منفرداً لعذر كعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تكون صلاته منفرداً مكروهة. والأقرب الأول ولذا لم يذكروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لأنها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهية الصلاة ويؤيده أيضاً أنهم قالوا يجب الترتيب في سور القرآن فلو قرأ منكوساً أثم لكن لا يلزمه سجود السهو لأن ذلك من واجبات القراءة لا من واجبات الصلاة كما ذكره في البحر في باب السهو لكن قولهم كلّ صلاة اديت مع كراهة التحريم يشمل ترك الواجب وغيره، ويؤيده

ماصرّحوا به من وجوب الإعادة بالصلاة في ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلي وهو حامل الصنم

وفي حاشية الطحطاوي(ص۳۰۳): قوله فتجب إهانته شرعاً فلا يعظم بتقديمه للإمامة تبع فيه الزيلعي: ومفاده كون الكراهة في الفاسق تحريمية.

وفي البحر الرائق(۱/۶۱۱): فالحاصل أنه يكره لهولاء التقدم ويكره الإقتداء بهم كراهة تنزيهة فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الإنفراد، وينبغي أن يكون محل كراهة الإقتداء بهم عند وجود غيرهم وإلا فلا كراهة كما لا يخفى.

وفي الشامية (۱/۹۵): ثم إن المجتهد قد يقوى عنده الدليل الظني حتى يصير قريبا عنده من القطعي، فماثبت به يسميه فرضا عمليًا لأنه يعامل معاملة الفرض في وجوب العمل، ويسمى واجباً نظراً إلى ظنّية دليله ...... وفي التلويح أن إستعمال الفرض فيما ثبت بظني والواجب فيما ثبت بقطعي شائع مستفيض فلفظ الواجب يقع على ماهو فرض علما وعملاً كصلاة الفجر.

﴿فصل فی المسبوق واللاحق﴾

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

(۱۴۸) امام کے رکوع سے سر اٹھا لینے کے بعد جماعت میں شامل ہونے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) امام جب رکوع سے قیام کی طرف آ جائے اور اب تک تکبیر نہ کہی ہو اسی دوران کوئی مقتدی آ کر نماز کی نیت کرکے رکوع بھی امام کے تکبیر کہنے سے قبل ادا کر کے قیام کی طرف آ جائے تو یہ کیسا ہے؟

(۲) مقتدی (مسبوق) کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہوتا ہے یا تکبیر کہنے پر یا دونوں کے جمع ہونے پر؟

الجواب حامداً ومصلیاً مقتدی کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ امام جب رکوع سے قیام کی طرف آ جائے اس وقت مقتدی رکوع میں شامل ہوا تو مقتدی کی اس رکعت کو شمار نہیں کیا جائے گا، مقتدی مسبوق کہلائے گا۔ کیونکہ امام کے ساتھ افعال میں مشارکت ضروری ہے، اور امام کے رکوع سے سر اٹھانے کی وجہ سے مشارکت نہیں پائی گئی۔

لما فی الدر المختار (۲/۰۶): (ولو اقتدی بامام راکع فوقف حتی رفع الامام رأسه لم یدرک) المؤتم (الرکعة) لان المشارکة فی جزء من الرکن شرط ولم توجد فیکون مسبوقا فیأتی بها بعد فراغ الامام بخلاف ما لو ادرکه فی القیام ولم یرکع معه فانه یصیر مدرکا لها فیکون لاحقا.

(۱۴۹) امام کو آخری رکعت میں پا لینے والے شخص کیلئے بقیہ نماز پڑھنے کا طریقہ

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) اگر کوئی شخص امام کے ساتھ آخری رکعت پائے چار رکعت والی نماز میں تو نماز پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

(۲) اگر کوئی شخص امام کے بعد والی رکعت پڑھ کر نہ بیٹھے بلکہ دو رکعت کے بعد بیٹھے اور تشہد پڑھ کر آخری رکعت کے لئے اٹھے تو اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۱) جو شخص چار رکعت والی نماز میں امام کے ساتھ ایک رکعت پائے وہ باقی نماز اس طرح ادا کرے کہ پہلی رکعت میں ثنا، تعوذ، تسمیہ، فاتحہ پڑھے اور ساتھ سورت ملائے اس رکعت میں دوسرے سجدہ کے بعد قعدہ اولیٰ میں بیٹھے اور تشہد پڑھے۔

کے، دوسری رکعت میں تسمیہ پڑھے قراءت کرے پہلی رکعت کی طرح لیکن قعدہ نہ کرے، تیسری رکعت میں صرف فاتحہ پڑھے اور باقی نماز پوری کرے۔

(۲)۔ اگر دوسری یعنی والی رکعت پر نہ بیٹھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا اگر سجدہ سہو ترک کر دیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لما في بدائع الصنائع (۲/۱۹۵): ولو ادرک مع الامام رکعة في ذوات الأربع فقام إلى القضاء فقضى رکعة يقرأ فيها بفاتحة الکتاب وسورة ويتشهد ثم يقوم فيقضي رکعة أخرى يقرأ فيها بفاتحة الکتاب وسورة ولو ترک القراءة في إحداهما تفسد صلاته لما قلنا وفي الثالثة هو بالخيار والقراءة افضل لما عرف.

وفي الشامية (۱/۵۹۷): وفي الفيض عن المستصفى: لو أدركه في ركعة الرباعي يقضي ركعتين بفاتحة وسورة ثم يتشهد ثم يأتي بالثالثة بفاتحة خاصة اهـ عند أبي حنيفة وقالا: ركعة بفاتحة وسورة وتشهد ثم ركعتين أولاهما بفاتحة وسورة وثانيتهما بفاتحة خاصة اهـ وظاهر كلامهم اعتماد قول محمد.

(قوله وتشهد بينهما): قال في شرح المنية ولو لم يقعد جاز استحسانا لا قياسا ولم يلزمه سجود السهو لكون الركعة أولى من وجه.

وفي تقريرات الرافعي على الشامية (۱/۷۷): (قوله ولو لم يقعد جاز الخ) المراد بالجواز الصحة بلا اثم نظراً لكون الركعة التي صلاها أولى من وجه لا أصل الصحة اذ هي قياس أيضا اذ التشهد واجب ولا الحل بلا كراهة أصلا اذ هي متحققة ثم ظهر أن المراد أنه ترك القعود بينهما اصلا لا التشهد فقط فالقياس الفساد عندهما لأنه هو القعود الأخير.

(۱۵۰) مسبوق کا امام کے سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز میں شریک ہونا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل رات نماز عشاء میں ہمارے امام صاحب نے کسی غلطی کی بناء پر سجدہ سہو کیا تو اس وقت ایک آدمی نماز میں شریک ہوا لیکن وہ شخص سجدہ سہو میں شریک نہیں ہو سکا بلکہ سجدہ سہو ہونے کے بعد نماز میں آکر ملا تو کیا اس طرح اس کی نماز ہو گئی؟ اور کیا مسبوق آدمی سجدہ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز ہو جائے گی اور مسبوق آدمی سجدہ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کر سکتا ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۲۸): ولا يشترط ان يكون مقتديا به وقت السهو حتى لو ادرك الامام بعدما

سهوا يلزمه ان يسجد مع الامام تبعا له ولو دخل معه بعدما سجد سجدة السهو يتابعه في الثانية ولا يقضي الاولى وان دخل معه بعد ما سجدهما لا يقضيهما كذا في التبيين

وفي الدر المختار (۲/ ۸۲): (والمسبوق يسجد مع امامه مطلقا) سواء كان السهو قبل الاقتداء وبعده (ثم يقضي مافاته)

(وفي الشامية تحته): (قوله سواء كان السهو قبل الاقتداء او بعده) بيان للاطلاق وشمل أيضا ما اذا سجد الامام واحدة ثم اقتدى به قال في البحر فانه يتابعه في الاخرى ولا يقضي قضاء الاولى كما لا يقضيهما ولو اقتدى به بعدما سجدهما.

(۱۵۱) مسبوق کیلئے امام کے ساتھ قعدہ آخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق درود شریف وغیرہ بھی پڑھے گا یا صرف تشہد پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مسبوق کو قعدہ اخیرہ میں درود شریف اور دعا وغیرہ نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ تشہد کو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کے سلام تک اس سے فارغ ہو، اگر پہلے فارغ ہو جائے تو کلمہ شہادت کو مکرر پڑھتا رہے یا پھر خاموش بیٹھا رہے۔

لما في الهندية (۱/ ۹۱): ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام في التشهد الاخير واذا أتم التشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات ثم ماذا يفعل تكلموا فيه وعن ابن شجاع انه يكرر التشهد اي قوله اشهد والصحيح ان المسبوق يترسل في التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام.

وفي الدر المختار ([illegible]): والمسبوق فيترسل ليفرغ عند سلام امامه. وقيل يتم، وقيل يكرر كلمة الشهادة.

(وفي الشامية تحته): (قوله فيترسل) اي يتمهل وهذا ما صححه في الخانية وشرح المنية في بحث المسبوق من باب السهو وباقي الاقوال مصحح ايضاً. قال في البحر وينبغي الافتاء بما في الخانية كما لا يخفى..... وهذا في قعدة الامام الاخيرة كما هو صريح قوله: ليفرغ عند سلام امامه واما فيما قبلها من القعدات فحكمه السكوت كما لا يخفى.

(۱۵۲) تشہد میں مسبوق کا درود شریف پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق قعدہ میں تشہد پڑھنے کے بعد خاموش رہے یا

درود شریف وغیرہ پڑھے۔ نیز اگر قدیم اور جدید قضا نمازیں جمع ہوں تو کیا ترتیب ساقط ہوگی۔ مثلاً زید اس سال سے مسلسل نماز پڑھ رہا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے اس کے ذمے بہت سی قضا نمازیں ہیں۔ اب پھر اس سے ایک نماز چھوٹ گئی تو اس پر صاحب ترتیب کے احکام تو لاگو نہیں ہوں گے؟ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں مسبوق امام کے ساتھ قعدہ آخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد درود شریف نہ ملائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ تشہد کو اتنا آہستہ پڑھے کہ امام کے سلام پھیرنے تک مکمل کرے اور اگر پڑھ چکا ہے تو شہادتین کو لوٹاتا رہے۔ ایسا شخص جس کی قدیم نمازیں باقی ہوں تو ایسے شخص کو سب سے پہلے اپنی فوت شدہ نمازوں کی فکر کرنی چاہیے۔ جتنا جلد ممکن ہو فوت شدہ نمازوں کو ادا کرلے۔ تاہم ایسا شخص صاحب ترتیب نہیں کہلائے گا۔

لما في الهندية(۱/۹۱): ومنها ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام في التشهد الاخير واذا اتم التشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات ثم ما ذا يفعل تكلموا فيه وعن ابن شجاع انه يكرر التشهد اى قوله أشهد ان لا اله الا الله وهو المختار كذا في الغياثية والصحيح أن المسبوق يترسل في التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام كذا في الوجيز للكردري وفتاوىٰ قاضي خان وهكذا في الخلاصة وفتح القدير.

وفي الشامية(۲/۶۹): (قوله أوقديمة على المعتمد الخ) كما لو ترك صلاة شهر تسقا ثم اقبل على الصلاة ثم ترك فائتة حادثة فان الوقتية جائزة مع تذكر الفائتة الحادثة لانضمامها إلى الفوائت القديمة وهي كثيرة فلم يجب الترتيب وقال بعضهم إن المسقط الفوائت الحديثة لا القديمة ويجعل الماضي كأن لم يكن زجراً له عن التهاون بالصلوات فلا تجوز الوقتية مع تذكرها وصححه الصدر الشهيد. وفي التجنيس وعليه الفتوى وذكر في المجتبى ان الأول أصح وفي الكافي والمعراج وعليه الفتوىٰ فقد اختلف التصحيح والفتوى كما رأيت والعمل بما وافق إطلاق المتون اولى.

(۱۵۳) ایک یا دو رکعات نکل جانے کی صورت میں تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے؟

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر ہم فرض نماز امام کے ساتھ پڑھیں اور ہماری ایک یا دو رکعت نکل جائے تو اب تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد آپ کی بقیہ نماز "تلاوت" کے بارے میں شروع کی نماز ہوگی اور "قعدہ وتشہد" کے سلسلے میں آخری نماز ہوگی یعنی آپ امام کے سلام کے بعد جو رکعت پڑھیں گے اس میں پہلی رکعت کی طرح تلاوت

کریں گے پھر دوسری رکعت میں دوسری رکعت کی طرح تلاوت کریں اور امام کے بعد جو آپ نے دو رکعتیں ادا کیں ان کے بعد قعدہ کریں گے (تشہد پڑھیں گے) اور آخری ہوگا۔

لما فی الهندية (۱/۹۲): ومنها انه يقضي أول صلاته في حق القراءة وآخرها في حق التشهد حتى لو ادرك ركعة من المغرب قضى ركعتين وفصل بقعدة فيكون بثلاث قعدات وقرأ في كل فاتحة وسورة.

(۱۵۴) مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی رکعات میں قرأت کیوں کرتا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض کی آخری دو رکعت میں سورۃ کی قرأت نہیں کی جاتی لیکن جب کوئی امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے اور جب وہ اپنی اگلی دو رکعت امام کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھتا ہے تو اسے حکم دیا جاتا ہے کہ سورۃ بھی پڑھے اور اگر کوئی سورۃ پڑھنا بھول جاتا ہے تو اسے سجدۂ سہو کا حکم ہوتا ہے۔ براہ کرم اس کی وجہ ذرا وضاحت کے ساتھ دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے دین کی خدمت میں لگائے رکھے۔

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کوئی شخص امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے تو اس کی یہ دو رکعتیں آخری دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں اس لئے امام کے سلام کے بعد جو دو رکعت وہ پڑھتا ہے یہ اس کی پہلی دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں اور فرض کی پہلی دو رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورت ملانا واجب ہے اس لئے ان دو رکعتوں میں بھی سورت پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر سورت پڑھنا بھول جائے تو چونکہ ان دو رکعتوں میں سورت فاتحہ کے ساتھ سورت کا ملانا واجب ہے تو اس واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کو سجدۂ سہو کا حکم دیا جاتا ہے۔

لما في الهندية (۱/۷۱): الفصل الثاني في واجبات الصلاة. يجب تعيين الاولين من الثلاثية والرباعية المكتوبتين للقراءة المفروضة حتى لو قرأ في الاخريين من الرباعية دون الاولين او في احدى الاولين واحدى الاخريين ساهياً وجب عليه سجود السهو كذا في البحر الرائق. وتجب قراءة الفاتحة وضم السورة او ما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصار او آية طويلة في الاولين بعد الفاتحة كذا في النهر الفائق وكذا ما يقضيه المسبوق بعد فراغ الامام أول صلاته عندنا.

وفي الشامية (۱/۴۳۶) (قوله ومنها القراءة) اي قراءة آية من القرآن وهي فرض عملي في جميع ركعات النفل والوتر وفي ركعتين من الفرض ... واما تعيين القراءة في الاولين من الفرض فهو واجب واما قراءة الفاتحة والسورة او ثلاث آيات فهي واجبة ايضاً.

وفي الدر المختار (۱/۵۹۶): (والمسبوق من سبقه الامام بها او ببعضها وهو منفرد) حتى يثني و يتعوذ ويقرأ (فيما يقضيه) اي بعد متابعته لامامه، فلو قبلها فالاظهر الفساد ويقضي اول صلاته

فی حق قراءۃ، وآخرھا فی حق تشھد۔

وفیہ ایضاً(۲/۸۳): (ثم یقضی ما فاتہ) ولو سھا فیہ سجد ثانیاً.

(قولہ ولو سھا فیہ) ای فیما یقضیہ بعد فراغ الامام یسجد ثانیاً لانہ منفرد فیہ والمنفرد یسجد لسھوہ۔

(۱۵۵) مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص یعنی مسبوق امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے، امام نے جیسے ہی سجدہ سہو کیلئے دائیں طرف سلام پھیر لیا تو وہ فوراً کھڑا ہو گیا لیکن امام بائیں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو میں چلا گیا تو کیا یہ مسبوق بھی امام کے ساتھ سجدہ سہو میں چلا جائے؟ اور مسبوق پر اس طرح عمل کرنے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس کے کھڑے ہونے اور بیٹھنے کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافی الھندیۃ(۱/۱۲۸): ولو سلم الامام فقام المسبوق ثم تذکر الامام ان علیہ سھواً فسجد لہ قبل ان یقید المسبوق الرکعۃ بسجدۃ فعلیہ ان یرفض ذلک ویعود الی متابعتہ ثم اذا سلم الامام قام الی القضاء ولا یعتد بما فعل من القیام والقراءۃ والرکوع ولو لم یعد الی متابعۃ الامام ومضی علی قضائہ فانہ تجوز صلوتہ ویسجد للسھو بعد فراغہ استحساناً۔

وفی الشامیۃ (۱/۵۹۸): والحاصل انہ اذا لم یقید ماقام الیہ بسجدۃ لم یصر منفرداً ویرتفض فلو لم یتابع امامہ فسدت صلوتہ وقد اطلق الفساد ھنا فی الفتح وغیرہ لکن فصل فی الذخیرۃ فی تذکر التلاوۃ بانہ ان لم یتابع الامام فیھا ینظر ان وجد منہ قیام وقراءۃ بعد فراغ الامام من القعدۃ الثانیۃ مقدار مایجوز بہ الصلوۃ جازت صلوتہ والا فلا۔

وفی الدر المختار (۱/۵۹۸) وھذا کلہ قبل تقیید ماقام الیہ بسجدۃ اما بعدہ فتفسد فی صلبیۃ مطلقا وکذا فی تلاوۃ وسھو ان تابع والا لا۔

(۱۵۶) مسبوق اپنی بقیہ رکعات کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال.. کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جب وہ بھی مسبوق ہوتا ہے تو امام کے سلام پھیرتے ہی وہ فوراً کھڑا ہو جاتا ہے تو امام کے سلام کے کتنی دیر بعد مسبوق کو اٹھنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ آپ کے دوست کو امام کے سلام پھیرتے ہی فوراً کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ امام کی فراغت کا انتظار کرے تاکہ امام پر سجدہ سہو ہونے کی صورت میں یہ اس میں شریک ہو سکے۔

لمافی الھندیۃ (۱/۹۱): انہ لایقوم الی القضاء بعد التسلیمتین بل ینتظر فراغ الامام.

وفی الدر المختار (۱/۵۹۷): وینبغی أن یصبر حتی یفھم انہ لاسھو علی الامام.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وینبغی ان یصبر الخ) أی لایقوم بعد التسلیمۃ او التسلیمتین بل ینتظر فراغ الامام بعدھما کما فی الفیض والفتح والبحر: قال الزند ویستنی فی النظم یمکث حتی یقوم الامام الی تطوعہ أویستند الی المحراب ان کان لاتطوع بعدھا، قال فی الحلیۃ: ولیس ھذا بلازم بل المقصود مایفھم أن لاسھو علی الامام أو یوجد لہ مایقطع حرمۃ الصلاۃ.

(۱۵۷) مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب کا حکم

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جماعت میں شامل ہوا اس وقت ایک رکعت مکمل ہو چکی تھی، امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الشمس اور دوسری میں سورۃ واللیل پڑھی ہے یہ شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی رکعت پوری کرے گا، اب اس مسبوق کیلئے سورتوں کی ترتیب ضروری ہے کہ نہیں یا یہ کوئی بھی سورت مثلاً اخلاص، کافرون وغیرہ پڑھ سکتا ہے؟ ترتیب کو الٹنے سے کراہت آئے گی یا نہیں جبکہ مکمل نماز میں سورتوں کی ترتیب ضروری ہے ورنہ کراہت آتی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب ضروری نہیں ہے اس لئے کہ مسبوق اپنی بقیہ نماز میں منفرد کے حکم میں ہوتا ہے۔

لمافی المبسوط السرخسی (۱/۱۸۲): لان المسبوق فیما یقضی کالمنفرد حتی تلزمہ القراءۃ وسجود السھو اذا سھا.

وفی الدر المختار (۱/۵۹۶): والمسبوق من سبقہ الامام بھا او ببعضھا وھو منفرد.

(۱۵۸) مسبوق اگر اپنی پہلی رکعت میں سورت نہ ملائے تو اس کا حکم

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں ظہر کی نماز میں تاخیر سے پہنچا اور جماعت کھڑی تھی، میں جماعت میں شریک ہوا اور ایک رکعت مل گئی امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد میں نے بقایا تین رکعات اس طرح پڑھیں کہ پہلی رکعت میں صرف الحمد شریف پڑھی اور قعدہ کر لیا اس کے بعد دو رکعات میں الحمد کے ساتھ سورۃ بھی ملائی، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طریقے سے میری نماز ادا ہو گئی ہے یا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے نیز اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ صورت مسئولہ میں جب آپ امام کے ساتھ آخری رکعت میں شریک ہوئے تو بقیہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پہلی اور دوسری رکعت میں الحمد شریف کے ساتھ دوسری کوئی سورت ملاتے اور آپ پہلی رکعت میں ملانا بھول گئے تو آخر میں سجدہ سہو کرتے لیکن چونکہ آپ نے اس طرح نہیں کیا لہٰذا آپ پر دوبارہ نماز پڑھنا واجب اور ضروری ہے اگر آپ دوبارہ نماز نہیں لوٹائیں گے تو گناہگار رہوں گے۔

لما فی خلاصۃ الفتاویٰ(۱/۱۶۵،۱۶۶): والمسبوق فیما یقضی یقضی اول صلاتہ فی حق القراءۃ واخر صلوتہ فی حق التشہد حتی لو ادرک مع الامام رکعۃ من المغرب ثم قام الی قضائہ بعد تسلیم الامام فانہ یقضی رکعتین ویقرأ فی رکعۃ بالفاتحۃ والسورۃ ولو ترک القراءۃ فی احداھما تفسد صلوتہ وعلیہ ان یقضی رکعۃ ویتشہد ثم رکعۃ اخری ویتشہد ویسلم۔

وفی الشامیۃ(۱/۴۵۹): اعلم ان فی محل القراءۃ المفروضۃ فی الفرض ثلاثۃ اقوال الاول ان محلھا الرکعتان الاولیان عینا وصححہ فی البدائع. الثانی ان محلھا رکعتان منھا غیر عین: ای فیکون تعیینھا فی الاولیین واجبا وھو المشھور فی المذھب الثالث ان تعیینھا فیھما افضل وعلیہ مشی فی غایۃ البیان وھو ضعیف والقولان الاولان اتفقا علی ان لو قرأ فی الاخریین فقط یصح ویلزمہ سجود السھو لو ساھیا لکن سببہ علی الاول تغییر الفرض عن محلہ وتکون قراءتہ قضاء عن قراءتہ فی الاولیین وسببہ علی الثانی ترک الواجب وتکون قراءتہ فی الاخریین اداء۔۔۔ والحاصل انہ قیل ان محل القراءۃ رکعتان من الفرض غیر عین وکونھا فی الاولیین افضل وقیل ان محلھا الاولیان منہ عینا فیجب کونھا فیھما وھو المشھور فی المذھب الذی علیہ المتون وھو المصحح وعلمت تأییدہ بما مر فی عبارۃ البحر عن البدائع من مسألۃ المسافر والمسبوق وقال القھستانی: انہ الصحیح من مذھب اصحابنا۔

وفیہ ایضاً(۱/۴۵۶): (ولھا واجبات) لا تفسد بترکھا وتعاد وجوبا فی العمد والسھو ان لم یسجد لہ وان لم یعدھا یکون فاسقا آثما وکذا کل صلاۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا

(۱۵۹) مسبوق امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے گا یا نہیں؟

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ایک یا دو رکعات کے بعد امام کیساتھ شریک ہوا امام نے آخری رکعت میں سجدہ سہو کیلئے سلام پھیرا اور سجدہ سہو کیا تو پیچھے اس مسبوق نے بھی امام کیساتھ سلام پھیر دیا اور بعد میں کھڑے ہو کر اپنی نماز پوری کر لی اب سوال یہ ہے کہ مسبوق کے امام کیساتھ سلام پھیرنے سے مسبوق کی نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ اور اس پر سجدہ سہو

واجب تو نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ مسبوق سجدہ سہو میں تو امام کی متابعت کریگا یعنی سجدہ سہو امام کیساتھ ادا کریگا البتہ سلام میں امام کی متابعت نہیں کریگا یعنی بغیر سلام پھیرے امام کیساتھ سجدہ میں جائیگا اب صورت مسئولہ کو لیجئے اگر مسبوق نے امام کیساتھ سلام پھیر لیا تو پھر اگر قصداً سلام پھیرا ہے (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہوگئی اور اگر قصداً سلام نہیں پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور سجدہ سہو بھی لازم نہ ہوگا اسی طرح جب امام نماز ختم کرنے کیلئے سلام پھیرے تو اس سلام میں بھی مسبوق امام کی متابعت نہ کرے اگر اس آخری سلام میں مسبوق نے امام کیساتھ قصداً سلام پھیر لیا (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہو جائیگی اور اگر سہواً سلام پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور یہ سلام جو مسبوق نے سہواً پھیرا ہے اگر یہ سلام امام کے سلام سے پہلے یا متصل واقع ہوا ہو تو مسبوق پر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا کیونکہ مسبوق مقتدی کے حکم میں ہے اور امام کے ساتھ مقتدی جب سہو کرے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر مسبوق نے امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا تو اپنی نماز کے آخر میں اسپر سجدہ سہو لازم ہوگا کیونکہ اب یہ منفرد ہوگیا۔

لما فی الشامیۃ (۸۲/۲): (قولہ والمسبوق یسجد مع امامہ) قید بالسجود لانہ لایتابعہ فی السلام بل یسجد معہ ویتشہد فاذا سلم الامام قام الی القضاء فان سلم فان کان عامدا فسدت والا لا ولاسجود علیہ ان سلم سہوا قبل الامام او معہ وان سلم بعدہ لزمہ لکونہ منفردا حینئذ.

(۱۶۰) مسبوق کا اپنی بقیہ رکعات میں قرأت بھول جانے پر سجدہ سہو نہ کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ظہر کی نماز میں دو رکعت کے بعد آکر جماعت میں شریک ہوا اور جب امام نے سلام پھیر دیا تو کھڑے ہو کر اپنی بقیہ دو رکعت پڑھنے لگا ان دو رکعت میں وہ سورۃ فاتحہ کے بعد سورت پڑھنا بھول گیا۔ لیکن چونکہ اس نے آخری دو رکعت امام کے ساتھ پڑھیں تھیں اس وجہ سے اس نے ان دو رکعتوں میں چھوٹنے والی سورۃ کی وجہ سے سجدہ سہو نہیں کیا تو آیا اس کی نماز ہوگئی؟ یا اس کا اعادہ کرنا لازم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً مسبوق آدمی (جس کی ابتداء امام سے کچھ رکعتیں رہ گئی ہوں) وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں منفرد یعنی اکیلے نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہوتا ہے اور جب وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی کرے تو اس کے ذمہ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ ملانا واجب ہے اسی طرح اگر اس سے کوئی سہو ہو جائے اپنی بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں تو اس پر سجدہ سہو کرنا بھی لازم ہوتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص پر واجب کے ترک یعنی پہلی دو رکعتوں میں سورت چھوڑنے کی بناء پر نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے اور مذکورہ شخص کا اس بات کو علت قرار دینا کہ میں نے چونکہ آخری دو رکعتیں امام کے ساتھ پڑھی تھیں اس لئے سجدہ سہو نہیں کیا یہ بات صحیح نہیں۔

لما فی المبسوط للامام السرخسی (۲۲۰/۱): قال وان سہا عن القراءۃ فی الاولیین فعلیہ سجود

السهو لان القراءة ركن والاوليان تعينتا لاداء هذا الركن واجبا وبترك الواجب يتمكن النقصان في الصلاة.

وفي الهندية (۱/۱۰۹): ولو ادرك ركعتين قضى ركعتين بقراءة ولو ترك في احداهما فسدت.

وفي (ص۱۲۶): ولا يجب السجود الا بترك واجب او تاخيره　　　　ولو قرأ الفاتحة وحدها وترك السورة يجب عليه سجود السهو وكذا لو قرأ مع الفاتحة آية قصيرة كذا في التبيين.

(۱۶۱) سجدہ میں سوجانے اور نیند یا کسی اور وجہ سے مقتدی کے لاحق ہوجانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دکان پر کام کرتا ہوں اور رات دیر تک دکان کھلی رہتی ہے اس لیے صبح کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے، آج ظہر کی نماز میں میں پہلے سجدہ میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو امام صاحب کھڑے تھے میں بھی کھڑا ہو گیا اور آخر میں امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی تو میری یہ نماز ہوئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو کس طرح ادا کروں، از سر نو ادا کروں یا آخر میں امام کے سلام کے بعد سجدہ سہو کر کے ادا کروں۔ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورتِ مسئولہ میں جب آپ سجدہ میں سو گئے اگر اس حالت میں سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار نہ رہی تو اس سے آپ کا وضو ٹوٹ گیا اور نماز بھی جاتی رہی۔ سجدہ کی مسنون کیفیت سے مراد یہ ہے کہ حالتِ سجدہ میں پیٹ رانوں سے اور بازو پہلوؤں سے الگ رہیں اور اگر سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار رہی تو آنکھ کھلنے پر آپ کو چاہئے تھا کہ پہلے دوسرا سجدہ جو آپ سے چھوٹ گیا تھا ادا کرتے اور پھر امام کے ساتھ رکعت میں شریک ہو جاتے تو آپ کی نماز درست ہو جاتی لیکن آپ نے ایسا نہ کیا، پھر بھی اگر آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد چھوٹا ہوا سجدہ ادا کر کے سلام پھیر دیتے تب بھی آپ کی نماز درست ہو جاتی۔ لیکن چونکہ آپ نے ان صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار نہ کی بلکہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر لیا، حالانکہ سجدہ سہو سے فرض کا تدارک نہیں ہوتا، اور نہ ہی لاحق (جو شروع سے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو اور بیچ میں نماز کا کچھ حصہ عذر کی وجہ سے چھوٹ جائے) پر سجدہ سہو آتا ہے۔ اور فرض کے رہ جانے سے نماز درست نہیں ہوتی۔ لہٰذا اب آپ کو چاہئے کہ اپنی نماز کی از سر نو قضاء کریں۔

لما في الهندية (۱/۹۲): واذا كبر مع الامام ثم نام حتى صلى الامام ركعة ثم انتبه فانه يصلي الركعة الاولى وان كان الامام يصلي الركعة الثانية هكذا في الذخيرة ولو لم يشتغل بقضاء ما سبقه الامام ولكن يتابع الامام اولا ثم قضى ما سبقه الامام بعد تسليم الامام جازت صلاته عندنا

وفي الشامية (۱/۴۰۱): (قوله وساجدا) وكذا قائما وراكعا بالاولى والهيئة المسنونة بان يكون رافعا بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه كما في البحر، قال ط: وظاهره ان المراد الهيئة المسنونة في حق الرجل لا المرأة.

﴿فصل فی القراءة﴾

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۶۲) نماز میں منہ ہی منہ میں قرأت کا حکم

سوال — سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ سری منہ میں قرأت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً — سری نمازوں میں صحت نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لما فی الهندية (۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجهر والمخافتة قال الفقيه ابو جعفر والشيخ الامام ابو بكر — ادنى الجهر ان يسمع غيره وادنى المخافتة ان يسمع نفسه وعلى هذا يعتمد كذا فی محيط. وهو الصحيح كذا فی الوقاية والنقاية. وبه اخذ عامة المشايخ، ولو كان بحيث تجاوز شفتيه حتى لو قرب انسان صماخه من فمه يدخل صوته فی اذنه وفهم مايقرأ فهذه مجمجة (۱) كذا فی الخلاصة.

وفی الشامية (۱/۵۳۴): فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت يصل الى اذنه وبه قال الشافعی وشرط بشر المريسی واحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى اذنه — ولم يشترط الكرخی وابوبكر البلخی السماع واكتفيا بتصحيح الحروف. واختار شيخ الاسلام وقاضيخان وصاحب المحيط والحلوانی قول الهندوانی — وان ما قاله الهندوانی اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا عليه.

(۱۶۳) نماز میں دل ہی دل میں تلاوت کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں الحمد للہ ایک عرصے سے نماز پابندی سے پڑھ رہا ہوں، میں نے اپنی قضائے عمری بھی پوری کرلی ہے۔ ایک صاحب سے ایک دن باتوں باتوں میں اس مسئلے کا پتا چلا کہ نماز میں تلاوت

زبان سے کرنا ضروری ہے، حالانکہ میں تو اب تک ساری نمازوں میں تلاوت وغیرہ دل ہی دل میں کرتا تھا۔ میں اس سلسلے میں بڑا پریشان ہوں کہ میری گزشتہ نمازوں کا کیا ہوگا؟ کیا دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی؟ مہربانی فرما کر اس مسئلے کا حل جلد مرحمت فرما دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ نماز میں تلاوت زبان سے کرنا ضروری ہے اور دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی لہٰذا جتنی نمازیں آپ نے اس طرح اکیلے پڑھی ہیں وہ ادا نہیں ہوئیں لہٰذا ان نمازوں کا اعادہ کرنا لازم ہے۔

لما في بدائع الصنائع (۱/۱۶۱،۱۶۲): ثم المنفرد اذا خافت واسمع أذنيه يجوز بلا خلاف لوجود القراءة بيقين اذ السماع بدون القراءة لا يتصور وأما اذا صحح الحروف بلسانه وأداها على وجهها ولم يسمع أذنيه ولكن وقع له العلم بتحريك اللسان وخروج الحروف من مخارجها فهل تجوز صلاته اختلف فيه ذكر الكرخي انه يجوز وهو قول أبي بكر البلخي المعروف بالأعمش وعن الشيخ أبي القاسم الصفار والفقيه أبي جعفر الهندواني والشيخ الامام أبي بكر محمد بن الفضل البخاري انه لا يجوز مالم يسمع نفسه و عن بشر بن غياث المريسي انه قال ان كان بحال لو أدنى رجل صماخ أذنيه الى فيه سمع كفى وإلا فلا ومنهم من ذكر في المسئلة خلافاً بين أبي يوسف ومحمد فقال على قول أبي يوسف يجوز وعلى قول محمد لا يجوز وجه قول الكرخي أن القراءة فعل اللسان وذلك بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص وقد وجد فأما اسماعه نفسه فلا عبرة به لأن السماع فعل الأذنين دون اللسان ـــــ وما قاله الكرخي أقيس وأصح.

وفي الشامية(۱/۵۳۴): اعلم انهم اختلفوا في حد وجود القراءة على ثلاثة أقوال فشرط الهندواني والفضلي لوجودها خروج صوت يصل إلى أذنه وبه قال الشافعي. وشرط بشر المريسي وأحمد خروج الصوت من الفم وإن لم يصل إلى أذنه لكن بشرط كونه مسموعاً في الجملة حتى لو أدنى أحد صماخه إلى فيه يسمع ولم يشترط الكرخي وأبو بكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الحروف ـــــ وذكر أن كلامن قولي الهندواني والكرخي مصححان وان ما قاله الهندواني أصح وأرجح لاعتماد أكثر علمائنا عليه.

(۱۶۴) سری نمازوں میں قرأت میں تصحیح حروف ضروری ہے یا پھر آواز کا سنائی دینا بھی؟

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ منہ ہی منہ میں تلاوت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سری نمازوں میں صحت نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قراءت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لما في عالمگیری (١/٦٩): اختلفوا في حد الجهر والمخافتة قال الفقيه ابو جعفر والشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل ادنى الجهر ان يسمع غيره وادنى المخافتة ان يسمع نفسه وعلى هذا يعتمد كذا في المحيط وهو الصحيح كذا في الوقاية والنقاية، وبه اخذ عامة المشايخ كذا في الزاهدي ولو كان سمعيت تجاوز شفتيه حتى لو قرب انسان صماخه من فمه يدخل صوته في اذنه وفهم مايقرأ فهذه مجمجة كذا في الخلاصة

وفي الشامية (١/٥٣٤): فشرط الهندواني والفضلي لوجودها خروج صوت يصل الى اذنه وبه قال الشافعي وشرط بشر المريسي واحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى اذنه ولم يشترط الكرخي وابو بكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الحروف. واختار شيخ الاسلام وقاضيخان وصاحب المحيط والحلواني قول الهندواني وان ما قاله الهندواني اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا عليه.

(١٦٥) "ض" کی ادائیگی کا طریقہ اور اس میں تعامل عرب

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ "ض" کی ادائیگی میں جو اختلاف ہے براہ کرم اس کی صحیح وضاحت فرمادیں کہ کونسا طریقہ افضل ہے "دال" کی آواز میں پڑھنا افضل ہے یا "ظا" "ذال" کی آواز میں پڑھنا افضل ہے۔ اور یہ بھی وضاحت سے بتادیں کہ تعامل عرب کیا ہے؟ کیونکہ حدیث میں ہے کہ قرآن کو عرب کے طرز میں پڑھیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: جمہور قراء اور فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ حرف ضاد کا مخرج اصلی حافہ لسان یعنی زبان کی دائیں یا بائیں کروٹ اور اس کی متصل داڑھیں ہیں۔ جس کی آواز ظاء کے مشابہ ہے البتہ دال کے مشابہ نہیں ہے جیسا کہ بعض کتب فقہ اور قراءت کی کتابوں میں اس کی تصریحات موجود ہیں اور چونکہ حرف ضاد، ظا کے مشابہ ہے تو قراء کرام نے ضاد کو صحیح طور پر ادا کرنے کیلئے یہ فرمایا ہے کہ اس کو جہر، استعلاء، استطالت اور رخاوت سے ممتاز کر کے پڑھنا چاہئے تاکہ ہر ایک میں تمیز ہو سکے۔ البتہ اگر کوئی قاری کوشش کے باوجود بھی حرف ضاد کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے تو پھر فقہاء کرام نے گنجائش بھی دی ہے کہ اگر دال یا ذال یا ظاء میں سے کسی کے مشابہ بھی پڑھا جائے تو عموم بلویٰ کے تحت اس کی نماز درست قرار دی جائے گی البتہ اگر کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ جان بوجھ کر غلط پڑھتا ہے تو پھر نماز فاسد ہو جائے گی۔

لما في الشامية (١/٦٣٣): وفي التاتارخانية عن الحاوي حكى عن الصفار انه كان يقول الخطأ اذا دخل في الحروف لايفسد لان فيه بلوى عامة الناس لانهم لايقيمون الحروف الابمشقة. اه وفيها

اذا لم یمکن بین الحرفین اتحاد المخرج ولا قربہ الا ان فیہ بلوی العامۃ کالذال مکان الصاد أو الزای المحض مکان الذال والظاء مکان الضاد لاتفسد عند بعض المشایخ۔

وفیہ ایضاً (۱/ ۱۳۳): ان تعمد ذلک تفسد وان جری علی لسانہ أو لایعرف التمیز لاتفسد وھو المختار حلیۃ وفی البزازیۃ وھو أعدل الاقاویل وھو المختار۔

(۱۶۶) ظہر وعصر کی نمازوں میں آہستہ قرأت کرنے کی وجہ

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قرأت آہستہ کیوں کی جاتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں قرأت زور سے کی جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء میں تمام نمازوں کے اندر قرأت جہر (اونچی آواز) کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ کفار نے مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے اور ان کی نمازوں میں خلل ڈالنے کیلئے قرأت کے دوران شور مچانے کا مشورہ کیا۔ ظہر اور عصر ان دو اوقات میں یہ لوگ فارغ ہوتے تھے اس لئے ان اوقات میں تکلیف پہنچانے اور اپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کیلئے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ بخلاف باقی تین اوقات کے کہ ان میں یہ لوگ مصروف رہتے تھے اس وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شر سے بچنے کیلئے ظہر اور عصر کی نمازوں کی قرأت آہستہ پڑھنا شروع کی اور چونکہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاحیات مواظبت اختیار کی اس وجہ سے یہ عمل واجب قرار پایا۔ جمعہ اور عیدین میں چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوتی تھی اور یہ نمازیں شہر میں ادا ہوتی تھیں اور کفار کو شہر میں مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی قوت حاصل نہیں تھی۔ اس لئے جمعہ اور عیدین میں قرأت جہراً ہوا کرتی تھی۔

اب بھی ظہر اور عصر میں آہستہ قرأت پڑھنا حکمت اور فائدے سے خالی نہیں۔ یہ کہ قرأت رکن ہے جس کو امام قوم کی طرف سے ادا کرتا ہے تو جہر اس لئے کرتا ہے کہ اس میں غور کریں اور ان کو بھی فائدہ حاصل ہو، لیکن ظہر اور عصر کی نمازوں میں لوگوں کے دل عموماً اپنے کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جن کو چھوڑ کر لوگ نماز کیلئے آئے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے حقیقی معنوں میں قرأت میں غور کرنا مشکل ہے۔ اس لئے ظہر اور عصر میں قرأت جہراً مفید نہیں بلکہ سراً مفید ہے۔ بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان میں لوگ فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور پوری توجہ قرأت کی طرف یکسوئی کے ساتھ مبذول کی جاسکتی ہے۔ اس لئے اس میں قرأت جہراً مفید ہے۔ جمعہ اور عیدین کا خاص دن ہونے کی وجہ سے ان میں تیاری کر کے اہتمام کے ساتھ آتے ہیں۔ اور فارغ البال ہو کر توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

لما فی بدائع الصنائع (۱/ ۲۸۳،۶۸۲): ویجب علیہ المخافتۃ فیما یخافت وانما کان کذلک لأن القراءۃ رکن یتحملہ الامام عن القوم فعلا فیجھر لیتأمل القوم ویتفکروا فی ذلک فتحصل ثمرۃ القراءۃ وفائدتھا للقوم فتصیر قراءۃ الامام قراءۃ لھم تقدیرا کأنھم قرؤوا وثمرۃ الجھر تفوت فی صلوۃ النھار لأن الناس فی الاغلب یحضرون الجماعات فی خلال الکسب والتصرف والانتشار فی

الارض فكانت قلوبهم معلقة بذلك فيشغلهم ذلك عن حقيقة التأمل فلا يكون الجهر مفيداً بل يقع تسبباً الى الاثم بترك التأمل

وفي المبسوط للسرخسي (۱/۱۷): وقد كان النبي ﷺ في الابتداء يجهر بالقرآن في الصلاة كلها وكان المشركون يؤذونه ويسبون من أنزل ومن أنزل عليه فأنزل الله تعالى ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا فكان يخافت بعد ذلك في صلاة الظهر والعصر لانهم كانوا مستعدين للأذى في هذين الوقتين ويجهر في صلاة المغرب لأنهم كانوا مشغولين بالأكل وفي صلاة العشاء والفجر لأنهم كانوا نياماً ولهذا جهر في الجمعة والعيدين لأنه اقامها بالمدينة وما كان للكفار بها قوة الأذى.

وفي الدر المختار (۱/۵۳۳): وكان عليه الصلاة والسلام يجهر في الكل ثم تركه في الظهر والعصر لدفع اذى الكفار.

(۱۲۷) قرأتِ شاذہ سے تلاوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرأتِ شاذہ سے تلاوت کرنا کیسا ہے اور اگر نماز میں پڑھے تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نماز میں قرأتِ شاذہ سے تلاوت کرنا بذاتِ خود تو منع نہیں ہے مگر عام مجمعوں میں اس سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ ناواقف لوگوں میں شکوک وشبہات کا باعث بن سکتا ہے اس لئے عام مجمعوں میں قرأتِ حفص سے ہی تلاوت کرنی چاہئے۔

لما في الهندية (۱/۷۹): في الحجة قراءة القرآن بالقراءات السبعة والروايات كلها جائزة. ولكني أرى الصواب أن لا يقرأ القراءة العجيبة بالامالات، والروايات الغريبة.

وفي الطحطاوي على الدر (۱/۲۰۳): (قوله ومنها القراءة) أي من القرآن المنقول عن الرسول عليه الصلاة والسلام متواتراً فلا يقرأ بالشواذ وان قرأ بها لا تفسد ولا يعتد بها.

وفي الشامية (۱/۵۴۴): حاصل معنى كلام هذين الشيخين بيان وجه الكراهة في المداومة. وهو أنه ان رأى ذلك حتما يكره من حيث تغيير المشروع، والا يكره من حيث ايهام الجاهل.

(۱۲۸) قراءة سبعہ اور عشرہ کی نماز میں تلاوت اور مخفف کو مشدد یا برعکس پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید "مسجد خالد بن الولید" میں امام ہے یہ مسجد چونکہ

رکعت میں قعدہ کرنے کے بجائے پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اور اگر تین تسبیح کے بقدر بیٹھا ہو تو آخر میں سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔

لما في صحيح البخاري (۱/۱۰۵): عن عبدالله بن ابي قتادة عن ابيه ان النبي ﷺ كان يقرأ في الظهر في الاوليين بام الكتاب وسورتين وفي الركعتين الاخريين بام الكتاب ويسمعنا الاية ويطول في الركعة الاولى ما لا يطيل في الركعة الثانية وهكذا في العصر وهكذا في الصبح.

وفي حاشية الطحطاوي (ص ۲۴۴): (قوله: وجب عليه سجود السهو) إذا شغله التفكر عن اداء واجب بقدر ركن ... وهو مقدر بثلاث تسبيحات، ثم ان محل وجوب سجود السهو إذا لم يشتغل حالة الشك بقراءة ولا تسبيح اهـ.

وفي الدر المختار (۱/۵۴۲، ۵۴۳): (وتطال اولى الفجر على ثانيتها) بقدر الثلث وقيل النصف ندبا فلو فحش لا بأس به (فقط) وقال محمد: واولى الكل حتى التراويح قيل وعليه الفتوى (واطالة الثانية على الاولى يكره) تنزيها اجماعا ان بثلاث آيات ان تقاربت طولا وقصرا والا اعتبر الحروف والكلمات ... (ص ۵۴۳) (وان باقل لا يكره).

وفي الدر المختار (۱/۵۴۶، ۵۴۷): لا بأس ان يقرأ سورة ويعيدها في الثانية وان يقرأ في الاولى من محل وفي الثانية من آخر ولو من سورة ان كان بينهما آيتان فأكثر ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفي القنية قرأ في الاولى الكافرون وفي الثانية الم تر او تبت، ثم ذكر يتم وقيل يقطع ويبدأ ولا يكره في النفل شيء من ذلك

وفي الشامية تحته: (قوله ثم ذكر يتم) افاد ان التنكيس او الفصل بالقصيرة انما يكره اذا كان عن قصد فلو سهوا فلا كما في شرح المنية

وفيه ايضا (۲/۹۰): (ولو نسيه) اي القنوت (ثم تذكره في الركوع لا يقنت) فيه لفوات محله (ولا يعود الى القيام) في الاصح لان فيه رفض الفرض للواجب (فان عاد اليه وقنت ولم يعد الركوع لم تفسد صلاته) لكون ركوعه بعد قراءة تامة (ص ۰) (وسجد للسهو قنت او لا لزواله عن محله.

(۱۷۰) مسئلہ زلۃ القاری

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) مسئلہ زلۃ القاری میں فتوی حضرات متقدمین رحمہم اللہ کے قول پر ہے یا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر؟

(۲) متاخرین [illegible]

قریب المعنی اور بعید المعنی ہونے کی کیا تحدید اور ضابطہ ہے؟

(۳) مسائل زلۃ القاری میں جن مقامات میں متقدمین ومتاخرین کے قول میں اختلاف ہے فتویٰ متقدمین کے قول پر ہے یا متاخرین کے قول پر مثلاً وخطائی الاعراب جو مفسد ہو عند المتقدمین اور دیگر مقامات۔

الجواب حامداً ومصلیاً قرآن مجید کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں اتارا ہے لہٰذا اس کو عربی لہجے میں پڑھنا چاہئے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اقرؤوا القرآن بلحون العرب یعنی قرآن مجید کو عربی لہجے میں پڑھو۔ لہٰذا قرآن مجید کو تجوید کے قواعد کے مطابق ہر حرف کو اپنے مخارج اور صفات کے ساتھ اپنی قدرت وگنجائش کے موافق پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص بے فکر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتا رہے تو وہ گنہگار ہوگا۔

صورت مسئولہ میں جن مقامات میں متقدمین ومتاخرین کا اختلاف ہے وہاں پر فتویٰ متاخرین کے قول پر ہے۔ لیکن جو شخص صحیح حروف اور صحیح اعراب ادا کرنے پر قادر ہو اور پھر بھی لا پرواہی کرکے قصداً غلط ادا کرتا ہے اور غلط ادا کرنے کی وجہ سے معنی میں بھی تغیر فاحش آجائے تو پھر متقدمین اور متاخرین سب کا فتویٰ یہی ہے کہ نماز فاسد ہوگی۔

كما في الشامية (١/٦٣٠): ان الخطاء اما في الاعراب اي الحركات والسكون ويدخل فيه تخفيف المشدد وقصر الممدود وعكسهما او في الحروف بوضع حرف مكان آخر او زيادته او نقصه او تقديمه او تاخيره او في الكلمات او في الجمل كذلك او في الوقف ومقابله والقاعدة عند المتقدمين ان ما غير المعنى تغييرا يكون اعتقاده كفرا يفسد في جميع ذلك سواء كان في القرآن او لا الا ما كان من تبديل الجمل مفصولا بوقف تام وان لم يكن التغيير كذلك فان لم يكن مثله في القرآن والمعنى بعيد متغير تغيرا فاحشا يفسد ايضا كهذا الغبار مكان هذا الغراب، وكذا اذا لم يكن مثله في القرآن ولا معنى له كالسرائل باللام مكان السرائر وان كان مثله في القرآن والمعنى بعيد ولم يكن متغيرا فاحشا تفسد ايضا عند ابي حنيفة ومحمد، وهو الاحوط، وقال بعض المشايخ: لا تفسد لعموم البلوى، وهو قول ابي يوسف وان لم يكن مثله في القرآن ولكن لم يتغير به المعنى نحو قيامين مكان قوامين فالخلاف على العكس، فالمعتبر في عدم الفساد عند عدم تغير المعنى كثيرا وجود المثل في القرآن عنده والموافقة في المعنى عندهما فهذه قواعد الائمة المتقدمين، واما المتاخرون كابن مقاتل وابن سلام واسماعيل الزاهد وابي بكر البلخي والهندواني وابن الفضل والحلواني، فاتفقوا على ان الخطأ في الاعراب لا يفسد مطلقا ولو اعتقاده كفرا لان اكثر الناس لا يميزون بين وجوه الاعراب، قال قاضيخان: وما قاله المتاخرون اوسع وما قاله المتقدمون احوط، وان كان الخطأ بابدال حرف بحرف، فان امكن الفصل بينهما بلا كلفة كالصاد مع الطاء بان قرء

الصالحات مكان الصالحات فاتفقوا على انه مفسد، وان لم يمكن الا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين فاكثرهم على عدم الفساد لعموم البلوى، وبعضهم يعتبر عسر الفصل بين الحرفين وعدمه وبعضهم قرب المخرج وعدمه ولكن الفروع غير منضبطة على شيء من ذلك، فالاولى الاخذ فيه بقول المتقدمين لانضباط قواعدهم وكون قولهم احوط واكثر الفروع المذكورة في الفتاوى منزلة عليه ونحوه في الفتح، وسياتي تمامه

وفيه ايضاً (۱/۶۳۳): الاصل فيما اذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى ان امكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد، والا يمكن الا بمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال اكثرهم لاتفسد، وفي خزانة الاكمل قال القاضي ابو عاصم: ان تعمد ذلك تفسد، وان جرى على لسانه او لايعرف التمييز لاتفسد، وهو المختار حلية وفي البزازية: وهو اعدل الاقاويل، وهو المختار.

(۱۷۱) قرأت میں حرکات واعراب کی تبدیلی سے نماز کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب صبح کی نماز پڑھا رہے تھے انہوں نے سورۃ النحل کا آخری رکوع تلاوت کیا جب اس آیت پر پہنچے "وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَا اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ (سورۃ نمل: ۹۲) تو انہوں نے مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ کو مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ پڑھا جب نماز ہوگئی سارے مقتدی چلے گئے تو بعد میں امام صاحب کو خیال آیا کہ میں نے تو قرأت میں غلطی کی ہے۔ آیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہوئی یا اعادہ ضروری ہوگا نیز اعادہ کرنے میں انتشار کا بھی قوی اندیشہ ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی آسان سا حل اس مسئلے کا نکالدیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　نماز کے دوران قرأت کرتے وقت حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے نماز میں کسی قسم کی خرابی اور نقصان واقع نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے معنی ومطلب میں تبدیلی اور فساد واقع ہوجائے۔ بصورت مسئولہ میں اس غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

لما في الهندية (۱/۸۱): ومنها اللحن في الاعراب، اذا لحن في الاعراب لحنا لايغير المعنى بان قرأ "لاترفعوا اصواتكم" "برفع التاء" لاتفسد صلاته بالاجماع وان غير المعنى تغيراً فاحشاً بان قرأ "وعصى آدم ربه" "بنصب الميم" ورفع الرب" وما اشبه ذلك مما لو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأ فسدت صلاته في قول المتقدمين واختلف المتأخرون "الى ان قال" لاتفسد صلاته وما قاله المتقدمون احوط لانه لو تعمد يكون كفراً وما يكون كفراً لا يكون من القرآن. وما قاله المتأخرون

انہوں نے پہلی رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی آخری آیات تلاوت کیں لیکن اس میں تقدیم و تاخیر ہوگئی مثلاً افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت قرآن میں اس طرح ہے لیکن انہوں نے خلقت کی بجائے رفعت پڑھ دیا، رفعت کی جگہ خلقت پڑھا، نصبت کی جگہ سطحت پڑھا اور سطحت کی جگہ نصبت پڑھا تو اس صورت میں نماز ہوگئی یا واجب الاعادہ ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً دوران نماز قراءت کی ایسی غلطی جس سے معنی میں تغیر فاحش لازم آتا ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن اگر معنی میں فساد زیادہ نہ ہو اور وہ کلمہ قرآن میں موجود بھی ہو تو امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس صورت میں بھی نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک اس صورت میں نماز فاسد نہیں ہوتی۔ صورت مسئولہ میں اگرچہ احتیاط طرفین کے قول پر عمل کرنے ہی میں ہے کہ نماز کا اعادہ کیا جائے لیکن اس نماز کی ادائیگی کو چند دن گذر چکے ہیں اور اعادہ کا حکم کرنے سے فساد و حرج کا اندیشہ ہے لہذا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

لما في المحيط البرهاني (۲/ ۰۰۰): وإن كان اختلافاً متباعداً نحو أن يختم آية الرحمة بآية العذاب أو آية العذاب بآية الرحمة، أو يريد أن يقرأ الرحمن علم القرآن فجرى على لسانه الشيطان... فعلى قول أبي حنيفة ومحمد تفسد صلاته وأما على قول أبي يوسف، فقد اختلف المشايخ، قال بعضهم لا تفسد إذا لم يقصد ذلك، وجرى على لسانه غلطاً، ويجعل كأنه ابتدأ بكلمة من كلمات القراءة وهذا لأنه قصد قراءة القرآن على ما أنزل، فيجعل في التقدير كأنه ترك القراءة من هذا الموضع وأخذ بالقراءة من ذلك الموضع، وهو في ذلك الموضع قرآن فلا تفسد صلاته وبه كان يفتي الشيخ الإمام الفقيه أبو الحسن وهو اختيار محمد بن مقاتل الرازي وقيل في المسئلة عن أبي يوسف روايتان.

وفي خلاصة الفتاوى (۱/ ۱۰۵): ولو قرأ أفلا ينظرون إلى قوله وإلى الجبال كيف سطحت مكان نصبت فعلى قياس قول أبي يوسف لا يفسد وكذا نصبت مكان سطحت وخلقت مكان رفعت وعلى قولهما ينبغي أن يفسد.

وفي الفقه الإسلامي وأدلته (۲/ ۰۰۰): تبطل الصلاة بكل ما غير المعنى تغيراً يكون اعتقاده كفراً، وبكل ما لم يكن مثله في القرآن، والمعنى بعيد متغير تغيراً فاحشاً، كهذا الغبار مكان "هذا الغراب" (المائدة ۵/ ۳۱) وبكل ما لم يكن له مثل في القرآن ولا معنى له كالسرائل مكان "السرائر" (الطارق: ۸۶/ ۹) وتبطل أيضاً عند أبي حنيفة ومحمد بما له مثل في القرآن والمعنى بعيد ولم يكن متغيراً تغيراً فاحشاً ولا تبطل عند أبي يوسف لعموم البلوى.

وفي الشامية (١/٦٣٣): فالمعتبر في عدم الفساد عند عدم تغير المعنى كثيرا وجود المثل في القرآن عنده والموافقة في المعنى عندهما فهذه قواعد الائمة المتقدمين.

وفي الشامية (١/٦٣٣): وهذا كله قول المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع، وأن قول المتقدمين أحوط، قال في شرح المنية وهو الذي صححه المحققون وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار، والاحتياط أولى سيما في أمر الصلوة التي هي أول ما يحاسب العبد عليها.

(۱۷۴) اس آدمی کی نماز کا حکم جو قرأت پر قدرت نہ رکھتا ہو

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بھائی ہے جس کی زبان میں زبردست قسم کی لکنت ہے، ایک ایک حرف کو کئی کئی بار ادا کرتا ہے اور لفظوں کو خوب کھینچ تان کر پڑھتا ہے، مثلاً اگر اس نے یہ پوچھنا ہو (یہ کون ہے) تو کہے گا اے اے کون (یہ ک ک ک) اور نون کو خوب کھینچتا ہے تین چار دفعہ ادا ہو جاتے ہیں۔ (ہے) کو کھینچتا ہے۔ وہ بالغ ہے اب نماز کا اس کیلئے مسئلہ ہے سوچتے ہیں قرآن نہ پڑھا ہیں تو کافر گنہگار ہوگا۔ مسجد میں آتا ہے امام کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے لیکن پڑھتا نہیں اور جب کبھی پڑھتا ہے تو ہم کہتے ہیں واللہ تعالیٰ پڑھتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی نماز بغیر قرأت درست ہے یا نہیں؟ یا ہم اس کو ازدی غلط سلط قرآن سکھوائیں یا اس کی مرضی پہ چھوڑ دیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ابتداء میں قرآن پڑھوانے کی کوشش کی امام صاحب بچارے نے بہت زور لگایا مگر وہ بھی تھک کے کہنے لگے یہ نہیں پڑھ سکتا اور جو چند جملے سیکھے گا وہ بھی قرآن کی بجائے کوئی اور لفظ بنے گا۔ مہربانی کریں کہ شرعی حکم سے آگاہ کریں تاکہ ہم بڑا گناہ سے بچ جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نماز میں قرأت کرنا اس آدمی پر فرض ہے جو قرأت قرآن پر قادر ہو، صورت مسئولہ میں اگر آپ کا بھائی اس طریقہ پر قرآن پڑھتا ہو جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہے اور وہ کسی بھی صورت سے صحیح پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتا، بہت کوشش کرنے کے بعد وہ سیکھنے سے مایوس ہو جائے، اور کوئی مجوّد قاری اس کی تصدیق بھی کرے کہ یہ کبھی بھی درست نہیں پڑھ سکتا تو اس کی نماز بغیر قرأت قرآن کے درست ہے۔

لما في الشامية (١/٥٨٢): (قوله دائماً) اي في آناء الليل وأطراف النهار، فمادام في التصحيح والتعلم ولم يقدر عليه فصلاته جائزة وإن ترك جهده فصلاته فاسدة كما في المحيط وغيره، قال في الذخيرة: وإنه مشكل عندي، لأن ما كان خلقة فالعبد لا يقدر على تغييره اھ وتمامه في شرح المنية.

وفي اعلاء السنن (٤/١٣٨): عن رفاعة بن رافع أن رسول الله ﷺ علم رجلاً الصلوة فقال إن كان معك قرآن فاقرأ وإلا فاحمد الله وكبره وهلله ثم اركع، رواه ابو داؤد والترمذي، وأخرجه

النسائي أيضاً وقال الترمذي: حديث رفاعة حسن، كذا في النيل (١١٨/٢)

قوله عن رفاعة بن رافع الخ، قلت فيه دلالة على أن العاجز عن قراءة القرآن تسقط عنه القراءة مادام عاجزا، ويكفيه الذكر عوضا عنها، ولا يخفى أن الذكر لا يتقيد بالعربية ولا ينحصر فيها بل يحصل بأي لسان كان، كالإيمان فإنه لو آمن بغير العربية جاز اجماعا لحصول المقصود، كذا في البحر (٢٠٧/١).

وفيه أيضاً (١٢٣/٢) قلت وقد صرح بوجوب التجويد وتصحيح الحروف فقهاؤنا الحنفية أيضاً، قال في غنية المستملي وقال صاحب المحيط: والمختار للفتوى في جنس هذه المسائل أنه إن كان يجتهد آناء الليل وأطراف النهار في التصحيح ولا يقدر عليه فصلاته جائزة وإن ترك جهده فصلاته فاسدة وإن ترك جهده في بعض عمره لا يسعه أن يتركه في باقي عمره ولو ترك تفسد صلاته، انتهى.

وقال صاحب الذخيرة: إنه مشكل عندي (١) لأن ما كان خلقة فالعبد لا يقدر على تغييره "انتهى".

وعلى هامشها (١٢٣/٢)، (١) أي الحكم بفساد صلاة بترك الجهد بعد ما اجتهد مدة وصرف فيها برهة من الزمان ... مشكل يفضي إلى الحرج ولذا قال شيخ في بعض تصانيفه إن تصحيح الحروف وبذل الجهد فيه واجب مالم يحصل اليأس منه، وإذا أيس سقط الجهد وتجوز صلاته دائماً، والمعتبر في حصول اليأس شهادة حاذق من القراء بأن ذلك لا يرجى منه أن يصح الحروف أبداً لا مجرد زعم المتعلم "فافهم" فإن هذا لا تجده في كتاب ولكنه هو الأولى بالصواب.

(١٧٥) سورۂ "الم السجدة" اور "هل أتى على الانسان" جمعہ کو فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک چچازاد بھائی ہے جو گلشن اقبال میں رہتا ہے کچھ دن اس سے ملنے گیا کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی، وہاں فجر کی نماز جماعت سے پڑھی امام نے بہت طویل قرأت کی دونوں رکعتوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھیں جب نماز ختم ہوئی تو میں نے کہا بھائی تمہارا امام تو بہت طویل قرأت کرتا ہے کہنے لگا اصل میں آج جمعہ ہے اور جمعے کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر میں الم السجدہ اور سورۃ هل اتی علی الانسان پڑھتے تھے۔ میں نے تو ہمارے امام صاحب سے تو کبھی نہیں پڑھی پھر جب میں اپنے محلے میں آیا امام صاحب کو بتایا کہ یوں معاملہ ہوا اس نے کہا ہمارے فقہ میں ان کو پڑھنا منع ہے اس لئے میں نہیں پڑھتا میرے ذہن میں خیال آیا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے پھر ہمارے فقہ میں کیوں منع ہے مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ براہِ مہربانی رہنمائی فرمائیں۔

او عاب کفر کذا فی التاتارخانیة

وفی بزازیة علی هامش الهندیة (۶/۳۳۸): قرأ القرآن علی ضرب الدف والقضیب یکفر لاستخفافه وأدب القرآن أن لا یقرأ فی مثل هذه المجالس والمجلس الذی اجتمعوا فیه للغنا والرقص لا یقرأ فیه القرآن کما لا یقرأ فی البیع والکنائس لانه مجمع الشیطان قال من ذکر الله کبر یکفر. ادخل آیة القرآن فی المزاح والدعابة کفر لانه استخفاف به وکذا المزاح به مثل ان یقول قل هو الله احد رابوست بردی الخ.

(۱۷۷) نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے غلطی کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے سال مدرسہ کی سالانہ چھٹیوں میں، میں چھٹی میں گیا تھا، ہماری تحصیل بلوچستان کے پہاڑی علاقے میں ہے، وہاں مسجد کے جو امام صاحب تھے قرآن پڑھتے ہوئے تلفظ صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکتے تھے اور ایک بڑی غلطی یہ کرتے کہ الحمد للہ میں الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھتے تو میں نے ان سے کہا کہ اس طرح پڑھنے سے معنی غلط ہو جاتا ہے اور اس سے نماز بھی مکروہ ہو جاتی ہے تو امام صاحب نے کہا کہ میرے پیچھے کئی مرتبہ علماء نے نماز پڑھی ہے مگر کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے تم تبلیغی لوگ ایسے علماء پر اعتراضات کرتے ہو، تو میں خاموش ہو گیا کہ جب علمائے کرام نے کچھ نہیں فرمایا ہے تو شاید نماز اس سے فاسد نہ ہوتی ہو مگر دل بھی مطمئن نہ ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ فرمائیں قرآن وسنت کی روشنی میں کیا اس طریقے سے قرآن پڑھنا جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نماز میں قرآن شریف کو صحیح ڈھنگ سے تلفظ ادا کرنے میں ایسی غلطی کرنا جس سے معنی میں بگاڑ لازم آتا ہو ایسی غلطی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور جس غلطی سے معنی میں بگاڑ لازم نہ آتا ہو تو ایسی غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی۔ کیونکہ الف کو کھینچ کر پڑھنے سے ہمزہ استفہام بن کر الحمد للہ کا معنی بگڑ جاتا ہے۔

لما فی الهندیة (۱/۸۱): ولو قال الله اکبر مع الف الاستفهام لا یصیر شارعاً بالاتفاق.

وفیه ایضاً (ص۷۹): ان ذکر حرفاً مکان حرف ولم یغیر المعنی لم تفسد صلوته، وان غیر المعنی فان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مکان الصالحات تفسد صلوته عند الکل وان کان لا یمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین والطاء مع التاء اختلف المشائخ قال اکثرهم لا تفسد صلاته هکذا فی فتاوی قاضیخان وکثیر من المشائخ افتوا به

وفی الدر المختار (۱/ ۶۳۰): ومنها مد الهمزة فی التکبیر کما مر، ومنها القراءة بالالحان ان غیر المعنی والا لا، الا فی حرف مد ولین اذا فحش والا لا بزازیة.

وفی الشامیة تحته. (قوله والا لا الخ) ای وان لم یغیر المعنی فلا فساد الا فی حرف مد ولین ان فحش فانه یفسد، وان لم یغیر المعنی.

(۱۷۸) دورانِ نماز سورتوں کے درمیان قصداً ترتیب نہ رکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مسجد کا جو امام ہے وہ ایک نوجوان آدمی ہے جو کہ صرف حافظ قرآن ہے اب تک اس نے عالم کا کورس نہیں کیا ہے بعض اوقات یہ حافظ صاحب نماز دن میں پہلی رکعت میں کوئی سورت پڑھ لیتا ہے پھر دوسری رکعت میں اس سے پیچھے والی سورت پڑھ لیتا ہے۔ تو ایک دن عشاء کی نماز میں جب اس نے اسی طرح کیا تو نماز کے بعد میں نے کہا کہ حافظ صاحب اس طرح پڑھنا جائز نہیں ہے اور اس سے نماز فاسد ہوتی ہے تو حافظ صاحب نے کہا کہ قرآن پاک میں اللہ پاک کا ارشاد مبارک ہے "فاقرؤا ما تیسر من القرآن" (قرآن مجید میں سے جو آسان ہو پڑھ لو) لہٰذا جس طرح بھی پڑھ لیں نماز ہو جاتی ہے مگر حافظ صاحب چونکہ عالم یا مفتی نہیں ہیں لہٰذا ان کی بات پر مجھے اطمینان نہیں ہوا لہٰذا مفتی صاحب آپ بتائیں کیا اس طرح جان بوجھ کر نماز میں قرأت جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت رکھنا یہ قرآن مجید کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے اگر کسی شخص سے غیر ارادی طور پر کبھی سورتوں میں تقدیم اور تاخیر ہو جائے تو نماز بلا کراہت ادا ہو جاتی ہے البتہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا عمل کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حافظ صاحب کا قصداً اس طرح کرنا اور اس بات کو اپنی عادت بنا لینا ٹھیک نہیں کیونکہ اس صورت میں فرض نماز کی ادائیگی کراہت کے ساتھ ہوتی ہے البتہ آپ کا یہ کہنا کہ اس طرح سورتوں میں تقدیم وتاخیر کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ قرآن کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا نماز فاسد نہیں ہوتی مگر قصداً اس طرح کرنے سے فرض نماز مکروہ ضرور ہوتی ہے لہٰذا حافظ صاحب کو احسن طریقے سے مسئلہ بتا دیا جائے۔

لما فی البحر الرائق (۲/ ۱۶۵): لو قرأ سورة ثم قرأ فی الثانية سورة قبلها ساهيا لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القرآن لا من واجبات الصلاة فتركها لا يوجب سجود السهو.

وفی الهندیة (۱/ ۷۸): واذا قرأ فی ركعة سورة وفی الركعة الاخرى او فی تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره. ... هذا كله فی الفرائض واما فی السنن فلا يكره.

ضرورت ہوتی تو اللہ رب العزت نے اتنی ہی مقدار میں اس کو نازل کر دیا مگر جب اس کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد رکھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبین وحی کو اسی طرح حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی طرح قرآن کو لکھا جس طرح آپ سے سنا، گرچہ قرآن مجید کو مصحف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار فانی سے پردہ فرما جانے کے بعد جمع کیا گیا لیکن صحابہ نے صرف جمع کرنے میں ہی کی ترتیب میں نہیں ترتیب وہی تھی جس کو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور تلاوت کے سنا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ اسی ترتیب سے رکھو اور مصحف میں اس ترتیب کے ساتھ رکھنے پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے اس وجہ سے سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا دوران تلاوت تلاوت کے واجبات میں سے ہے لہذا اس واجب کے ترک کی بناء پر (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے) کراہت آتی ہے۔

لما في البحر الرائق (٢/١٠٣): الرابع سببه ترك واجب من واجبات الصلاة الاصلية سهوا وهو المراد بقوله "بترك واجب" لا كل واجب بدليل ما سنذكره من انه لو ترك ترتيب السور لا يلزمه شيء مع كونه واجبا وهو اجمع ما قيل فيه لو قرأ سورة ثم قرأ في الثانية سورة قبلها ساهيا لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القرآن لا من واجبات الصلاة فتركها لا يوجب سجود السهو.

وفي الهندية (١/٧٨): واذا قرأ في ركعة سورة وفي الركعة الاخرى او في تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره هذا كله في الفرائض واما في السنن فلا يكره

وفي الشامية (١/٥٤٦): ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفي القنية قرأ في الاولى الكافرون وفي الثانية الم تر او تبت ثم ذكر يتم وقيل يقطع ويبدأ (قوله وان يقرأ منكوسا) بان يقرأ في الثانية سورة اعلى مما قرأ في الاولى لان ترتيب السور في القراءة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم (قوله ثم ذكر يتم) افاد ان التنكيس او الفصل بالقصيرة انما يكره اذا كان عن قصد فلو سهوا فلا كما في شرح المنية. وفيه ايضا (١/٤٥٧): ويؤيده ايضا انهم قالوا يجب الترتيب في سور القرآن فلو قرأ منكوسا اثم لكن لا يلزمه سجود السهو لان ذلك من واجبات القراءة لا من واجبات الصلوة كما ذكره في البحر في باب السهو.

(١٨٠) ایک رکعت میں دو سورتیں ملا کر پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ [illegible]

اپنے گھر کو چلا گیا مغرب کو جب نماز پڑھنے کیلئے مسجد گیا تو امام صاحب نے نماز پڑھانے کیلئے مجھے کہا تو میں نے مغرب کی نماز میں پہلی رکعت میں الم تر کیف اور سورۃ قریش دونوں پڑھیں اور دوسری رکعت میں سورۃ اخلاص پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب نے کہا کہ جماعت پڑھاتے ہوئے دو سورتیں ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے میں نے کچھ نہیں کہا اور سوچا کہ مدرسے جا کر مفتی صاحب سے پوچھوں گا۔ لہذا مفتی صاحب آپ بتلائیں کہ مذکورہ امام کا یہ کہنا کہ "فرض نماز کی جماعت کراتے ہوئے دو سورتوں کو ملا کر ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے" صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً بہتر یہ ہے کہ فرض نماز کی ایک رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک سورت پڑھی جائے دو سورتیں نہ پڑھے اگر دو سورتیں پڑھ لیں جیسے کہ صورت مذکورہ میں ہے تو بھی بلا کراہت نماز جائز ہے لہذا امام صاحب کی بات درست ہے۔

لما في بدائع الصنائع (۲/۳۳۳) ولو جمع بين السورتين في ركعة لا يكره لما روي أن النبي ﷺ أوتر بسبع سور من المفصل والأفضل أن لا يجمع.

وفي الهندية (۱/۷۸): وإذا جمع بين سورتين بينهما سور أو سورة واحدة في ركعة واحدة يكره وأما في الركعتين إن كان بينهما سور لا يكره الخ

وفي الشامية (۱/۵۴۶): وفي التاتارخانية: إذا جمع بين سورتين في ركعة رأيت في موضع أنه لا بأس به وذكر شيخ الإسلام لا ينبغي له أن يفعل على ما هو ظاهر الرواية اهـ وفي شرح المنية: الأولى أن لا يفعل في الفرض ولو فعل لا يكره إلا أن يترك بينهما سورة أو أكثر.

﴿فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

(۱۸۱) دورانِ نماز ستر کھل جانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بچہ ہے جس کی عمر دو تین سال ہے میں جب نماز پڑھتی ہوں تو میرے پاس آ کر میرا دوپٹہ اتار لیتا ہے جس کی وجہ سے میرا سر ننگا ہو جاتا ہے بسا اوقات میرے آگے آ کر بیٹھ جاتا ہے میں اس کو ایک طرف کرتے سجدہ کر لیتی ہوں اب سر ننگا ہونے کی وجہ سے یا بچہ کو ہٹانے کی وجہ سے میری نماز میں فساد آئے گا یا نماز درست ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً عورت کا نماز کے اندر سوائے چہرہ، ہتھیلی اور قدموں کے تمام بدن کا چھپانا فرض ہے، بدن کے جو اعضاء ستر میں داخل ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کا چوتھائی یا اس سے زیادہ حصہ نماز پڑھتے وقت کھل جائے اور اتنی دیر کھلا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر کھلتے ہی فوراً کھلے ہوئے حصے کو عمل قلیل کے ساتھ چھپالیں تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ عمل قلیل سے مراد وہ کام ہے جو ایک ہاتھ کے ذریعے سے کیا جا سکے اور اس میں تکرار بھی نہ ہو۔

بنا بریں صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا سر اتنی دیر تک ننگا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہے تو آپ کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ البتہ اگر سر کھلتے ہی فوراً عمل قلیل کے ساتھ سر کو دوبارہ چھپا لیں تو آپ کی نماز درست ہو جائے گی۔ اسی طرح سجدہ کرنے کیلئے سامنے بیٹھے ہوئے بچے کو عمل قلیل کے ذریعے ایک طرف ہٹا دینے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

لما في الهندية (۱/۵۸): بدن الحرة عورة الا وجهها وكفيها وقدميها كذا في المتون وشعر المرأة ما على رأسها عورة واما المسترسل ففيه روايتان الاصح انه عورة كذا في الخلاصة وهو الصحيح وبه اخذ الفقيه ابو الليث وعليه الفتوى كذا في معراج الدراية وان انكشف عورته في الصلاة فسترها بلا مكث جازت صلاته اجماعا وان ادى ركنا مع الانكشاف فسدت اجماعاً والعمل القليل ان تاخذه بيد واحدة كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار (۱/۴۰۵): (وللحرة) ولو خنثى (جميع بدنها) حتى شعرها النازل في الاصح (خلا الوجه والكفين) فظهر الكف عورة على المذهب (والقدمين)

القراءة من المصحف فتفسد الصلوة عند ابی حنيفة لان حمل المصحف والنظر فيه وتقليب الاوراق عمل كثير ولانه يشبه التلقين من الآخرين.

(۱۸۳) نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور نماز کی حالت میں اس کو نیند آ جائے تو کیا اس سے نماز میں کچھ خلل پڑے گا یا نہیں؟ نیز اگر نیند کے اندر وہ ہنسنے لگ جائے تو پھر اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قہقہہ وہ ہنسی ہے جو دوسرے کو بھی سنائی دے۔ اس سے بیداری کی حالت میں وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں۔ ضحک وہ ہنسی ہے جس کی آواز اپنے تک محدود ہے۔ اس سے بیداری کی حالت میں نماز فاسد ہوتی ہے، نہ کہ وضو۔ اور تبسم وہ مسکراہٹ ہے جس میں کوئی آواز نہ ہو۔ اس سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو۔ اور نماز کی حالت میں نیند آنے سے نماز میں کچھ خلل نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ نماز ہیئت مسنونہ پر ہو، اور نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنے یعنی ضحک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو، اور سونے کی حالت میں قہقہہ لگانے سے صرف نماز فاسد ہو جاتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا۔

لما في تاتارخانية (۱/۱۳۸): وكذلك القهقهة من النائم في الصلاة لاينقض الوضوء ـــ هكذا وقع في بعض الكتب وذكر الزندوسي في نظمه، اذا نام في صلوته قائماً او ساجداً ثم قهقه لا رواية لهذا في الاصول قال شداد بن اوس رقال ابو حنيفة تفسد صلوته ولايفسد وضوءه وهكذا افتى الفقيه عبدالواحدؒ.

وفي الهندية (۱/۱۲): ومنها النوم، ينقضه النوم مضطجعاً في الصلوة وفي غيرها بلاخلاف بين الفقهاء وكذا النوم متوركاً بان نام على احدوركيه هكذا في البدائع ـــ ولا ينقض نوم القائم والقاعد ولو في السرج او المحمل ولا الراكع ولا الساجد مطلقاً ان كان في الصلوة وان كان خارجها فكذلك.

وفي الشامية (۱/۱۴۱): قال في شرح الوهبانية، ظاهر الرواية ان النوم في الصلوة قائماً او قاعداً او ساجداً لا يكون حدثاً سواء غلبه النوم او تعمده، وفي جوامع الفقه انه في الركوع والسجود لاينقض ولو تعمده ولكن تفسد صلوته.

وفي تبيين الحقائق (۱/۵۰): ثم القهقهة ما يكون مسموعاً له ولجيرانه بدت اسنانه اولا وقد تقدم حكمها، والضحك مايكون مسموعاً له دون جيرانه وهو مبطل للصلوة دون الوضوء والتبسم مالاصوت فيه ولا تاثير له في واحد منهما.

(۱۸۴) عورت اگر مرد سے محاذاۃ میں کھڑی ہو اور دونوں نماز میں مشترک ہوں تو اس کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں گھر میں ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا دو رکعت فرض ادا کر چکے تھے کہ میری بیوی نے اسی مصلے پر میرے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی اسی دوران میری بیوی کے بڑے بھائی آ گئے ہوئے تھے انہوں نے دیکھ کر فرمایا آپ کی نماز فاسد ہو گئی ہے کیونکہ آپ نے عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے اب آپ حضرات سے معلوم کرنا ہے کہ واقعی میری نماز فاسد ہو گئی ہے یا نہیں؟ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً جب کوئی عورت نماز میں مرد کے ساتھ یا آگے اس طرح کھڑی ہو جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو اور نہ دونوں میں ایک آدمی کے کھڑے ہونے کے بقدر فاصلہ ہو اور دونوں ایک ہی نماز میں شریک ہوں یعنی ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہوں تو مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ یہ صورت نہیں پائی گئی لہذا آپ کی نماز صحیح ہے۔ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں مگر اس طرح عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لما في الهندية (۱/۸۹): محاذاة المرأة الرجل مفسدة لصلاته...... والمسبوق بان في حق التحريمة منفرد فيما يقضيه فلو حاذت الرجل المرأة فيما يقضيان لاتفسد صلوته. كذا في التبيين.

وفي الدر المختار مع الشامية (۱/۵۷۲): (مشتركة) فمحاذاة المصلية لمصل ليس في صلاتها مكروهة لامفسدة.

وفي الشامية تحته: (قوله ليس في صلاتها) بأن صليا منفردين أو مقتديا أحدهما بامام لم يقتد به الآخر شرح المنية (قوله مكروهة) الظاهر انها تحريمة لأنها مظنة الشهوة والكراهة على الطارئ ط. قلت: وفي معراج الدراية: وذكر شيخ الاسلام مكان الكراهة الاساءة، والكراهة افحش اهـ.

وفي الشامية (۱/۵۷۲): فالتفسير الصحيح للمحاذاة ما في المجتبى: المحاذاة المفسدة ان تقوم بجنب الرجل من غير حائل او قدامه

(۱۸۵) مرد کا عورت کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھر پر عورت مرد سے آگے نماز پڑھ رہی ہے۔ یعنی مرد اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ دیکھنے والے کے دل میں یہ خیال آ جائے کہ عورت امامت کر رہی ہے جبکہ وہ امامت نہیں کر رہی ہوتی اس صورت میں مرد کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اصل حکم یہ ہے کہ مرد عورت سے آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھے تاکہ نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ تاہم گھر وغیرہ پر محرم

عورت یا بیوی آگے نماز پڑھ رہی ہے، اور مرد اس کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھے اس طور پر کہ نیت میں کسی قسم کا فرق نہ ہو اور کوئی خلل بھی واقع نہ ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے، اور دل میں صرف یہ خیال آتا کہ "عورت امامت کرا رہی ہے" نماز کیلئے مخل نہیں جبکہ حقیقت میں وہ امامت نہ کرا بھی نہیں رہی ہے۔

لما في صحيح البخاري (۱/۷۲): عن عائشة رضي الله عنها قالت بئسما عدلتمونا بالكلب و الحمار لقد رأيتني ورسول الله ﷺ يصلي وانا مضطجعة بينه وبين القبلة فاذا اراد ان يسجد غمز رجلي فقبضتهما.

وفي الشامية (۱/۶۳۳): (قوله ولو امرأة او كلبا) بيان للاطلاق، واشار به إلى الرد على الظاهرية بقولهم يقطع الصلاة مرور المرأة والكلب والحمار.

(۱۸۶) تعداد رکعات میں شک کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنہیں نماز کے دوران اکثر شک پڑ جاتا ہے کہ دو رکعتیں پڑھیں یا تین، ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: دورانِ نماز اگر رکعتوں کی تعداد میں اکثر شک ہوتا ہو تو تحری (غور وفکر) کے ذریعے جس جانب ظن غالب ہو اس کے مطابق نماز پوری کرلیں اور اگر کسی ایک جانب ظن غالب نہ ہو تو کم رکعتوں پر بنا کریں اور ہر رکعت پر قعدہ کر کے آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لما في الدر المختار (۲/۴۰۹،۳۰۹): (اذا شك) في صلاته ... (وان كثر) شكه (عمل بغالب ظنه ان كان) له ظن للحرج (والا اخذ بالاقل) لتيقنه (وقعد في كل موضع توهمه موضع قعود) ولو واجبا لئلا يصير تاركا فرض القعود او واجبه.

وفي الشامية تحته: ولو شك انها الثانية او الثالثة اتمها وقعد ثم صلى اخرى وقعد ثم الرابعة وقعد وتمامه في البحر.

(۱۸۷) نماز میں قطرہ کا وہم اور تعداد رکعات میں شک کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا ہے شادی سے پہلے میں بہت دین کا کام کرتی تھی اور بہت زیادہ عبادت کرتی تھی گھر کے تمام کام خود کرتی تھی اور جو بھی احادیث پڑھتی تھی ان پر عمل کرتی تھی پھر دوسری حدیث پڑھتی تھی۔

(۱)۔ میرا سوال مختصر یہ ہے کہ میں آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتی بس اتنا بتا سکتی ہوں جتنا نماز کو اچھا اور خوبصورت بنانا چاہتی ہوں تاکہ میں نماز میں بھولتی ہوں میں اول وقت میں نماز پڑھتی تھی اللہ کی توفیق سے اور اب بھی میری یہی کوشش ہوتی ہے مگر مجھے بیماری لگ گئی ہے کہ پیشاب نکل جاتا ہے وہ بھی صرف قطرہ اور کبھی وہم ہوتا اور ایسا لگتا ہے کہ نکل گیا۔ پوری نماز میں مجھے یقین ہوتا ہے کہ نکل گیا جب دیکھتی ہوں تو بعض دفعہ تو ایک قطرہ ہوتا ہے یا نقطہ بعض دفعہ تو نہیں مگر نماز میں یہی خیال ہوتا ہے کہ نکل گیا نماز پڑھتے ڈرتی ہوں چار رکعت کی نیت کرتی ہوں اور آرام سے تسبیح سے پڑھتی ہوں اور پھر بھول جاتی ہوں کہ کتنی رکعت پڑھی پھر دوبارہ پڑھتی ہوں اور کبھی جلدی ہوں بعض کرنے کی فکر اور جلدی ہوتی تو فوراً نماز پڑھ لوں گی تو یہی خیال ہوتا ہے کہ پہلے پیشاب کر لوں وضو توڑ کیا نماز کو دیر ہو جاتی ہے اور جب حرکت ہو جو ذرا جلدی تو بھول جاتی ہوں کہ کیا پڑھا اور سوچتی ہوں کہ اگلی پڑھوں گی قرآن پڑھوں گی بعض دفعہ تو پڑھ لیتی ہوں اور بعض دفعہ وقت نہیں رہتا اس میں تھک جاتی ہوں جب نماز ختم ہو جاتی ہوں تو تھوڑی دیر ہو جاتی ہے پیشاب رک رک کے آتا ہے بار بار دھوتی ہوں پہلے ہر وقت وضو رہتا تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً (۱)۔ جو شخص جس کو قطرہ ان کی بیماری ہو اور اس کے پیشاب کے قطرے ہر وقت ٹپکتے رہتے ہوں اور اس نماز پڑھنے کے وقت کے بقدر بھی قطروں سے افاقہ نہ ہوتا ہو تو وہ شخص معذور ہوگا اور اگر یہ کیفیت اور حالت نہ ہو بلکہ پوری نماز بغیر قطروں کے نکلنے کے پڑھی جا سکتی ہو تو وہ شخص معذور شمار نہیں ہوگا لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ معذور کے حکم میں نہیں ہیں اس لئے ٹھیک طریقے سے وضو کر کے نماز شروع کریں۔ دوران نماز قطرے گرنے کے جو خیالات آتے رہتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ اپنی نماز پوری کر لیں لیکن اگر قطرے گرنے کا یقین ہو جائے تو پھر نماز توڑ کر وضو کر کے دوبارہ پڑھ لیں۔ بغیر یقین کے محض وہم اور خیال قطروں کے گرنے کے آئیں تو نماز نہ توڑیں بلکہ اپنی نماز کو اسی حالت میں پوری کر لیں۔ رہا نماز میں بھول جانے کا مسئلہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب آپ نماز میں بھول جائیں تو غور و فکر کریں جتنی رکعت پڑھنے کا ظن غالب ہو جائے اسی رکعت سے آگے پڑھ لیں مثلاً دو اور تین رکعت میں اگر ظن غالب تین رکعتوں کا ہے تو تیسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں اور اگر ظن غالب دو رکعتوں کا ہے تو دوسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں۔ اور اگر غور و فکر کے باوجود ظن غالب کسی رکعت کا حاصل نہیں ہوتا تو پھر بنا علی الاقل کریں۔ یعنی مثلاً تین اور چار میں تین رکعت پر اکتفا کرتے مزید ایک رکعت اور ساتھ ملا لیں۔ اور پھر آخر میں سجدہ سہو کر لیں۔

لما فی البخاری (۱/۲۵): عن عباد بن تمیم عن عمه انه شکی الی رسول الله ﷺ الرجل الذی یخیل الیه انه یجد الشیء فی الصلاة فقال لا ینفتل او لا ینصرف حتی یسمع صوتا او یجد ریحا

وفی الدر المختار (۲/۹۲،۹۳،۹۴): (واذا شک) فی صلاته (من لم یکن ذلک) ای الشک (عادة له) وقیل من لم یشک فی صلاة قط بعد بلوغه وعلیه اکثر المشایخ بحر عن الخلاصة (کم صلی استانف) بعمل مناف وبالسلام قاعدا اولی لانه المحلل (وان کثر) شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والا اخذ بالاقل) لتیقنه (وقعد فی کل موضع توهمه موضع قعود) ولو واجبا

لئلا یصیر تارکا فرض القعود او واجبہ (و) اعلم انہ (اذا شغلہ ذلک) الشک فتفکر (قدر اداء رکن ولم یشتغل حالۃ الشک بقراءۃ ولا تسبیح) ذکرہ فی الذخیرۃ (وجب علیہ سجود السھو فی) جمیع (صور الشک) سواء عمل بالتحری او بنی علی الاقل فتح لتاخیر الرکن لکن فی السراج انہ یسجد للسھو فی اخذ الاقل مطلقا وفی غلبۃ الظن ان تفکر قدر رکن۔

(۱۸۸) رکوع وسجود اور سلام میں امام کی متابعت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی قعدہ اولیٰ میں اپنا تشہد پورا کر کے اٹھے گا یا امام کی اطاعت کرتے ہوئے اسکے ساتھ اٹھے گا اسی طرح رکوع اور سجدے میں تسبیحات مکمل کر کے اٹھے یا امام کے ساتھ ہی اٹھ جائے؟ نیز قعدہ اخیرہ میں مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے پہلے ہی امام نے سلام پھیر دیا تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں تین مسئلے ہیں (۱) پہلے مسئلہ میں مقتدی کو چاہئے کہ قعدہ اولیٰ میں اپنا تشہد پورا کر کے کھڑا ہو جائے، اگر تشہد پورا کئے بغیر اٹھ جائے تو یہ بھی جائز ہے لیکن علامہ شامی کی تحقیق کے مطابق اس طرح کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (۲)(۳) دوسرے اور تیسرے مسئلہ میں مقتدی کو چاہئے کہ رکوع اور سجدے کی تسبیحات کو چھوڑ کر اسی طرح درود شریف کو چھوڑ کر امام کی اتباع کرے کیونکہ تسبیحات اور درود شریف نماز میں پڑھنا سنت ہے جبکہ امام کی اتباع واجب ہے چنانچہ امام کی اتباع میں مقتدی کو رکوع وسجدے سے اٹھ جانا اور درود شریف چھوڑ کر امام کے سلام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے۔

لما فی الشامیۃ (۱/۴۷۰): فان عارضہا واجب لاینبغی أن یفوتہ بل یأتی بہ ثم یتابع، کما لو قام الإمام قبل أن یتم المقتدی التشہد فإنہ یتمہ ثم یقوم لان الاتیان بہ لایفوت المتابعۃ بالکلیۃ وانما یؤخرھا، والمتابعۃ مع قطعہ تفوتہ بالکلیۃ، فکان تاخیر أحد الواجبین مع الاتیان بھما اولی من ترک أحدھما بالکلیۃ بخلاف ما اذا عارضہا سنۃ کما رفع الامام قبل تسبیح المقتدی ثلاثا فالاصح انہ یتابعہ لان ترک السنۃ اولی من تاخیر الواجب

(۱۸۹) سجدہ کی حالت میں پیر کی انگلیوں کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن پہلے ہماری مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص ظہر کی سنتیں ادا کر رہا تھا کہ سجدہ کی حالت میں اسکے پاؤں کی انگلیاں اٹھ گئیں، بعد نماز ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کی نماز ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کریں یہ بات ہم نے امام صاحب سے دریافت کی تو وہ ہمیں اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے برائے مہربانی صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً۔ حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ کرنا سنت ہے، دونوں پاؤں زمین سے لگانا واجب ہے اور بالفرض ایک پاؤں کا زمین سے اٹھانا مکروہ تحریمی ہے، دونوں میں سے ایک پاؤں کا کچھ حصہ زمین پر لگانا فرض کہا جاتا ہے ایک انگلی ہی کیوں نہ ہو، اور اگر دونوں پاؤں زمین سے اٹھائے اور تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کی مقدار نہ رکھے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

لما في البحر الرائق (۲/۳۳۰): أو سقوط الثوب عن عورته مع العمد مطلقاً ومع أداء ركن إن لم يتعمد عليه أو بعضه ومع التمكث قدره إن لم يؤد عند أبي حنيفة ومحمد.

وفي الدر المختار (۱/۵۰۰-۵۰۲): (ويفترض وضعها) أداء ركن حقيقة اتفاقاً (أو تمكنه) منه بسنة، وهو قدر ثلاث تسبيحات الخ.

وفي الشامية (۱/۴۷۶): (قوله وقدميه) يجب إسقاطه لأن وضع إصبع واحدة منهما يكفي كما ذكره بعده. ح. وأفاد أنه لو لم يضع شيئاً من القدمين لم يصح السجود وهو مقتضى ما قدمناه أيضاً.

(۱۹۰) دوسرے شخص کا نمازی کو نماز میں یاد دلانا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جن کی عمر بھی زیادہ ہو گئی ہے اور بیماری بھی ہے، اکثر باتیں بھول جاتے ہیں، چونکہ وہ نماز کے بہت پابند ہیں اگر کوئی نماز ایسی حالت میں قضا ہو جائے تو سب پریشان ہوتے ہیں، چنانچہ جب وہ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں تو اکثر رکعت کی تعداد بلکہ بعض دفعہ سجدوں میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں ان کے ساتھ ایک آدمی بیٹھتا ہے جو ان کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ ابھی کھڑے ہو جائیں اور اب بیٹھ جائیں وغیرہ، کیا ایسی صورت میں ان کی نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: خارج صلوٰۃ سے کسی شخص کا نمازی کو یاد دلانے سے نماز درست نہیں ہوتی بلکہ جو شخص تعداد رکعت وغیرہ میں بھی کے بارے میں بھول جاتا ہو اور یہ عارضہ کثرت سے پیش آتا ہو تو ایسے شخص کے لئے حکم یہ ہے کہ ایسا شخص نماز میں غور و فکر کرے اور جس طرف غالب گمان ہو جائے اسی رکن سے نماز پوری کرے اور اگر کسی ایک جانب غالب گمان نہ ہو پائے تو بنا علی الاقل یعنی جو کم رکن ہوا اس سے نماز پوری کرے، مثلاً پہلی یا دوسری رکعت میں شک ہو جائے تو غور و فکر کے بعد اگر غالب گمان یہ ہو کہ دوسری رکعت ہے تو اسی سے نماز جاری رکھے، اور اگر غالب گمان نہ ہو تو پہلی رکعت ہی سمجھے، نیز یہ صورت بھی صحیح ہے کہ اس طرح تسبیح کے دانوں کی تعداد گن کرے اور آخر میں سجدہ سہو کرے۔

لما في الشامية (۱/۶۲۲): (قوله لا إذا سمعه المؤتم الخ) في البحر عن القنية ولو سمعه المؤتم ممن ليس في الصلاة ففتح به على إمامه يجب أن تبطل صلاة الكل لأن التلقين من خارج.

وفي الشامية أيضاً (۲/۹۳): (قوله وإن كثر شكه) بأن عرض له مرتين في عمره على ما عليه أكثرهم أو في صلاته على ما اختاره فخر الإسلام (قوله وإلا) أي وإن لم يغلب على ظنه شيء.

وفیہ ایضا(ص ۹۲): (قولہ سواء عمل بالتحری) ای بان غلب علی ظنہ انہا الرکعۃ الثانیۃ مثلا، (وقولہ او بنی علی الاقل) ای بان لم یغلب علی ظنہ شیٔ واخذ بالاقل

(۱۹۱) فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چار رکعت والی فرض نماز میں کوئی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کوئی فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد سورت ملا لے تو سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا۔

لما فی الھندیۃ(۱/۱۲۶): ولو قرأ فی الاخریین الفاتحۃ والسورۃ لایلزمہ السہو وھو الاصح.

وفی الشامیۃ(۱/۵۱۱): (قولہ ولو زاد ولا بأس) ای لو ضم الیہا سورۃ لابأس بہ لان القراءۃ فی الاخریین مشروعۃ من غیر تقدیر.

(۱۹۲) نمازی کا کسی دوسرے کو سبحان اللہ کہہ کر تنبیہ کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہو تو خارج عن الصلوٰۃ کو تنبیہ کرنے کیلئے "سبحان اللہ" کہتا ہے اس صورت میں اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اگر فاسد ہوتی ہے تو صاحب ہدایہ کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے "او یدفع بالتسبیح لما روینا من قبل" (الہدایہ ۱/۱۴۹)

الجواب حامداً ومصلیاً فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ اگر نمازی نماز میں قرآن کی آیت یا لا الٰہ الا اللہ یا سبحان اللہ یا الحمد للہ وغیرہ کسی کو جواب دینے کی نیت سے پڑھے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد ہونے کی ہے، اور اگر کوئی نمازی مذکورہ کلمات بطور اعلام (کہ میں نماز میں ہوں) یا امام دوران نماز قرأت وغیرہ میں غلطی کرے اور مقتدی نے یہ کلمات پڑھے تو نماز فاسد نہ ہوگی اگرچہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نماز فاسد ہوجائے لیکن یہاں پر حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا ہے۔ اور یہی مقصد صاحب ہدایہ کی اس عبارت کا ہے۔

لما فی البخاری(۱/۹۲، ۱۶۵، ۳۷۰): من نابہ شیٔ فی صلاتہ فلیقل سبحان اللہ.

وفی الھدایۃ(۱/۱۳۸): (فلو اجاب فی الصلوٰۃ رجلا بلا الٰہ الا اللہ فہذا کلام مفسد عند ابی حنیفۃ ومحمدؒ وقال ابو یوسفؒ لایکون مفسدا) وھذا الخلاف فیما اذا اراد بہ جوابہ لہ انہ ثناء بصیغتہ فلا یتغیر بعزیمتہ ولھما انہ اخرج الکلام مخرج الجواب وھو یحتملہ فیجعل جوابا کالتشمیت والاسترجاع علی الخلاف فی الصحیح وان اراد بہ اعلامہ انہ فی الصلوٰۃ لم تفسد بالاجماع) لقولہ

علیه السلام اذا نابت احدکم نائبة فی الصلوٰۃ فلیسبح

وفی الدر المختار (۱/۶۲۲،۶۲۱): (وجواب خبر) سوء (بالاسترجاع علی المذهب) لانه بقصد الجواب صار ککلام الناس (وکذا) یفسدها (کل ما قصد به الجواب) کأن قیل أمع الله إله فقال لا إله إلا الله (او الخطاب ک) قوله لمن اسمه یحیی أو موسی (یا یحیی خذ الکتاب بقوة) او (وما تلک بیمینک یا موسی) (مخاطبا لمن اسمه ذلک) الخ.

وقال فی الشامیة (۱/۶۲۲): واحترز بقصد الجواب عما لو سبح لمن استأذنه فی الدخول علی قصد اعلامه أنه فی الصلاة کما یأتی او سبح لتنبیه امامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما الا انه خارج عن القیاس بالحدیث الصحیح (اذا نابت أحدکم نائبة وهو فی الصلاة فلیسبح)

(۱۹۳) امام کے پیچھے نیت میں غلطی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک صاحب نے ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے ظہر کی جگہ عصر کی نماز کی نیت کر لی تو کیا ان کی نماز صحیح ہوئی؟ اگر صحیح ہوئی تو ظہر کی ہوئی یا عصر کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جس شخص نے امام کے پیچھے ظہر کے بجائے عصر کی نیت کی تو نہ ظہر ادا ہوئی نہ عصر، البتہ اگر مقتدی کے دل میں نیت ظہر ہی کی تھی لیکن غلطی سے زبان سے عصر کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں ظہر کی نماز ادا ہوگی۔

لما فی الهندیة (۱/۸۶): لا یصح اقتداء مصلی الظهر بمصلی العصر

وفی الشامیة (۱/۴۲۵): (قوله ومفترض فرضا آخر) سواء تغایر الفرضان اسما او صفة کمصلی ظهر امس بمصلی ظهر الیوم.

وفی الدر المختار (۱/۴۱۵): فلا عبرة للذکر باللسان ان خالف القلب لانه کلام لا نیة

وقال الشامی رحمه الله تعالی تحته: (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهوا اجزأه۔

(۱۹۴) عمداً واجب کو ترک کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میری والدہ محترمہ عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں کہ بھول کر پہلی رکعت میں التحیات پر بیٹھ گئیں اور التحیات پوری پڑھنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ یہ تو پہلی رکعت ہے تو فوراً کھڑی ہو گئیں۔ اور دوسری رکعت میں التحیات پر نہیں بیٹھیں اور آخری رکعت میں التحیات پڑھ کر سجدہ سہو کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ کر بتایا کیا اس طرح میری نماز ہو گئی ہے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ دوسری رکعت میں بھی التحیات میں بیٹھنا چاہیے تھا تو ان کہنے لگیں کہ وہ تو میں پہلی رکعت

تب پڑھ چکی تھی اسلئے نہیں بیٹھی۔ لیکن آخر میں سجدہ سہو تو کرلیا ہے۔ کیا میری نماز ہوگئی۔ تو میں نے انہی سے کہا کہ میں اپنے مدرسے میں مفتی صاحب سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔ اب آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس صورت میں میری والدہ کی نماز درست ہے یا دوبارہ ادا کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کی والدہ پہلی رکعت کے بعد بیٹھ گئی تھیں جس سے تاخیر رکن لازم آیا اور دوسری رکعت کے بعد بھی بیٹھی تھیں اور تشہد پڑھ لیتیں تو سہواً تاخیر رکن کی وجہ سے سجدہ سہو کر لینے سے نماز درست ہو جاتی لیکن چونکہ انہوں نے قعدہ اولیٰ قصداً ترک کر دیا اور واجب کو قصداً ترک کرنے سے تو صرف سجدہ سہو کر لینا کافی نہیں بلکہ اعادہ صلوٰۃ (نماز کا لوٹانا) واجب ہے لہٰذا آپ کی والدہ پر اس نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے۔

لما في الهندية (١/١٢٦) وفي الولوالجية: الأصل في هذا أن المتروك ثلاثة أنواع فرض وسنة وواجب وفي الثالث ان ترك ساهياً يجبر بسجدتي السهو وإن ترك عامداً لا كذا في التتارخانية وظاهر كلام الجم الغفير أنه لا يجب السجود في العمد وإنما تجب الإعادة جبراً لنقصانه. كذا في البحر الرائق.

وفي البحر الرائق (٢/١٠٦) وظاهر كلام الجم الغفير أنه لا يجب السجود في العمد وإنما تجب الإعادة إذا ترك واجباً عمداً جبراً لنقصانه، وذكر الولوالجي في فتاواه أن الواجب إذا تركه عمداً لا يجبر بسجدتي السهو لأنها عرفت جابرة بالشرع والشرع ورد حالة السهو وجعلها مثلاً لهذا الفائت لا فوقه

وفي الشامية (٢/٤٩٧) ولو بنى على الفرض تطوعاً وقد سها في الفرض لا يسجد اهـ لأن النفل صلاة أخرى غير الفرض ولا يمكن أن يكون سجود السهو لصلاة واقعاً في صلاة أخرى مقصودة وإن كانت تحريمة الفرض باقية فلذا لا يسجد. أو لأنه لما بنى النفل عمداً صار مؤخراً للسلام عن محله عمداً. والعمد لا يجبره سجود السهو بل تلزم فيه الإعادة، وحيث كانت الإعادة واجبة لم يبق السجود واجباً عن سهوه في الفرض لأنه بالإعادة يأتي بما سها فيه، والسجود جابر عما فات فقام مقام الإعادة، فإذا وجبت الإعادة سقط السجود.

(۱۹۵) امام نے پانچ رکعت پڑھیں اعادہ نماز کے وقت دیگر لوگ شامل ہوگئے انکی نماز کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مولوی صاحب نے عصر کی نماز چار رکعات کی بجائے پانچ رکعت پڑھائیں اور قعدہ اخیرہ میں نہیں بیٹھے تھے۔ سلام کے بعد مقتدیوں نے یاد دلایا کہ پانچ رکعتیں ہوگئیں جبکہ مولوی صاحب نے نماز دوبارہ لوٹادی اور دوسری جماعت کے بعد یہ اعلان کیا کہ جو حضرات پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے وہ دوبارہ نماز دھرائیں۔ ان کی نماز نہیں ہوئی۔ کیا ان کا یہ اعلان کرنا درست ہے یا نہیں۔ اگر درست ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ تفصیلاً جواب

(قوله والا) ای وان لم یکونوا معینین کلهم او بعضهم لا یلزمه.

(۱۹۸) پہلے سے نماز میں شامل فرد کا امام کے رکوع کے بعد رکوع کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں رمضان المبارک میں وتر کی نماز پڑھا رہا تھا تو آخری رکعت میں بجائے قنوت کے میں تکبیر کہہ کر رکوع میں چلا گیا، مقتدیوں نے لقمہ دیا، میں نے نہیں لیا چونکہ میں رکوع میں پہنچ گیا تھا، بعد میں چند مقتدی تو میرے ساتھ رکوع میں شامل ہو گئے اور بعض نے میرے اٹھنے کے بعد رکوع کیا۔ میں نے سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی، اب جن حضرات نے میرے بعد رکوع کیا ہے، ان کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں جن مقتدیوں نے امام کے ساتھ رکوع نہیں کیا بلکہ امام کے بعد کر لیا ہے، تو ان کی نماز بھی درست ہوگی، ایسے لوگ لاحق کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔

لما فی الهندیة (۱/۱۲۰): "اجمعوا انه لو انتهى الى الامام وهو قائم فكبر ولم يركع مع الامام حتى ركع الامام، ثم ركع انه يصير مدركا لتلك الركعة."

وفی الشامیة (۱/۵۹۳): قال فی الدر المختار: (واللاحق من فاتته) الركعات (كلها او بعضها) لكن (بعد اقتدائه) بعذر كغفلة وزحمة ... وكذا بلا عذر ... ويبدأ بقضاء ما فاته عكس المسبوق ثم يتابع امامه ان امكنه ادراكه والا تابعه.

وقال فی الشامی (ص ۵۹۵): وحق التعبير ان يقول: ويبدأ بقضاء ما فاته بلا قراءة عكس المسبوق ثم يتابع امامه ان ادركه ثم ما سبق به

وفیه ایضاً (۱/۴۷۰، ۴۷۱): "والحاصل ان متابعة الامام فی الفرائض والواجبات من غير تاخير واجبة فان عارضها واجب لا ينبغي ان يفوته بل ياتي به ثم يتابع ... نعم تكون المتابعة فرضاً بمعنى ان ياتي بالفرض مع امامه او بعده، كما لو ركع امامه فركع معه مقارناً او معاقباً او شاركه فيه او بعد ما رفع منه، فلو لم يركع اصلاً او ركع ورفع قبل ان يركع امامه ولم يعده معه او بعده بطلت صلاته.

(۱۹۹) نماز پڑھتے ہوئے کسی کی آمد پر دروازہ کھولنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کسی کا انتظار کر رہا ہو اور اسے نماز بھی پڑھنی ہے تو وہ نماز شروع کر دیتا ہے اب نماز کے دوران آنے والا آ جاتا ہے تو یہ نمازی کیا کرے، کیا نماز توڑ کر دروازہ کھولنا چاہئے یا اگر دروازے کے قریب ہی ہے تو وہ بغیر نیت توڑے جا کر دروازہ کھول دے، پھر نماز پوری کرے، کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں جب تھیلی کو جسم سے جدا کرنا ممکن نہیں اور حرج لازم آتا ہے تو اسی لگی ہوئی تھیلی کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں تاہم نماز سے پہلے اس کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے کیونکہ عذر کی وجہ سے نجاست کو معاف قرار دیا گیا ہے اور عذر میں نجاست کو جس قدر کم کرنا ممکن ہو تو وہ ضروری ہے۔

لما في الدر المختار (۱/۳۰۴): وكذا مريض لا يبسط ثوبه الا تنجس فوراً له تركه.

وفي الدر المختار (۱/۳۰۵): يجب رد عذره او تقليله بقدر قدرته

(۲۰۳) گندگی اور نجاست کا جیب میں موجود ہونا اور اسی حالت میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کچھ عرصہ پہلے بیمار ہو گیا ڈاکٹر نے کہا کہ کل صبح جب تمہیں سب سے پہلا ہو تو اسی وقت پیشاب ایک بوتل میں لے آنا تاکہ ٹیسٹ کر کے بیماری کا پتہ چلایا جا سکے تو میں نے شیشی میں پیشاب لے کر بند کر دیا اور پھر جیب میں ڈال کر ہسپتال آیا لیکن کافی رش ہو گیا اتنے میں ظہر کا وقت ہو گیا میں نے نماز ظہر پڑھ لی اور پیشاب والی شیشی میری جیب میں تھی کیا میری نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً کسی نجاست اور گندگی کا اپنی جائے پیدائش اور محل میں موجود ہونے سے اس کو اپنے محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار نہیں کیا جاتا ہے جیسے کہ دوران نماز جیب میں انڈا ہو جس کی زردی خون میں تبدیل ہو گیا ہو تو اس کی موجودگی میں نماز درست ہو جاتی ہے اور اگر وہ نجاست اپنے محل اور جگہ میں نہ ہو تو اس نجاست کو اپنے محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے جیسا کہ دوران نماز جیب میں شیشی ہو اور اس میں خون یا شراب وغیرہ ہو تو اس شیشی کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے اس نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا۔ مذکورہ مسئلہ میں جیب میں پیشاب والی شیشی کی موجودگی میں نماز ادا نہیں ہوئی لہذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری ہے۔

لما في التاتارخانية (۱/۴۰۲): وهذه المسائل ينبني على اصل ان الحيوانات التي لا تعيش الا في الماء، فالماء معدن هذه الحيوانات ومكانها والشيء في معدنه ومكانه لا يعطى له حكم النجاسة، الا ترى ان الرجل اذا صلى وفي كمه بيضة حال محها دماً فصلاته جائزة، ولو صلى وفي كمه قارورة بول لا يجوز.

وفي الهندية (۱/۴۶): اذا صلى وفي كمه بيضة مذرة قد حال محها دماً جازت صلاته وكذا البيضة التي فيها فرخ ميت كذا في فتاوى قاضيخان.

وحمل صبي وفي كمه قارورة فيها بول لا تجوز الصلوة سواء كانت ممتلئة او لم تكن، لان هذا ليس في مظانه ومعدنه بخلاف البيضة المذرة لانه في معدنه ومظانه وعليه الفتوى.

وفي الشامية (۱/۴۰۳): ونجاسة باطنه في معدنها فلا يظهر حكمها كنجاسة باطن المصلي. كما لو

مصلي حاملا بيضة مذرة صار محها دما جازت لأنه في معدنه، والشيء مادام في معدنه لايعطى له حكم النجاسة، بخلاف مالو حمل قارورة مضمومة فيها بول فلا تجوز صلاته لأنه في غير معدنه كذا في البحر عن المحيط.

(۲۰۳) امام کے بھول جانے پر لقمہ دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے ایک مسجد میں نماز پڑھی اور نماز میں امام صاحب قراءت میں بھول گئے اب نہ تو پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی رکوع کرتے تھے تو میں نے لقمہ دیا، پھر امام صاحب نماز مکمل کرنے کے بعد مجھ پر غصہ ہوئے اور مجھ سے کہا کہ تم اپنی نماز کا اعادہ کرو تمہاری نماز فاسد ہوگئی ہے۔ قریب میں ایک اور صاحب بھی کھڑے تھے جو بظاہر عالم لگتے تھے انہوں نے کہا کہ نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لقمہ دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن امام صاحب ماننے کو تیار نہیں۔ اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ امام صاحب کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟ کیا میرے لئے نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے یا نماز ادا ہوگئی نیز نماز میں امام کو لقمہ دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً... جب امام نماز پڑھاتے ہوئے قراءت میں بھول جائے اور مقتدی لقمہ دے تو مقتدی کے لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا مقتدی سے یہ کہنا کہ وہ نماز کا اعادہ کرے درست نہیں، بلکہ دونوں کی نماز ادا ہوگئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ بلا ضرورت امام کو لقمہ نہ دیں۔ ہاں اگر نماز کے فساد کا اندیشہ ہو یا امام دوران قراءت بالکل رک جائے اور رکوع میں بھی نہ جاتا ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں تو لقمہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اور امام صاحب کو بھی چاہئے کہ وہ مقتدیوں کو لقمہ دینے کا موقع نہ دیں، دوران نماز ان سورتوں کی قراءت کریں جو اچھی طرح یاد ہوں اور اگر امام قراءت میں بھول جائے اور اتنی مقدار قراءت کر لی ہے کہ جس سے نماز ادا ہو جائے تو رکوع کر لینا چاہئے۔

لما في الهداية (١/٩٦،٩٧): وإن فتح على امامه لم يكن كلاما استحسانا لأنه مضطر إلى اصلاح صلاته فكان هذا من اعمال صلاته معنى وينوي الفتح على امامه دون القراءة هو الصحيح لأنه مرخص فيه وقراءته ممنوع عنها.

وفي الهندية (١/٩٩): وإن اراد القراءة تحول لفتح عليه تفسد صلاة الفاتح والصحيح انها لا تفسد صلاة الفاتح بكل حال ولا صلاة الامام لو اخذ منه على الصحيح، هكذا في الكافي.

وفي الدر المختار مع رد المحتار (١/٦٢٢): (بخلاف فتحه على امامه) فانه لا يفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بكل حال.

قال الشامي رحمه الله: (قوله مطلقا) فسره بما بعده (قوله بكل حال) اي سواء قرأ الامام قدر ما

تجوز به الصلاة أم لا انتقل الی آیة اخری ام لا تکرر الفتح او لا هو الاصح.

(۲۰۴) مقتدی اگر نماز میں اللہ اکبر کہہ دے تو اس کی نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مسجد میں عصر کی نماز پڑھی امام جب دوسری رکعت میں بھی کھڑے ہو گئے تو پیچھے سے ایک شخص نے آواز دی "اللہ اکبر" بعد میں جب امام نے سلام پھیرا، تو کہا کہ جس شخص نے آواز دی تھی وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ یہ کہاں تک درست ہے تفصیل سے جواب مطلوب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر امام سے نماز میں سہو ہو جائے مثلاً چار رکعت یا تین رکعت والی نماز میں امام دوسری رکعت میں ہی کھڑا ہو جائے اور مقتدی پیچھے سے اصلاحِ نماز کیلئے تسبیح پڑھتا ہے تو اس صورت میں مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی بلکہ یہی صورت آپ کے اس مسئلہ میں ہے کہ امام صاحب دوسری رکعت میں قعدہ کئے بغیر کھڑے ہو گئے مقتدی نے پیچھے سے اللہ اکبر کہا تو اس سے مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوئی لہٰذا دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

لما في البخاري (۱/۹۴): فقال رسول اللہ ﷺ مالي رأيتكم أكثرتم التصفيق من نابه شيء في صلوته فليسبح فانه اذا سبح التفت اليه وانما التصفيق للنساء.

وفي الهندية (۱/۹۹): ولو عرض للامام شيء فسبح المأموم لا بأس به لان القصد به اصلاح الصلوة ولا يسبح للامام اذا قام الى الاخريين لانه لا يجوز له الرجوع اذا كان الى القيام اقرب فلم يكن التسبيح مفيداً.

وفي الشامية (۱/۶۲۲): لو سبح لمن استاذنه في الدخول على قصد اعلامه انه في الصلوة كما يأتي او سبح لتنبيه امامه فانه وان لزم تغييره بالنية عندهما الا انه خارج عن القياس بالحديث الصحيح واذا نابت احدكم نائبة وهو في الصلوة فليسبح.

(۲۰۵) پہلے بائیں طرف سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے پہلے بائیں طرف سلام پھیرا۔ کیا اب میں بہت پریشان ہوں کہ میری وہ نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سلام پھیرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں طرف سلام پھیرا جائے پھر بائیں طرف اور اگر کسی نے بھول کر پہلے بائیں طرف سلام پھیر دیا [illegible] دوبارہ دائیں طرف سلام پھیرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم قصداً ایسا کرنا [illegible] عادت بنالینا خلافِ سنت ہے۔

(۲۰۷) مکہ مکرمہ میں زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جب میں عمرہ کے لیے گیا تھا وہاں کوئی ایسا وقت نہیں جاتا تھا کہ نماز نہ پڑھتے ہوئے دیکھا گیا جیسے ہمارے یہاں زوال کا وقت ہے لیکن وہاں پر ان کے کسی بھی نماز کے نقشے میں زوال کا وقت نہیں ہے، اب ہم وہاں پر زوال کا وقت کس طرح معلوم کریں یا وہاں پر زوال کا وقت نہیں ہوتا۔

الجواب حامداً ومصلیاً: سورج جب بالکل آسمان کے بیچ میں آجائے تو اس وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ زوال ہو جائے اور یہ حکم احناف کے نزدیک عام ہے تمام نمازوں کیلئے اور تمام مقامات کیلئے لیکن دیگر ائمہ کرام اس حکم سے چند نمازوں کا استثناء کرتے ہیں مثلاً فرض نمازوں کی قضا کرنا، طواف کی دو رکعت پڑھنا اور نذر کی نماز وغیرہ اور اسی طرح شوافع مکہ مکرمہ کی تخصیص بھی کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں اوقات مکروہہ میں نوافل بھی پڑھنا جائز ہے اس لیے لوگ وہاں اس وقت میں بھی نماز پڑھتے ہیں البتہ ہمارے نزدیک مکہ مکرمہ میں بھی اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں اور اس کے تعین کا طریقہ یہ ہے کہ وقت زوال طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کے کل وقت کا نصف ہے اس سے پانچ منٹ پہلے اور پانچ منٹ بعد تک نماز نہ پڑھے تا کہ مکروہ وقت نکل جائے۔

لما في الجامع للترمذي (۱/۲۰۰): عن عقبة بن عامر الجهني قال ثلاث ساعات كان رسول الله ﷺ ينهانا أن نصلي فيهن أو نقبر فيهن موتانا حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل وحين تضيف للغروب حتى تغرب.

وفي عمدة القاري (۵/۷۷، ۸۰): احتج به أبو حنيفة على انه يكره أن يتنفل بعد صلاة الفجر حتى تطلع الشمس وبعد صلاة العصر حتى تغرب الشمس... وزعم ابن العربي أن الصلاة في هذين الوقتين تؤدى فيهما فريضة دون النافلة عند مالك وعند الشافعي تؤدى فيهما الفريضة والنافلة التي لها سبب ومذهب آخر لا يصلى فيهما بحال لا فريضة ولا نافلة ومذهب آخر تجوز بمكة دون غيرها وزعم الشافعي في كتاب اختلاف الحديث وذكر الصلاة التي لها سبب وعددها ثم قال وهذه الصلاة واشباهها تصلى في هذه الأوقات بالدلالة عن رسول الله ﷺ حيث قال من نسي صلاة فليصلها اذا ذكرها وصلى ركعتين كان يصليهما بعد الظهر شغل عنهما بعد العصر وامر أن لا يمنع احد طاف بالبيت أي ساعة شاء، والاستثناء الوارد في حديث عقبة الا بمكة وله في الجمعة حديث أبي سعيد انه ﷺ نهى عن الصلاة في نصف النهار الا يوم الجمعة...... الخ.

وفي الشامية (۱/۳۵۹): (ووقت الظهر من زواله أي ميل ذكاء عن كبد السماء) أي وسطها بحسب ما يظهر لنا.

وفی الشامیۃ (۱/۳۷۴): وقد قال أصحابنا: ان الصلاۃ فی هذه الاوقات ممنوع منها بمکۃ وغیرها اھ۔ ورأیت فی البدائع ایضاً مانصه: ما ورد من النهی إلا بمکۃ شاذ لا یقبل فی معارضۃ المشهور، وکذا روایۃ استثناء یوم الجمعۃ غریب فلا یجوز تخصیص المشهور به اھ۔

(۲۰۸) دوسورتوں کے درمیان سورت چھوڑنے کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ خامسہ میں پڑھتا ہوں ہمارے استادوں نے مسئلہ بیان کیا جب آدمی ایک سورت پڑھے تو اس کے بعد ایک سورت چھوڑ کر دوسری سورت شروع نہ کرے یعنی درمیان میں ایک سورت کا فرق نہ کرے۔ یہ مسئلہ میرے ذہن پر نہیں لگتا کہ پڑھتا تو قرآن ہی ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے معاذ اللہ جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو پھر دوسری سورت چھوڑ کر تیسری پڑھتا ہے قرآن ہی تو پڑھتا ہے کوئی ناجائز کام تو نہیں کرتا پھر منع کیوں؟ پھر بڑی اور چھوٹی سورتوں میں کوئی فرق ہے مثلاً بقرہ پڑھ کر سورہ نساء پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر فرق ہے تو کتنی آیت والی سورت پڑھ سکتا ہے کتنی والی نہیں پڑھ سکتا۔ میں اس مسئلہ کے بارے میں کافی پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر ضرور ایسا حل عنایت فرمائیں کہ میرے تردد کو دور کردے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً... صورت مسئولہ میں بعض حضرات کے نزدیک مطلقاً کراہت نہیں ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ترتیب سے پڑھے اور درمیان میں کوئی سورت نہ چھوڑے۔

لما فی المحیط البرهانی (۲/۷۴): وأما فی رکعتین فإن کان بینهما سور لا یکره وإن کان بینهما سورة واحدة هل یکره؟ اختلف المشائخ فیه قال بعضهم یکره وقال بعضهم ان کانت السورة طویلة لا یکره وقال بعضهم لایکره أصلاً.

وفی مراقی الفلاح (ص ۲۸): (و) یکره (فصله بسورة بین سورتین قرأهما فی رکعتین) لمافیه من شبهة التفضیل والهجر وقال بعضهم لا یکره إذا کانت السورة طویلة کما لو کان بینهما سورتان قصیرتان.

وفی الهندیة (۱/۷۸): وأما فی رکعتین إن کان بینهما سور لا یکره وإن کان بینهما سورة واحدة قال بعضهم یکره وقال بعضهم إن کانت السورة طویلة لا یکره هکذا فی المحیط کما اذا کان بینهما سورتان قصیرتان کذا فی الخلاصة، وقال بعضهم لایکره أصلاً.

وفی الشامیة (۱/۵۴۶): (قوله ویکره الفصل بسورة قصیرة) أما بسورة طویلة بحیث یلزم منه إطالة الرکعة الثانیة إطالة کثیرة فلایکره شرح المنیة کما اذا کانت سورتان قصیرتان وهذا لو فی رکعتین

اما في ركعة فيكره الجمع بين سورتين بينهما سور أو سورة فتح.

(٢٠٩) کیا دورانِ نماز انگڑائی لینے سے نماز ہو جائے گی؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام یا مقتدی نماز میں انگڑائی اور جمائی ترجیحات کے ساتھ لیں تو ان کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں نماز میں انگڑائی اور جمائی لینا ویسے بھی مکروہ ہے اس لئے اس کو حتی الامکان دفع کیا جائے اور اگر اتنی زیادہ ہو جائے کہ عمل کثیر بن جائے تو اس وقت نماز فاسد ہو جائے گی۔

لما في الخلاصة الفتاوى (١/١٢٥): وقوله اذا تثاوب احدكم في الصلاة فليكظم فانه دليل علمه انه لا يباح في غير تلك الحالة وهذا اذا كان بحال لايمكنه الامتناع عن التثاوب اما اذا امكنه ان يأخذ شفتيه باسنانه فلم يفعل وغطى فاه بيده او بثوبه يكره.

وفي الهندية (١/١٠٧): ويكره التثلم وهو تغطية الانف والفم في الصلاة والتثاوب فان غلبه فليكظم ما استطاع فان غلبه وضع يده او كمه على فيه.

وفي الهندية (١/١٠٢): انه لو نظر اليه ناظر من بعيد ان كان لا يشك انه في غير الصلاة فهو كثير مفسد وان شك فليس بمفسد وهذا هو الاصح هكذا في التبيين وهو احسن كذا في محيط السرخسي وهو اختيار العامة

(٢١٠) پینٹ شرٹ میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے لوگ جدت کی طرف مائل ہیں حتی کہ لباس میں بھی جدت ہے شہروں میں لوگ پینٹ شرٹ پہنتے ہیں اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھتے ہیں تو کیا پینٹ شرٹ پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً پینٹ اگر چست ہونے کی بناء پر کل اعضاء کو ظاہر کرتی ہے تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اگر چست اور باریک نہ ہو اور پانچ ٹخنوں سے نیچے نہ ہوں تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے مگر نیک مسلمان کو صلحاء کا لباس ہی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ یہ فیشن ہے۔

لما في الدر المختار (١/٤٠٩،٤١٠): (والشرط سترها عن غيره) ولو حكماً كمكان مظلم (لا) سترها (عن نفسه) به يفتى فلو رآها من زيقه لم تفسد وان كره (وعادم ساتر) لا يصف مالحته ولا

یضر التصاقہ وتشکلہ ــــ (ص ۱۱۳) (یصلی قاعداً)

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ ولا یضر التصاقہ) ای بالالیۃ مثلا وقولہ وتشکلہ من عطف المسبب علی السبب وعبارۃ الشرح المنیۃ اما لو کان غلیظاً لایری منہ لون البشرۃ الا انہ التصق بالعضو وتشکل بشکلہ فصار شکل العضو مرئیاً فینبغی ان لا یمنع جواز الصلوۃ لحصول الستر. اھ

(۲۱۱) دورانِ نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ دوران نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا کیسا ہے اور نماز کے علاوہ عام حالت میں نیچے رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ آیا شلوار کو اوپر سے اور پینٹ کو نیچے سے فولڈ کرنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور پینٹ کو باہر کی طرف فولڈ کریں یا اندر کی طرف؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ مردوں کیلئے شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا جائز نہیں۔ خواہ نماز کی حالت ہو یا نماز کے علاوہ۔ احادیث میں شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھنے والوں سے متعلق بہت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ لہٰذا مردوں کو چاہئے کہ وہ اپنی شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے اوپر رکھیں خواہ اوپر سے فولڈ کریں یا نیچے سے، باہر کی طرف کریں یا اندر کی طرف دونوں طرح درست ہے۔ اور یہ حکم نماز اور خارج نماز دونوں کیلئے ہے۔

لما فی صحیح البخاری (۸۶۱/۲): عن ابی ھریرۃ (رضی اللہ عنہ) عن النبی ﷺ قال ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار.

وفی تکملۃ فتح الملھم (۱۲۳/۴): والحاصل عند ھذا العبد الضعیف عفا اللہ عنہ۔ ان العلۃ الاصلیۃ من وراء تحریم الاسبال ھی الخیلاء کما صرح بہ رسول اللہ ﷺ فی حدیث الباب ولکن تحقق الخیلاء امر مخفی ربما لا یطلع علیہ من ابتلی بہ فاقیم سببہ مقام العلۃ وھو الاسبال الی ان قال. کلما تحقق الاسبال تحت الکعبین جاء المنع الا فی غیر حالۃ الاختیار فان انتفاء الخیلاء فی ذلک متیقن.

(۲۱۲) محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر امام محراب کے اندر کھڑا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے صحیح ہے یا نہیں؟

(۲)۔ نماز کتنے سال میں فرض ہوتی ہے اس میں مرد وعورت کا کوئی فرق ہے یا نہیں؟

(۳) میں ۱۷ سال کی عمر سے نماز پڑھ رہا ہوں کیا میرے اوپر قضائے عمری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اصل حکم یہ ہے کہ دورانِ امامت امام ایسی جگہ کھڑا ہو کہ صف کی دونوں طرفیں برابر ہوں۔ اور اکثر محراب جو ستونوں کے درمیان میں بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور محراب مسجد ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔ امام کو عام حالات میں محراب سے باہر ہی کھڑے ہو کر نماز پڑھانی چاہیے اور اگر ضرورت ہو جیسے جمعہ کے دن میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو محراب کے اندر بھی امام کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا خلافِ اولیٰ ہے، بہرصورت ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے۔

(۲) مرد اور عورت جب پندرہ سال کے ہو جائیں اگرچہ ان میں بلوغت کی علامات (مثلاً مرد میں احتلام کا ہو جانا، عورت کو حاملہ کر دینا، اور بیداری کی حالت میں انزال ہونا اور لڑکی میں حیض کا آنا، احتلام کا ہونا، حاملہ ہونا) نہ پائی جائیں تو پندرہ سال کی عمر میں ان پر نماز فرض ہو جاتی ہے اور اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے یا لڑکی میں مذکورہ علامات ظاہر ہو گئیں تو جس وقت بلوغت کی علامت ظاہر ہوگی اس وقت سے ان پر نماز فرض ہو جائے گی۔

(۳) نماز کے فرض ہونے کیلئے بلوغت شرط ہے اور لڑکے کے بالغ ہونے کی کم سے کم عمر ۱۲ سال ہے اور زیادہ سے زیادہ عمر ۱۵ سال ہے۔ اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے میں بلوغت کی علامات ظاہر ہو جائیں تو اسی وقت سے نماز فرض ہو جاتی ہے لہٰذا اگر بالغ ہونے کے بعد آپ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی تو آپ پر قضاء عمری نہیں ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده في الطاق وهو المحراب ولا يكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا في التبيين، واذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلا بأس بان يقوم في الطاق كذا في فتاوى البرهانية.

وفي الشامية (۱/۶۴۳): وحكى الحلواني عن ابي الليث: لا يكره قيام الامام في الطاق عند الضرورة بأن ضاق المسجد على القوم.

وفي الدر المختار (۶/۱۵۳، ۱۵۴): (بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال) والاصل هو الانزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الانزال صريحا لانه قلما يعلم منها (فان لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي) لقصر أعمار أهل زماننا
وفي الشامية تحته: (قوله به يفتى) هذا عندهما وهو رواية عن الامام وبه قالت الائمة الثلاثة (وأدنى مدته له اثنتا عشرة سنة ولها تسع سنين) هو المختار كما في أحكام الصغار.

(۲۱۳) آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو

حالت میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں بھی کیا نماز میں کراہت آئے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ لیکن اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں نماز میں کراہت نہیں آئے گی۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ آستینوں کو کلائیوں سے بھی اوپر نہ چڑھایا جائے۔

لما فی الدر المختار (۱/ ۶۴۰): (و) کره (کفه) ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم أو ذیل.

وفی الشامیة تحته: (قوله کمشمر کم أو ذیل) ای کما لو دخل فی الصلوة وهو مشمر کمه أو ذیله واشار بذلک الی ان الکراهة لاتختص بالکف وهو فی الصلوة کما افاده فی شرح المنیة لکن قال فی القنیة واختلف فیمن صلی وقد شمر کمیه لعمل کان یعمله قبل الصلوة او هیئته ذالک ومثله مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراک الرکعة مع الامام. واذا دخل فی الصلوة کذالک وقلنا بالکراهة فهل الأفضل ارخاء کمیه فیها بعمل قلیل اوترکهما؟ لم اره والاظهر الاول بدلیل قوله الاتی ولو سقطت قلنسوته فاعادتها افضل تامل هذا وقید الکراهة فی الخلاصة والمنیة بان یکون رافعا کمیه الی المرفقین وظاهره انه لایکره الی مادونهما قال فی البحر والظاهر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوه فی الحلیة وکذا قال فی شرح المنیة الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی. قال: وهذا لو شمرهما خارج الصلوة ثم شرع فیها کذالک امالو شمر وهو فیها تفسد لانه عمل کثیر

(۲۱۴) نماز میں کہنیوں کو کھلا رکھنے اور مچھروں کی وجہ سے ٹخنے ڈھانپنے کا حکم

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران نماز کہنیوں کو کھلا رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص مچھروں سے بچاؤ کے لئے اپنے ٹخنوں کو ڈھانپے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح نماز کیلئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس حد تک؟ مدلل طور پر جواب دے کر مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ نماز کے دوران کہنیوں کا ڈھانپنا سنت ہے اور ان کو کھلا رکھنا مکروہ ہے۔ مچھروں سے [illegible] وغیرہ کا کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں کیونکہ احادیث میں اس کے بارے میں بہت سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ البتہ مچھروں سے بچنے کے لئے جرابوں وغیرہ کا استعمال کریں۔

نماز کے درست ہونے کیلئے کپڑوں کا مکمل پاک ہونا ضروری ہے البتہ اگر کسی شخص نے نماز پڑھی اور اس کے کپڑوں میں نجاست قلیلہ

(مثلاً پیشاب، منی، پاخانہ، شراب وغیرہ) لگی ہوئی تھی، اب اس نجاست کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ نجاست ایک درہم کی مقدار یا اس سے کم تھی تو نماز ہوگئی ہاں اگر ایک درہم یا ایک درہم سے زیادہ تھی تو نماز درست نہ ہوگی، اور اگر کپڑے پر نجاست خفیفہ (مثلاً ان جانوروں کا پیشاب جن کا گوشت کھایا جاتا ہے گائے، بکری، بھینس وغیرہ) لگی ہوئی تھی اگر اس نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی سے کم تھی تو نماز ہوگئی اگر زیادہ تھی تو نماز درست نہ ہوئی۔

لما في مشكوة المصابيح (١/٢٤٣): عن النبي ﷺ قال: ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر إليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم قال أبو ذر: خابوا وخسروا من هم؟ يا رسول الله! قال: المسبل، والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب.

وفي مراقي الفلاح (ص٢٠٧،٢٠٨): (و) منها (طهارة الجسد والثوب والمكان) الذي يصلي عليه (من نجس غير معفو عنه) وتقدم بيانه

وفيه أيضاً (ص١٥٦،١٥٧): ولما بين القسمين بين القدر المعفو عنه فقال (وعفي قدر الدرهم) وزنا في المتجسدة وهو عشرون قيراطا ومساحة في المائعة وهو قدر مقعر الكف داخل مفاصل الأصابع كما وفقه الهندواني، وهو الصحيح فذلك عفو (من) النجاسة (المغلظة) فلا يعفى عنها إذا زادت على الدرهم مع القدرة على الإزالة (و) عفي قدر ما دون ربع الثوب الكامل (أو البدن) كله على الصحيح من الخفيفة لقيام الربع مقام الكل.

وفي الدر المختار (١/٦٤٠): وكره كفه أي رفعه ولو لتراب كمشمر كم أو ذيل

وفي الشامية تحته: أي كما لو دخل في الصلاة وهو مشمر كمه أو ذيله وأشار بذلك إلى أن الكراهة لا تختص بالكف وهو في الصلاة كما أفاده في شرح المنية لكن قال في القنية واختلف في من صلى وقد شمر كمه لعمل كان يعمله قبل الصلاة أو هيئته ذلك اهـ ومثله ما لو شمر للوضوء ثم عجل لإدراك الركعة مع الإمام وإذا دخل في الصلاة كذلك وقلنا بالكراهة فهل الأفضل إرخاء كمه فيها بعمل قليل أو تركهما؟ لم أره: والأظهر الأول بدليل قوله الآتي ولو سقطت قلنسوته فإعادتها أفضل

هذا وقيد الكراهة في الخلاصة والمنية بأن يكون رافعا كمه إلى المرفقين وظاهره أنه لا يكره إلى ما دونهما قال في البحر: والظاهر الإطلاق لصدق كف الثوب على الكل اهـ ونحوه في الحلية وكذا قال في شرح المنية الكبير: إن التقييد بالمرفقين اتفاقي

قال: وهذا لو شمر وهو خارج الصلاة ثم شرع فيها كذلك أما لو شمر وهو فيها تفسد لأنه عمل كثير

(۲۱۵) سود کے پیسوں سے بنائے ہوئے مکان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست سود کا کاروبار کرتے ہیں اور سودی رقم سے مکان بنایا ہے تو آپ پوچھنا یہ ہے کہ سودی رقم سے بنے ہوئے مکان میں نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں سودی کاروبار کرنے والا گناہ کبیرہ میں مبتلا ہے، اسے چاہئے کہ کوئی جائز کاروبار شروع کرے۔ اور ان پیسوں سے جو مکان بنایا ہے اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

لما في الهندية(۵/۱۳۲): في المنتقى قال ابو يوسفؒ اذا غصب رجل أرضا وبناها حوانيت و حماما و مسجدا فلا بأس بالصلوة في ذلك المسجد فأما الحمام فلا يدخل ولا يستأجر الحوانيت قال ولابأس بان يدخل الحوانيت لشراء المتاع قال هشام وأنا اكره الصلوة فيه حتى يطيب بملك اربابه.

وفي الفقه الاسلامي(۲/۹۸۳): الصلوة في الارض المغصوبة حرام بالاجماع لان اللبث فيها يحرم في غير الصلاة فلان يحرم في الصلوة اولى. والله اعلم بالصواب.

(۲۱۶) ٹی وی اور آلات موسیقی والے کمرے میں نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے ایک کمرے میں ٹی وی رکھا ہوا ہے اس کمرے میں کوئی اور سامان نہیں ہے بالکل خالی ہے تو ہمارے گھر والے اور ہم لوگ اس کمرے میں نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ آیا جس کمرے میں ٹی وی رکھا ہو، اس میں نماز پڑھنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر ٹی وی چل رہا ہو پھر تو یہ انتہائی مکروہ فعل ہے کیونکہ اس میں تصویروں کی عبادت کرنے والوں سے مشابہت لازم آئے گی لیکن نماز کراہت کے ساتھ ہوجائے گی اور اگر ٹی وی بند ہو تو پھر بھی نماز ہوجائے گی لیکن خلاف اولیٰ ہے کیونکہ عموماً ایسی جگہوں پر نماز میں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔

لما في الهندية(۱/۶۳): وتكره الصلاة في تسع مواطن في قوارع الطريق ومعاطن الابل والمزبلة والمجزرة والمخرج والمغتسل والحمام والمقبرة وسطح الكعبة ولا بأس بالصلاة والسجود على الحشيش والحصير والبسط والبواري هكذا في فتاوى قاضيخان.

وفيه ايضاً(۲/۹۸۱): الكنيسة(معبد النصارى) والبيعة (معبد اليهود) ونحوهما من أماكن الكفر تكره الصلاة فيها عند الجمهور وابن عباس مطلقا عامرة أو دارسة الا لضرورة كحر أو برد أو مطر

او خوف عدو او سبع فلا کراھۃ، وحکمۃ الکراھۃ إنھا ماوی الشیاطین لأنھا لا تخلو من التماثیل والصور ولأنھا موضع فتنۃ وأھواء مما یمنع الخشوع۔ قال النووی فی المجموع وتکرہ الصلاۃ فی ماوی الشیاطین کالخمارۃ وموضع المکس ونحو ذلک من المعاصی الفاحشۃ.

(۲۱۷) آئینہ کے سامنے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایسی جگہ نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں نمازی کے سامنے بڑا سا آئینہ ہو جس میں اپنی تصویر دکھائی دے رہی ہو، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:۔ آئینہ کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے البتہ اگر اس کی وجہ سے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہو رہا ہو تو آئینے کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہوگا، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنا بھی درست ہے جبکہ استقبال قبلہ درست ہو، اگر قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو کسی سے پوچھ کر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور اگر کوئی بتانے والا نہ ہو تو خود تحری کر کے نماز پڑھے۔

لما فی مراقی الفلاح (ص ۳۶۳): (و) تکرہ بحضرۃ کل (ما یشغل البال) کزینۃ (و) بحضرۃ ما (یخل بالخشوع) کلھو ولعب ولذا نھی النبی ﷺ عن الاتیان للصلاۃ سعیا بالھرولۃ.

وفی الشامیۃ (۱/ ۴۳۳): فان کان عاجزا بالاشتباہ وھو ان یکون فی المفازۃ فی لیلۃ مظلمۃ او لا علم له بالامارات الدالۃ علی القبلۃ فان کان بحضرته من یسئله عنھا لا یجوز له ان یتحری بل یجب ان یسئل لما قلنا ای من ان السؤال اقوی من التحری.

(۲۱۸) آئینے کے سامنے نماز پڑھنا تصویر کے حکم میں نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے سامنے بڑا آئینہ لگا ہوا ہو تو وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں جبکہ اس کی تصویر آئینے میں مکمل طور پر نظر آتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:۔ آئینے میں جو چیز نظر آتی ہے اس کو تصویر نہیں کہا جاتا بلکہ عکس کہا جاتا ہے اس لئے یہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آئینے کے سامنے نماز پڑھنے میں فی نفسہ کوئی کراہت نہیں جیسا کہ مصلی کا سایہ بحالت نماز سامنے پڑنا موجب کراہت نہیں البتہ آئینہ اور اس جیسی اشیاء جن سے نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہو سامنے رکھ کے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لما فی قاضی خان (۱/ ۱۶۸): ولو نظر فی مرآۃ ورای فیھا فرج امرأۃ فنظر عن شھوۃ لا یحرم علیه أمھا وابنتھا لانه لم یر فرجھا وانما رای عکسھا. ولو کانت المرأۃ علی شط حوض او علی قنطرۃ فنظر الرجل فی الماء فرای الرجل فرجھا فنظر عن شھوۃ لا یثبت الحرمۃ.

وفی الشامیۃ(۱/۴۵۸): قولہ لانہ یلھی المصلی: أی فیخل بخشوعہ من النظر الی موضع سجودہ ونحوہ، وقد صرح فی البدائع فی مستحبات الصلوۃ أنہ ینبغی الخشوع فیھا ویکون منتھی بصرہ إلیٰ موضع سجودہ الخ وکذا صرح فی الاشباہ أن الخشوع فی الصلوۃ مستحب والظاھر من ھذا ان الکراھۃ ھنا تنزیھیۃ فافھم.

وفیہ ایضاً(صـ۴۰۳): وفی القنیۃ: لو صلّی علی زجاج یصف ماتحتہ قالو جمیعا یجوز.

وفی المفصل فی احکام المرأۃ والبیت المسلم(۱/۲۲۹): مایکرہ فی الصلاۃ: یکرہ للمصلی فی صلوتہ العبث بثوبہ او بدنہ او ـــــ یرفع بصرہ الی السماء أو ـــــ إلی ما یشغلہ عن الصلوۃ أو ـــــ ان یصلی بحضرۃ الطعام او ـــــ ان یترک شیأ من سنن الصلوۃ.

(۲۱۹) اندھیرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے بڑے فرماتے ہیں کہ جب نماز پڑھی جائے تو روشنی کا انتظام پہلے کرلینا ضروری ہے، اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی۔ کیا ان حضرات کی بات صحیح ہے یا اندھیرے میں بھی نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ آپ کے بڑوں کا یہ کہنا کہ "اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی" صحیح نہیں ہے۔ اندھیرے میں نماز بلا کراہت درست ہے۔

لما فی الھندیۃ(۱/۶۳): رجل صلی فی المسجد فی لیلۃ مظلمۃ بالتحری فتبیّن انہ الی غیر القبلۃ جازت صلوتہ.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۹۲): اما باللیل فیصلی قائماً لان ظلمۃ اللیل تستر عورتہ.

وفی الدرالمختار(۱/۴۳۳): وان علم بہ فی صلوتہ او تحول رایہ .... ولو بمکۃ او مسجد مظلم ولا یلزمہ قرع ابواب ومس جدران.

وفی الشامیۃ تحتہ: وفی الخلاصۃ اذا لم یکن فی المسجد قوم والمسجد فی مصرٍ فی لیلۃ مظلمۃ (قولہ ومس جدران) لان الحائط لو کانت منقوشۃ لا یمکنہ تمییز المحراب من غیرہ وعسی ان یکون ثم ھامۃ مؤذیۃ ـــــ وھذا انما یصح فی بعض المساجد فاما فی الاکثر فیمکن تمیز المحراب من غیرہ فی الظلمۃ بلا ایذاء.

(۲۲۰) سامنے موم بتی یا لالٹین وغیرہ رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موم بتی اور لالٹین وغیرہ سامنے رکھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

او انفه من الارض فلا يجوز

(۲۲۲) بغیر عمامہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نماز بغیر عمامے کے پڑھنا ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: عمامہ باندھنا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت ہے اور احادیث مبارکہ میں عمامہ باندھنے کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عمامہ باندھنا اجر وثواب کا باعث ہے چنانچہ بغیر عمامہ نماز پڑھنا اور پڑھانا اگرچہ جائز ہے لیکن (بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ وہ ضعیف ہیں) عمامہ باندھ کر پڑھی گئی نماز کا ثواب بغیر عمامہ پہنے پڑھی گئی نماز کے مقابلے میں پچیس گنا زیادہ ہے لہٰذا بغیر عمامے کے پڑھی گئی نماز میں پچیس گنا ثواب سے محرومی ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر عمامے کے نماز پڑھنا تحقیق کے باوجود نہیں ملا، بلکہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے حالت احرام کے کبھی ننگے سر نماز نہیں پڑھی۔

لما في المرقاة (۸/۲۵۰): وروى ابن عساكر عن ابن عمر مرفوعا صلاة تطوع او فريضة بعمامة تعدل خمسا وعشرين صلاة بلا عمامة وجمعة بعمامة تعدل سبعين جمعة بلا عمامة فهذا كله يدل على فضيلة العمامة مطلقا.

وفي حاشية ملتقى الابحر (۲/۲۲۳): العمامة سنة نبوية شريفة غفل عنها كثير من العلماء بل زهدوا حتى في تغطية الرأس مما ليس من شعار الكفرة وقد قال علي القاري ان رسول الله ﷺ ما صلى حاسر الرأس الا في احرامه

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

(۲۲۳) سنتوں کو اذان سے پہلے پڑھ لینے کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی اذان سے قبل چار سنتیں پڑھنا کیسا ہے چاہے بعض مساجد میں اذان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یہ سنتیں وقت کی تابع ہیں یا اذان کے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... اذان شریعت میں فرض نماز کیلئے مشروع ہوئی ہے اور یہ نماز کے دخول وقت کی علامت ہے۔ البتہ نوافل اور سنتیں فرائض کے تابع ہیں۔ لہٰذا ان کو فرض نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ابھی اذان نہ ہوئی ہو۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۸۴): (و) سببه (بقاء دخول الوقت، وهو سنة) للرجال فی مكان عال (مؤكدة) هی كالواجب فی لحوق الاثم (للفرائض) الخمس (فی وقتها ولو قضاء) لانه سنة للصلاة حتی يبرد به لا للوقت (لا) يسن (لغيرها) كعيد.

(۲۲۴) صبح صادق کے بعد "نفل" سنت فجر شمار ہوگی

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی نیت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ صبح صادق طلوع ہوگئی ہے تو کیا یہ دو رکعت سنت فجر سے کفایت کرے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... اگر کوئی شخص تہجد کی نفل کی نیت کر کے نماز شروع کر دے بعد میں معلوم ہو جائے کہ صبح صادق طلوع ہو چکی ہے تو یہ دو رکعت فجر کی سنت ہی شمار ہوگی۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۲): لو صلى ركعتين وهو يظن أن الليل باق فاذا تبين أن الفجر قد كان طلع قال المتأخرون يجزيه عن ركعتی الفجر ذكر الشيخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی فی شرح كتاب الصلاة ظاهر الجواب أنه يجزيه عن ركعتی الفجر لان الاداء حصل فی الوقت.

(۲۲۵) اگر جماعت کھڑی ہو چکی ہو تو سنت فجر کب پڑھی جائے؟

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اور امام نماز پڑھا رہا

ہو تو بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی طرح یہ یقین یا ظن غالب ہو جائے کہ ایک رکعت جماعت سے مل جائے گی تو پھر فجر کی سنتوں کو پڑھ لینا چاہیے اور بعض فرماتے ہیں کہ اگر تشہد ہی مل جانے کی امید ہو تو پھر بھی پڑھ لینا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے کونسا قول راجح ہے تاکہ اس پر عمل کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً　آپ کے ذکر کردہ اقوال میں دوسرا قول راجح ہے یعنی اگر مقتدی کو صرف تشہد مل جانے کی امید ہو تب بھی فجر کی سنتیں پڑھ لینی چاہئیں نیز اس صورت میں اس کو دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں گی سنت فجر کی بھی اور جماعت کی بھی لہٰذا یہی بہتر ہے۔

لما في الهندية(۱/۱۲۰): ولم يذكر في الكتاب أنه ان كان يرجو ادراك القعدة كيف يفعل فظاهر ما ذكر في الكتاب أنه ان خاف ان تفوته الركعتان يدل على أنه يدخل مع الامام وحكي عن الفقيه ابي جعفرؒ انه قال على قول ابي حنيفة وابي يوسف رحمهما الله تعالى يصلي ركعتي الفجر لأن ادراك التشهد عندهما كادراك الركعة كذا في الكفاية

وفي الشامية(۲/۵۷): (وقيل التشهد) اي اذا رجا ادراك الامام في التشهد لايتركها بل يصليها وان علم أن تفوته الركعتان معه　قلت: لكن قواه في فتح القدير بما سيأتي من أن من ادرك ركعة من الظهر مثلا فقد أدرك فضل الجماعة وأحرز ثوابها كما نص عليه محمد وفاقا لصاحبيه وكذا لو ادرك التشهد يكون مدركا لفضيلتها على قولهم قال: وهذا يعكر على ماقيل إنه لو رجا ادراك التشهد لاياتي بسنة الفجر على قول محمدؒ والحق خلافه لنص محمد على ما يناقضه أي لأن المدار هنا على ادراك فضل الجماعة وقد اتفقوا على ادراكه بادراك التشهد فياتي بالسنة اتفاقا كما اوضحه في الشرنبلالية ايضا واقره في شرح المنية الخ.

(۲۲۶) فجر کی سنت کس وقت چھوڑ سکتا ہے

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی سنتیں کس وقت چھوڑنا جائز ہے نیز اگر مقتدی کو معلوم نہ ہو کہ کونسی رکعت ہے تو اس وقت سنت چھوڑنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً　فجر کی سنت اس وقت چھوڑ سکتا ہے جبکہ فرض کی دونوں رکعات فوت ہو جانے کا خدشہ ہو اور اگر یہ یقین ہو کہ امام کے ساتھ تشہد میں شریک ہو سکتا ہوں تو سنت چھوڑنا درست نہیں ہے۔

لما في التاتارخانية(۱/۴۲۷): اذا كان يرجوا ادراك القعدة مع الامام صرح انه يشتغل بركعتي الفجر، واشار الى انه يدخل مع الامام فانه قال: اذا خشي ان تفوته الركعتان مع الامام دخل في صلاة الامام وبه اخذ بعض المشايخ　ومنهم من قال على قياس قول ابي حنيفة و ابي يوسف رحمهما

(۲۳۲) شرعی سفر میں سنت ونوافل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر سفر پر جانا ہوتا ہے تو مجھ پر فرائض کے علاوہ سفر کے دوران سنتیں اور نوافل بھی پڑھنا ضروری ہے یا صرف فرائض پر اکتفا کرنا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: شرعی سفر میں کار، گاڑی وغیرہ کے نکلنے کا خوف ہو، یا جلدی ہو، یا حالت سیر (یعنی چلنے کی حالت) ہو تو پھر صرف فرائض کی ادائیگی کافی ہے۔ اور اگر حالت نزول (یعنی ٹھہرنے کی حالت) اور امن ہو، جلدی بھی نہ ہو تو اس حالت میں سنت مؤکدہ کا حکم وہی ہے جو حالت اقامت میں ہے۔ البتہ سنن غیر مؤکدہ اور نوافل پڑھ لینا افضل ہے۔

وفي الهندية (١/١٣٩): وبعضهم جوز للمسافر ترك السنن والمختار انه لاياتي بها في حال الخوف ويأتي بها في حال القرار والامن.

وفي الدر المختار (٢/١٣١): (ويأتي) المسافر (بالسنن) ان كان (في حال امن وقرار والا) بان كان في خوف وفرار (لا) يأتي بها هو المختار لانه ترك لعذر، تجنيس. قيل الا سنة الفجر.

وفي الشامية تحته: (قوله ويأتي المسافر بالسنن) اي الرواتب (قوله هو المختار) وقيل الافضل الترك ترخيصا، وقيل الفعل تقربا. وقال الهندواني: الفعل حال النزول والترك حال السير.
قلت: والظاهر ان ما في المتن هو هذا وان المراد بالامن والقرار النزول وبالخوف والفرار السير لكن قدمنا في فصل القراءة انه عبر عن الفرار بالعجلة لانها في السفر تكون غالبا من الخوف تأمل.

(۲۳۳) سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقوں کے گھر کے پاس جو مسجد ہے اس میں نماز کے بعد خصوصاً جمعہ کی نمازوں کے بعد سنتیں وغیرہ پڑھی جاتی ہیں۔ ان نمازوں میں امام صاحب سنتوں سے فارغ ہو کر اجتماعی دعا کرواتے ہیں اور سب لوگ ان کے ساتھ شریک ہو کر آمین آمین با آواز بلند کہتے ہیں، آنجناب سے اس مسئلہ کے متعلق یہ معلوم کرنا تھا کہ سنتوں کے بعد اس طرح اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کا مروجہ طریقہ کہ امام با آواز بلند دعا کرتا ہے اور سب مقتدی زور سے آمین کہتے ہیں، بعض جگہوں پر اس کو واجب اور نہایت ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر امام سے دعا میں تاخیر ہو جائے تو اس پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے اور اس کے نہ کرنے والے پر ملامت کی جاتی ہے یہ بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا مروجہ سنتوں کے بعد دعا کا اس طرح التزام درست نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

الملاحظ یکبر ویقرء الثناء ثم یقول سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر خمس عشرۃ الخ

وفی الدر المختار (۱۳/۲): ویستحب اربع قبل العصر وقبل العشاء وبعدھا بتسلیمۃ وست بعد المغرب لیکتب من الاوابین بتسلیمۃ او ثنتین او ثلاث والاول ادوم واشق.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ من الاوابین) جمیع اواب ای رجاع الی اللہ تعالی بالتوبۃ والاستغفار (قولہ بتسلیمۃ او ثنتین او ثلاث) جزم بالاول فی الدرر، وبالثانی فی الغزنویۃ و بالثالث فی التجنیس کما فی الامداد لکن الذی فی الغزنویۃ مافی التجنیس ... فکان المستحب فیہ ثلاث تسلیمات لیکون علی نسق واحد قال ھذا ماظہر لی ولم ارہ لغیری.

وفی الشامیۃ (۱/۳۷۳): واعلم ان الاوقات المکروھۃ نوعان الاول الشروق والاستواء والغروب والثانی مابین الفجر والشمس وما بین صلوٰۃ العصر الی الاصفرار: فالنوع الاول لاینعقد فیہ شیٔ من الصلوات التی ذکرناھا اذا شرع بھا فیہ وتبطل ان طرأ علیھا الا صلاۃ جنازۃ حضرت فیھا وسجدۃ تلیت آیتھا فیھا وعصر یومہ والنفل والنذر المقیدین بھا وقضاء ماشرع بہ فیھا ثم افسدہ فتنعقد ھذہ الستۃ بلا کراھۃ اصلا فی الاولی منھا ومع الکراھۃ التنزیھیۃ فی الثانیۃ والتحریمیۃ فی الثالثۃ وکذا فی البواقی لکن مع وجوب القطع والقضاء فی وقت غیر مکروہ: والنوع الثانی ینعقد فیہ جمیع الصلوات التی ذکرناھا من غیر کراھۃ الا النفل والواجب لغیرہ فانہ ینعقد مع الکراھۃ فیجب القطع والقضاء فی وقت غیر مکروہ اھ

وفی الدر المختار (۲۳/۲): وصلاۃ اللیل واقلھا علی مافی الجوھرۃ ثمان ولو جعلہ اثلاثا فالاوسط افضل ولو انصافا فالاخیر افضل

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ ولو جعلہ اثلاثا الخ) ای لو اراد ان یقوم ثلثۃ وینام ثلثیہ فالثلث الاوسط افضل من طرفیہ لان الغفلۃ فیہ اتم و العبادۃ فیہ اثقل ولو اراد ان یقوم نصفہ وینام نصفہ فقیام نصفہ الاخیر افضل لقلۃ المعاصی فیہ غالبا الخ

(۲۳۵) میت کیلئے بطور ایصال ثواب نوافل پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے ان کے جو کپڑے وغیرہ ہیں یہ کپڑے کس کو دینا جائز ہیں موذن یا مدرسہ میں اور ان کیلئے نوافل پڑھی جائے تو اس کی کیا نیت ہوگی؟

(۲) جس وقت یہ نوافل پڑھی جاتی ہے تو اس وقت کی نیت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۱) آپ کے والد صاحب کے کپڑے ان کے ترکے میں شامل ہوں گے یہ تمام ورثاء کی ملکیت ہوں گے اسلئے اگر سب ورثاء اپنی رضامندی سے کسی ضرورت مند کو صدقہ کردیں تو درست ہے بشرطیکہ ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

(۲) عام نفل کی طرح نیت کرکے میت کو ایصال ثواب کریں اس وقت کی طرف منسوب کرنا ضروری نہیں، اس کے علاوہ کسی مدرسہ میں یتامیٰ کو صدقہ وغیرہ کرکے بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے۔

لما في الفقه الإسلامي وأدلته (۲۷۷/۱۰): التركة لغة ما يتركه الشخص ويبقيه، واصطلاحا عند الحنفية الأموال والحقوق المالية التي كان يملكها الميت فتشمل الأموال المادية من عقارات ومنقولات وديون على الغير، والحقوق العينية التي ليست مالاً ولكنها تقوم بمال أو تتصل به.

وفي الشامية (۲۴۳/۲): تنبيه: صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوماً أو صدقة أو غيرها كذا في الهداية، بل في زكاة التاترخانية عن المحيط: الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء اهـ هو مذهب أهل السنة والجماعة.

وفي الدر المختار (۴۱۷/۱): ولا عبرة بنية متأخرة عنها على المذهب وجوزه الكرخي إلى الركوع وكفى مطلق نية الصلاة وإن لم يقل لله لنفل وسنة راتبة وتراويح على المعتمد إذ تعيينها بوقوعها وقت الشروع، والتعيين أحوط، ولا بد من التعيين عند النية

وفي الشامية تحته (قوله وكفى الخ) أي بأن يقصد الصلوة بلا قيد نفل أو سنة أو عدد (قوله لنفل) هذا بالاتفاق

(۲۳۶) نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھنا

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ کسی شخص نے نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھی تو اب بھی کیا اس کی نماز ادا ہو جائیگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو اور زبان سے تلفظ کرنا اگرچہ مستحسن ہے مگر نماز کے صحیح ہونے کیلئے شرط نہیں، اس لئے دل کے ارادے کا اعتبار ہوگا۔ لہٰذا اگر نیت سے مقصود فرض نماز تھی لیکن غلطی سے زبان سے نفل نکل گیا تو اس سے نماز کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ دل کے قصد کا اعتبار کرتے ہوئے نماز درست ہو جائے گی۔

لما في الهندية (۶۵/۱): الفصل الرابع في النية: النية إرادة الدخول في الصلوة والشرط أن يعلم

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ سنت اور نفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی نہیں بلکہ افضل ہے حدیث شریف میں ہے کہ "آدمی کا علاوہ فرض نمازوں کے باقی نمازیں گھر میں پڑھنا میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے" بشرطیکہ سنت اور نفل پڑھنے بیٹھ کر لوٹ کر جانے سے نمازی کو کسی کام میں مشغول ہو جانے کا خوف نہ ہو، گھر میں نماز پڑھنے سے نمازی کے خشوع وخضوع میں کمی واقع ہونے کا خوف نہ ہو تو گھر میں پڑھنا افضل ہے ورنہ مسجد ہی میں پڑھنا چاہیے۔

لما فی اعلاء السنن(۷/۲۵): والامر للاستحباب لان الاجازۃ وردت فی التطوع فی المسجد ایضاً کما یدل علیہ الحدیث الثانی من الباب وسیاتی تقریرہ قال المؤلف: النوافل التی فیہا الجماعۃ مستثناۃ من ھذا العموم، وکذلک تحیۃ المسجد للاحادیث التی وردت فیہا.

قولہ عن انس الخ: قال المؤلف دلالتہ علی الجزء الثانی من الباب کما قررہ النووی ونصہ: وفیہ جواز النفل فی المسجد، فانہا کانت تصلی النافلۃ فیہ فلم ینکر علیہا. (۱/۲۹۹)

وفی الھندیۃ(۱/۱۳): الافضل فی السنن والنوافل المنزل لقولہ علیہ السلام صلاۃ الرجل فی المنزل افضل الا المکتوبۃ الخ.

وذکر الحلوانی الافضل ان یؤدی کلہ فی البیت الا التراویح ومنہم من قال یجعل ذلک احیانا فی البیت والصحیح ان کل ذلک سواء، فلا تختص الفضیلۃ بوجہ دون وجہ ولکن الافضل ما یکون ابعد من الریاء واجمع للاخلاص والخشوع کذا فی النہایۃ.

وفی الشامیۃ(۲/۲۲): (قولہ والافضل فی النفل الخ) شمل ما بعد الفریضۃ وما قبلہا، لحدیث الصحیح "علیکم بالصلاۃ فی بیوتکم فان خیر صلاۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبۃ" واخرج ابو داؤد "صلاۃ المرء فی بیتہ افضل من صلاتہ فی مسجدی ھذا الا المکتوبۃ" وتمامہ فی شرح المنیۃ وحیث کان ھذا افضل یراعی مالم یلزم منہ خوف شغل عنہا لو ذھب لبیتہ، او کان فی بیتہ ما یشغل بالہ ویقلل خشوعہ فیصلیہا حینئذ فی المسجد لان اعتبار الخشوع ارجح

(قولہ غیر التراویح) ای لانہا تقام بالجماعۃ ومحلہا المسجد، واستثنی فی شرح المنیۃ ایضا تحیۃ المسجد وھو ظاھر

(۲۳۹) نفل نماز میں قراءۃ سبعہ پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمد للہ میں نے استاد سے سبعہ قرات مکمل پڑھی ہیں [illegible] میں نفل میں قرات شاذہ پڑھتے ہیں [illegible] میرا ارادہ ہو کہ [illegible] قرات میں نوافل میں ختم کروں لیکن مسئلہ [illegible]

سے ناواقف ہوں میں نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ نیکی کے بجائے گناہ مول لوں اس لئے آپ سے التماس ہے کہ میری رہنمائی فرمائیں کہ میں اس طرح پڑھ سکتا ہوں میری نماز میں تو کوئی خلل نہ آئے گا اس لئے کہ قرآن کو نماز میں پڑھنا گناہ ہو اس سے بچا رہوں لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ ہوتا ہے جب ان سے نماز فاسد ہوتی ہو تو ان کو پڑھنا کیسے جائز ہوگا قرآن اس کی تعلیم بھی دیتا ہے؟ اسی طرح قاری عاصم کوفی کے علاوہ دیگر ائمہ کی قرأت کو پڑھنا نماز میں کیسا ہے؟ جلد جواب عنایت فرمائیں بندہ اپنے معمولات شروع کرنے کیلئے آپ کے جواب کا منتظر ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: قراءت سبعہ نماز میں پڑھنا جائز ہے۔ البتہ جماعت کی نماز میں امام نہ پڑھے اور یہ کہ جماعت کی نماز میں عام لوگوں کا قرأت کے بارے میں تشویش میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہے عام لوگ اس بارے میں جاہل ہوتے ہیں۔ ایک قرأت مشہورہ کے علاوہ دوسری قراءتوں کا ان کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر وہ دوسری قرأت سنیں گے تو بعض مرتبہ جہالت کی وجہ سے بعض لوگ اس کے قرأت ہونے کا انکار کر دیتے ہیں، یا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ عوام کو گناہگار ہونے سے بچانے کیلئے جماعت کی نماز میں قرأت مشہورہ (روایت حفص) میں تلاوت کرے۔ ہاں اگر دوسری قرأت پڑھنا چاہے تو نفل نماز میں پڑھ سکتے ہیں۔ ان قرأت کے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ اس کے پڑھنے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اجر وثواب ملے گا اور یہ قرأت سبعہ متفق اور صحیح ہیں۔

لما في الهندية (۱/۷۹): وفي الحجة قراءة القرآن بالقراءات السبعة والروايات كلها جائزة ولكني أرى الصواب أن لا يقرأ القراءة العجيبة بالإمالات والروايات الغريبة.

وفي الدر المختار (۱/۵۴۱): ويجوز بالروايات السبع، لكن الأولى أن لا يقرأ بالغريبة عند العوام صيانة لدينهم

وفي الشامية تحته: أي بالروايات الغريبة والإمالات، لأن بعض السفهاء يقولون مالا يعلمون فيقعون في الإثم والشقاء ولا ينبغي للأئمة أن يحملوا العوام على ما فيه نقصان دينهم، ولا يقرأ عندهم مثل قراءة أبي جعفر وابن عامر وعلي بن حمزة والكسائي صيانة لدينهم فلعلهم يستخفون أو يضحكون وإن كان كل القراءات والروايات صحيحة فصيحة ومشايخنا اختاروا قراءة أبي عمرو وحفص عن عاصم.

وفي حاشية الطحطاوي على الدر (۱/۲۳۴): (قوله ويجوز بالروايات السبع) لا وجه للتقييد بالسبع بل يجوز إلى العشر كما نص عليه أهل الأصول (قوله صيانة لدينهم) لأن بعض السفهاء ربما يقع في الإثم فلا يقرأ عند العوام بقراءة أبي جعفر وابن عامر وحمزة والكسائي صيانة لدينهم فربما يستخفون أو يضحكون وإن كانت كلها صحيحة فصيحة ومشايخنا اختار والقراءة أبي عمرو

[illegible] ابن عامر أبو السعود عن شارح المنية.

(۴۳۰) بغیر عذر کے نوافل نہ پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری دلی خواہش تھی کہ میرا کوئی بیٹا عالم بن جائے تو میں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کیلئے کراچی بھیج دیا، وہ اس سال فراغت حاصل کرکے مفتی بن رہا ہے جب وہ گھر آتا ہے تو نمازوں کے وقت صرف فرائض وسنن پڑھ کر چلا جاتا ہے نوافل نہیں پڑھتا اور کہتا ہے نوافل لازمی نہیں ہیں پڑھو تو ثواب ہے نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا واقعی اس کی بات صحیح ہے کہ نوافل لازم نہیں، اگر کوئی بغیر عذر کے نوافل چھوڑ دے تو گناہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نوافل اور مستحبات کی دین میں بڑی اہمیت ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ روز قیامت فرائض کی کمی بیشی کو پورا فرمادیں گے اور ان میں سستی بھی نہیں کرنی چاہیے، تاہم اگر کوئی نوافل کو بغیر عذر کے بھی ترک کرتا ہے تو وہ قابل عتاب اور مواخذہ نہیں۔ لہذا آپ کے بیٹے کی بات درست ہے۔

لما في رد المحتار (١٠٢/١): اعلم ان المشروعات اربعة اقسام، فرض وواجب وسنة ونفل فما كان فعله اولى من تركه مع منع الترك ان ثبت بدليل قطعي ففرض او بظني فواجب، وبلا منع الترك ان كان مما واظب عليه الرسول ﷺ أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة والا فمندوب ونفل والسنة نوعان: سنة الهدى، وتركها يوجب اساءة وكراهية كالجماعة والاذان والاقامة ونحوها. وسنة الزوائد وتركها لايوجب ذالك كسير النبي عليه الصلوة والسلام في لباسه وقيامه وقعوده، والنفل ومنه المندوب يثاب فاعله ولا يسيء تاركه، قيل وهو دون سنن الزوائد.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (١٠٥٥/٢): "فصلاة التطوع: هي ما طلب فعلها من المكلف زيادة على الفرائض طلباً غير جازم، وتكمل به صلاة الفرض يوم القيامة، ان لم يكمل المصلي الفها، وفيه حديث صحيح مرفوع رواه احمد في المسند

وحكمها: انه يثاب على فعلها ولا يعاقب على تركها".

(۴۳۱) اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک طالب علم ہوں درجہ ثانیہ میں پڑھتا ہوں اللہ کے فضل سے تہجد، اشراق اور اوابین کا اہتمام کرتا ہوں لیکن پڑھائی کی وجہ سے چاشت ادا نہیں کرپاتا چونکہ اساتذہ کرام چھٹی نہیں دیتے اس جمعرات اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا آپ چاشت کو اشراق کے ساتھ ادا کرلیا کرو، چونکہ وہ عالم نہیں ہیں اس لئے ان کی بات سے دل مطمئن نہیں ہوا اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اشراق اور چاشت دونوں ایک ہی نماز ہے، البتہ سورج نکلنے کے فوراً بعد جو نماز پڑھی جاتی ہے بعض حضرات نے اس کو اشراق کہا ہے۔ اور جو تھوڑی دیر بعد جبکہ سورج بلند ہو جائے پڑھی جاتی ہے اس کو چاشت کہا ہے۔ لہٰذا اشراق اور چاشت کو ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے۔

لما في الهندية (١/١١٢): (ومن المندوبات صلوة الضحى) واقلها ركعتان واكثرها ثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس الى زوالها.

وفي الدر المختار (٢/٢٢): (و) ندب (اربع فصاعدا في الضحى) على الصحيح من بعد الطلوع الى الزوال. ووقتها المختار بعد ربع النهار.

وفي الشامية تحته: (قوله من بعد الطلوع) عبارة شرح المنية من ارتفاع الشمس. (قوله ووقتها المختار) اي الذي يختار ويرجح لفعلها وهذا عزاه في شرح المنية الى الحاوي. وقال: لحديث زيد بن ارقم ان رسول الله ﷺ قال: "صلاة الاوابين حين ترمض الفصال" رواه مسلم. وترمض بفتح التاء والميم اي تبرك من شدة الحر في اخفافها اهـ.

(٢٤٢) کیا عورت اپنے گھر میں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے اس جمعرات کو ہمارے محلے کی مسجد میں بیان فرمایا جس کے اندر مرد اور خواتین نے شرکت کی۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ جب انسان مسجد آئے تو وضو کرنے کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھے۔ اس کے انہوں نے کافی فضائل سنائے تو محلے کی عورتیں فضائل سن کر پڑھنے لگ گئیں لیکن ان کو علم نہیں کہ عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟ یا صرف یہ نمازیں مردوں کیلئے ہیں۔ آپ حضرات کی رہنمائی فرمائیں کہ عورتیں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جس طرح مرد تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں۔ البتہ خوف فتنہ کی وجہ سے عورت کا مسجد میں جانا ممنوع قرار دیا گیا ہے تو گھر میں جو جگہ نماز کیلئے مخصوص کی ہو جس طرح اس میں اعتکاف کیلئے بیٹھ سکتی ہے اسی طرح اگر اس جگہ میں تحیۃ المسجد بھی پڑھ لیں تو انشاء اللہ اجر ملے گا۔ اور تحیۃ الوضوء کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اس لئے عورت بھی تحیۃ الوضوء پڑھ سکتی ہے۔

لما في مسند احمد (٦/٢٩٧): عن ام سلمة (رضي الله تعالى عنها) عن رسول الله ﷺ انه قال "خير مساجد النساء قعر بيوتهن".

وفي الهندية (١/١١٢): (ومن المندوبات صلاة الضحى) الى ان قال (ومنها) تحية المسجد وفي

ركعتان (ومنها) ركعتان عقيب الوضوء.

(وفي الدر المختار مع الشامية (٢/ ١٨، ١٩): (ويسن تحية) رب (المسجد وهي ركعتان وأداء الفرض) أو غيره وكذا دخوله بنية فرض أو اقتداء وتكفيه لكل يوم مرة ولا تسقط بالجلوس عندنا بحر.

وفيه ايضاً (٢٢): (قوله وندب ركعتان بعد الوضوء) لحديث مسلم "ما من احد يتوضأ فيحسن الوضوء ويصلي ركعتين يقبل بقلبه ووجهه عليهما الا وجبت له الجنة" خزائن.

(۲۴۳) بیٹھ کر نوافل پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہو کر؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اکثر ہمارے وقت کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ظہر کے بعد، مغرب کے بعد اسی طرح عشاء کے بعد کے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟ کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے یا بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب برابر ملے گا؟ حالت صحت اور بیماری میں حکم یکساں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نفل نماز میں شرعاً قاعدہ یہ ہے کہ عام حالات میں کھڑے ہو کر پڑھنے میں پورا ثواب ملتا ہے اور بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب کم ہوگا۔ اس کے برخلاف بیماری کی حالت میں آدمی کو اپنی عبادت کا پورا ثواب ملتا ہے۔ خواہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے یا بیٹھ کر یا جس طرح ممکن ہو، اور اگر مریض کچھ مشقت کرتے ہوئے کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے تو ایسی صورت میں اس مریض کو مشقت برداشت کرنے پر دو کامل اجر وثواب ملے گا۔ اسی طرح کوئی مریض اگر رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کو کھڑے ہونے والے مریض کی بنسبت آدھا ثواب ملے گا جو کہ عام تندرست آدمی کی کامل نماز کے پورے ثواب کے برابر ہوگا۔ اور عذر کی وجہ سے اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔

لما في فتح الباري (٢/ ٤٣٣): قال الخطابي كنت تأولت هذا الحديث على ان المراد به صلاة التطوع يعني للقادر لكن قوله من صلى نائما يفسده لان المضطجع لا يصلي التطوع كما يفعل القاعد، لاني لا احفظ عن احد من اهل العلم انه رخص في ذلك ... وقد رأيت الآن ان المراد بحديث عمران المريض المفترض الذي يمكنه ان يتحامل فيقوم مع مشقة فجعل اجر القاعد على النصف من اجر القائم ترغيبا له في القيام مع جواز قعوده ... فمن صلى فرضا قاعدا وكان يشق عليه القيام اجزأه وكان هو ومن صلى قائما سواء كما دل عليه حديث انسؓ وعائشةؓ فلو تحامل هذا المعذور وتكلف القيام ولو شق عليه كان افضل لمزيد اجر تكلف القيام فلا يمتنع ان يكون اجره

علی ذلک نظیر اجرہ علی الصلاۃ فیصح ان اجر القاعد علی النصف من اجر القائم ومن صلی النفل قاعدا مع القدرۃ علی القیام اجزاہ وکان اجرہ علی النصف من اجر القائم بغیر اشکال الخ

وفی اعلاء السنن(۱۴۵/۶، ۱۴۶، ۱۴۷) : اجعلوا اخر صلوتکم من اللیل وترا الخ وقد ورد مایخالفہ ایضاً ففی صحیح مسلم فی حدیث طویل ثم یصلی النبی ﷺ بعد الوتر رکعتین بعد ما یسلم وھو قاعد. واخرج الدار قطنی فی سننہ عن ام سلمۃ رضی اللہ عنھا ان النبی ﷺ کان یصلی رکعتین خفیفتین بعد الوتر وھو جالس .... واخرج الدارمی والطحاوی والدار قطنی واللفظ لھما عن ثوبان مولی رسول اللہ ﷺ قال کنامع رسول اللہ ﷺ فی سفر فقال "ان السفر جھد وثقل فاذا اوتر احد کم فلیرکع رکعتین فان استیقظ والا کانتالہ، وفی التعلیق المغنی اسنادہ جید وفی آثار السنن اسنادہ حسن . واخرج الطحاوی عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ "ان النبی ﷺ کان یصلیھما بعد الوتر وھو جالس یقرأ فیھما اذا زلزلت وقل یاایھا الکٰفرون، واسنادہ حسن.

والتطبیق بینھما وبین حدیث الباب بوجوہ منھا ماذکرہ الحافظ فی الفتح بما نصہ، وقد ذھب الیہ (ای الی مشروعیۃ التنفل بعد الوتر)بعض اھل العلم وجعلوا الامر فی قولہ اجعلوا اخر صلاتکم من اللیل وتراً مختصاً بمن اوتر آخر اللیل. وقال العبد الضعیف. معناہ اوتروا فی اللیل مرۃ لامرتین لتکون اخر صلوتکم باللیل وترا فان من اوتر مرتین فقد جعل آخر صلاتہ باللیل شفعاً وحمل بعضھم حدیث الرکعتین بعد الوتر علی الجواز، وامر الایتار اخر اللیل علی الاستحباب ....

قال النووی فی شرح مسلم ھذا الحدیث (ای حدیث الرکعتین بعد الوتر) اخذ بظاھرہ الاوزاعی واحمد فیما حکاہ القاضی عنھما. فاباحا رکعتین بعد الوتر جالساً..... قلت والصواب ان ھاتین الرکعتین فعلھما علیہ السلام بعد الوتر جالسا لبیان جواز الصلاۃ بعد الوتر، وبیان جواز النفل جالسا، ولم یواظب علی ذلک بل فعلہ مرۃ او مرتین او مرات قلیلۃ. وانما تأولنا حدیث الرکعتین جالسا لان الروایات المشھورۃ فی الصحیحین وغیرھما عن عائشۃ مع روایۃ خلائق من الصحابۃ فی الصحیحین مصرحۃ بان اخر صلاتہ ﷺ فی اللیل کان وتراً. وفی الصحیحین احادیث کثیرۃ مشھورۃ بالامر بجعل اخر صلاۃ اللیل وترا فکیف یظن بہ علیہ السلام مع ھذہ الاحادیث واشباھھا انہ یداوم علی الرکعتین بعد الوتر ویجعلھما اخر صلاۃ اللیل؟

وانما معناہ ماقدمناہ من بیان الجواز وھذا الجواب ھو الصواب.

(۴۴۴) بیٹھ کر نماز پڑھنے میں آدھے ثواب کا حکم فرائض یا نوافل سب میں ہے یا صرف نوافل میں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے اگر معذوری نہ ہو تو؟ مثلاً ایک شخص بخار کی حالت میں ہے یا بدن، ہاتھ میں اچھا خاصا درد ہو یا تھکاوٹ بہت لگ رہی ہو اس صورت میں بھی نماز کھڑے ہو کر پڑھنی چاہئے کیا صرف فرض نماز میں ثواب آدھا ہو جاتا ہے یا سنت اور نفل میں بھی آدھا ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: فرض نماز میں رکوع اور سجدہ کی طرح قیام بھی فرض ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر عذر کے فرض نماز بیٹھ کر پڑھے گا تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی اور اگر کوئی شخص معذور ہو مثلاً قیام پر قدرت نہ رکھتا ہو، یا قیام کرنے سے بیماری بڑھنے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو اس کو نماز کا پورا ثواب ملے گا، البتہ نوافل میں قیام فرض نہیں ہے اس لئے اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر نفل پڑھے گا تو اس کو نماز کا آدھا ثواب ملے گا، اور اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھے گا تو پورا ثواب ملے گا۔

لما في الصحيح لمسلم (۱/۲۵۳): وعن عبدالله بن عمرو رضي الله عنه قال: حدثت أن رسول الله ﷺ قال صلوة الرجل قاعداً نصف الصلاة، قال فأتيته فوجدته يصلي جالساً فوضعت يدي على رأسه فقال: مالك يا عبدالله بن عمرو قلت حدثت يا رسول الله أنك قلت "صلوة الرجل قاعداً على نصف الصلاة" وأنت تصلي قاعداً قال أجل ولكني لست كأحد منكم

وفي جامع الترمذي (۱/۸۵): (باب ما جاء أن صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم) عن عمران بن حصين قال سألت رسول الله ﷺ عن صلاة الرجل وهو قاعد فقال من صلى قائماً فهو أفضل ومن صلاها قاعداً فله نصف أجر القائم .... وقال سفيان الثوري في هذا الحديث من صلى جالساً فله نصف أجر القائم قال هذا للصحيح ولمن ليس له عذر فأما من كان له عذر من مرض أو غيره فصلى جالساً فله مثل أجر القائم.

وفي الشامية (۱/۴۴۴): (قوله القادر عليه) فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر أو حكماً كما لو حصل له به ألم شديد أو خاف زيادة المرض وكالمسائل الآتية في قوله وقد يتحتم القعود الخ فإنه يسقط

(۴۴۵) سنت فجر گھر میں پڑھ کر آنے والے کیلئے تحیۃ المسجد کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص فجر کی سنتیں گھر میں پڑھے اور پھر مسجد میں آئے تو کیا وہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تمام سنتوں کی طرح سنت فجر بھی گھر میں پڑھنا افضل ہے اور طلوع فجر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا جو

شخص گھر میں سنت فجر پڑھ کر مسجد آئے تو اس کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنا درست نہیں بلکہ اسے چاہئے کہ تیسرا کلمہ اور درود شریف پڑھے یہ پڑھنے سے اسے تحیۃ المسجد پڑھنے کا ثواب مل جائے گا اور اگر مسجد میں آتے ہی فرض نماز میں مشغول ہو گیا تو پھر فرض نماز تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہو جائے گی اگر چہ اس نے تحیۃ المسجد کی نیت نہ کی ہو۔

لما فی قاضی خان(۱/۹۴): ورکعتی الطواف وتحیۃ المسجد اولم یکن لها سبب بعد طلوع الفجر قبل صلوٰۃ الفجر لایجوز الا سنۃ الفجر وبعد الفریضۃ قبل طلوع الشمس۔

وفی الهندیۃ(۱/۵۲): منها مابعد طلوع الفجر قبل صلاۃ الفجر کذا فی النهایۃ والکفایۃ یکره فیه التطوع باکثر من سنۃ الفجر۔

وفی الشامیۃ(۲/۱۸): ورکعتان او اربع وهی افضل لتحیۃ المسجد الا اذا دخل فیه بعد الفجر او العصر فانه یسبح ویهلل ویصلی علی النبی ﷺ فانه حینئذ یؤدی حق المسجد کما اذا دخل للمکتوبۃ فانه غیر مامور بها حینئذ کمافی التمرتاشی۔

(۴۴۶) تہجد کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی کم تعداد کتنی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سے کم تہجد کتنی رکعات پڑھی ہیں دو یا چار رکعات تہجد ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً تہجد کی اقل مقدار کی احادیث میں کوئی تصریح موجود نہیں ہے البتہ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اقل مقدار دو رکعت ہے۔

لمافی الشامیۃ(۲/۲۵): وهذا بناء علی ان اقل تهجده ﷺ کان رکعتین وان منتهاه کان ثمانی رکعات الی ان قال القول فمقتضی القول بان اقل التهجد رکعتان واوسطه اربع واکثره ثمان۔

(۴۴۷) صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان سے اصلاحی تعلق قائم کروں انہوں نے میری درخواست قبول کرلی اور مجھے کچھ معمولات بتائے جن میں سے ایک صلوٰۃ التسبیح بھی ہے انہوں نے فرمایا کہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح ضرور پڑھا کرو اب مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسے پڑھی جاتی ہے۔ اب آپ حضرات اس کے پڑھنے کا طریقہ بتائیں نیز یہ بھی بتائیں کہ صلوٰۃ التسبیح پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صلوٰۃ التسبیح بڑی اہم نماز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ نماز بڑی تاکید کے بعد

بطور تحفہ سکھائی تھی۔ امام حاکم نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے صحیح ہونے پر یہ دلیل ہے کہ تبع تابعین کے زمانے سے ہمارے زمانہ تک مقتداء حضرات اس پر مداومت کرتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ یہ چار رکعات والی نماز ہے جس میں تین سو مرتبہ تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔

صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کے دو طریقے ہیں:

اول...... یہ کہ کھڑے ہو کر الحمد شریف اور سورت کے بعد پندرہ مرتبہ تیسرا کلمہ سبحان اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھے، پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر رکوع سے کھڑا ہو کر سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر دونوں سجدوں میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد دس دس مرتبہ پڑھے پھر دونوں سجدوں کے درمیان دس مرتبہ پڑھے اور جب دوسرے سجدے سے اللہ اکبر کہہ کر اٹھے تو کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ جائے اور دس مرتبہ پڑھے۔ پھر بغیر اللہ اکبر کہے کھڑا ہو جائے۔ اسی طرح تیسری رکعت کے بعد جب چوتھی رکعت کیلئے اٹھا ہو وہاں بھی پہلے اللہ اکبر پھر تسبیحات اور پھر بغیر اللہ اکبر کہے کھڑا ہو جائے لیکن پہلے قعدہ میں اللہ اکبر کے بعد تسبیحات پھر التحیات اور پھر اللہ اکبر کہہ کر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو جائے۔ اسی طرح پہلے اور دوسرے قعدہ میں پہلے ان تسبیحات کو دس دس مرتبہ پڑھے پھر التحیات پڑھے۔

دوم...... یہ ہے کہ سبحانک اللھم کے بعد الحمد شریف سے پہلے پندرہ مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھے اور الحمد شریف اور سورت کے بعد دس مرتبہ پڑھے باقی وہی طریقہ ہے جو پہلے میں تھا۔ البتہ اس صورت میں نہ دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھنے کی ضرورت ہے اور نہ التحیات کے ساتھ پڑھنے کی۔ علماء نے کہا ہے اور لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ کبھی اس طرح پڑھ لیا کریں اور کبھی اس طرح پڑھ لیا کریں۔

یہ نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو سکھائی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی ہے یا نہیں یہ بات تتبع کے باوجود نہیں مل سکی۔

لما فی المشکوٰۃ (ص ۱۱۷): صلوٰۃ التسبیح۔ عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال للعباس بن عبدالمطلب یا عباس یا عماہ الا اعطیک الا امنحک الا اخبرک الا افعل بک عشر خصال اذا انت فعلت ذالک غفر اللہ لک ذنبک اولہ واخرہ قدیمہ وحدیثہ خطاہ وعمدہ صغیرہ وکبیرہ سرہ وعلانیتہ ان تصلی اربع رکعات تقرء فی کل رکعۃ فاتحۃ الکتاب وسورۃ فاذا فرغت من القراءۃ فی اول رکعۃ وانت قائم قلت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر خمس عشرۃ مرۃ ثم ترکع فتقولھا وانت راکع عشرا ثم ترفع راسک من الرکوع فتقولھا عشرا ثم تھوی ساجدا فتقولھا وانت ساجد عشراً ثم ترفع راسک من السجود فتقولھا عشرا ثم تسجد فتقولھا عشرا ثم ترفع راسک فتقولھا عشرا فذالک خمس وسبعون فی کل رکعۃ تفعل ذالک فی اربع رکعات ان استطعت ان تصلیھا فی کل یوم مرۃ فافعل فان لم تفعل ففی کل جمعۃ مرۃ فان لم تفعل ففی کل سنۃ

مرۃ فان لم تفعل ففی عمرک مرۃ رواہ ابو داؤد وابن ماجہ والبیھقی فی الدعوات الکبیر وروی الترمذی عن ابی رافع نحوہ.

وفی المستدرک علی الصحیحین (۱/۴۶۵): ... ثنا ابو وھب محمد بن مزاحم قال: سألت عبداللہ بن المبارک عن الصلوۃ التی یسبح فیھا، فقال تکبر ثم تقول: سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک ولا الہ غیرک ثم تقول خمس عشرۃ مرۃ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر، ثم تتعوذ وتقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم وفاتحۃ الکتاب وسورۃ، ثم تقول عشر مرات سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ثم ترکع فتقولھا عشرا ثم ترفع راسک فتقولھا عشرا ثم تسجد فتقولھا عشرا ثم ترفع راسک فتقولھا عشرا ثم تسجد الثانیۃ فتقولھا عشرا، ثم ترفع راسک فتقولھا عشرا تصلی اربع رکعات علی ھذا، فذالک خمس وسبعون تسبیحۃ فی کل رکعۃ، وذالک تمام الثلاث مائۃ فان صلاھا لیلا فاحب الی ان یسلم فی الرکعتین فان صلی نھارا فان شاء سلم وان شاء لم یسلم رواۃ ھذا الحدیث عن ابن المبارک کلھم ثقات اثبات ولا یتھم عبداللہ ان یعلمہ مالم یصح عندہ سندہ

وفی مرقاۃ المفاتیح (۳/۴۷۷): وینبغی للمتعبد ان یعمل بحدیث ابن عباس تارۃ ویعمل بحدیث ابن مبارک اخری.

(۲۴۸) صلوٰۃ التسبیح میں چھوٹ جانے والی تسبیح کو دوسرے رکن میں پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے مجھے فرمایا کہ آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح پڑھا کریں میں نے معمول بنایا کہ جمعہ والے دن اذان کے فوراً بعد پڑھا کروں گا اس جمعہ کو میں نے پڑھنا شروع کی تو پہلی رکعت میں رکوع سے اٹھنے کے بعد کی تسبیحات بھول گیا پھر میں نے سجدے میں وہ بھی پڑھ دیں گویا کہ تین سو تعداد مکمل ہوگئی آیا میری نماز صحیح ہوگئی یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہوگا صلوٰۃ التسبیح میں تسبیحات پڑھنا واجب ہیں یا مسنون یا مستحب ان کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صلوٰۃ التسبیح پڑھنا مستحب ہے اور احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے جن کی تعداد چار رکعات میں ۳۰۰ بنتی ہے اور اس میں اصل مطلوب ۳۰۰ کا عدد پورا کرنا ہے اور ان تسبیحات کا پڑھنا مسنون عمل ہے اگر کسی سے ایک رکن میں تسبیح ادا کرنا رہ گئی تو دوسرے رکن میں وہ بھی ادا کرکے تعداد پوری کرسکتا ہے پس صورت مسئولہ میں جب آپ نے رکوع سے اٹھنے کی تسبیحات کو سجدے میں ادا کردیا تو تسبیحات کی تعداد مکمل ہوگئی اس لیے آپ کی نماز درست ہے دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الهندیة (۱/۱۱۲): (ومن المندوبات) واما صلوة التسبیح فذکرها فی الملتقط یکبر و یقرأ الثناء ثم یقول سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر خمس عشر مرة ثم یتعوذ ویقرأ فاتحة الکتاب وسورة ثم یقرأ هذه الکلمات عشرا وفی الرکوع عشرا وفی القیام عشرا وفی کل سجدة عشرا وبین السجدتین عشرا ویتمها اربع رکعات.

وفی الشامیة (۲/۲۷): والطعن فی ندبها بان فیها تغییر النظم الصلوة انما یتاتی علی ضعف حدیثها فاذا ارتقی الی درجة الحسن اثبتها ... قال الملا علی فی شرح المشکاة مفهوم انه سها ونقص عددا من محل معین یاتی به فی محل آخر تکملة للعدد المطلوب قلت واستفید انه لیس له الرجوع الی المحل الذی سها فیه وهو ظاهر وینبغی کما قال بعض الشافعیة ان یاتی بما ترک فیما یلیه ان کان غیر قصیر فتسبیح الاعتدال یاتی به فی السجود اما تسبیح الرکوع فیاتی به فی السجود ایضا لافی الاعتدال لانه قصیر قلت وکذا تسبیح السجدة الاولی یاتی به فی الثانیة لافی الجلسة لان تطویلها غیر مشروع عندنا علی ما مر فی الواجبات.

(۴۲۹) مغرب کی دو سنتوں کے بعد نوافل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) ... اکثر لوگ عموماً مغرب کی دو سنت کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے ہیں، آیا مغرب کی دو سنت کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا مسنون ہے حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

(۲) ۔ صلوٰۃ الاوابین کی کل کتنی رکعت ہیں؟ فرض کے بعد والی دو رکعت سنت کو بھی صلوٰۃ الاوابین میں شمار کر سکتے ہیں یا نہیں مثلاً دو رکعت سنت کے ساتھ چار رکعت اور ملا لیں تو چھ رکعت صلوٰۃ الاوابین بن گئی یا دو رکعت سنت کے علاوہ چھ رکعت پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: (۱) ۔ نمازِ مغرب کی دو سنتوں کے بعد نوافل کا پڑھنا یقیناً باعث اجر وثواب ہے، جیسا کہ متعدد روایات میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن سنتوں کی ادائیگی کے بعد دو رکعت نفل پڑھنے کو مسنون قرار دینے کی صراحت بندہ کو نہیں ملی البتہ مستحب کہہ سکتے ہیں۔

(۲) ۔ متعدد روایات میں صلاۃ الاوابین کی رکعات کی تعداد چھ (۶) ملتی ہے اگرچہ اس سے کم وبیش کی بھی صراحت ملتی ہے۔ چنانچہ افضل صورت یہی ہے کہ دو رکعت سنت مؤکدہ کی ادائیگی کے بعد چھ (۶) رکعت صلاۃ الاوابین کی مستقل ادائیگی کی جائے البتہ مشاغل کی کثرت کی وجہ سے چار رکعت پر اکتفاء کر کے دو رکعت سنت مؤکدہ کو بھی ساتھ شمار کیا جا سکتا ہے۔

لما فی کنز العمال (۷/۳۸۶): ۱۹۴۲۰۔ من صلی بعد المغرب رکعتین قبل أن یتکلم کتبتا فی علیین.

وفیه ایضاً (۷/۳۹۲): ۱۹۴۵۱۔ من صلی أربع رکعات بعد المغرب کان کمن عقب غزوة بعد غزوة فی سبیل الله عز وجل (ابو الشیخ عن ابن عمر).

وفي الشامية (۲/۱۲): (قوله وهي تحسب المؤكدة) اى في الأربع بعد الظهر وبعد العشاء والست بعد المغرب بحر (قوله إختار الكمال) نعم ذكر الكمال في فتح القدير أنه وقع إختلاف بين أهل عصره في أن الأربع المستحبة هل هي أربع مستقلة غير ركعتي الراتبة أو أربع بهما؟ وعلى الثاني هل تؤدى معهما بتسليمة واحدة أو لا. فقال جماعة لا، واختار هو أنه إذا صلى أربعا بتسليمة أو تسليمتين وقع عن السنة والمندوب، وحقق ذلك بما لا مزيد عليه وأقره في شرح المنية والبحر والنهر

(۲۵۰) دو رکعت نماز نفل میں متعدد نیت کرنے سے متعدد نفل ادا کرنے کا ثواب ملے گا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ساتھی نے بتایا نفل دو رکعت میں جتنے دوسرے نفلوں کی نیت کرو سب ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دو رکعت نفل نماز میں اگر کوئی شخص حاجت کی نماز، توبہ کی نماز، شکرانے کی نماز، اشراق، سنت کی نماز کی نیت کرتا ہے تو دو رکعت نفل پڑھنے سے سب نمازیں ادا ہو جائیں گی۔ کیا ان کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو دو رکعت نفل عملاً ادا ہو جائیں گی یا ان میں سے جس کی نیت پہلے کی ہوگی وہ ادا ہوگی یا کوئی بھی ادا نہ ہوگی۔ کیا اس طرح نیت کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اور ایک ہی نیت درست ہو جیسے مثلاً دو رکعت میں تو شکرانے کی نماز کی نیت کرے یا توبہ یا حاجت کی نماز کی نیت کرلے۔ جلدی جواب دیں اللہ آپ کو ثواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: آپ کے ساتھی کی بات صحیح ہے کہ دو رکعت نفل میں جتنی نوافل کی نیت کرو سب ادا ہو جاتی ہیں۔ البتہ وہ نوافل جو کسی وقت کے ساتھ موقت ہیں، یا ذوات الاسباب ہیں، تو ان کے ادا ہونے کیلئے وقت اور سبب کا پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً دو رکعت نفل میں اشراق کی نیت کی جائے تو اشراق تب ادا ہوگی جب اشراق کا وقت موجود ہو۔ یا دو رکعت نفل میں تحیۃ المسجد کی نیت کی جائے تو تحیۃ المسجد تب ادا ہوگی جب دخول مسجد ہو۔

كما في الصحيح للبخاري (۱/۲): علقمة ابن وقاص الليثي يقول سمعت عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه على المنبر يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول انما الاعمال بالنيات وانما لامرئ ما نوى.

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح (ص۲۲۶): ثم انه ان جمع بين عبادات الوسائل في النية صح كما لو اغتسل لجنابة وعيد وجمعة اجتمعت ونال ثواب الكل وكما لو توضأ لنوم وبعد غيبة واكل لحم جزور وكذا يصح لو نوى نافلتين او اكثر كما لو نوى تحية مسجد وسنة وضوء وضحى وكسوف.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۱/۵۹۰): وان كانت الصلاة نافلة: فيجب تعيينها ان كانت معينة او

موقتة بوقت كصلوة الكسوف والاستسقاء والتراويح والوتر والسنن الرواتب.

(۲۵۱) موٹر سائیکل پر نفل پڑھنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے چند روز قبل دوران مطالعہ میں نے ایک صحابیؓ کے حالات میں پڑھا ہے کہ انہوں نے دوران سفر سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کئے تو کیا آج بھی سواری پر بیٹھ کر اشارہ سے نوافل پڑھنا جائز ہے؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے روزانہ دو ڈھائی گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے اگر میں بھی دوران سفر سواری پر نفل نماز اشارے سے پڑھتا رہوں تو میرے لئے جائز ہوگا؟ نیز اگر میں موٹر سائیکل خود چلاؤں تو پھر نفل پڑھ سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں نفل نماز حالت سفر میں سواری پر پڑھنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لہٰذا ہمارے فقہاء کرام نے شہر سے باہر نفل نماز اشارہ سے پڑھنے کے جواز کے قول کو اختیار کیا ہے البتہ اگر سواری خود چلا رہا ہے تو شرط یہ ہے کہ عمل کثیر نہ پایا جائے اگر سواری چلاتے وقت عمل کثیر پایا گیا تو نماز درست نہ ہوگی۔ اور چونکہ موٹر سائیکل چلاتے وقت عام طور سے عمل کثیر پایا جاتا ہے اس لیے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے نماز پڑھنا درست نہیں۔

لما في الشامية (۳۸/۲): (قوله خارج المصر) هذا هو المشهور، وعندهما يجوز في المصر، لكن بكراهة عند محمد لانه يمنع من الخشوع وتمامه في الحلية

(قوله محل القصر): بالنصب بدل من خارج المصر وفائدته شمول خارج القرية وخارج الاخبية ح اى المحل الذى يجوز للمسافر قصر الصلاة فيه وهو الصحيح بحر ......

(قوله ولو سيرها): ذكره في النهر بحثا اخذا من قولهم اذا حرك رجله أو ضرب دابته فلا بأس به اذا لم يكن كثيرا.

(۲۵۲) وتروں کے بعد دو رکعت کا مخصوص سورتوں کے ساتھ ثبوت

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتوں کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو تو ان کی ترتیب اور فضیلت بھی بیان فرما دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتیں، سورۃ اذا زلزلت اور سورۃ الکافرون کے ساتھ پڑھنا حدیث سے ثابت ہے۔ البتہ ان کو لازم نہ سمجھا جائے۔ کبھی کبھار ترک بھی کر دینا چاہئے۔ تاکہ واجب کا اعتقاد نہ ہو۔ اور ابن خزیمہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ تم رات کے قیام کو لازم پکڑو، کیونکہ بے شک یہ تم سے پہلے نیک لوگوں کا طریقہ رہا ہے اور قربت کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے کا ذریعہ ہے اور طبرانی میں ہے کہ جو نماز، نماز عشاء کے بعد سونے سے پہلے پڑھی جائے وہ صلوۃ اللیل

بھی ثابت ہوتی ہے۔

لما في مشكوة المصابيح (ص۱۱۲): عن ام سلمة ان النبي ﷺ كان يصلي بعد الوتر ركعتين.

وفيه ايضاً: عن ثوبان عن النبي ﷺ قال ان هذا السهر جهد وثقل فاذا اوتر احدكم فليركع ركعتين فان قام من الليل والا كانتا له.

وفيه ايضاً: عن ابي امامة (رضي الله عنه) ان النبي ﷺ كان يصليهما بعد الوتر وهو جالس يقرأ فيهما اذا زلزلت وقل يايها الكافرون.

وفي الشامية (۲/۲۴): قال في البحر، فمنها ما في صحيح مسلم مرفوعاً افضل الصلاة بعد الفريضة صلاة الليل، وروى الطبراني مرفوعاً ((لابد من صلاة بليل ولو حلب شاة وما كان بعد صلاة العشاء فهو من الليل)) وهذا يفيد ان هذه السنة تحصل بالتنفل بعد صلاة العشاء قبل النوم.

وفيه ايضاً (۱/۳۸۱): وكذا قالوا بسنية قراءة السور الثلاثة في الوتر مع الترك احياناً لئلا يعتقد وجوبها.

(۲۵۳) فوت شدہ نماز کے بارے میں یاد نہیں کہ کونسی تھی تو اس کی قضا کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار سال قبل میں ساتھیوں کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے گیا تھا، وہاں میں نے قصداً سستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی تھی، اب میں اس پر بہت نادم ہوں اور مجھے وہ نماز بھی یاد نہیں ہے کہ ظہر کی نماز چھوڑی تھی یا عصر کی، تو اب میں کیا کروں، کوئی شرعی حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر کسی سے کوئی نماز فوت ہو جائے لیکن اس کو یہ یاد نہ ہو کہ کونسی نماز فوت ہوئی ہے تو پورے دن کی نمازوں کی قضا کرے، صورتِ مسئولہ میں آپ کو چونکہ صرف ظہر اور عصر میں تردد ہے اس لئے صرف ان دونوں کی قضا کرلیں۔

لما في فتاوى سراجية (ص۱۱۹): رجل فاتته صلاة من يوم وليلة ولا يدري اية صلاة هي اعاد صلاة يوم وليلة احتياطاً.

وفي الهندية (۱/۱۲۳): رجل نسي صلاة ولا يدريها ولم يقع تحريه على شيء يعيد صلاة يوم وليلة عندنا كذا في الظهيرية.

(۲۵۴) چھوڑی ہوئی نمازوں اور روزوں کی قضاء کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عمر پچاس سال ہے اللہ پاک نے کافی مال سے

نواز اب ہے اور اولاد بھی دی ہے لیکن آج تک میں احکام خداوندی سے دور تھا نماز اکثر چھوڑ دیتا تھا روزے بھی کبھی رکھ لیے اور کبھی چھوڑ دیے اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک جماعت والے آئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے میں نے ایک چلہ جماعت کے ساتھ لگایا تو اب ندامت ہوتی ہے میں نے ساری عمر ضائع کی ہے۔ تو ابھی وقت اللہ پاک سے توبہ کرلی اور آئندہ نماز نہ چھوڑنے کا عزم کیا ہے۔ کیا چھوٹے روزے اور نمازیں جو چھوڑ دیں معاف ہوجائیں گی یا ان کیلئے مزید کوئی اور حکم ہے؟ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں میں انتہائی پریشان ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ..... جتنے روزے اور نمازیں آپ نے چھوڑی ہیں ان سب کی قضاء آپ پر لازم ہے۔ اور قضاء کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت سے استغفار بھی کریں۔ اس لیے کہ بغیر عذر نماز، روزہ وغیرہ کو چھوڑنا بہت سخت گناہ ہے۔

لما فی مصنف ابن ابی شیبہ (۲/ ۳۴۷): عن سعید بن المسیب قال جاء رجل النبی ﷺ فقال انی افطرت یوماً فی رمضان فقال له النبی ﷺ تصدق واستغفر الله وصم یوماً مکانه.

وفی الدر المختار (۲/ ۶۵): والقضاء فعل الواجب بعد وقته. وفیه (۲/ ۶۲) اذا لتاخیر بلا عذر کبیرة لاتزول بالقضاء بل بالتوبة او الحج

وفی الشامیة تحته: قوله (لاتزول بالقضاء) وانما یزول اثم الترک فلا یعاقب علیها اذا قضاها واثم التاخیر باق بحر.

(۳۵۵) وقتی اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب کا حکم

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کی فجر، ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں قضا ہوجائیں تو ترتیب کے ساتھ یہ نمازیں پڑھنا ضروری ہے یا بغیر ترتیب بھی پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے فجر کی نماز رہ گئی تو ظہر کی جماعت کا وقت ہوجانے پر کیا پہلے فجر کی نماز پڑھنا ضروری ہے یا ظہر کی نماز پڑھ کر پھر فجر پڑھ لیں، امام ومقتدی کے اعتبار سے اس مسئلے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً .....(۱) کسی کی فجر، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضاء ہوجائیں، اگر وہ شخص صاحب ترتیب ہے (صاحب ترتیب اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ذمے چھ نمازیں باقی نہ ہوں، چاہے پرانی ہوں یا نئی مسلسل ہوں یا متفرق، اگر کسی کے ذمے چھ نمازوں کی قضاء باقی ہوتو وہ صاحب ترتیب نہیں) تو ترتیب کے ساتھ ان نمازوں کو ادا کرنا اس کیلئے ضروری ہے۔ اگر صاحب ترتیب نہیں تو ترتیب کا لحاظ رکھنا بہتر ہے اور بغیر ترتیب کے پڑھنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ابھی تک ادا نہیں کرسکا تھا کہ ظہر کی جماعت کا وقت ہوگیا اگر وہ امام ہے اور صاحب ترتیب بھی ہے تو اس صورت میں اگر مقتدی حضرات امام کے قضاء نماز ادا کرنے تک انتظار کو گوارا کرتے ہوں تو امام پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں جماعت کرائے، اگر مقتدی حضرات انتظار کو گوارا نہیں کرتے تو کسی اور شخص سے

جماعت کروائے اور خود پہلے قضا نماز پڑھے بعد میں وقتی نماز، اگر وہ شخص امام نہیں بلکہ عام آدمی ہے تو صاحب ترتیب ہونے کی صورت میں اس کیلئے بھی پہلے قضا نماز ادا کرنا ضروری ہوگا بعد میں وقتی نماز پڑھے گا۔ صاحب ترتیب نہ ہونے کی صورت میں پہلے وقتی نماز پڑھ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ترتیب آدمی کیلئے وقتی نمازوں اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب قائم رکھنا ضروری ہے، غیر صاحب ترتیب کے لئے ضروری نہیں۔

لما في الدر المختار (۲/۶۸، ۶۹): (و) إن فاتت ست اعتقادية) لدخولها في حد التكرار المقتضي للحرج (بخروج وقت السادسة) على الأصح (ولو متفرقة أو قديمة) على المعتمد.

وفي الشامية تحته: ولا يسقط الترتيب الا بفوت ست صلوات (قوله ولو متفرقة) اى يسقط الترتيب بصيرورة الفوائت ستا ولو كانت متفرقة.

(۳۵۶) امدادی کاروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں زلزلہ آگیا تھا اور اکثر آبادی اپنے گھروں میں دب گئی تھی (تقریباً ۲۰۰ افراد) لیکن ہم ۸ دوست زلزلے میں دبنے سے رہ گئے تو کیا ہم امدادی کاروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کر سکتے ہیں؟ کیونکہ ہم نے لوگوں کو ملبے سے نکالنے کیلئے اپنی کافی ساری نمازیں قضا کر دی تھیں اور کافی لوگوں کو ملبے سے زندہ نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ تمام نمازیں بروقت باجماعت ادا کرے۔ تاہم اگر کسی عذر شرعی کی بناء پر نماز میں تاخیر ہو جائے اور وقت میں ادا نہ ہو سکے تو اس کی قضا کرنے میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ لہٰذا آپ نے اگر امدادی کاروائیوں میں شریک ہو کر دوسرے مسلمانوں کی جان بچاتے ہوئے نمازیں قضا ہوگئی ہیں تو امید ہے کہ عنداللہ مؤاخذہ نہ ہوگا۔ البتہ آپ کیلئے ضروری ہے کہ آپ ان نمازوں کی جلد از جلد قضا کریں۔

لما في صحيح البخاري (۱/۷۶): سألت النبي ﷺ اى العمل احب الى الله قال الصلوة على وقتها قال ثم اى قال ثم بر الوالدين قال ثم اى قال الجهاد في سبيل الله قال حدثني بهن ولو استزدته لزادني.

وفي الدر المختار مع الشامية (۲/۶۲): ومن العذر العدو وخوف القابلة موت الولد لأنه عليه الصلاة والسلام اخرها يوم الخندق.

قال الشامي رحمه الله تعالى تحته: قوله ومن العذر اى لجواز تاخير الوقتية عن وقتها. قوله العدو كما اذا خاف المسافر من اللصوص او قطاع الطريق جاز له ان يؤخر الوقتية لأنه بعذر.

وفي مراقي الفلاح (ص۲۷۱): من تاخير الصلوة وتركها (يجب قطع الصلوة) ولو فرضاً باستغاثة شخص

ملهوف لمهم أصابه كما لو تعلق به غالم أو وقع في ماء أو صال عليه حيوان فاستغاث بالمصلي.

(۳۵۷) دورانِ نماز دورہ پڑ جائے تو اس نماز کی قضاء کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرا چھوٹا بھائی اسلم جس کی عمر تقریباً ۲۰ سال ہے گزشتہ رات عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک دورہ پڑ گیا اور گر گیا تقریباً ۴۲ گھنٹے بعد بحمد اللہ ہوش میں آ گیا۔ اب جو نمازیں اس کی رہ گئی ہیں ان کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا وہ نماز جس کو شروع کیا تھا دورہ پڑ گیا تو اس کی قضا بھی واجب نہیں یا اس کی قضاء واجب ہے؟ اس لئے کہ اس کو شروع کیا تھا اور جب نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑ دیا جائے تو احناف کے نزدیک اس کی قضاء واجب ہے لہٰذا مفتی صاحب آپ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً اگر کوئی شخص دورانِ نماز بے ہوش ہو جائے اور پانچ نمازوں تک بے ہوش رہے تو قضاء واجب ہوگی۔ البتہ اگر پانچ نمازوں سے زائد وقت گزر جائے تو قضاء واجب نہ ہوگی۔ صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی اسلم اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت بے ہوش رہے تو ان پر قضاء واجب نہ ہوگی۔ اور اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت میں یا اس سے کم بے ہوش رہے تو شروع کی ہوئی نماز سمیت تمام نمازوں کی قضاء واجب ہوگی۔

لما في الهندية (۱/۱۳۷): ومن أغمي عليه خمس صلوات قضى ولو أكثر لا يقضي والجنون كالإغماء وهو الصحيح ثم الكثرة تعتبر من حيث الأوقات عند محمد رحمه الله تعالى وهو الأصح.

وفي الدر المختار (۲/۱۰۲): (ومن جن أو أغمي عليه) ولو بفزع من سبع أو آدمي (يوما وليلة قضى الخمس وإن زاد وقت صلوة) سادسة (لا) للحرج.

وفي الشامية تحته: (ومن جن أو أغمي عليه) الجنون آفة تسلب العقل والإغماء آفة تستره الى ان قال: واعتبر الزيادة بالأوقات على قول الثالث وهو الأصح.

وفي الفقه الإسلامي وأدلته (۱/۶۲۸، ۶۲۷): فلو جن البالغ أو أغمي عليه أو حاضت المرأة أو نفست في أول الوقت أو أثناءه بحيث يمكنه أداء الصلاة وجب عليه عند الجمهور غير الحنفية قضاء تلك الصلوة إن مضى قدر الفرض مع الطهر، ولا تجب الصلاة الثانية التي تجمع معها لأن وقت الأولى لا يصلح للثانية إلا إذا صلاهما جمعاً بخلاف العكس الى ان قال: وقال الحنفية لا تجب صلاة تلك الوقت على أصحاب الأعذار هؤلاء. لأن سبب إيجاب الصلوة: هو الجزء الذي يتصل به الأداء من الوقت فإن لم يؤد تعين الجزء الأخير الذي يسع الواجب للسببية، وبعد خروج الوقت تضاف السببية الى جملة الوقت.

ومضان ثمان ركعات، ثم اوتر، فلما كانت القابلة اجتمعنا في المسجد ورجونا أن يخرج إلينا حتى اصبحنا ثم دخلنا فقلنا يا رسول الله..... فهذا كما تراه ليس فيه الابيان فعله الجزئي في ليلة واحدة فقط دون سائر الليالي بل ليس فيه التصريح بنفي الزائد على الثمان في تلك الليلة ايضاً فانه يمكن ان يكون هو ﷺ قد صلى قبل الخروج اليهم منفرداً عنهم ماشاء الله من الركعات ثم صلى بهم ثمان ركعات والوتر.

وفي ايضاً(۱۱۰/۵): واحاديث الزيادة على فعله في بعض الاوقات نادراً وحينئذ فلا منافاة بين حديث عائشة وبين ماروى ابن ابى شيبة والطبراني والبيهقي من حديث ابن عباسؓ باسناد ضعيف "انه عليه الصلاة والسلام كان يصلي في رمضان عشرين ركعة سوى الوتر" أي في بعض الليالي. لا في اكثرها والمسئلة ليست من الفرائض والواجبات بل هي من الفضائل والتطوعات والحديث الضعيف مقبول فيها اذا لم يعارضه حديث صحيح وقد بينا أنه لا معارضة بين حديث العشرين وحديث عائشة اذا حمل حديثها على الاوقات الغالبة والأحوال الاكثرية ولاسيما اذا اتفق جمهور الصحابة والتابعين على العشرين في اخر الامر قال البيهقي "ثم استقر الأمر على العشرين فانه المتوارث."

وفي فتح الباري(۱۶/۳): وظهر لي أن الحكمة في عدم الزيادة على احدى عشرة أن التهجد والوتر مختص بصلاة الليل وفرائض النهار الظهر وهي أربع والعصر وهي أربع والمغرب وهي ثلاث وتر النهار فناسب ان تكون صلوة الليل كصلاة النهار في العدد جملة وتفصيلاً وأما مناسبة ثلاث عشرة فبضم صلاة الصبح لكونها نهارية إلى ما بعدها.

(۲۵۹) بغیر روزہ رکھے تراویح کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال . . کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سانس کا مریض ہوں روزے رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ایک روز تراویح کیلئے چلا گیا تو ایک صاحب نے کہا کہ تراویح اس شخص پر لازم ہے جو روزے رکھ رہا ہو، چونکہ آپ روزے نہیں رکھ رہے اس لئے آپ کو تراویح نہیں پڑھنی چاہیے۔ کیا اس شخص کی بات صحیح ہے؟ اور کیا روزے نہ رکھنے والا تراویح ادا کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً . تراویح سنت مؤکدہ ہے اس کا چھوڑنا اور بغیر عذر کے چھوڑنے پر اصرار کرنا جائز نہیں اور تراویح رمضان کے روزوں کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ بلکہ رمضان کے روزے اور رمضان میں رات کا قیام یعنی تراویح دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔ لہٰذا جو شخص روزہ رکھنے سے معذور ہے اور تراویح پڑھنے پر قادر ہے تو اس کو تراویح پڑھنی چاہیے۔ اگرچہ روزہ نہ رکھتا ہو۔

لما فی الهندیۃ (۱/۱۱۶): وهی سنۃ رسول اللہ ﷺ وقیل هی سنۃ عمر رضی اللہ عنہ، والاول اصح کذا فی جواهر الاخلاطی، وهی سنۃ للرجال والنساء جمیعاً کذا فی الزاهدی ونفس التراویح سنۃ علی الاعیان عندنا کما روی الحسن عن ابی حنیفۃؒ وقیل تستحب والاول اصح۔

وفی الدر المختار (۲/۴۳): (التراویح سنۃ) مؤکدۃ لمواظبۃ الخلفاء الراشدین (للرجال والنساء) اجماعاً.

وفی الشامیۃ (۲/۱۲): ولهذا کانت السنۃ المؤکدۃ قریبۃ من الواجب فی لحوق الاثم کمافی البحر، ویستوجب تارکها التضلیل واللوم کمافی التحریر ای علی سبیل الاصرار بلا عذر۔

(۲۶۰) تراویح میں امام کو کھانسی وغیرہ کے ذریعے غلطی پر متنبہ کرنا

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید تراویح پڑھاتا ہے عمرو سامع ہے زید عمرو سے کہتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی تلاوت میں ہو جائے تو آپ صرف کھانسی یا کھنکار نے کے ذریعے مجھے مطلع کیجئے اگر پھر بھی صحیح نہ کر سکا تو پھر بے شک آپ بتا بھی سکتے ہیں۔اس کے ساتھ یہ بات یاد رہے کہ یہ ساری کہانی جو حضرت قاری صاحب نے بتا رکھی ہے۔اس لئے کہ مقتدیوں کو پتہ نہ چلے کہ کیسا حافظ ہے۔آپ علماء سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں نماز کا کیا حکم ہوگا آیا نماز میں کچھ فساد تو نہیں آئے گا۔

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔نماز میں کسی عذر (مثلاً گلے میں خراش وغیرہ) کی وجہ سے کھانسنا یا غرض صحیح (مثلاً تحسین صوت یا مقتدی کا امام کو غلطی پر متنبہ کرنے پر) کھانسنا یہ مفسد صلوٰۃ نہیں۔اور اگر بلا عذر اور بلا وجہ کھانسا جائے تو اس سے نماز ٹوٹ جائے گی۔لہٰذا صورت مسئولہ میں سامع کا قاری کی تلاوت میں غلطی آنے پر اس وجہ سے کھنکارنا کہ دوسرے لوگ غلطی پر مطلع نہ ہوں اور قاری صاحب کو پتہ چل جائے اس سے نماز تو فاسد نہ ہوگی البتہ اس طرح کرنا ایک نامناسب حرکت ہے اس سے گریز کرنا چاہیے۔

لما فی الشامیۃ (۱/۶۱۹): (قوله علی الصحیح) لانه یفعله لاصلاح القراءۃ فیکون من القراءۃ معنی کالمشی للبناء فانه وان لم یکن من الصلاۃ لکنه لاصلاحها فصار منها معناً شرح المنیۃ عن الکفایۃ، لکنه لایشمل مالو کان لاعلام انه فی الصلاۃ او لیهتدی امامه الی الصواب۔ والقیاس الفساد فی الکل الا فی المدفوع الیه کما هو قول ابی حنیفۃ ومحمد لانه کلام، والنحنح مفسد علی کل حال کما مر وکأنهم عدلوا بذلک عن القیاس وصححوا عدم الفساد به اذا کان لغرض صحیح لوجود نص،

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۰۴۳): وتبطل بالتنحنح بحرفین بلاعذر، فان وجد عذر، کان نشأ من طبعه فلا تفسد، کما لا تفسد ان کان لغرض صحیح کتحسین الصوت، او لیهتدی امامه الی

الصواب، او للاعلام انه في الصلاة، فلا فساد على الصحيح، وهكذا لان التنحنح عن علة لا يفسد الصلاة.

(۲۶۱) نمازِ تراویح کی بیس رکعات کا دو اماموں کا پڑھانا

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح کیلئے دو امام ہوتے ہیں ایک امام صاحب سولہ رکعت پڑھاتے ہیں اور دوسرے چار رکعت پڑھاتے ہیں دونوں مل کر قرآن پاک مکمل سناتے ہیں معلوم یہ کرنا ہے کہ نمازِ تراویح دو امام پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ تراویح کی نماز دو امام پڑھا سکتے ہیں۔

لمافي خلاصة الفتاوى (۱/۶۴): اذا صلى الترويحة الواحدة امامان كل امام ركعتين اختلف المشايخ فيه والاصح انه لا يستحب لكن كل ترويحة يؤديها امام واحد.

وفي الهندية (۱/۱۱۶): واذا جازت التراويح بامامين على هذا الوجه جاز ان يصلي الفريضة احدهما ويصلي التراويح الاخر وقد كان عمرؓ يؤمهم في الفريضة والوتر وكان ابي يؤمهم في التراويح كذا في السراج الوهاج.

(۲۶۲) تراویح میں ایک امام کا بارہ رکعات، دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں دو سال سے یہ معمول ہو گیا ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح دو امام پڑھاتے ہیں۔ ایک بارہ رکعات اور دوسرا آٹھ رکعات تو کیا ایک مصلے پر دو امام ایک قرآن سنا سکتے ہیں؟ یا ایک ہی کو سنانا چاہیے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کے دور میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟ اور افضل صورت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ ایک امام کا بارہ رکعات اور دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا درست ہے۔ جبکہ ایک امام پورا ایک ترویحہ پڑھائے۔ رہی یہ بات کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اس کی کوئی مثال تو اس کے متعلق صاحب الجوہرۃ النیرۃ علامہ ابو بکر بن محمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز اور وتر پڑھاتے اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نمازِ تراویح پڑھاتے تھے۔ لہٰذا دو اماموں کا نماز پڑھانا اور انصراف جائز ہے۔

لمافي الجوهرة النيرة طبع مكتبه رحمانيه (۱/۲۳۶): والأفضل أن يصلّي التراويح بامام واحد لأنّ عمر رضي الله عنه جمع الناس على قارئ واحد، وهو أبي بن كعب رضي الله عنه، فان صلوها بامامين فالمستحب ان يكون انصراف كل واحد على كمال الترويحة فان انصرف على تسليمة، لا

يستحب ذلك وكان عمر رضي الله عنه يؤمهم في الفريضة والوتر وكان أبي بن كعب رضي الله عنه يؤمهم في التراويح

وفي فتاوى قاضي خان(۱/۱۱۲): ولو أقاموا التراويح بإمامين فصلّى كل إمام تسليمة بعضهم جوّزوا ذلك والصحيح أنه لا يستحب وإنما يستحب أن يصلي كل إمام ترويحة ليكون موافقا عمل أهل الحرمين.

وفي الهندية(۱/۱۱٦): والأفضل أن يصلّي التراويح بإمام واحد فإن صلّوها بإمامين فالمستحب أن يكون انصراف كل واحد على كمال الترويحة فإن انصرف على تسليمة لا يستحب ذلك في الصحيح.

(۲٦۳) فلیٹ میں نماز پنجگانہ اور تراویح پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ ماریہ ٹاور کی اپارٹمنٹ میں ابھی حال ہی میں رہائش پذیر ہوئے ہیں یہاں ہمارے فلیٹ ہیں کیونکہ یہاں نہ کوئی مسجد بنائی گئی ہے اور نہ ہی کوئی مسجد کی جگہ دی ہے لہٰذا ہم لوگ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ماریہ فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز تراویح اور پنجگانہ وقت کی نماز ادا کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صحت نماز کیلئے مسجد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ زمین کے ہر ہر جزء اور موضع میں نماز جائز ہے اگرچہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز پنجگانہ اور تراویح جائز ہے۔ البتہ اس جگہ کی حیثیت شرعاً مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ مسجد کیلئے ضروری ہے کہ مالک اس جگہ میں ہمیشہ کیلئے لوگوں کو نماز کی اجازت دیتے ہوئے اس کو اپنی ملکیت سے خارج کردے چنانچہ پھر یہ جگہ اس کی میراث میں بھی تقسیم نہ ہوگی جبکہ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے۔

لما في البخاري(۱/٦۲): باب قول النبيّ جعلت لي الأرض مسجدا وطهورا. عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ أعطيت خمسا لم يعطهن أحد من الأنبياء قبلي، نصرت بالرعب مسيرة شهر وجعلت لي الأرض مسجدا وطهورا الخ.

وفي البحر الرائق(٥/۲٦۸): ولو قال المصنف ومن جعل أرضه مسجدا بدل قوله ومن بنى لكان أولى لأنه لو كان له ساحة لا بناء فيها فأمر قومه أن يصلوا فيها بجماعة قالوا إن أمرهم بالصلوة فيها أبدا أو أمرهم بالصلوة فيها بالجماعة ولم يذكر أبدا إلا أنه أراد بها الأبد ثم مات لا يكون ميراثا عنه وإن أمرهم بالصلاة شهرا أو سنة ثم مات تكون ميراثا عنه لأنه لا بد من التأبيد والتوقيت ينافي التأبيد كذا في الخانية.

(۲۶۴) نمازِ تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد قہوہ پینا

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب نمازِ تراویح میں چار رکعت کے بعد قہوہ پیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس سے میرا گلا صاف ہو جاتا ہے؟ تو کیا تراویح کی نماز کے دوران اس عذر پر قہوہ پینا درست ہے؟ نمازِ تراویح مکروہ تو نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً... اگر کوئی میٹھی چیز پی کر نماز کے اندر داخل ہو جائے جبکہ اس کے منہ میں مٹھاس باقی ہو اور وہ اس کو نگلتا ہے تو اس سے نماز کی صحت پر کچھ فرق نہیں آئے گا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تراویح کی نماز کے دوران جبکہ عذر بھی ہے قہوہ پینا جائز ہے۔

لما فی الھندیۃ(۱/۱۰۲): اذا کان بین اسنانہ شیٔ من الطعام فابتلعہ ان کان قلیلاً دون الحمصۃ لم تفسد صلوتہ الا انہ یکرہ وان کان مقدار الحمصۃ فسدت......

......ولو اکل شیأ من الحلاوۃ وابتلع عینھا فدخل فی الصلوۃ فوجد حلاوتھا فی فیہ فابتلعھا لا تفسد صلوتہ ولو ادخل الفانید او السکر فی فیہ ولم یمضغہ لکن یصلی والحلاوۃ تصل الی جوفہ تفسد صلاتہ.

وفی الشامیۃ(۱/۶۲۳): قولہ کسکر الخ، افاد ان المفسد اما المضغ الکثیر او وصول عین الماکول الی الجوف بخلاف الطعم. قال فی البحر عن الخلاصۃ: ولو اکل شیأ من الحلاوۃ وابتلع عینھا فدخل فی الصلاۃ فوجد حلاوتھا فی فیہ وابتلعھا لاتفسد صلاتہ، ولو ادخل الفانید او السکر فی فیہ ولم یمضغہ لکن یصلی والحلاوۃ تصل الی جوفہ تفسد صلاتہ.

(۲۶۵) نمازِ تراویح کے بعد اجتماعی دعا مانگنے کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نماز اور تراویح اور اسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان المبارک میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دعا انفرادی طور پر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کی دلائل اور جو شریعت سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا مانگنا ثابت ہے البتہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا پر ایسا التزام و دوام کرنا کہ جو شخص اس اجتماعی دعا میں شامل نہ ہو رہا ہو اس پر طعن و تشنیع کی جائے درست نہیں نیز تراویح کے بعد اجتماعی طور پر دعا ثابت تو نہیں البتہ تلاوتِ قرآن کے بعد دعا کے قبول ہونے کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں اس لئے کبھی کبھار ترک کے ساتھ توحت کے بغیر اگر تراویح کے بعد دعا کر لی جائے تو حرج نہیں اور اکابرین سے یہ متوارث بھی ہے تاہم رمضان کے وتر کی

جماعت کے بعد بھی اسی اجتماعی ہیئت سے دعا مانگنا ثابت نہیں۔

لما فی اعلاء السنن (۳/۱۹۳): واعلم انه قد وقع العرف فی دیارنا ان الامام والقوم یدعون مستقبل القبلة رافعی ایدیهم عقیب السلام معا فی الظهر والمغرب والعشاء ولا ینحرف الامام فی هذه الاوقات عن القبلة وبعد العصر والفجر ینحرف یمینا وشمالا ویقرأ شیئا من الورد جالسا، وكذا القوم معه ثم یدعون فانكر بعض الناس علی ذلك بوجهین اما اولا فلعدم انحراف الامام یمینا وشمالا فی الظهر والمغرب والعشاء ودعائه مستدبرا للمامومین. وقد ثبت انه ﷺ كان ینحرف دائما، واما ثانیا فلان الدعاء بعد السلام من الصلاة لم یثبت عنه ﷺ بل عامة الادعیة المتعلقة بالصلاة انما فعلها فیها، وامر بها فیها. والجواب عن الاول بانه قد ثبت عنه ﷺ انه دعا فی بعض الاحیان مستقبل القبلة مستدبرا القوم . وعن الثانی بان الدعاء بعد السلام ثبت عنه ﷺ، قولا وفعلا، وانكار ذلك مكابرة الخ . .

وفیه ایضاً (ص۱۹۳): قوله عن ابی امامة الخ، قلت فیه اثبات الدعا بعد الصلاة فاندحض به ما ورده ابن القیم ان الدعاء بعد السلام من الصلاة مستقبل القبلة او المامومین. فلم یكن من هدیه ﷺ اصلا ولا روی عنه باسناد صحیح ولا حسن ..... قلت قد ثبت ذلك عنه ﷺ قولا وفعلا فهذا حدیث ابی امامة فیه ارشاد الامة بالدعاء بعد الصلوات المكتوبات واما تاویله بان المراد من دبر الصلوات ما قبل السلام كما زعمه ابن القیم فباطل. ... فان فیه یسبحون دبر كل صلاة وهو بعد السلام جزما

وفی سنن الدارمی (۲/۵۶۱): عن مجاهد قال بعث الی قال انما دعوناك انا اردنا ان نختم القرآن وانه بلغنا ان الدعاء یستجاب عند ختم القرآن قال فدعوا بدعوات.

(۲۶۶) تراویح کی جماعت ثانی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چچا زاد بھائی امریکہ میں رہتے ہیں انہوں نے ایک مسئلہ معلوم کروایا ہے کہ امریکہ میں بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں محراب میں تھوڑے وقفے سے دو الگ تراویح کی جماعت ہوتی ہیں، دراصل لوگوں کی ڈیوٹی کا مسئلہ یہ مجبوری ہے کہ یوں کرنا پڑتا ہے؟ اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً فرض نماز میں جماعت ثانی جماعت اولیٰ کی تبدیل ہیئت کے باوجود مکروہ ہے لیکن تراویح میں فرائض کی بنسبت توسع ہے اس لئے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے تراویح کی جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ

درست ہے اور ہمارے اسلاف رحمہ اللہ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ امداد الاحکام (۱/۶۳۳) میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ چونکہ آپ کے مسئلہ میں جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت پر ہے اس وجہ سے یہ دوسری جماعت مکروہ ہے نیز اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی دوسری مرتبہ تراویح کی جماعت کرواتے ہیں تو یہ جماعت ثانی مکروہ ہے خواہ مسجد میں پڑھیں یا مسجد سے باہر پڑھیں۔

لمافی الشامیۃ (۱/۵۵۳): عن ابی یوسف رحمہ اللہ انہ اذا لم تکن الجماعۃ علی الھیئۃ الاولی لا تکرہ والا تکرہ وھو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الھیئۃ کذا فی البزازیۃ.

وفی کبیری (ص۳۸۹): ولو ام فی التراویح مرتین فی مسجد واحد کرہ.

وفی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص۳۳۵): وکرہ ان یوم فی التراویح مرتین فی لیلۃ واحدۃ وعلیہ الفتوی لان السنۃ لاتتکرر فی الوقت الواحد فتقع الثانیۃ نفلا مضمرات.

وفی قاضی خان (۱/۱۱۲): ولو صلی التراویح مرتین فی مسجد واحد یکرہ کما لو اذن واقام مرتین فی مسجد واحد واختار الفقیہ ابو اللیث قول ابی بکر ھذا اذا ام للناس مرتین.

وفی الھندیۃ (۱/۱۱۶): ولو صلی التراویح مرتین فی مسجد واحد یکرہ.

(۲۶۷) عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت چھوڑنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک بچپن کے دوست ہیں ہم دونوں کلاس فیلو بھی رہے ہیں ان بیچاروں کو ڈکار کا مرض ہے اور ڈکاریں بھی گیس کی آتی ہیں۔ نماز تراویح میں انہیں بڑی پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آیا اس صورت میں وہ نماز تراویح چھوڑ سکتے ہیں؟ یا تنہا گھر پر پڑھ لیا کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... اگر گیس کی ڈکاریں ایسی ہوں کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو مثلاً ان میں بدبو ہو یا ڈکاریں ایسی آواز ہوں کہ جن کی وجہ سے پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہو، تو ایسی صورت میں تراویح کی نماز گھر پہ ادا کر سکتا ہے۔ البتہ بغیر عذر کے تراویح کی نماز کو بالکل چھوڑ دینا جائز نہیں کیونکہ تراویح سنت مؤکدہ ہے اور بغیر عذر کے سنت مؤکدہ کے چھوڑنے پر اصرار کرنے میں گناہ ہے۔

لمافی الشامیۃ (۲/۱۲): (قولہ سن مؤکدا) ...... زیادۃ علی بقیۃ النوافل ولھذا کانت السنۃ المؤکدۃ قریبۃ من الواجب فی لحوق الاثم کمافی البحر، ویستوجب تارکھا التضلیل واللوم ...... ای علی سبیل الاصرار بلا عذر.

وفی الشامیۃ (۱/۶۶۱): کل مالہ رائحۃ کریھۃ ماکولا او غیرہ ...... وکذلک الحق بعضھم بذلک من بفیہ بخراو بہ جرح لہ رائحۃ وکذلک القصاب والسماک والمجذوم والابرص اولی بالالحاق

وقال سحنون لاأری الجمعة علیهما.

وفی الهندیة(۱/۸۳): وتسقط الجماعة بالاعذار حتی لا تجب علی المریض والمقعد والزمن ومقطوع الید والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذی لا یستطیع المشی والشیخ الکبیر العاجز والاعمی عند ابی حنیفة رحمه الله تعالی والصحیح انها تسقط بالمطر والطین والبرد الشدید والظلمة الشدیدة کذا فی التبیین وتسقط بالریح فی اللیلة المظلمة او کان اذا خرج یخاف ان یحبسه غریمه فی الدین او یرید سفرا واقیمت صلاة فیخشی ان تفوته القافلة او کان قیما لمریض او یخاف ضیاع ماله.

وفی الدر المختار(۱/۵۵۳، ۵۵۵، ۵۵۶): (قیل واجب) لمرتبة تظهر فی الإثم بترکها مرة (علی الرجال العقلاء البالغین الأحرار القادرین علی الصلاة بالجماعة من غیر حرج) ولو فاتته ندب طلبها فی مسجد آخر الا المسجد الحرام ونحوه (فلا تجب علی مریض ومقعد وزمن ومقطوع ید ورجل من خلاف) او رجل فقط (وبرد شدید وظلمة کذلک) وریح لیلا لانهارا، وخوف علی ماله او من غریم او ظالم او مدافعة أحد الأخبثین الخ.

(۲۶۸) بیس رکعات تراویح کا دورانیہ کتنا ہو؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں حفاظ نمازِ تراویح مختلف انداز اور رفتار سے پڑھاتے ہیں۔ کوئی تو ڈیڑھ دو گھنٹے لگادیتا ہے اور کوئی آدھ پون گھنٹے میں فارغ کردیتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ بیس رکعات نمازِ تراویح کتنی دیر میں ختم ہونا چاہیے؟ اس بارے میں شریعت کا کوئی حکم ہے؟ اگر ہے تو براہ کرم رہبری فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً بیس رکعات نمازِ تراویح ختم کرنے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں، قاری کی اس رفتار کا اعتبار ہے جو شریعت میں معتبر ہے لہٰذا شرعاً اتنی مقدار پڑھنے کی اجازت ہے جس سے لوگ تراویح کی جماعت میں آنے سے متنفر نہ ہوں اور اتنی سرعت کے ساتھ پڑھنا کہ الفاظ پوشیدہ رہ جائیں یا اپنے مخارج سے ادا نہ ہوں مکروہ ہے بلکہ یہیں ہیں ہو بلکہ نہ تو اتنی تیز رفتاری ہو کہ کچھ سمجھ میں ہی نہ آئے اور نہ اتنی سست روی کہ لوگ اکتا جائیں۔

لما فی الهندیة(۱/۱۱۸): والافضل فی زماننا ان یقرأ بما لا یؤدی الی تنفیر القوم عن الجماعة لکسلهم لان تکثیر الجمع افضل من تطویل القراءة.

وفی الشامیة(۱/۵۴۱): (قوله وفی الحجة) اسم کتاب من کتب الفتاوی (قوله بین بین) ای بان تکون بین الترسل والاسراع.

وفي الفقه الاسلامي وادلته (۲/۱۰۹۰): قال احمد رحمه الله: يقرأ الامام بالقوم في شهر رمضان ما يخف على الناس ولا يشق عليهم

(۲۶۹) نمازِ تراویح کے بعد قرآن مجید کا خلاصہ بیان کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس رمضان میں پورے مہینے میری رات کی ڈیوٹی رہی میں اپنی فیکٹری کے قریب جا کر ہی ایک مسجد میں تراویح پڑھتا تھا۔ چونکہ ڈیوٹی کا وقت تھوڑی دیر میں شروع ہوتا تھا اس لئے تراویح کے بعد تھوڑی دیر بھی تلاوت کا معمول بنانے کا سوچا تھا لیکن اس مسجد میں تراویح کے بعد تھوڑی دیر خلاصہ سنایا جاتا تھا، میں بھی اس میں شریک ہو جاتا تھا، مجھے یہ انداز بہت اچھا لگا لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ بدعت میں تو شمار نہیں ہوتا؟ آپ مجھے اس بارے میں صحیح صحیح بتا دیں کہ آئندہ میں اسی کے مطابق عمل کروں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: ہر وہ کام جو دین میں نہ ہو بلکہ اسے دین سمجھ کر کرنا بدعت کہلاتا ہے۔ لہٰذا تراویح کے بعد خلاصہ بیان کرنا بدعت نہیں۔ بلکہ یہ اشاعت الدین کے زمرہ میں آتا ہے۔ اور اس کے لئے ہر وہ صورت جو کہ قواعد شرع کے خلاف نہ ہو اختیار کرنا جائز ہے۔ جبکہ دیگر موانع موجود نہ ہوں مثلاً نمازیوں کو اس طور سے پابند کرنا نہ پایا جاتا ہو کہ جس سے وہ دین کی بات سننے سے اکتا جائیں۔ حاصل کلام یہ کہ جو لوگ اپنی خوشی سے آمادگی کے ساتھ بیٹھ کر سننا چاہیں ان کیلئے مناسب مقدار میں بیان کر دینا چاہئے۔

لما في مرقاة المفاتيح (۱/۲۱۶): قال النووي رحمه الله: البدعة كل شيء عمل على غير مثال سبق وفي الشرع احداث ما لم يكن في عهد رسول الله ﷺ.

وفي فتح الباري (۱/۱۶۳): قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس فقال له رجل يا ابا عبد الرحمن لوددت انك ذكرتنا كل يوم قال اما انه يمنعني من ذلك اني اكره ان املكم واني اتخولكم بالموعظة كما كان النبي ﷺ يتخولنا بها مخافة السآمة علينا.

ويستفاد من الحديث استحباب ترك المداومة في الجد في العمل الصالح خشية الملال وان كانت المواظبة مطلوبة لكنها على قسمين اما كل يوم مع عدم التكلف واما يوما بعد يوم فيكون يوم الترك لاجل الراحة ليقبل على الثاني بنشاط واما يوما في الجمعة ويختلف باختلاف الاحوال والاشخاص والضابط الحاجة مع مراعاة وجود النشاط.

(۲۷۰) تراویح میں دوسرے ختم کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں ایک قاری صاحب نے قرآن

﴿فصل فی الوتر﴾

(وتر سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۷۱) دعائے قنوت کے وقت ہاتھ کانوں تک اٹھانا، اور قنوت نازلہ پڑھنے کا وقت

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا قرآن وحدیث میں وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اور قنوت کے وقت ہاتھ کہاں باندھے؟ اور قنوت نازلہ کن کن نمازوں میں پڑھی جاسکتی ہے، اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھ باندھتے ہیں یا چھوڑتے ہیں؟ کن حالات میں قنوت نازلہ پڑھنی چاہیے؟ جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین ثابت ہے البتہ اگر وتر فوت ہوجائے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھنا ہو تو ہاتھ نہ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو اس کی سستی پر علم نہ ہو، اور قنوت کے وقت ہاتھوں کو زیر ناف باندھے اور قنوت نازلہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صرف نماز فجر میں مسلمانوں پر سخت حالات مثلاً (قحط، وباء، خوف) کے وقت پڑھنی چاہیے اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھوں کو چھوڑنا بہتر ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۱): اذا فرغ من القراءة فی الركعة الثالثة كبر ورفع يديه حذاء اذنيه ويقنت قبل الركوع...... واختلفوا انه يرسل يديه فی القنوت ام يعتمد و المختار انه يعتمد.

وفی الدر المختار (۲/۶): (ويكبر قبل ركوع ثالثه رافعا يديه) كما مر ثم يعتمد وقيل كالداعی (وقنت فيه) (فی رد المحتار قوله رافعا يديه) ای سنة الی حذاء اذنيه كتكبيرة الاحرام وهذا كما فی الامداد عن مجمع الروايات لو فی الوقت اما فی القضاء عند الناس فلا يرفع حتی لا يطلع احد علی تقصيره (قوله ثم يعتمد) ای يضع يمينه علی يساره كما فی حالة القراءة (قوله وقيل كالداعی) ای عن ابی يوسفؒ انه يرفعهما الی صدره وبطونهما الی السماء امداد والظاهر انه يبقيهما كذلك الی تمام الدعاء علی هذه الرواية تامل.

وفی تنوير الابصار مع الدر (۲/۸،۹): (ويأتی المأموم بقنوت الوتر لا الفجر بل يقف ساكتا علی الاظهر) مرسلا يديه قال الشامی تحت (قوله مرسلا يديه) لان الوضع سنة قيام طويل فيه مسنون

وهذا الذكر ليس بمسنون عندنا.

(۲۷۲) دعائے قنوت سے پہلے رفع یدین کا حدیث سے ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ صلوٰۃ وتر میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا کہاں سے ثابت ہے آثار صحابہ اور احادیث نبوی سے مزین جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا احادیث نبوی اور آثار صحابہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ کے تعامل سے ثابت ہے۔

لما في السنن الكبرى (۲/ ۲۱۱): عن سلمان الفارسي رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال إن الله حيي كريم يستحيي إذا رفع الرجل إليه يديه أن يردهما صفرا خائبتين. رفعه جعفر بن ميمون هكذا ووقفه سليمان التيمي عن أبي عثمان في إحدى الروايتين عنه والحديث في الدعاء جملة إلا أن عددا من الصحابة رضي الله تعالى عنهم رفعوا أيديهم في القنوت مع ما رويناه عن أنس بن مالك عن النبي ﷺ.

وفي إعلاء السنن (۶/ ۸۹): عن أبي عثمان: "كان عمر رضي الله تعالى عنه يرفع يديه في القنوت.

وفي شرح معاني الآثار (۱/ ۲۱۷): وقد روي في ذلك عن إبراهيم النخعي ما حدثنا سليمن بن شعيب بن سليمن عن أبيه عن أبي يوسف عن أبي حنيفة عن طلحة بن مصرف عن إبراهيم النخعي قال ترفع الأيدي في سبع مواطن في افتتاح الصلوة وفي التكبير للقنوت في الوتر وفي العيدين وعند استلام الحجر وعلى الصفا والمروة وبجمع وعرفات وعند المقامين عند الجمرتين.

(۲۷۳) دعائے قنوت کیلئے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر باندھنے کا ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتر میں دعائے قنوت کے وقت جو ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں آیا کانوں تک اٹھا کر باندھنا کسی حدیث یا نص سے ثابت ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دعا کی صورت میں اٹھانا چاہیے ان کی بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے اور دعائے قنوت کیلئے کانوں کی لو تک ہاتھوں کو اٹھانا اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا سنت ہے۔ صورت مسئولہ میں دعائے قنوت کیلئے دونوں ہاتھوں کو اٹھانا یہ حدیث مبارک سے ثابت ہے حدیث مبارک یہ

ہے

(۱)۔ "عن ابراهيم قال: ارفع يديك للقنوت"۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۵۳۱)

(۲)۔ "عن ليث، عن ابن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعودؓ: انه كان يرفع يديه اذا قنت في الوتر"۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج۲/ ۵۳۱)

لیکن ہاتھوں کے اٹھانے میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ کانوں کی لو تک دونوں ہاتھوں کو اٹھایا گیا ہو یا دعا کی طرح دونوں ہاتھوں کو سینے تک اٹھایا گیا ہو۔ لہٰذا ان احتمالات کی وجہ سے ان احادیث کو کانوں کی لو تک اٹھانے پر بطور استدلال پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ فقہاء اور علماء کے اقوال اور افعال سے دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لو تک اٹھا کر باندھنا ثابت ہے۔ وہ اس طرح کہ دعائے قنوت میں دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لو تک اٹھانے کو احناف نے تکبیر تحریمہ پر قیاس کیا ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ میں کانوں کی لو تک اٹھانا مسنون ہے۔

اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا قیام پر جس میں طویل اور مسنون ذکر ہو، قیاس کیا ہے۔ لہٰذا فقہاء احناف نے احادیث میں رفع یدین کے دونوں احتمالوں کو قیاس سے ثابت کیا ہے۔

لما في المصنف لابن ابي شيبة (۲/ ۵۳۱): ۵۹۴. في رفع اليدين في قنوت الوتر.

۷۰۲۶. حدثنا ابو الاحوص، عن مغيرة، عن ابراهيم قال: ارفع يديك للقنوت.

۷۰۲۷. حدثنا معاوية بن هشام قال: حدثنا سفيان، عن ليث، عن عبدالرحمن بن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعود: انه كان يرفع يديه في قنوت الوتر.

۷۰۲۸. حدثنا عبدالرحمن بن محمد المحاربي، عن ليث، عن ابن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعود: انه كان يرفع يديه اذا قنت في الوتر.

وفي الدر المختار (۲/ ۶): (ويكبر قبل ركوع ثالثة رافعاً يديه) كما مر ثم يعتمد، وقيل كالداعي (وقنت فيه) ويسن الدعاء المشهور، ويصلي على النبي ﷺ به يفتى.

وفي الشامية تحته: (قوله رافعاً يديه) اي سنة الى حذاء اذنيه كتكبيرة الاحرام وهذا كما في الامداد عن مجمع الروايات لو في وقت، اما في القضاء عند الناس فلا يرفع حتى لا يطلع احد على تقصيره اهـ (قوله كما مر) اي في فصل اذا اراد الشروع في الصلوة عند قوله ولا يسن رفع اليدين الا في سبع. (قوله ثم يعتمد) اي يضع يمينه على يساره كما في حالة القراءة ح (قوله وقيل كالداعي) اي عن ابي يوسف انه يرفعهما الى صدره وبطونهما الى السماء امداد، والظاهر انه يبقيهما كذلك الى تمام الدعاء على هذه الرواية تامل (قوله وقنت فيه) اي في الوتر او الضمير الى ماقبل الركوع

وفي اعلاء السنن (۶/ ۱۰۲): واما السادس: فلم ار فقهائنا تعرضوا له خصوصاً، نعم مقتضى اطلاقهم ان من محال الرفع القنوت وهو يعم قنوت النوازل ايضاً ان يرفع يديه عنده، ولكن الدليل الذي

استدل به الحنفية للرفع في قنوت الوتر لا يعم غيره، بل يختص به، هو أثر ابراهيم النخعي بسند صحيح عند الطحاوي، قال "ترفع الأيدي في سبع مواطن، في افتتاح الصلاة وفي التكبير للقنوت في الوتر الخ.

وفيه أيضاً (ص۱۲۳، ۱۲۴): بقي أنه لا دليل فيه ولا في أثر غيره على أنه ﷺ كان يضع يديه بعد رفعهما حال سكيه او يرسلهما، فمن اين قال ابو حنيفةؒ وابو يوسفؒ بالوضع في القنوت بعده؟ والجواب: أن الوضع والارسال بعد الرفع مسكوت عنهما في الأحاديث، فيري محمدؒ على الأصل وهو الإرسال، لأن الوضع عمل حادث يحتاج الى الدليل، وأخذ الشيخان بالقياس وقالا: إن إرسال اليدين زمانا طويلا ينافي الخشوع، وإنما السنة أن تقول وضع الكف على الكف تحت السرة كما مر في باب صفة الصلاة، وكان مقتضى ذلك ان يقول بالوضع في القومة بين الركوع والسجدة أيضاً، لكن في الوضع لتمام اليسير وتركه معا حرج، فقلنا بأن الوضع سنة قيام فيه ذكر مسنون طويل، فيضع يديه في القنوت للنازلة أيضاً، لكونه ذكرا طويلا، ولا يرفعهما حذاء الوجه، فقد روى مسلم عن حصين عن عمارةؓ بن رويبة: "رأى بشر بن مروان على المنبر رافعاً يديه، فقال: قبح الله هاتين اليدين، لقد رأيت رسول الله ﷺ مايزيد على ان يقول بيده هكذا، وأشار باصبعه المسبحة اهـ (۱/۲۸۷) فلما أنكر على الرفع في حال الخطبة التي هي مشابهة بالصلاة فكيف في عين الصلاة؟ فما ورد عن النبي ﷺ أنه رفع يديه يدعو في القنوت للنازلة، وما ورد عن عمر مثله محمول على الرفع القصير الذي يكون قبل القنوت وهذا هو الأمر الناسخ فافهم.

وأيضاً (ص۱۲۳). والحاصل: أنه يضع عند الشيخين في القنوت سواء كان قبل الركوع أو بعده، وعند محمد يرسل ولا يرفع يديه في خلال القنوت حذاء الوجه او الصدر كرفعهما في الدعاء خارج الصلاة عندهم اتفاقاً، فإن المشروع عندهم بعد رفعهما في افتتاح الصلاة أو عند القنوت، إما الوضع وإما الإرسال لا إبقائهما مرفوعتين الخ

(۳۷۴) دعائے قنوت کی جگہ سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں جن عورتوں کو دعائے قنوت نہیں آتی وہ اس کی جگہ "سورۂ اخلاص" پڑھتی ہیں تو کیا اس سے دعائے قنوت کا وجوب ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا ان عورتوں پر ان سب نمازوں کی قضا کرنا واجب ہو گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...... وتر کی تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے کوئی مخصوص دعا پڑھنا واجب نہیں بلکہ کوئی بھی دعا پڑھ سکتے ہیں البتہ احناف کے نزدیک مشہور دعا "اللھم انا نستعینک ونستغفرک ونومن بک ...... الخ "پڑھنا سنت ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو یہ دعا یاد نہیں تو اسے چاہیے کہ اس کو یاد کرے اور جب تک یہ دعا یاد نہیں ہوتی اس کی جگہ دوسری دعا مثلاً "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" یا "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ" تین مرتبہ پڑھنے سے نماز درست ہو جائے گی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں جن عورتوں کو مذکورہ دعا یاد نہیں تو ان کو چاہیے کہ اس کو یاد کرنے کی کوشش کریں اور جب تک یاد نہ ہو تو مذکورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھ سکتی ہیں اس سے نماز درست ہو جائے گی۔ عام حالت میں حکم یہی ہے تاہم اگر کسی شخص کو دعائے قنوت یا کوئی دعا یاد نہیں تو اگر وہ اس کی جگہ تین مرتبہ "سورۃ اخلاص" پڑھ لیتا ہے تو اس کی نماز درست ہو جائے گی۔

لما في الشامية (۲/۶۰۷): (قوله ويسن الدعاء المشهور) قد مافي بحث الواجبات التصريح بذلك عن النهر، وذكر في البحر عن الكرخي ان القنوت ليس فيه دعاء مؤقت، لانه روى عن الصحابة ادعية مختلفة، لانّ المؤقت من الدعا يذهب برقة القلب ...... ومن لا يحسن القنوت يقول ربنا اتنا في الدنيا حسنه۔ الآية. وقال ابو ليث يقول: اللهم اغفرلي يكررها ثلاثا، وقيل يقول يارب ثلاثا، ذكره في الذخيرة.

وفي السعاية في كشف مافي شرح الوقاية، باب صفة الصلاة (۲/۱۳۹): وفي مقدمة الغزنوية: ان كان لايحسن القنوت يقرأ ثلاث مرات "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" او ثلاث مرات "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ".

وفي حاشية الطحطاوي على الدر المختار (۱/۲۸۰): (وقوله ويسن الدعاء المشهور) وهو اللهم انا نستعينك ونستهديك ونستغفرك ونتوب اليك ونومن بك ...... الخ ويجوز ان يقتصر في دعا القنوت على نحو قوله رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ او يقول يا رب ثلاثا او اللهم اغفرلي ثلاثا لانه غير مؤقت في ظاهر الرواية مطلقا سواء كان يحسن الدعا اولا......

(۴۷۵) وتر کی تیسری رکعت کے رکوع سے قنوت کیلئے لوٹنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وتر کی نماز پڑھ رہا تھا، تیسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، جب رکوع میں یاد آیا کہ دعائے قنوت نہیں پڑھی تو وہ واپس کھڑا ہو گیا اور دعائے قنوت پڑھ کر دوبارہ رکوع کیا، اب پوچھنا یہ تھا کہ آیا یہ شخص سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دے تو نماز درست ہو جائے گی یا نہیں؟ یا پھر اسے دوبارہ سے

لوٹنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر سجدہ سہو کر لیا جائے تو نماز درست ہو جائے گی۔ البتہ اس صورت میں رکوع کی طرف واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔

لما فی الشامیۃ (۸۱/۲): والحاصل ان مایقرؤہ یلتحق بما قبل الرکوع ویلغو ھذا الرکوع فیلزم اعادتہ، حتی لو لم یعدہ بطلت صلاتہ بل ذکر فی شرح المنیۃ انہ لو قام لاجل القراءۃ فلم بدا لہ فسجد ولم یقرأ ولم یعد الرکوع قال بعضھم تفسد لانہ لما انتصب قائماً للقراءۃ ارتفض رکوعہ وان کان البعض یقول لا تفسد اھ وھذا کلہ بخلاف مالو تذکر القنوت فی الرکوع فالصحیح انہ لایعود، ولو عاد وقنت لا یرتفض رکوعہ وعلیہ السھو لان القنوت اذا اعید یقع واجباً لا فرضاً.

وفی الھندیۃ (۱۲۷/۱): وکذا اذا سجد فی موضع الرکوع او رکع فی موضع السجود او کرر رکنا او قدم الرکن او اخرہ ففی ھذہ الفصول کلھا یجب سجود السھو.

(۴۷۶) رمضان میں عشاء کی نماز باجماعت نہ پڑھنے والے کا وتر باجماعت پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے رمضان المبارک میں نماز عشاء جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی تو کیا یہ آدمی وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟ مفتی بہ قول ذکر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھی ہو وہ وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے یہی مفتی بہ قول ہے۔

لما فی حلبی کبیری (ص ۴۰۲): واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمۃ الکرابیسی انہ لا یتبعہ فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذا لم یتابعہ فی التراویح لا یتابعہ فی الوتر، وقال ابویوسف الیانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معہ الوتر وکذا اذا لم یدرک معہ شیئا منھا وکذا اذا صلی التراویح مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ وھو الصحیح ذکرہ ابو اللیث وکذا قال ظھیر الدین المرغینانی الخ.

وفی حاشیۃ طحطاوی علی الدر المختار (۲۹۷/۱): قولہ فلیراجع قضیۃ التعلیل فی المسئلۃ السابقۃ بقولھم لانھا تبع أن یصلی الوتر بجماعۃ فی ھذہ الصورۃ لانہ لیس بتبع للتراویح ولا للعشاء عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ انتھیٰ حلبی.

وفی فتاویٰ دار العلوم دیوبند (۱۵۴/۳): جماعت وتر میں شریک ہو سکتا ہے۔ کما صرح بہ فی الطحطاوی،

اور علامہ شامی نے بے شک عدم جواز نقل کیا ہے لیکن طحطاوی کی عبارت میں جواز کی تصریح ہے، اور قاعدہ بھی مقتضی جواز کو ہے اس لئے ہمارے اکابر اساتذہ وتر کی جماعت میں شرکت کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ وجہ عدم جواز کی کچھ نہیں ہے۔

(۴۷۷) صرف رمضان میں وتر جماعت سے ادا کرنے کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان کے مہینہ میں وتر باجماعت ادا کیے جاتے ہیں دوسرے مہینوں میں انفرادی طور پر ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے نیز رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں فرض ہیں یا واجب یا سنت؟

الجواب حامداً ومصلیاً رمضان میں وتر جو بجماعت ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے ثابت ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے، اور دوسرے مہینوں میں انفرادی اس لئے ادا کیے جاتے ہیں کہ ان مہینوں میں کوئی اثر وارد نہیں ہے۔ وتر جو بجماعت ادا کیے جاتے ہیں یہ مستحب ہے۔

لما في البحر الرائق (۲/۹۹): (قوله ويوتر بجماعة في رمضان فقط) أي على وجه الاستحباب وعليه اجماع المسلمين كما في الهداية واختلفوا في الافضل ففي الخانية الصحيح ان اداء الوتر بجماعة في رمضان افضل لان عمرؓ كان يؤمهم في الوتر الخ.

وفي الشامية (۲/۹۹،۴۸): بأن جماعة الوتر تبع لجماعة التراويح وان كان الوتر نفسه أصلا في ذاته لان سنة الجماعة في الوتر انما عرفت بالأثر تابعة للتراويح.

(ص۴۹): فالوتر كالتراويح فكما أن الجماعة فيها سنة فكذلك الوتر بحر وفي شرح المنية والصحيح ان الجماعة فيها افضل الا ان سنيتها ليست كسنية جماعة التراويح الخ.

(۴۷۸) وتر میں نو سورتیں پڑھی جانے والی حدیث پر عمل کا حکم

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں (۹) سورتیں تلاوت فرماتے تھے پہلی رکعت میں سورۃ التکاثر، سورۃ القدر، سورۃ الزلزال، دوسری رکعت میں سورۃ العصر، النصر، الکوثر اور تیسری رکعت میں سورۃ الکافرون، اللھب اور سورۃ الاخلاص، اب اگر کوئی اتباع سنت کی نیت سے ان (۹) سورتوں کو پڑھے تو جو ترتیب حدیث میں وارد ہوئی ہے اس طرح پڑھنا مسنون ہوگا یا قرآن شریف کی ترتیب پر پڑھنا مسنون ہوگا۔ کیا ذخیرہ احادیث میں اس مضمون کی حدیث ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...فرض اور واجب نماز میں ترتیب سے قرأت کرنا قرأت کے واجبات میں سے ہے اور اس کی مخالفت کرنا مکروہ

ہے البتہ نوافل کے اندر اس کی گنجائش ہے اور چونکہ وتر کی نماز ہمارے ہاں واجب ہے اور واضح رہے کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب بھی صحیح قول کے مطابق توقیفی ہے لہذا اس کی رعایت کرنا ضروری ہے اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے نماز وتر کے اندر پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص پڑھنے والی روایت کو سنیت پر محمول کیا ہے لہذا ایسی طریقہ سنت ہے البتہ مسند احمد کی روایت سے ان "۹" سورتوں کا پڑھنا بھی ثابت ہے لیکن اس میں چونکہ ترتیب توقیفی (جس کی رعایت واجب ہے) کا عکس ہے اس لئے اس کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا۔ لہذا صورت مسئولہ میں وتر کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص پڑھنا ہی مسنون ہے البتہ یہ روایت (کہ جس میں ان ۹ سورتوں کا پڑھنا مذکور ہے) جواز پر محمول ہے۔ اگر کبھی کبھار اس طرح پڑھ لے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور بعض حضرات نے وتر میں مسنون قرآت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(۱)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ، دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

(۲)۔ پہلی میں سورۃ التکاثر، دوسری میں سورۃ العصر، تیسری میں سورۃ الکافرون۔

(۳)۔ پہلی رکعت میں سورۃ القدر، دوسری رکعت میں سورۃ النصر، تیسری میں سورۃ اللہب۔

(۴)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال، دوسری میں سورۃ الکوثر اور تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

اگر اس تاویل کو لے لیا جائے تو اس میں سورتوں کی ترتیب کی بھی رعایت ہو جاتی ہے اور تمام روایات پر عمل بھی ہو جاتا ہے لیکن اس میں بھی پہلا طریقہ زیادہ راجح ہے لانہ اکثر عملاً، البتہ وتر کی جماعت میں (جو کہ صرف رمضان میں ہوتی ہے) اس پر بھی التزام نہ کیا جائے۔

لما فی الترمذی (۱/۱۰۶): عن عبدالعزیز بن جریج قال سالت عائشۃ بای شیء کان یوتر رسول اللہ ﷺ قالت کان یقرأ فی الاولی بسبح اسم ربک الاعلی وفی الثانیۃ بقل یایھا الکافرون وفی الثالثۃ قل ھو اللہ احد والمعوذتین.

وفی تحفۃ الاحوذی (۱/۳۴۱): والذی اختارہ اکثر اھل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعدھم ان یقرأ بسبح اسم ربک الاعلی وقل یایھا الکفرون وقل ھو اللہ احد ویقرأ فی کل رکعۃ من ذلک بسورۃ وبہ قال الحنفیۃ.

وفی المسند للامام احمد (۱/۱۴۳): عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ یوتر بتسع سور من المفصل، قال اسود: یقرأ فی الرکعۃ الاولی الھاکم التکاثر، وانا انزلناہ فی لیلۃ القدر، واذا زلزلت الارض وفی الرکعۃ الثانیۃ والعصر واذا جاء نصر اللہ والفتح وانا اعطیناک الکوثر وفی الرکعۃ الثالثۃ قل یایھا الکافرون وتبت یدا ابی لھب وقل ھو اللہ احد.

وفی الموسوعۃ الفقھیۃ (۲۷/۲۹۸): اتفق الفقھاء علی انہ یقرأ فی کل رکعۃ من الوتر الفاتحۃ ..... ثم ذھب الحنفیۃ الی انہ لم یوقت فی القراءۃ فی الوتر شیء غیر الفاتحۃ فما قرأ فیہ فھو حسن، وما

ورد عن النبی ﷺ: انه قرأ به فی الأولی بسورة سبح اسم ربک الاعلی وفی الثانية الكافرون، وفی الثالثة بالاخلاص فيقرأ به احيانا، ويقرأ بغيره احيانا للتحرز عن هجران باقی القرآن.

وفی الهندية (۱/ ۷۹): هذا كله فی الفرائض اما فی السنن فلا يكره هكذا فی المحيط.

وفی الشامية (۱/ ۵۴۴): لان الشارع إذا لم يعين عليه شيئا تيسيرا عليه كره له ان يعين ــــ لما فيه من هجر الباقی وايهام التفضيل ــــ وهذا اذا صلی الوتر بجماعة وان صلی وحده يقرأ كيف شاء اهـ ــــ فيستحب ان يقرأ ذلک احيانا تبركا بالماثور

وايضا ذكر فی وتر البحر عن النهاية انه لا ينبغی ان يقرأ سورة معينة علی الدوام لئلا يظن بعض الناس انه واجب ــــ اما لو قرأه للتيسير عليه او تبركا بقراءته عليه السلام فلا كراهة ولكن بشرط ان يقرأ غيرها احيانا لئلا يظن الجاهل ان غيرها لايجوز ــــ

وفی الشامية (۲/۶): والسنة السور الثلاث ای الاعلی والكافرون والاخلاص لكن فی النهاية ان التعيين علی الدوام يفضی الی اعتقاد بعض الناس أنه واجب وهو لا يجوز فلو قرأ بما ورد به الآثار احيانا بلا مواظبة يكون حسنا ــــ

وفی الدر المختار (۱/ ۵۴۶): ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة ــــ وفی الشامية تحته (وقوله وان يقرأ منكوسا) بأن يقرأ فی الثانية سورة اعلی مما قرأ فی الاولی لان ترتيب السور فی القراءة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم ــــ

وفی مرقاة المفاتيح (۵/ ۱۱۱): بخلاف ترتيب السور فانه لما كان مختلفا فيه كرهت مخالفته لغير عذر، ولما ورد أنه ﷺ قرأ النساء قبل آل عمران لبيان الجواز او نسيانا ليعلم الصحة به، مع ان الاصح ان ترتيب السور توقيفی.

(۴۷۹) وتر کی نماز دوسلاموں سے پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ارادہ انشاء اللہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کے ائمہ وتر کی نماز میں دو رکعات پر سلام پھیرتے ہیں پھر اسکے بعد ایک رکعت پڑھ کر دوبارہ سلام پھیرتے ہیں، آیا میرے لئے اسطرح انکی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو کیا انفرادا وتر کی نماز پڑھوں؟

الجواب حامداً ومصلياً: صورت مسئولہ میں اصح قول کی بناء پر کسی حنفی المسلک کو ایسے امام کی اقتداء درست نہیں بلکہ انفرادی نماز پڑھ لی جائے۔

لما في الشامية (۸/۲). ولم يذكر الشارح تعليل اشتراط عدم الفصل بسلام اكتفاءً بما أشار إليه قبله من ان الاصح اعتبار اعتقاد المقتدي والسلام قاطع في اعتقاده فيفسد اقتداؤه وان صح شروعه مع الامام معه في الابتداء كما افاده ح.

(۲۸۰) وتر میں حنفی کا شافعی کی اقتداء کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔ عربوں کے یہاں وتر دو اور ایک رکعت کر کے پڑھی جاتی ہے، حنفی ایک نیت کے ساتھ تینوں رکعت پڑھتے ہیں، اگر شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھی جائے (رمضان میں) تو پھر حنفی ان کے ساتھ نماز پڑھیں یا نہیں؟ کیونکہ نیت تین کی باندھی ہے شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲)۔ دوسری بات یہ ہے کہ نیت کیا کرنی چاہئے، امام نماز سے پہلے بولتا ہے کہ دو رکعت نماز عشاء ہے اور پھر بعد میں کہتا ہے کہ ایک رکعت نماز وتر ہے اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ نیت کس نماز کی کرنی چاہئے لہٰذا کوئی حنفی یہ نیت کرتے ہیں کہ "جو نیت امام کی وہ میری" کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: (۱)۔ احناف کے ہاں وتر تین رکعات ہیں جو کہ ایک سلام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر شافعی امام وتر میں پہلی دو رکعات کے بعد سلام پھیرتا ہے اور اس کے بعد ایک رکعت پڑھ کر آخر میں پھر سلام پھیرتا ہے تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی اقتداء شرعاً درست نہیں ہے۔

(۲)۔ اگر شافعی امام دو رکعات کے بعد سلام نہیں پھیرتا ہے بلکہ تینوں رکعات کیلئے آخر ہی میں سلام پھیرتا ہے تو اس کے پیچھے حنفی کی اقتداء درست ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ حنفی وتر کی نیت میں مطلقاً وتر کا ذکر کرے۔

لما في الدر المختار (۶/۲): (وصح الاقتداء فيه) ففي غيره أولى إن لم يتحقق منه ما يفسدها في اعتقاده في الاصح كما بسطه في البحر (بشافعي) مثلاً (لم يفصله بسلام) لا إن فصله (على الاصح) فيهما للاتحاد وإن اختلف الاعتقاد (و) لذا (ينوي الوتر لا الوتر الواجب كما في العيني) بلا خلاف.

(۲۸۱) حنفی کا شافعی امام کے پیچھے وتر میں لفظ واجب ملانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک حنفی صاحب سے یہ مسئلہ سنا ہے کہ حنفی آدمی شافعی آدمی کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ امام حنفی مقتدی کے مسائل اختلافیہ میں اس کی رعایت رکھتا ہو اب میرے ذہن میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی حنفی وتر یا عیدین شافعی امام کے پیچھے پڑھتا ہے تو چونکہ احناف کے نزدیک یہ نمازیں واجب ہیں اور شوافع

ایجب من ان الامام ان نوی الوتر وهو یراہ سنة جاز الاقتداء کمن صلی الظهر خلف من یری ان الرکوع سنة وان نواہ بنیة التطوع لایصح الاقتداء لانه یصیر اقتداء المفترض بالمتنفل اھ۔ ۔ ۔ (قوله لا الوتر الواجب) الذی ینبغی ان یفهم من قولهم انه لا ینوی انه واجب انه لا یلزمه تعیین الوجوب لا منعه من ذالک لانه ان کان حنفیاً ینبغی ان ینویه لیطابق اعتقادہ وان کان غیرہ فلا تضرہ تلک النیة بحر (قوله للاختلاف) ای فی الوجوب والسنیة وهو علة للمنفیین فقط۔

(۴۸۲) وتر کے بعد دو رکعت کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک دیندار انسان ہے تمام نمازیں باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہے چنانچہ وہ روزانہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھتا ہے لیکن عمرو کہتا ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنا چاہیے کیونکہ بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب آدھا ملے گا اب پوچھنا یہ ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً نفل نماز مطلقاً چاہے وتر کے بعد کی دو رکعت ہوں یا دیگر نوافل کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے اور اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھے تو اس کو آدھا اجر ملے گا۔

لما فی مشکوٰۃ المصابیح (ص۱۱۲): وعن ابی امامة ان النبی ﷺ کان یصلیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما اذا زلزلت وقل یاایها الکٰفرون رواہ احمد۔

وفی النسائی (۱/۱۸۸): عن عبد اللہ بن عمرو قال رأیت النبی ﷺ یصلی جالساً فقلت حدثت انک قلت ان صلوٰۃ القاعد علی النصف من صلوٰۃ القائم وانت تصلی قاعداً قال أجل ولکنی لست کاحد منکم۔

وفی هامشه (ص۵): قوله لست کاحد منکم یفید انه مخصوص بینهم بأن لا ینقص له فی الاجر فی صلاته قاعداً وقائماً کذا قال السندی

وفی الدر المختار (۲/۳۶): (ویتنفل مع قدرته علی القیام قاعداً)۔ ۔ وفیه أجر غیر النبی ﷺ علی النصف الا بعذر

وفی الشامیة تحته: (قوله أجر غیر النبی ﷺ) اما النبی ﷺ فمن خصائصه أن نافلته قاعداً مع القدرة علی القیام کنافلته قائماً۔ ۔ (قوله علی النصف الا بعذر) أما مع العذر فلا ینقص ثوابه عن ثوابه قائماً

وفي شرح النووي على هامش الصحيح المسلم (۱/۲۵۴): قلت الصواب أن هاتين الركعتين فعلهما ﷺ بعد الوتر جالساً لبيان جواز الصلوة بعد الوتر وبيان جواز النفل جالساً ولم يواظب على ذلك بل فعله مرة أو مرتين أو مرات قليلة ولا تغتر بقولها كان يصلي فإن المختار الذي عليه الأكثرون والمحققون من الأصوليين أن لفظة كان لا يلزم منها الدوام ولا التكرار وإنما هي فعل ماض يدل على وقوعه مرة فإن دل دليل على التكرار عمل به وإلا فلا تقتضيه بوضعها وقد قالت عائشة رضي الله عنها كنت أطيب رسول الله ﷺ لحله قبل أن يطوف ومعلوم أنه ﷺ لم يحج بعد أن صحبته عائشة إلا حجة واحدة وهي حجة الوداع فاستعملت كان في مرة واحدة.

﴿فصل في سجود السهو والتلاوة﴾

(سجدۂ سہو اور سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

(۲۸۳) سجدۂ سہو کے واجب ہونے کی صورتیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر نماز میں بے دھیانی پیش آجاتی ہے، بعض چیزیں چھوٹ جاتی ہیں، کبھی دو رکعت کے بعد والے قعدہ کی تسبیحات چھوٹ جاتی ہیں اور کبھی کچھ، میں اس پر سجدۂ سہو کرلیا کرتا تھا، پھر میرے ایک دوست نے بتایا کہ ہر غلطی پر سجدۂ سہو نہیں ہوتا بلکہ بعض مخصوص صورتیں ہیں، کسی عالم دین سے ان کی تفصیل پوچھ لو، برائے کرم آپ مجھے اس تحریر کے ذریعے بتادیں کہ سجدۂ سہو کن صورتوں میں کرنا ضروری ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سجدۂ سہو کسی واجب کے چھوٹ جانے یا واجب یا فرض میں تاخیر کی وجہ سے یا کسی فرض یا واجب کو اس کی جگہ سے ہٹ کر پہلے کردینے یا کسی فرض کو دوبارہ ادا کرلینے سے واجب ہوتا ہے اور سجدۂ سہو سے تو بھول کی تلافی ہوجاتی ہے، اگر قصداً ایسا کرے تو سجدۂ سہو سے کام نہ چلے گا بلکہ نماز کا دوہرانا لازم ہوگا، اور اگر کوئی فرض چھوٹ جائے تو اس کی تلافی سجدۂ سہو سے نہ ہوگی۔ اور تسبیحات وغیرہ جو سنت اور مستحب کے قبیل سے ہیں ان کے چھوٹنے پر سجدہ واجب نہیں۔

لما في المحيط البرهاني (٢/٣٠٩): تكلم المشائخ في هذا، أكثرهم على أنه يجب بستة أشياء: بتقديم ركن وتأخير ركن وبتكرار ركن وبتغيير واجب وبترك واجب وبترك سنة تضاف إلى جميع الصلاة. أما تقديم الركن نحو أن يركع قبل أن يقرأ ويسجد قبل أن يركع، وتأخير الركن أن يترك سجدة صلبية سهواً فيذكرها في الركعة الثانية فيسجدها أو يؤخر القيام إلى الثالثة بالزيادة على قدر التشهد، وتكرار ركن أن يركع ركوعين أو يسجد ثلاث سجدات، وتغيير الواجب أن يجهر فيما يخافت أو يخافت فيما يجهر، وترك الواجب نحو أن يترك القعدة الأولى في الفرائض، وترك السنة المضافة إلى جميع الصلاة نحو أن يترك التشهد في القعدة الأولى.

وفي الهندية (١/١٢٦): ولا يجب بترك التعوذ والبسملة في الأولى والثناء وتكبيرات الانتقالات الخ

وفي الشامية (٢/٩٧): والعمد لا يجبره سجود السهو بل تلزم فيه الإعادة.

وفي شرح الوقاية (١/١٨٣) في هامش (١٢) بعد أسطر: ولا يجب أيضاً بترك ركن عمداً كان

او سہوا لان ترک الرکن مبطل للصلوٰۃ راسا ولا یمکن جبر نقصان ثابت بہ ولو ترک الواجب عمدا لا یسجد لان الوارد فی الاحادیث ہو السجود عند السہو لا عند العمد بل یعید الصلوٰۃ۔

(۲۸۴) امام کا قرأت کے دوران بھول کر خاموش رہنا پھر سجدہ سہو کرنا کیسا ہے؟

سوال... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں نے تبلیغی جماعت میں ۴ مہینے لگائے، جب گاؤں میں واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے نماز پڑھنے میں ستائیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے اس لئے اکیلے اکیلے نماز پڑھنے کے بجائے تم اور دوستوں کو بھی یہاں میری بیٹھک میں ہی لے آیا کرو، ہم سب مل کر جماعت سے نماز پڑھا کریں گے۔ الحمدللہ اب ہم سب جماعت سے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کی نسبت ماموں کو قرآن پڑھنا درست آتا ہے اسلئے وہ ہمارے امام بن جاتے ہیں لیکن قرأت کے دوران غلطیاں بہت کرتے ہیں کبھی پڑھتے پڑھتے بھول جاتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ پھر دوسری سورت شروع کر دیتے ہیں اور آخر میں سجدہ سہو کرتے ہیں کیا اس طرح ہم سب کی نماز سجدہ سہو کرنے سے درست ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہو (یعنی مسجد میں) اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سر سر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں۔ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑنے والے ہو گے، اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے (مسلم شریف ۱/۲۳۲)... دوسری حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی ہوگی (کنز العمال ۷/۶۵۰)، نیز اور بے شمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو بلا عذر اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں، ان تمام احادیث کی بناء پر آپ کے ماموں کیلئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ مسجد کو چھوڑ کر بیٹھک میں جماعت کروائیں لہٰذا ان کو چاہیے کہ تمام نمازوں کو مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ ادا کریں ہاں اگر قریب میں کوئی مسجد نہیں تو کسی مسجد کی بنیاد رکھیں تا کہ ان وعیدوں سے بچ سکیں باقی صورت مسئولہ میں اگر آپ کے ماموں قرأت کے دوران ایسی غلطیاں کرتے ہیں جس سے معنی تبدیل نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں نماز فاسد نہ ہوگی، ہاں ان کا بھول جانا پھر خاموش ہو جانا اگر ایک رکن کی مقدار ہے تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنے سے نماز درست ہوگی اور اگر اتنی مقدار سے کم خاموش رہے تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا اور نماز درست ہوگی۔

لما فی المسلم (۱/۲۳۲): عن عبداللہ قال من سرہ ان یلقی اللہ تعالیٰ غدا مسلما فلیحافظ علی ہولاء الصلوات حیث ینادی بہن فان اللہ شرع لنبیکم سنن الہدی، وانہن من سنن الہدی ولو انکم صلیتم

في بيوتكم كما يصلي هذا المتخلف في بيته لتركتم سنة نبيكم ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم　الخ

وفي سنن ابي داؤد(۱/۸۱): عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من سمع المنادي فلم يمنعه من اتباعه عذر قالوا وما العذر قال خوف أو مرض لم تقبل منه الصلوة التي صلى.

وفي المحيط البرهاني(۲/۳۰۳): وشرح الكافي "للصدر الشهيد: وكان الشيخ الامام الأجل ظهير الدين المرغيناني يقول: لا يجب سجود السهو بقوله: اللهم صل على محمد ونحوه، وانما المعتبر مقدار ما يؤدي فيه ركناً.

وفي البحر الرائق(۱/۳۰۶): وسئل الحلواني عمن يجمع باهله احيانا هل ينال ثواب الجماعة أولا؟ قال: لا ويكون بدعة ومكروها بلا عذر.

وفي التاتارخانية(۱/۱۵۷): سئل الحلواني عمن يصلي جماعة مع اهله في بيته أحيانا هل ينال فضل الجماعة؟ قال لا وسئل هل يكون بدعة ومكروها؟ قال نعم.

وفي الهندية (۱/۸۱): وان غير المعنى تغيرا فاحشا بأن قرأ "وعصى آدم ربه" بنصب الميم ورفع الرب وما أشبه ذلك مما لو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأ فسدت صلاته في قول المتقدمين واختلف المتاخرون قال محمد بن مقاتل　وشمس الائمة الحلواني لاتفسد صلاته الخ.

(۲۸۵) قیام میں پہلے التحیات پڑھے پھر فاتحہ یا قعدہ میں فاتحہ پڑھے تو کیا حکم ہے

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی قیام میں التحیات شروع پڑھ لیتا ہے پھر اس کو خیال آیا اور قرأت کی۔ آیا اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اگر تشہد میں سورۂ فاتحہ پڑھے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً　کوئی شخص قعدہ میں تشہد سے پہلے فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور اگر قیام میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا، اور اگر قعدہ میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ تو بھی سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لمافي الخلاصة(۱/۱۷۲): وفي الفتاوى لو قرأ الفاتحة او آية من القرآن في القعدة او في الركوع او في السجود او قرأ التشهد في الركوع او في السجود عليه السهو، ولو قرأ التشهد في القيام قبل ان يشرع في القرآءة عامداً او ناسياً فلا سهو عليه.

لمافي الهندية(۱/۱۲۷). واذا قرأ الفاتحة مكان التشهد فعليه السهو وكذلك اذا قرء الفاتحة ثم التشهد كان عليه السهو كذا روى عن ابي حنيفة رحمة الله تعالى عليه في الواقعات الناطفية وذكر هناك اذا بدأ في موضع التشهد بالقرآءة ثم تشهد فعليه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقرآءة فلا

سہو علیہ.

(۲۸۶) سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلی پڑھ لیا تو سجدہ سہو کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نماز میں سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلی پڑھ لیا تو اس شخص پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً مذکورہ صورت سجدہ سہو لازم نہیں۔

لما فی التاتارخانیۃ (۱/۵۱۷): واما الاذکار کل ذکر لم یقصد لنفسہ۔ لا یلزمہ السہو... و کتسبیحات الرکوع والسجود.

وفی الشامیۃ (۲/۸۰): قولہ بترک واجب) ... واحترز بالواجب عن السنۃ، کالثناء والتعوذ ونحوھما.

(۲۸۷) قعدہ اولی نہ کرنے کا حکم

سوال ..... جناب حضرت مفتی صاحب ایک مسئلہ پوچھنا ہے کہ اگر چار رکعات والی سنتوں میں یا وتر میں کوئی قعدہ اولی بھول جائے تو سجدہ سہو کرنے سے نماز ہو جائیگی؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سنتوں اور وتر میں قعدہ اولی فرض ہے لہذا بھول جانے پر سجدہ سہو کافی نہیں، نماز نہیں ہوگی اعادہ واجب ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً چار رکعات والی سنتوں اور وتر میں قعدہ اولی واجب ہے نہ کہ فرض، لہذا اگر کسی سے قعدہ اولی رہ گیا تو سجدہ سہو کر لینے سے نماز ہو جائیگی اعادہ واجب نہ ہوگا۔

لما فی الدر المختار (۱/۶۵۳): (والقعود الاول) ولو فی النفل فی الاصح و کذا ترک الزیادۃ فیہ علی التشھد.

(۲۸۸) غلطی سے قاعدہ اولی میں سلام پھیرنے کا حکم

سوال ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا چار رکعات کی نیت باندھی تھی لیکن بھولے سے قعدہ اولی میں سلام پھیر دیا جب یاد آیا کہ یہ میری دوسری رکعت ہے تو فوراً کھڑا ہو گیا اور باقی نماز پڑھ لی اور آخر میں سجدہ سہو بھی کر لیا آیا اس شخص کی نماز ہوگئی؟ نیز اگر مسبوق سے امام کے ساتھ یا امام کے فارغ ہونے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔ صورت مسئولہ میں جب بھولے سے سلام پھیر لیا اور قبلہ کی طرف سینہ پھیرنے اور کسی منافی صلاۃ کے ارتکاب

سے پہلے بقیہ رکعات پڑھ کر سجدہ سہو کرلیا تو نماز ہوگئی۔ نیز مسبوق اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے کوئی واجب چھوڑدے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر امام کے سلام پھیرنے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا۔

لمافی الشامیۃ (۹۲/۲): در: ویسجد للسہو ولو مع سلامہ ناویا للقطع لان نیۃ تغیر المشروع لغو ــــ مالم یتحول عن القبلۃ او یتکلم ــــ سلم مصلی الظہر مثلاً علی راس الرکعتین توھما اتمھا اربعا وسجد للسہو لان ساھیا لایبطل لانہ دعاء من وجہ بخلاف مالو سلم علی ظن.

وفی الشامیۃ تحتہ: قولہ لانہ دعاء من وجہ ای فلذا خالف الامام ــــ

وفی الشامیۃ (۵۹۶/۱): قولہ حتی یثنی، تفریع علی قولہ منفرد فیمایقضیہ بعدفراغ امامہ ...... ویلزمہ السجود اذاسہافیمایقضیہ

(۲۸۹) قعدۂ اولیٰ سہواً چھوٹ جانے کے بعد قیام سے دوبارہ واپس آنے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ظہر کی پہلی چار سنتیں جماعت سے پہلے نہیں پڑھ سکا اور بعد میں چار سنتیں پڑھ رہا تھا۔ تو دوسری رکعت میں التحیات میں بیٹھنا بھول گیا اور سیدھا کھڑا ہوگیا ابھی تک سورۃ فاتحہ شروع نہیں کی تھی کہ مجھے یاد آگیا کہ میں التحیات پر بیٹھنا بھول گیا ہوں تو میں فوراً التحیات میں بیٹھ گیا۔ پھر تیسری اور چوتھی رکعت پوری کی اور آخر میں سجدہ سہو کیا۔ کیا اس طرح میری نماز درست ہوگئی ہے۔ یا سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ صورت مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی اور آپ نے جو سجدہ سہو کیا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ آپ نہ بیٹھتے اور آخر میں سجدہ سہو کرکے اپنی نماز کو مکمل کرتے۔

لمافی الفتاوی التاتارخانیۃ (۱/ ۳۸ے): وفی الفتاوی العتابیۃ وان کان فی التطوع قال بعضھم یعود مالم یقید بالسجدۃ والصحیح انہ لا یعود.

وفی الطحطاوی علی الدر (۳۱۲/۱): (قولہ واماالنفل) ولو الرباعیۃ المؤکدۃ نھر (قولہ فیعود) لان کل شفع صلاۃ علی حدۃ فی حق القراءۃ فامرنا بالعود الی القعدۃ احتیاطا ومتی عاد تبین ان القعدۃ وقعت فرضا فیکون رفض الفرض لمکان الفرض فیجوز وقیل لا یعود لانہ صار کالفرض حلبی عن البحر.

وتحت (قولہ ویسجد لتاخیر الواجب) الاولی ان یقول لتاخیر الفرض وھو القیام اویقول لترک الواجب وھو القعود.

وفی الدر المختار (۸۳/۲): (والا) ای وان استقام قائما (لا) یعود لاشتغالہ بفرض القیام (وسجد

للسهو) لترك الواجب (فلو عاد إلى القعود) بعد ذلك (تفسد صلاته) لرفض الفرض لما ليس بفرض وصححه الزيلعي (وقيل لا) تفسد لكنه يكون مسيئا ويسجد لتأخير الواجب (وهو الأشبه) كما حققه الكمال وهو الحق بحر الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله بعد ذلك) اى بعد ما استقام قائما .. (قوله لكنه يكون مسيئا) اى ويأثم.

(۲۹۰) دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدۂ سہو کیلئے منفرد کو دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا چاہئے یا ایک طرف بھی سلام پھیرنا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: منفرد کو سجدۂ سہو میں ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا چاہئے البتہ اگر دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرلیا تو بھی نماز ہو جائے گی۔

لما في الشامية(۲/۷۸): والذي ينبغي الاعتماد عليه تصحيح المجتبى أنه يسلم عن يمينه فقط.. وبزيادة صارجهوا به القول الواحدة من أن السلام الأول لشيئين: للتحليل وللتحية والسلام الثاني للتحية فقط اى تحية بقية القوم لأن التحليل لا يتكرر، وهنا سقط معنى التحية عن السلام لأنه يقطع الإحرام فكان ضم الثاني إليه عبثا ولو فعله فاعل لقطع الإحرام.

(۲۹۱) سجدۂ سہو کرنا بھول کر دونوں طرف سلام پھیر دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نے نماز میں غلطی کی اور سجدۂ سہو کرنا تھا مگر بھول کر سلام پھیرا، یا اب اسے پوری نماز دہرانی پڑے گی یا کوئی اور طریقہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر کسی وجہ سے سجدۂ سہو کرنا تھا لیکن یاد نہ رہا اور بھول کر سلام پھیر دیا تو اس صورت میں اگر نمازی نے کوئی منافی صلاۃ عمل نہ کیا ہو مثلاً اپنی جگہ سے ابھی اٹھا نہیں اور نہ ہی قبلہ سے رخ پھیرا ہو کہ اس کو یاد آگیا تو فوراً سجدۂ سہو کر کے نماز پوری کرلے اور اگر کوئی عمل منافی صلاۃ کیا ہو تو اس صورت میں سجدۂ سہو چھوڑ دینے کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لما في فتاوى التاتارخانية (۱/۴۳۲): واذا سلم يريد به قطع الصلوة وعليه سجود السهو فعليه أن يسجد للسهو .. فقد شرط لاداء سجدتي السهو شرطاً زائداً وهو ان لا يتكلم ولا يقوم عن محله ذالك، فهذا اشارة الى انه متى قام عن محله واستدبر القبلة انه لا يأتي بسجدتي السهو وان كان لم يخرج عن المسجد بعد.

وفی الدر المختار (١/٤٥٦): (وتجب) واجبات لاتفسد بترکها وتعاد وجوبا فی العمد والسهو إن لم یسجد له.

(٢٩٢) سجدۂ سہو بھول کر سلام پھیرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ پچھلے ہفتے میں کسی کام کے سلسلے میں صدر گیا ہوا تھا اور وہاں عشاء کی اذان ہوگئی تو میں نے اپنے کام کو مؤخر کیا اور مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے گیا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کے بعد وتر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا۔ کیونکہ مجھے مسئلہ معلوم تھا کہ اب رکوع سے نہیں اٹھنا چاہیے بلکہ آخر میں سجدہ سہو کر لینا چاہیے۔ لیکن آخری قعدہ میں بھی سجدہ سہو کرنا بھی بھول کر سلام پھیر دیا۔ جب سلام پھیرا تو مجھے یاد آیا کہ مجھ پر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا اور میں نے سجدہ سہو نہیں کیا اس لئے میں نے دوبارہ وتر ادا کئے۔ کیا اگر سجدہ سہو واجب ہو اور نمازی سجدہ سہو کرنا بھول جائے تو نماز کو ازسر نو پڑھنا ضروری ہے یا اس وقت صرف سجدہ سہو کر لیں تو کیا نماز درست ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، اسے نہ پڑھنے کی صورت میں سجدہ سہو لازم ہوگا، تاہم اگر کوئی شخص سجدہ سہو بھول جائے اور نماز ختم کرنے کی نیت سے سلام پھیر دے تو اس صورت میں اگر قبلہ سے انحراف نہ پایا گیا ہو اور بات چیت نہ کی ہو تو ترک واجب کے یاد آنے پر سجدہ سہو کر لینے سے اس کی نماز بغیر نقصان کے درست ہو جائے گی، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر لیتے تو آپ کی نماز بغیر نقصان کے ٹھیک ہو جاتی اور دوبارہ پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی۔

لما فی فتاوی التاتارخانية (١/٣٢٤): وإذا سلم يريد به قطع الصلوة وعليه سجود السهو فعليه أن يسجد للسهو. فقد شرط لأداء سجدتي السهو شرطاً زائداً وهو أن لا يتكلم ولا يقوم عن محله ذالک، فهذا اشارة الى أنه متى قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا يأتي بسجدتي السهو وإن كان لم يخرج عن المسجد بعد

وفی الشامية (٢/٩١): قال في الدر: (ويسجد للسهو ولو مع سلامه) ناويا (للقطع) لأن نية تغيير المشروع لغو (مالم يتحول عن القبلة او يتكلم) لبطلان التحريمة.

قال في الشامية: قيد بالسهو لأنه لو سلم ذاكراً أن عليه سجدة تلاوة أو قراءة التشهد الأخير سقطت عنه، لأن سلامه عمد فيخرجه من الصلاة ولا تفسد صلاته لأنه لم يبق عليه ركن من أركان الصلوة بل تكون ناقصة لترک الواجب.

(قوله لبطلان التحريمة) أي بالتحول أو التكلم، وقيل لا يقطع بالتحول مالم يتكلم أو يخرج من المسجد كما في الدرر عن النهاية

(۲۹۳) سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ دوبارہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ پھر فاتحہ کو پڑھتا ہے تو اس شخص کی نماز کا کیا حکم ہے نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ فرض کی آخری دو رکعتوں کے علاوہ چاہے فرض ہو یا واجب سنت ہو یا نفل ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت، تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت ملانا واجب ہے۔

صورت مسئولہ میں دوبارہ فاتحہ پڑھنے سے واجب ادا نہ ہوا، پس اگر یہ فعل سہواً صادر ہوا ہو تو سجدہ سہو کرنے سے نماز صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر قصداً کیا ہے تو نماز کا اعادہ کرنا لازم ہوگا۔

لما فی القدوری (باب النوافل) (ص ۲۶): القراءۃ واجبۃ فی الرکعتین الاولیین وھو مخیر فی الاخریین ان شاء قرأ الفاتحۃ، وان شاء سکت وان شاء سبح والقراءۃ واجبۃ فی جمیع رکعات النفل وجمیع الوتر.

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۲۵۸): (قولہ کذا ترک تکریرھا) فلو قرأ الفاتحۃ مرتین قبل السورۃ وجب سجود السھو لتاخیر السورۃ.

وفی الشامیۃ (۱/۳۵۶): (قولہ وتعاد وجوباً) ای بترک ھذہ الواجبات او واحد منھا وما فی الزیلعی والدرر والمجتبی من انہ لو ترک الفاتحۃ یؤمر بالاعادۃ لا لو ترک السورۃ ردہ فی البحر بان الفاتحۃ وان کانت آکد فی الوجوب للاختلاف فی رکنیتھا دون السورۃ لکن وجوب الاعادۃ حکم ترک الواجب مطلقا لا الواجب المؤکد وانما تظھر الآکدیۃ فی الاثم لانہ مقول بالتشکیک.

(۲۹۴) سجدہ سہو ادا کرنے کے بعد قیام کی طرف لوٹنا

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی نے نماز کے دوران سہو ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کیا اس کے بعد نماز کو پورا کرنے کے بجائے کھڑے ہو کر سورہ فاتحہ پڑھنے لگا پھر سورہ فاتحہ پڑھتے وقت یاد آ جائے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟ از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ صورت مسئولہ میں یہ شخص سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز کو مکمل کرنے کے بجائے کھڑا ہو گیا اب یہ شخص قعدہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور سلام پھیر کر نماز کو ختم کرے۔

لما فی الھندیۃ (۱/۱۲۶): قال فی الفتاوی القعدۃ بعد سجدتی السھو لیست برکن وانما أمر بھا بعد

سجدتي السهو ليقع ختم الصلاة بها حتى لو تركها لتمام وذهب لاتفسد صلاته كذا قاله الحلواني كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار (۲/۸۵): (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (مالم يقيدها بسجدة) لأن مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود.

وفي الشامية تحته: (قوله ولو سها عن القعود الأخير) اراد به القعود المفروض او ماكان آخر الصلاة فيشمل نحو الفجر.

وفي الهندية (۱/۱۳۰): السهو في سجود السهو لا يوجب السهو لانه لايتناهى كذا في التهذيب ولو سها في صلاته مرارا يكفيه سجدتان كذا في الخلاصة.

(۲۹۵) امام کا بھول کر سری نماز میں جہراً تلاوت کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے اور تجوید بھی کی ہے اور میرا ارادہ تھا کہ عالم بھی بنوں لیکن گھر کے حالات کچھ ایسے تھے کہ میں عالم نہیں بن سکا اب ایک مسجد میں امامت کرتا ہوں کل عصر کی نماز کے وقت جب میں امامت کرا رہا تھا تو بھول کر سورۃ فاتحہ زور سے پڑھنا شروع کر دی جب اھدنا الصراط تک پہنچا تو پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا (سبحان اللہ) تو مجھے یاد آیا کہ میں تو عصر کی نماز پڑھا رہا ہوں اور اس میں قرأت آہستہ کرنی ہوتی ہے اور میں نے زور سے پڑھا ہے تو میں فوراً خاموش ہو گیا اور باقی سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت دل میں ہی پڑھی ہے۔ کیا اس طرح نماز درست ہو گئی ہے۔ یا پھر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً امام کیلئے جہری نمازوں میں جہراً اور سری نمازوں میں سراً قرأت کرنا واجب ہے۔ اگر امام بھول کر کسی سری نماز میں جہراً قرأت شروع کر دے تو اگر ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیتوں کے بقدر تلاوت کر لی تو ترک واجب کی وجہ سے سجدہ سہو واجب ہو گا۔ اب اگر امام سجدہ سہو کر لیتا ہے تو نماز بلا کراہت درست ہو جائے گی اور اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو ترک واجب کی بناء پر نماز مکروہ ہو گی اور نماز کا اعادہ واجب ہو گا۔

صورت مسئولہ میں آپ پر سجدہ سہو واجب تھا اگر آپ نے بغیر سجدہ سہو کے سلام پھیر دیا تو اگرچہ فرضیت ادا ہو گئی مگر واجب ترک کرنے کی وجہ سے نماز مکروہ ہو گئی جس کا اعادہ آپ پر و مقتدیوں پر واجب ہے۔ اعادہ نہ کرنے کی صورت میں گناہ گار ہوں گے۔

لما في الهندية (۱/۱۲۸): (ومنها الجهر والإخفاء) حتى لو جهر فيما يخافت أو خافت فيما يجهر وجب عليه سجود السهو واختلفوا في مقدار ما يجب به السهو منهما قيل يعتبر في الفصلين بقدر ما

تجوز به الصلاة وهو الأصح ولا فرق بين الفاتحة وغيرها.

وفي الدر المختار (۲/۸۱): (والجهر فيما يخافت فيه) ــ (وعكسه) ــ والأصح تقديره (بقدر ما تجوز به الصلاة في الفصلين. وقيل) قائله قاضيخان يجب السهو (بهما) اي بالجهر والمخافتة (مطلقا) اي قل أو كثر (وهو ظاهر الرواية)

وفي الشامية تحته: (قوله والأصح الخ) صححه في الهداية والفتح والتبيين والمنية لأن اليسير من الجهر والإخفاء لايمكن الاحتراز عنه وعن الكثير يمكن وما تصح به الصلاة كثير غير أن ذالك عنده آية واحدة وعندهما ثلث آيات هداية

وفي الدر المختار (۱/۴۵۷،۴۵۶): (ولها واجبات) لاتفسد بتركها وتعاد وجوباً في العمد والسهو ان لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقاً آثماً، وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها.

وفي الشامية تحته: (قوله وتعاد وجوباً) اى بترك هذه الواجبات او واحدمنها. ــ

(قوله إن لم يسجد له) اى للسهو، وهذا قيد لقوله والسهو، إذ لا سجود في العمد ــ وهل تجب الاعادة بترك سجود السهو لعذر كما لو نسيه او طلعت الشمس في الفجر؟ لم أره فليراجع والذي يظهر الوجوب كماهو مقتضىٰ اطلاق الشارح، لأن النقصان لم ينجبر بجابر، وإن لم يأثم بتركه فليتأمل.

وفي (ص۴۵۷) وأن النقص إذا دخل في صلاة الإمام ولم يجبر وجبت الإعادة على المقتدى أيضاً.

(۲۹۶) فرض کے چھوٹ جانے کی کمی کو سجدۂ سہو سے پورا کرنے کا حکم

سوال ــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ گزشتہ رات ہماری بستی کے امام صاحب عشاء کی نماز میں چوتھی رکعت میں بیٹھنا بھول گئے۔ یعنی التحیات نہیں پڑھی اور کھڑے ہوگئے۔ پیچھے سے ایک مقتدی نے لقمہ بھی دیا لیکن امام صاحب نے پانچویں رکعت پوری کی پھر چھٹی رکعت پوری کرکے سجدہ سہو کیا اور سلام پھیر دیا۔ ان کے سلام پھیرنے کے بعد کچھ لوگ کہنے لگے کہ اس طرح نماز نہیں ہوئی لیکن امام صاحب کہتے ہیں کہ میں بھول گیا اور جب کوئی بھول ہوجائے تو سجدہ سہو کرتے ہیں اور میں نے سجدہ سہو بھی کیا ہے، لہٰذا نماز درست ہے بلکہ چار رکعت فرض نماز ہوگئی اور دو رکعت نفل ہوگی۔ آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا امام صاحب کی بات درست ہے اور سجدہ سہو کرنے سے نماز ہوگی ہے یا نہیں!!

الجواب حامداً ومصلیاً ــ نماز میں واجب کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے۔ اور فرض کے چھوٹ

جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی تلافی نہیں ہوتی ہے، بلکہ دوبارہ اس نماز کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔

چونکہ نماز میں قعدہ اخیرہ فرض ہے، اور امام صاحب نے قعدہ اخیرہ نہیں کیا، بلکہ پانچویں رکعت کیلئے کھڑے ہو گئے تو فرض کے چھوٹ جانے سے نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا پڑے گا، سجدہ سہو کرنے سے یہ نماز نہیں ہوئی۔ باقی امام صاحب کا یہ کہنا کہ "بھول سے سجدہ سہو کرتے ہیں اس لئے میں نے کیا" یہ بات درست نہیں بلکہ سجدہ سہو اس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی واجب چھوٹ جائے یا فرض اور واجب میں تاخیر ہو جائے۔ لہٰذا امام سمیت سب مقتدیوں پر اس نماز کا اعادہ لازمی ہے۔

وفي الدر المختار (۲/۸۵ تا ۸۸): (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (ما لم يقيدها بسجدة) لأن ما دون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود، (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا أو مخطئا (تحول فرضه نفلاً برفعه) الجبهة عند محمد، وبه يفتى، لأن تمام الشيء بآخره، فلو سبقه الحدث قبل رفعه توضأ وبنى خلافاً لأبي يوسف، حتى قال: زه صلاة فسدت أصلحها الحدث والعبرة للإمام، حتى لو عاد ولم يعلم به القوم حتى سجدوا لم تفسد صلاتهم ما لم يتعمدوا السجود. وفيه يلغز: أي مصلّ ترك القعود الأخير وقيد الخامسة بسجدة ولم يبطل فرضه، (وضم سادسة) ولو في العصر والفجر (إن شاء) لاختصاص الكراهة والإتمام بالقصد (ولا يسجد للسهو على الأصح) لأن النقصان بالفساد لا ينجبر (وإن قعد في الرابعة) مثلاً قدر التشهد (ثم قام عاد وسلم) ولو سلم قائما صح، ثم الأصح أن القوم ينتظرونه، فإن عاد تبعوه (وإن سجد للخامسة سلموا) لأنه تم فرضه، إذ لم يبق عليه إلا السلام (وضم إليها سادسة) لو في العصر، وخامسة في المغرب: ورابعة في الفجر، به يفتى (لتصير الركعتان له نفلا) والضم هنا آكد، ولا عهدة لو قطع، ولا بأس بإتمامه في وقت كراهة على المعتمد (وسجد للسهو) في الصورتين لنقصان فرضه بتأخير السلام في الأولى وتركه في الثانية.

(۲۹۷) مقتدی سے سہو کی صورت میں سجدۂ سہو کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں اور کوئی غلطی ہو جائے تو سجدہ سہو کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر آپ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ سے کوئی سہو یا غلطی ہو جائے تو آپ سجدہ سہو نہیں کریں گے۔

وفي الهندية (۱/۱۲۸): سهو المؤتم لا يوجب السجدة.

(۲۹۸) سجدۂ سہو میں تکرار نہیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدۂ سہو کے بعد اگر دوبارہ غلطی کی تو دوبارہ سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورتِ مسئولہ میں جبکہ نمازی ایک مرتبہ غلطی کرنے پر سجدۂ سہو کر چکا ہو تو دوسری بار غلطی کرنے پر دوبارہ سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ سہو کے دو سجدے تمام غلطیوں کا ازالہ کر دیتے ہیں اور سجدۂ سہو میں تکرار نہیں ہے۔

وفي التجنيس (۲/۲۲۸): قال الشيخ الامام شمس الأئمة الحلواني: القعدة بعد سجدتي السهو ليس بركن، وانما امرنا بها بعد سجود السهو ليقع ختم الصلوٰة بها. فيوافق ذالك موضع الصلوٰة ونظمها، فاما ان يكون ركناً فلا، حتى لو تركها، بان سجد سجدتين بعد السلام ثم قام وذهب لم تفسد صلوته ولو سجد قبل السلام لا يعيده، لانه مجتهد فيه، فاذا اداه، وقع جائزا وهذا لأنه لو اعاده يؤدي إلى تكرار سجود السهو ولم يقل به احد.

وفي الطحطاوي على الدر (۱/۳۱۰): لو سجد قبل السلام لايعيده، لأنه لو أعاده يتكرر وهو خلاف الاجماع.

وفي الهندية (۱/۱۲۸): السهو في سجود السهو لايوجب السهو لأنه لا يتناهي كذا في التهذيب.

(۲۹۹) سجدہ تلاوت کے وجوب سے لاعلمی کی بناء پر سجدہ تلاوت نہ کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بچپن میں ایک حافظ صاحب سے قرآن پڑھا تو تقریباً اس وقت میری عمر دس چودہ سال تھی اب میں چالیس سال کے قریب ہوں مسئلہ یہ پیش آیا کہ میں نے سجدہ تلاوت تو کبھی بھی ادا نہیں کیا کیونکہ مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ اس طرح سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے اب چار ماہ ہوگئے تو پتہ چلا کہ سجدہ واجب ہوتا ہے میں بہت پریشان ہوں کہ پچیس سال میں نہ جانے کتنے سجدے چھوڑے اور نماز میں بھی سورہ علق پڑھتا تھا کیونکہ مجھے میرے استاد نے بتایا تھا کہ یہ قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے مجھے بہت پسند ہے اب ان نمازوں کی بھی تعداد یاد نہیں۔ برائے مہربانی آپ حضرات علماء ہی رہنمائی فرمائیں کہ ان سجدوں اور نمازوں کا میں کیا کروں کوئی تاوان ہے یا قضاء ہے اگر قضاء ہے تو نمازوں کا کیا حکم ہے ان کی بھی قضا ضروری ہے یا فقط ان سجدوں کی قضا کافی ہے۔ جو نماز میں نہیں کئے گئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً قرآن کریم میں چودہ مقامات ایسے ہیں جن کے تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ اب آیت سجدہ تلاوت کرنے والا یا سننے والا نماز میں ہوگا یا غیر نماز میں۔ اگر نماز میں ہو تو مقتدی ہوگا یا منفرد اگر مقتدی ہو تو اپنے امام سے

آیت سجدہ سننے سے سجدہ کرنے میں امام کا تابع ہوگا اگر کسی اور شخص سے سنے جو اس نماز میں شریک نہ ہو تو نماز کے بعد اس پر سجدہ کرنا واجب ہوگا۔ اور اگر منفرد ہو تو آیت سجدہ کے تلاوت کرنے سے نماز میں سجدہ تلاوت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر نماز میں کسی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تو نماز کے بعد اس کو ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ ساقط ہو جائے گا (البتہ ترک واجب کا گناہ ہوگا)۔ جبکہ حالت نماز کے علاوہ آیت سجدہ خود پڑھنے یا دوسرے سے سننے پر سجدہ تلاوت واجب ہو جاتا ہے جو ادا کئے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جو نمازیں آپ نے پڑھی ہیں اور ان میں سورۃ علق تلاوت کی ہے اور نماز میں سجدہ تلاوت ادا نہیں کیا ہے تو نمازیں درست ہیں ان کا اعادہ نہیں ہے اور سجدے بھی ساقط ہو گئے ہیں البتہ واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے گناہ ہوگا جس سے توبہ و استغفار ضروری ہے۔ جبکہ نماز کے علاوہ جتنے سجدے آپ پر آیت سجدہ خود پڑھنے سے یا دوسروں سے سننے سے واجب ہوئے ہیں ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا بلوغت سے اب تک کا حساب لگا کر تمام سجدے اسی حساب سے ادا کئے جائیں۔

لما في الجوهرة النيرة (۱/۲۱۱): وفي رواية النوادر: ما وجب خارج الصلوة لا يسقط.

وفي الهندية (۱/۱۳۲): والسجدة واجبة في هذه المواضع على التالي والسامع سواء قصد سماع القرآن اولم يقصد كذا في الهداية (وفي صـ۱۳۳) ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقا لكن يعذر بالتاخير مالم يعلم . . . ولو سمعها من الامام اجنبي ليس معهم في الصلاة ولم يدخل معهم في الصلاة لزمه السجود كذا في الجوهرة النيرة وهو الصحيح كذا في الهداية سمع من امام فدخل معه قبل ان يسجد سجد معه وان دخل في صلاة الامام بعد ما سجدها الامام لا يسجدها . . . ولو سمع المصلي من اجنبي يسجد بعد الفراغ (وفي صـ۱۳۳) والسجدة التي وجبت في الصلاة لا تؤدى خارج الصلاة كذا في السراجية وهكذا في الكافي (وفي صـ۱۳۵) وفي الظهيرية واداؤها ليس على الفور حتى لو اداها في اي وقت كان يكون مؤديا لا قاضيا كذا في التاتارخانية.

وفي الدر المختار مع الشامية (۲/۱۰۹): (وهي على التراخي) على المختار ويكره تأخيرها تنزيها ويكفيه ان يسجد عدد ما عليه بلا تعيين ويكون مؤديا.

وفي الشامية تحته (قوله على المختار) كذا في النهر: وينبغي ان يكون محل الخلاف في الاثم وعدمه حتى لو اداها بعد مدة كان مؤديا اتفاقا لا قاضيا اهـ . (قوله تنزيها) لانه بطول الزمان قد ينساها، ولو كانت الكراهة تحريمية لوجبت على الفور وليس كذلك ولذا كره تحريما تأخير الصلاتية عن وقت القراءة امداد واستثنى من كراهة التأخير ما اذا كان الوقت مكروها كوقت الطلوع.

(۳۰۰) آیت سجدہ سننے والوں کو اگر علم ہو کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو سجدہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جب رمضان قریب آتا ہے حفاظ دور ہو کر ایک دوسرے کا قرآن دن کو سنتے ہیں ہم بھی ساتھ بیٹھتے ہیں کبھی کبھی وہ سجدہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے میں نے ایک حافظ صاحب سے پوچھا اس نے کہا قرآن میں چودہ سجدے ہیں پڑھنے اور سننے والے پر جب بھی پڑھے یا سنے واجب ہے کہ سجدہ کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ آیت سجدہ ہے یا نہیں پھر ہمارے لئے آگے دو حالتیں ہوتی ہیں کبھی تو پڑھنے والا سجدہ کرتا ہے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت سجدہ تھی۔ لیکن کبھی پڑھنے والا ہمیں نظر ہی نہیں آتا اور وہ آیت سجدہ پڑھ چکا ہوتا ہے ہم گزر جاتے ہیں آیت سن لیتے ہیں۔ مگر خبر نہیں ہوتی کہ آیت سجدہ تھی۔ کیا دونوں حالتوں میں سجدہ واجب ہوگا اور ترک پر گناہ ہوگا یا کچھ فرق ہوگا؟ تفصیل سے آسان اور واضح الفاظ میں جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ اللہ آپ کو دنیا وآخرت میں اجر عظیم عطا فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً سجدے کے وجوب کا تعلق نفس سماع سے ہے چاہے سننے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ البتہ جو شخص ان مقامات سجدہ سے ناواقف ہو تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ اسے معلوم بھی ہو جائے کہ آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ترک واجب کا گناہ بھی نہ ہوگا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کو جب اس بات کا علم ہو جائے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو آپ پر سجدہ کرنا واجب ہے، اور اگر آپ کو علم نہ ہو سکا تو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے آپ پر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہاں تک کہ اس کا علم ہو جائے لیکن جس شخص نے آیت سجدہ کی تلاوت کی ہے اس کی ذمہ لازم ہے کہ یا تو آیت سجدہ کے مقام پر اپنی آواز کو پست رکھے تاکہ زیادہ لوگ مشقت میں نہ پڑیں یا پھر تلاوت کے بعد سامعین کو اس سے باخبر کردے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے۔

لما فی الخانیۃ (۱/۳۲): اما السامع إن علم انها آية السجدة يلزمه السجدة والا فلا الخ.

وفی الهندیة (۱/۱۳۳): اذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أو لا اذا أخبر السامع انه قرأ آية السجدة وعندهما ان كان السامع يعلم أنه يقرأ القرآن يلزمه والا فلا ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقاً لكن بعلم بالتأخير عالم بعلم الخ.

وفی الدر مع الشامیة (۲/۱۰۵): فی الدر: والسماع شرط فی حق غير التالی ولو بالفارسية اذا اخبر الخ.

وفی الشامیة تحته: (قوله اذا أخبر) ای بانها آية سجدة سواء فهمها او لا وهذا عند الإمام، و عندهما ان علم السامع أنه يقرأ القرآن لزمته والا فلا بحر، وفی الفيض وبه يفتى، وفی النهر عن السراج أن

الامام رجع الى قولهما وعليه الاعتماد ... لكن لو كانت بالعربية فانه يجب بالاتفاق فهم أو لا لكن لا يجب على الاعجمى مالم يعلم كما فى الفتح اى وان لم يفهم الخ.

وفيه ايضاً (۲/۱۰۸): واستحسن اخفاءها عن سامع غير متهيئ للسجود الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله واستحسن اخفاءها الخ) لانه لو جهر بها لصار موجبا عليهم شيئاً ربما يتكاسلون عن ادائه فيقعون في المعصية فان كانوا متهيئين جهر بها بحر عن البدائع قال في المحيط بشرط ان يقع في قلبه أن لا يشق عليهم اداء السجدة فان وقع اخفاها وينبغي انه اذا لم يعلم بحالهم ان يخفيها نهر.

(۳۰۱) سجدۂ شکر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب بھی وتر سے فارغ ہوتا ہوں یا صلوٰۃ التسبیح سے فارغ ہوتا ہوں تو اس کے بعد سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں، میرے ایک دوست نے مجھے کہا کہ اس طرح کرنا صحیح نہیں ہے تو اب آپ حضرات سے یہ سوال ہے کہ میرا اس طرح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کسی نعمت کے حصول یا مصیبت سے نجات پر سجدۂ شکر کرنا مستحب ہے۔ البتہ کسی بھی نماز کے فوراً بعد سجدۂ شکر کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے۔ لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ "اس طرح کرنا صحیح نہیں" درست ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔ تاہم دیگر اوقات میں سجدۂ شکر ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لما فى الدر المختار (۲/۱۱۹، ۱۲۰): وسجدة الشكر مستحبة به يفتى، لكنها تكره بعد الصلاة لأن الجهلة يعتقدونها سنة أو واجبة وكل مباح يؤدى اليه فمكروه.

وفي الشامية تحته: (قوله وسجدة الشكر) هي لمن تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالى مالاً أو ولداً أو اندفعت عنه نقمة ونحو ذلك، يستحب له ان يسجد لله تعالى شكراً مستقبل القبلة يحمد الله تعالى فيها ويسبحه ثم يكبر فيرفع رأسه كما في سجدة التلاوة، سراج.

﴿فصل في المريض والمسافر﴾

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

(۳۰۲) زخم سے مسلسل خون نکلنے کی صورت میں نماز کی صورت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے ایسا زخم ہو جس سے مسلسل خون رستا رہتا ہو تو اب وضو اور نماز کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر خون اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ اس شخص پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد خون بہنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ معذور سمجھا جائے گا اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کر سکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور اگر خون اس قدر مسلسل نہیں بہتا تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لما في الدر المختار (۱/۳۰۵): (وصاحب عذر من به سلس) بول لا يمكنه امساكه (او استطلاق بطن... ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بان لا يجد في جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلي فيه خاليا عن الحدث (ولو حكما) لان الانقطاع اليسير ملحق بالعدم (وهذا شرط) العذر (في حق الابتداء وفي) حق (البقاء كفى وجوده في جزء من الوقت) ولو مرة (وفي) حق الزوال يشترط (استيعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقيقة) لانه الانقطاع الكامل.

(وحكمه الوضوء) لا غسل ثوبه وفي(ص ۳۰۶) ونحوه (لكل فرض) اللام للوقت كما في لدلوك الشمس (ثم يصلي به) فيه (فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالاولى (فاذا خرج الوقت بطل).

(۳۰۳) زخمی کیلئے لیٹ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید میرا خالہ زاد بھائی ہے پچھلے ہفتے وہ بذریعہ ٹرین ڈیرہ

نکالی جاتی ہے اور فقرات میں ہڈی کے بعض ٹکڑے اپنی جگہ سے اترنے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ اب الحمد للہ آپریشن ہوا ہے جو کہ بظاہر کامیاب ہے۔ آپ سے پوچھنا ہے کہ رکوع کرنا تو نہیں ہوتا لیکن بیٹھنے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے کیا زید کیلئے ایسی حالت میں لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر جائز ہے تو کیا نوافل اور سنتیں بھی لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں یا صرف فرائض جائز ہے لیٹ کر؟ براہ مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں زید اگر سہارا لگا کر بیٹھ سکتا ہو اگرچہ بیٹھنے میں تھوڑی بہت مشقت ہو تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز نہیں، اگر زید کو سہارا لگا کر بیٹھنے سے بھی شدید تکلیف ہو یا مرض کے بڑھنے کا خوف ہو تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا (مراد ہاتھوں کے اشارہ سے) جائز ہے۔ خواہ فرض نماز ہو یا سنت یا نفل سب کا حکم یکساں ہے۔

لما في الهندية (١/١٣٦، ١٣٧): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد واصح الأقاويل في تفسير العجز ان يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوى ... واذا لم يقدر على القعود مستويا وقدر متكئا او مستندا الى حائط او انسان يجب ان يصلي متكئا او مستندا ولا يجوز له ان يصلي مضطجعا على المختار ... وان تعذر القعود اومأ بالركوع والسجود مستلقيا على ظهره وجعل رجليه الى القبلة وينبغي ان يوضع تحت رأسه وسادة حتى يكون شبه القاعد ليتمكن من الايماء بالركوع والسجود واضطجع على جنبه ووجهه الى القبلة واومأ جاز والأول أولى كذا في الكافي وان لم يستطع على جنبه الايمن فعلى الايسر كذا في السراج الوهاج ووجهه الى القبلة

وفي الدر المختار (٢/٩٥، ٩٦، ٩٧): (من تعذر عليه القيام) أي كله (لمرض) حقيقي وحده أن يلحقه بالقيام ضرر به يفتى (قبلها أو فيها) أي الفريضة ... (صلى قاعدا) ولو مستندا إلى وسادة أو إنسان فإنه يلزمه ذلك على المختار. ... وفي (صـ ٩٩): (وإن تعذر القعود) ولو حكما (أومأ مستلقيا) على ظهره (ورجلاه نحو القبلة).

(٣٠٤) مسلسل قطرات آنے کی صورت میں نماز کیسے پڑھیں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کی تکلیف ہے جس کی وجہ سے اسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہیں اور وضو کرکے نماز پڑھنا انتہائی مشکل ہوتا ہے کیا ایسا شخص نماز پڑھے گا؟ اگر پڑھے گا تو پڑھنے کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر پیشاب کے قطرات اس قدر مسلسل آتے ہوں کہ اس پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد قطرات کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ

معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرلے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کر سکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور قطرات اگر اس قدر مسلسل نہیں آتے تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لما فی المصنف لعبد الرزاق (۱/ ۱۵۱): عبد الرزاق عن معمر عن الزهری عن خارجة بن زيد قال ... حتى سلس منه البول فكان يداويه ما استطاع فاذا غلبه توضأثم صلى.

بقية الدلائل مر سابقاً فى السوال السابق

(۳۰۵) اگر اٹھنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص پر نماز فرض ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اتنا زخمی ہو چکا ہو کہ اس کا چارپائی سے اٹھنا بھی مشکل ہو تو کیا ایسی حالت میں اس پر نماز واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر واجب ہو تو پھر وضو کس طرح کرے حالانکہ اس کا چارپائی سے اٹھنا بھی مشکل ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مریض اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے گا اور اگر بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہ ہو تو لیٹ کر سر کے اشارے سے نماز پڑھے گا اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو نماز کو مؤخر کرے گا صحیح ہونے تک۔ صحیح ہونے کے بعد اگر پانچ سے کم نمازیں قضا ہوئی ہوں تو ان کی قضا کرنا لازمی ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو اس سے قضا ساقط ہوگی لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر کھڑے ہونے پر قادر نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، اس پر بھی قادر نہیں ہے تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھے اور وضو اگر خود کر سکتا ہے یا ایسا شخص ہے جو اسے وضو کرائے تو تیمم کرکے نماز پڑھے۔ الغرض نماز ایسے شخص پر بھی فرض ہے جو بیٹھ کر یا اشارہ سے پڑھ سکتا ہو۔

لما فی الطحطاوی على الدر (۱/ ۱۲۵): (قوله بشدة) تقييد لاطلاق المصنف المرض فيعلم ان اليسير لايبيح التيمم ولا فرق فى الاشتداد بين ان يشتد بالتحرك كالمبطون كما افاده بقوله ولو بتحرك او بالاستعمال كالجدرى وجاز له التيمم اتفاقا ان كان لايجد من يوضئه ولا يقدر بنفسه

وفيه ايضاً (۱/ ۳۱۹): (قوله بان زادت على يوم وليلة) اى بالساعات او بالاوقات على وزان ماسياتى فى مسئلة المجنون (قوله فى ظاهر الرواية) وقيل تؤخر ولا تسقط وصحح (قوله وعليه الفتوى) راجع الى المقابلة لاللمقابلة عليه وهو اذا لم يفهم فانه لايقضى له اجماعاً ومحل الخلاف فيما اذا برئ من مرضه ...... على الايماء بالرأس اما ان قدر عليه بعد عجزه فانه يلزمه القضاء وان كان القضاء يجب موسعا لظهور فائدته فى الايصاء بالاطعام عنه بحر.

وفي الشامية (۹۹/۲): (قوله بان زادت على يوم وليلة) اما لو كانت يوماً وليلة أو اقل وهو يعقل فلا تسقط بل تقضي اتفاقاً وهذا اذا صح للو مات ولم يقدر على الصلاة ثم يلزمه القضاء حتى لا يلزمه الايصاء . (قوله في ظاهر الرواية) وقيل لا يسقط القضاء بل تؤخر عنه اذا كان يعقل وصححه في الهداية وهو من اهل الترجيح لكن خالف نفسه في كتابه التجنيس.

(۳۰۶) معذور آدمی کا گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک معذور آدمی ہوں اور مسجد کے پڑوس میں رہتا ہوں لیکن مسجد میں عذر کی وجہ سے نہیں جا سکتا تو کیا میں اپنے بیٹوں کے ساتھ گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً شریعت مطہرہ نے عذر شرعی مثلاً بیماری، شدید بارش، شیخ فانی وغیرہ کا اعتبار کیا ہے اور معذور آدمی کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ترک کرنے کی رعایت رکھی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ مسجد کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی گھر میں اپنے تیمارداریا دیکھ بھال کرنے والے کسی فرد کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

لما في الهندية (۸۲/۱): الجماعة سنة مؤكدة كذا في المتون والخلاصة والمحيط ومحيط السرخسي . (ص۸۳) وتسقط الجماعة بالأعذار حتى لا تجب على المريض والمقعد والزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذي لا يستطيع المشي والشيخ الكبير العاجز والاعمى عند ابي حنيفة رحمه الله تعالى.

وفي الدر المختار (۵۵۲/۱): (والجماعة سنة مؤكدة للرجال . (وأقلها اثنان) .. (وقيل واجبة وعليه العامة) . (فتسن أو تجب) على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج) (فلا تجب على مريض ومقعد وزمن ومقطوع يد ورجل من خلاف) .. (ومفلوج وشيخ كبير عاجز وأعمى) وإن وجد قائداً .. وقيامه بمريض الخ. قال الشامي رحمه الله تحته: (۵۵۵/۱) (قوله ولو فاتته ندب طلبها) .. وذكر القدوري: يجمع بأهله ويصلي بهم؛ يعني وينال ثواب الجماعة كذا في الفتح.

(۳۰۷) دورانِ نماز اگر قیام سے عاجز ہوجائے تو باقی نماز بیٹھ کر ادا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے دو ہفتوں سے میں شدید بخار میں مبتلا ہوں اب اللہ پاک کا فضل ہے صحت تھوڑی اچھی ہوئی ہے لیکن چونکہ دو ہفتوں کے مسلسل بخار نے بہت کمزور کر دیا ہے اب میری حالت یہ ہے کہ جب

نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو تھوڑی دیر کے بعد سر پر چکر آنا شروع ہوتا ہے تو گرنے لگتا ہوں تو کیا ایسی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں؟ یا کھڑے ہو کر نماز شروع کروں جب چکر آجائے پھر بیٹھ جاؤں۔ لہٰذا جو بھی صورت شرعاً جائز ہو تحریر فرما کر اللہ کے فضل وکرم کے مستحق بنئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... نماز کے اندر قیام فرض ہے اور اگر کوئی عذر کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ البتہ جتنی دیر قیام پر قادر ہے اتنی دیر کھڑا رہے پھر بیٹھ جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کھڑے ہو کر نماز شروع کرنے پر قادر ہیں اس لئے کھڑے ہو کر نماز شروع کریں جب چکر آنا شروع ہو جائیں تو اس وقت بیٹھ جائیں۔

لمافی الفتاوی الهندية (۱/۱۳۶): ولو كان قادرا على بعض القيام دون تمامه يؤمر بان يقوم قدر ما يقدر حتى اذا كان قادرا على ان يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقراءة او كان قادرا على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ قدر ما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلوانی رحمه الله تعالىٰ هو المذهب الصحيح ولو ترک هذا خفت ان لا تجوز صلاته كذا فی الخلاصة.

وفی الشامية (۲/۹۷): وفی شرح الحلوانی نقلا عن الهندوانی: لو قدر على بعض القيام دون تمامه، او كان يقدر على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ ما قدر عليه ثم يقعد ان عجز وهو المذهب الصحيح لایروی خلافه عن اصحابنا.

(۳۰۸) بیمار آدمی کیلئے قبلہ رُخ کئے بغیر نماز ادا کرنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ ہسپتال کی چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور چارپائی مریضوں کے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ادھر ادھر بھی نہیں ہو سکتی تو کیا مریض بغیر قبلہ رخ کئے نماز ادا کر سکتا ہے کیونکہ چہرہ قبلہ کی طرف نہیں بلکہ شمال کی جانب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں مریض کے چہرے کو قبلہ کی طرف پھیرنے والا موجود ہے تو قبلہ کی طرف منہ پھیر کر نماز پڑھے اگر مریض کے پاس کوئی بھی موجود نہ ہو، اور وہ خود بھی نہیں پھیر سکتا تو جس طرف پھیرنے کی قدرت ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے۔

لمافی الهندية (۱/۶۳): مريض صاحب فراش لا يمكنه ان يحول وجهه وليس بحضرته احد يوجهه يجزيه صلوته الى حيث ماشاء كذا فی الخلاصة وكذا اذا كان يجد من يحوله ولكن يضره التحويل هكذا فی الظهيرية.

وفي الدر المختار (۱/۲۴۲) (وقبلة العاجز عنها) لمرض وإن وجد موجها عند الإمام او خوف مال (وكذا كل من سقط عنه الأركان)

وفي الشامية تحته: (وكذا كل من سقط عنه الاركان) اي تكون قبلته جهة قدرته ايضا.

(۳۰۹) قیام، رکوع وسجدہ سے عاجز کا بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری والدہ جوڑوں (گٹھیا) کی مریض ہیں اور زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے اب اگر وہ اس مجبوری کی بنا پر تخت یا چارپائی وغیرہ پر ہی بیٹھ کر نماز پڑھنا چاہیں تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ اور اگر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھتی ہیں تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر آپ کی والدہ قیام، رکوع وسجدہ کرنے سے عاجز ہیں تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتی ہیں، چاہے چارپائی پر پڑھیں یا تخت پر۔ اگر بیٹھ کر رکوع وسجدہ سے بھی عاجز ہوں تو پھر اشارے سے نماز پڑھ لیں لیکن سجدہ کا اشارہ رکوع سے ذرا جھک کر کریں۔

لما في الهندية (۱/۱۳۶) اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد كذا في الهداية وان عجز عن القيام والركوع والسجود وقدر على القعود يصلي قاعدا بايماء ويجعل السجود اخفض من الركوع.

وفي الدر المختار (۲/۹۷) (وان تعذرا) وفي (ص۹۸) (اوما) بالهمز قاعدا وهو افضل من الايماء قائما لقربه من الارض (ويجعل سجوده اخفض من ركوعه).

(۳۱۰) تختہ لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں ایسی کرسیاں استعمال ہوتی ہیں جن میں آگے ایک تختی لگی ہوتی ہے اور کرسی پر بیٹھنے والا اس پر سجدہ کرتا ہے کیا فرش کے علاوہ کسی اور چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ اگر اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہو تو ضرور بیان کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ہر ایسی چیز پر سجدہ کرنا درست ہے جو کہ مجمر رکھی ہو اور ٹھوس ہو کہ پیشانی اس پر ٹھہر سکے تو ایسی چیز زمین ہی کے حکم میں ہوگی۔ صورت مسئولہ میں معذور شخص جو کہ رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو تو اس کیلئے اس مخصوص کرسی پر بیٹھ کر سامنے نصب شدہ تختی پر سجدہ کرنا اور نماز کا پڑھنا بلا کسی کراہت کے جائز ہے اور ائمہ اربعہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

لما في الشامية (۱/۳۵۳): (وشرط سجوده) مستقرا ومضاف اليه (فالقرار) عبر بزيادة الفاء (لجبهته)

أي يفترض أن يسجد على ما يجد حجمه بحيث أن الساجد لو بالغ لا يتسفل رأسه أبلغ مما كان عليه حال الوضع، فلا يصح على نحو الأرز والذرة، إلا أن يكون في نحو جوالق، ولا على نحو القطن والثلج والفرش إلا إن وجد حجم الأرض بكبسه.

(۳۱۱) زمین یا کرسی وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر آج کل لوگ مساجد میں مخصوص کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور کتنے عذر کی بناء پر آدمی کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جو لوگ مخصوص کرسیوں وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں ان لوگوں کا ان کرسیوں پر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا اس شرط کے ساتھ جائز ہوگا کہ یہ لوگ بغیر ضرر کے کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں لیکن اگر بغیر ضرر کے تکبیر تحریمہ کہنے کے بقدر بھی قیام پر قادر ہوں اور رکوع وسجدہ بھی کر سکتے ہوں تو تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر کہیں اور پھر بیٹھ جائیں۔ یا جتنی مقدار بھی کھڑے ہونے پر بغیر ضرر کے قادر ہوں تو اس قدر کھڑے ہونا ان حضرات پر لازم ہے پھر جب عاجز ہو جائیں تو بیٹھ جائیں، اور اگر رکوع اور سجدہ پر قدرت نہ رکھتے ہوں تو اگرچہ قیام پر بغیر ضرر کے بھی قادر ہوں تو پھر ان حضرات کیلئے یہ جائز ہے بلکہ افضل ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھیں اور قیام ان لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اور جس شخص کیلئے کھڑا ہونا متعذر ہو یا کھڑا ہونے میں ان کو ضرر لاحق ہوتا ہو تو اس شخص کو بیٹھ کر نماز پڑھنا درست ہے۔

لما في الهندية (١/١٣٦): إذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد كذا في الهداية وأصح الأقاويل في تفسير العجز أن يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوى كذا في معراج الدراية. وكذلك إذا خاف زيادة المرض أو إبطاء البرء بالقيام أو دوران الرأس كذا في التبيين أو يجد وجعاً لذلك، فإن لحقه نوع مشقة لم يجز ترك ذلك القيام كذا في الكافي ولو كان قادراً على بعض القيام دون تمامه يؤمر بأن يقوم قدر ما يقدر حتى إذا كان قادراً على أن يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقراءة أو كان قادراً على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائما ويقرأ قدر ما يقدر عليه قائما ثم يقعد إذا عجز قال شمس الأئمة الحلواني رحمه الله تعالى هو المذهب الصحيح ولو ترك هذا خفت أن لا تجوز صلاته كذا في الخلاصة ولو قدر على القيام متكئاً الصحيح أنه يصلي قائما متكئاً ولا يجزيه غير ذلك وكذلك لو قدر على أن يعتمد على عصا أو على خادم له فإنه يقوم ويتكئ كذا في التبيين ويكره للمومي أن يرفع إليه عوداً أو وسادة ليسجد عليه .... فإن كانت الوسادة موضوعة على الأرض وكان يسجد عليها جازت صلاته.

وفي الدر المختار (٢/٩٧): (وإن تعذرا) ليس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود كاف (لا القيام)

وفی الشامیة تحته: وفی الذخیرة: رجل بحلقه خراج إن سجد سال وهو قادر علی الرکوع والقیام والقراءة یصلی قاعدا یومی، ولو صلی قائما برکوع وقعد واوما بالسجود اجزاه والأول أفضل، لأن القیام والرکوع لم یشرعا قربة بنفسهما بل لیکونا وسیلتین الی السجود اهـ.

وفیه ایضاً (۲/۹۵): (من تعذر علیه القیام) ای کله (لمرض) حقیقی و حده ان یلحقه بالقیام ضرر به یفتی (قبلها او فیها) ای الفریضة (او) حکمی بان (خاف زیادته او بطء برئه بقیامه او دوران رأسه او وجد لقیامه الما شدیداً) او کان لو صلی قائما سلس بوله او تعذر علیه الصوم کما مر (صلی قاعداً) ولو مستندا الی وسادة او انسان فانه یلزمه ذلک علی المختار (کیف شاء) علی المذهب ــــ (برکوع وسجود وان قدر علی بعض القیام) ولو متکئاً علی عصا او حائط (قام) لزوماً بقدر مایقدر ولو قدر آیة اوتکبیرة علی المذهب.

وفی الشامیة: (۲/۹۶) واختلفوا فی التعذر ــــ فقیل ما یبیح الافطار وقیل التیمم وقیل بحیث لو قام سقط وقیل ما یعجزه والاصح ان یلحقه ضرر بالقیام ــــ (قوله ولو مستنداً الخ) ای اذا لم یلحقه ضرر به بدلیل ماмр (وفی صـ۹) وبه ظهر ان المراد بالانسان من یطیعه اعم من الخادم والاجنبی ــــ (قوله کیف شاء) ای کیف تیسر له بغیر ضرر من تربع او غیره (قوله علی المذهب) جزم به فی الغرر ونور الایضاح وصححه فی البدائع وشرح المجمع واختاره فی البحر والنهر.

(۳۱۲) نمازیوں کی مروجہ کرسیوں میں ۹/ انچ اونچائی رکھنے کی علت

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ کی مسجد میں چند کرسیاں جو آجکل مساجد میں بزرگ حضرات نماز ادا کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں موجود تھیں۔ کچھ دن قبل یہ کرسیاں مذکورہ مسجد کے خطیب کے کہنے پر اٹھادی گئیں تھیں، اُن کا کہنا تھا کہ ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن چند دن بعد دوبارہ رکھ دی گئیں اور کہا گیا کہ ان کرسیوں میں سے جن کی اونچائی ۹/ انچ تھی ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح ہے اور جن کی اونچائی ۹/ انچ نہیں ہے اُن کو ۹/ انچ تک برابر کروا کر دوبارہ رکھ دیں گے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس ۹/ انچ اونچائی کی کیا علت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ سجدہ کے لغوی معنی ہے پیشانی زمین پر رکھنا یعنی آدمی جس جگہ بیٹھا ہوا ہو، اس جگہ سے جھک کر پیشانی زمین پر رکھے یا وہ چیز جو زمین کے قائم مقام ہو مثلاً تخت وغیرہ وغیرہ۔ اگر سجدہ والی جگہ بیٹھنے والی جگہ کی بہ نسبت اونچی ہو تو اس صورت میں سجدہ ادا ہوگا یا نہیں تو اس کے لئے فقہائے کرام نے یہ حد مقرر کی ہے کہ اگر سجدہ والی جگہ نصف ذراع کے بقدر اونچی ہے تو سجدہ ادا ہو جائے گا اور اگر اس سے زیادہ اونچی ہے تو پھر سجدہ ادا نہ ہوگا اور نصف ذراع تقریباً ۹/ انچ ہے کما صرح به فی اوزان الشرعیة (صفحہ ۳۲) لہٰذا مذکورہ

امام صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی المحیط البرھانی(۲/۱۲۳): واذا کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین (کہ زمین نشیب بود) قیل ذکر الشیخ الامام الاجل شمس الائمۃ الحلوانی فی شرح کتاب الصلوۃ انہ ان کان التفاوت بمقدار لبنۃ او لبنتین یجوز وان کان اکثر من ذلک لایجوز واراد باللبنۃ اللبنۃ المنصوبۃ دون المفروشۃ.

وفی الدر المختار(۱/۵۰۳): ولو کان موضع سجودہ ارفع من موضع القدمین بمقدار لبنتین منصوبتین (ای موضوعۃ احدھما فوق الاخری) جاز سجودہ وان اکثر لا الالزحمۃ کمامر والمراد لبنۃ بخاری وھی ربع ذراع عرض ستۃ اصابع(ای مقدار بعرض ستۃ اصابع مضموم بعضھا الی بعض لا بطولھا) فمقدار ارتفاعھما نصف ذراع ثنتا عشرۃ اصبعاً ذکرہ الحلبی

وفیہ ایضاً(۲/۴۰): ولو صلی علی دابۃ فی شق محمل وھو یقدر علی النزول بنفسہ لاتجوز الصلاۃ علیھا اذا کانت واقفۃ الا ان تکون عیدان المحمل علی الارض بأن رکز تحتہ خشبۃ.

وفی الکبیری(ص۲۷۸): والخامسۃ من الفرائض السجدۃ وھی فریضۃ تتادی بوضع الجبھۃ علی الارض اوما یتصل بھا بشرط الانخفاض الزائد علی نھایۃ الرکوع مع الخروج عن حد القیام لانہ لا یعد ساجداً لغۃ وعرفاً بما دونہ ویعدبہ.

وفیہ ایضاً(ص۲۸۱): ولو کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین ان کان ارتفاعہ مقدار ارتفاع لبنتین منصوبتین جاز السجود علیہ والا فلا یجوز السجود واراد باللبنۃ لبنۃ بخاری وھی ربع ذراع عرض ست اصابع فمقدار ارتفاع اللبنتین المنصوبتین نصف ذراع طول اثنی عشرۃ اصبعاً ـــ وذکر الزاھدی لو سجد یعنی المریض علی دکان دون صدرہ یجوز کالصحیح انتھی والاقرب ماذکر المصنف لما قدمناہ فی اوّل بحث السجدۃ من حدادنی السجود المجزی فانہ صادق فیما اذا کان الارتفاع ھذا المقدار لافی الأزید فلیتامل.

(۳۱۳) بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے رکوع کا طریقہ

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والا سر کو کس قدر جھکائے تا کہ رکوع ادا ہو جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ اگر کوئی شخص بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے، اس کیلئے مناسب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے وہ اپنی پیشانی کو اپنے گھٹنے

الوسادة موضوعة على الارض وكان يسجد عليها جازت صلاته، فقد صح ان ام سلمة كانت تسجد على مرفقة موضوعة بين يديها لعلة كانت بها ولم يمنعها رسول الله ﷺ من ذلك اهـ فان مفاد هذه المقابلة والاستدلال عدم الكراهة في الموضوع على الارض المرتفع ثم رأيت القهستاني صرح بذلك.

وفيه ايضاً (۲/۹۹): انه لو كان قادرا على وضع شيء على الارض مما يصح السجود عليه انه يلزمه ذلك لانه قادر على الركوع والسجود حقيقة ولا يصح الايماء بهما مع القدرة عليهما بل شرطه تعذرهما كما هو موضوع المسألة

(۳۱۵) خروج ریح کی صورت میں اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصے سے ایک بیماری ہے جو ناف کے نیچے پریشانی کا باعث بنتی ہے وہ یہ ہے کہ جب میں نماز کے دوران رکوع یا سجدہ کرتا ہوں تو ریح خارج ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ آپ نماز بیٹھ کر ادا کیا کریں اور رکوع اور سجدہ کرنے کی بجائے اشارہ کیا کریں۔ آیا ایسی صورت میں میرے لئے بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں مذکورہ عذر (خروج ریح) کی وجہ سے آپ کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھنا اور رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرنا جائز ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۳۸): كل من لا يقدر على اداء ركن الا بحدث يسقط عنه ذلك الركن كذا في فتاوى قاضيخان حتى لو كان به جراحة لا يستطيع ان يسجد الا وتسيل جراحته وهو صحيح فيما سوى ذلك يقدر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعدا يومي ايماء

وفي الشامية (۲/۹۸): رجل بحلقه خراج ان سجد سال وهو قادر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعدا ويومي.

وفيه ايضاً (۱/۵۰۴): (قوله ولو بصلاته مومئا) اي كما اذا سال عند السجود ولم يسل بدونه فيومي قائما او قاعدا وكذا لو سال عند القيام يصلي قاعدا.

(قوله وبرده لا يبقى ذا عذر) قال في البحر: ومتى قدر المعذور على رد السيلان برباط او حشو او كان لو جلس لا يسيل ولو قام سال وجب رده، وخرج برده عن ان يكون صاحب عذر، ويجب ان يصلي جالسا بايماء ان سال بالميلان لان ترك السجود اهون من الصلاة مع الحدث.

(۳۱۶) کبڑے شخص کے رکوع کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبڑا شخص نماز کے اندر رکوع کس طرح کرے جبکہ وہ عام حالات میں بھی اتنا جھکا ہوتا ہے جیسے رکوع کی حالت میں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: کبڑا پن اگر حالت رکوع تک پہنچ جائے تو پھر کبڑا شخص سر کے اشارے سے رکوع کرے گا۔

لما فی الخلاصة (۱/۵۳): الاحدب اذا بلغت حدوبته الرکوع یشیر برأسه للرکوع.

وفی الهندیة (۱/۷۰): والاحدب اذا بلغت حدوبته الرکوع یشیر برأسه للرکوع.

(۳۱۷) دو راستوں میں کم وزیادہ مسافت کے وقت سفر شرعی کیلئے ۴۸ میل کا اعتبار ہوگا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے اپنے سسرال جانے کیلئے دو راستے ہیں ایک ہموار دوسرا ناہموار، زید جب ہموار راستے سے اپنے سسرال جاتا ہے تو تین دن میں ۴۸ میل سفر طے کرتا ہے اور جب ناہموار راستے سے جاتا ہے تو تین دن میں ۳۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۳۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اب وہ قصر نماز پڑھے گا یا مکمل نماز پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: فقہاء احناف کے یہاں سفر کی ادنیٰ مقدار مسافر شرعی بننے کیلئے وہ تین دن اور تین رات کا سفر ہے چاہے حقیقۃً تین دن پائے جائیں یا تین دن کی مسافت کے بقدر مسافت پائی جائے دونوں صورتوں میں انسان مسافر شرعی کہلاتا ہے اور اس پر سفر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اصل مذہب کے اعتبار سے فرسخ کا اعتبار نہیں ہے بلکہ صرف تین دن کی مسافت کا اعتبار ہے اگرچہ بعد کے فقہاء نے فرسخ کا اعتبار کیا ہے جس کو موجودہ دور میں میل اور کلومیٹر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ان حضرات کا مقصد بھی فرسخ وغیرہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تین دن میں انسان درمیانی چال (اونٹ یا پیدل سفر کرنے) سے اتنی مسافت طے کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص تین دن کا سفر کر کے کسی جگہ پہنچتا ہے زمین کے دشوار گزار ہونے کی بناء پر تو وہ بھی مسافر شرعی ہے اگرچہ فرسخ کے اعتبار سے کم ہی فاصلہ ہو اس صورت میں فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا بعینہٖ نص کے کیونکہ نص میں تین دن کے الفاظ موجود ہیں لہٰذا صورت مسئولہ میں جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۳۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اس صورت میں وہ مسافر شرعی ہے اور وہ قصر نماز پڑھے گا کیونکہ تین دن کے سفر کی صورت میں میل اور فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے البتہ یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو کہ حقیقۃً تین دن اور تین رات کا سفر کرے اور اگر کوئی شخص گاڑی وغیرہ میں سفر کرتا ہے جیسا کہ موجودہ زمانے میں کیا جاتا ہے تو وہاں ۴۸ میل کا ہی اعتبار ہوگا چاہے ۴۸ میل تین دن سے کم میں ہی مکمل ہو جائیں اس صورت میں دنوں کا اعتبار نہیں ہوگا اگر ۴۸ میل کا سفر طے کرلیا ہے تو قصر پڑھے گا ورنہ نہیں۔

لما فی الهندیة (۱/۱۳۸): فاذا قصد بلدة والی مقصده طریقان أحدهما مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها

والآخر دونها فسلك الطريق الابعد كان مسافرا عندنا هكذا في فتاوى قاضي خان وان سلك الا قصر يتم كذا في البحر.

وفي فتح القدير (۲/۳۰): (قوله هو الصحيح) احتراز عما قيل يقدرها فقيل باحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر بقدر منها اعتقد انه مسيرة ثلاثة ايام وانما كان الصحيح ان لا يقدر بها لانه لو كان الطريق وعرا بحيث يقطع في ثلاثة ايام اقل من خمسة عشر فرسخا قصر بالنص وعلى التقدير باحد هذه التقديرات لايقصر فيعارض النص فلا يعتبر سوى سير الثلاثة وعلى اعتبار سير الثلاثة بمشي الاقدام لو سارها مستعجل كالبريد في يوم قصر فيه وافطر لتحقق سبب الرخصة وهو قطع مسافة ثلاثة بسير الابل ومشي الاقدام.

وفي الدر المختار (۲/۱۲۲، ۱۲۳): (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها) من أقصر أيام السنة ولا يشترط سفر كل يوم إلى الليل بل إلى الزوال ولا اعتبار بالفراسخ على المذهب (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لو اسرع فوصل في يومين قصر، ولو لموضع طريقان أحدهما مدة السفر والاخر اقل قصر في الاول لا الثاني. قال العلامة الشامي عليه الرحمة في رد المحتار: قال في النهاية: أي التقدير بثلاث مراحل قريب من التقدير بثلاثة ايام لان المعتاد من السير في كل يوم مرحلة واحدة خصوصا في أقصر ايام السنة كذا في المبسوط اهـ وكذا مافي الفتح من أنه قيل يقدر بأحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر منها اعتقد أنه مسيرة ثلاثة ايام اهـ اى بناء على اختلاف البلدان فكل قائل قدر ما في بلده من أقصر الأيام أو بناء على اعتبار أقصر الأيام او أطولها او المعتدل منها وعلى كل فهو صريح بأن المراد بالأيام ماتقطع فيها المراحل المعتادة فافهم . (قوله على المذهب) لأن المذكور في ظاهر الرواية اعتبار ثلاثة ايام كما في الحلية وقال في الهداية: هو الصحيح احتراز عن قول عامة المشايخ من تقديرها بالفراسخ.

وفي فتح الملهم (۳/۵۳۴): تنبيه. نبه ابن عابدين على ان المراد بالايام ما تقطع فيه المراحل المعتادة. وفي الدر المختار وغيره لو اسرع فوصل في يومين الى مكان مسافة ثلثة ايام بالسير المعتاد: قصر. قال ابن عابدين وظاهره انه كذلك لو وصل اليه في زمن يسير بكرامة لكن استبعده (ابن الهمام) في فتح القدير بانتفاء مظنة المشقة وهي العلة في القصر قلت: والظاهر ان هذا الاستبعاد من ابن الهمام يجرى في اسفار زمننا ايضا من سير البابورة والطيارة وغيرهما والله اعلم.

(٣١٨) مسافر شرعی کی تعریف

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر شرعی کسے کہتے ہیں؟ آج کل تبلیغی جماعت والے جب چلہ تین چلہ میں دن لگاتے ہیں تو ایک بستی میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن تشکیل ہو جانے کی صورت میں بعض جماعتیں سفری نماز ہی پڑھتی ہیں حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ کسی شخص کا پندرہ دن یا اس سے زیادہ وقت اگر ایک جگہ پر رہنے کا ارادہ ہو تو وہ مسافر مقیم ہو جاتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً جو شخص ایسی جگہ جانے کا ارادہ کرے جس کی مسافت تین دن پیدل چلنے یا اونٹ کے چلنے کے برابر ہو جس کا اندازہ فقہائے کرام نے ۴۸ میل / ٧٧.٢٥ کلو میٹر لگایا ہے اور وہاں پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ ہو تو ایسا شخص مسافر شرعی کہلائے گا اور یہ شخص قصر کرے گا۔ پس صورت مسئولہ میں جن جماعتوں کی تشکیل ایک ہی بستی یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ہو جائے اور وہاں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت بھی ہو یہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے ہاں اگر پندرہ دن سے کم ہو تو پھر یہ مسافر ہوں گے اور نماز قصر پڑھیں گے۔

وفي الهندية (١/١٣٩): ولايزال على حكم السفر حتى ينوي الاقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر كذا في الهداية.

وفي الدر المختار (٢/١٢٥، دار معرفة): ولو في الصلوة اذا لم يخرج وقتها ولم يك لاحقا واقامة نصف الشهر حقيقة أو حكما لما في البزازية وغيرها: لو دخل الحاج الشام وعلم انه لايخرج الامير القافلة في نصف شوال أتم لانه كناوي الاقامة.

(٣١٩) مسافت شرعی کی ابتداء وانتہا کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شرعی مسافت جو کہ ۴۸ میل ہے اس کا اعتبار و شمار کہاں سے ہوگا شہر کی حدود کے باہر سے یا مسافر کے گھر سے؟ اسی طرح جس شہر کی طرف سفر کر رہا ہے وہاں پر بھی اس شہر کی حدود تک مسافت کا اعتبار ہوگا یا اس خاص مقام تک کا اعتبار کیا جائے گا جہاں وہ قیام پذیر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً شرعی مسافت کا اعتبار اپنے شہر کی آبادی یا اس کی حدود کے ختم ہونے کے بعد سے کیا جاتا ہے۔

لما في الهندية (١/١٣٩): قال محمد رحمه الله: يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور المصر كذا في المحيط.

وفي الدر المختار (٢/١٢١): (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم يجاوز

من الجانب الاٰخر.

وفی الشامیة (۲/ ۱۲۱): (قوله من جانب خروجه الخ) قال فی شرح المنیة: فلا یصیر مسافرًا قبل ان یفارق عمران ماخرج منه من الجانب الذی خرج حتی لو کان ثمة محلة منفصلة عن المصر وقد کانت متصلة به لایصیر مسافرًا مالم یجاوزها، ولو جاوز العمران من جهة خروجه وکان بحذائه محلة من الجانب الاٰخر یصیر مسافرًا اذ المعتبر جانب خروجه.

(۳۲۰) مسافت سفر کی ابتداء وانتہاء کہاں سے ہوگی؟

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مسافت سفر کے بارے میں ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص گوجرانوالہ سے لاہور شہر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی مسافت کی مقدار سفر شرعی کے برابر نہیں تھی، لیکن وہ لاہور شہر ہی میں اتنی دور چلا جاتا ہے کہ اس کی مسافت کی مقدار سفر شرعی کی مقدار کے برابر ہو جاتی ہے تو آیا اس پر احکامات سفر لازم ہوں گے یا نہیں، اور مقدار مسافت کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... اگر گوجرانوالہ سے لاہور کے اس مقام تک جانے کی نیت کی ہے جہاں تک سفر شرعی نہیں بنتا تو مسافر نہیں ہوگا۔ البتہ اگر لاہور سے آگے جا رہا ہے اور گوجرانوالہ سے نکل کر وہاں تک مدت شرعی ہے۔ تو گوجرانوالہ سے نکلتے ہی مسافر شمار کیا جائے گا۔ باقی مقدار مسافت شہر یا بستی کی آبادی سے نکلنے سے شروع ہوتی ہے اور دوبارہ آبادی میں آنے سے ختم ہو جاتی ہے۔

لما فی الدر المختار (۲/ ۱۲۱، ۱۲۲): (من خرج من عمارة موضع اقامته) ..... (قاصدا) (مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها) ..... (حتی یدخل موضع مقامه) ان سار مدة السفر .....

وفی بدائع الصنائع (۱/ ۲۷۷): وفعل السفر لا یتحقق الا بعد الخروج من المصر فمالم یخرج لا یتحقق قران النیة بالفعل، فلا یصیر مسافراً.

(۳۲۱) جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو تو وہ کب قصر کرے گا؟

سوال ..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں سڑک سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اگر ہمیں سفر کرنا ہو تو ایک کلومیٹر پیدل سفر کر کے گاڑی پر جا کر سوار ہوتے ہیں اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم سے کسی کو مسافت شرعی سے زیادہ کہیں سفر پر جانا پڑے تو راستے میں قصر ہوگی۔ اب یہ قصر گاؤں سے نکلتے ہی شروع ہوگی یا اڈے سے سوار ہونے کے بعد قصر کے احکامات شروع ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ..... جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو تو جب وہ شہر کی آبادی اور فناء مصر سے نکل جائے گا تو اس پر سفر کے

احکام جاری ہوں گے لہٰذا اگر صورت مسئولہ میں اذیقان شہر میں داخل ہے تو اڈے سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے اگر اذیقان شہر میں داخل نہیں تو پھر آبادی سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے۔

لما في الهندية (۱/۱۳۹): قال محمد رحمه الله تعالى يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور المصر كذا في المحيط. وفي الغياثية هو المختار وعليه الفتوى كذا في التتارخانية. الصحيح ما ذكر انه يعتبر مجاوزة عمران المصر لا غير الا اذا كان ثمة قرية او قرى متصلة بربض المصر فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى بخلاف القرية التي تكون متصلة بفناء المصر فانه يقصر الصلاة وان لم يجاوز تلك القرية كذا في المحيط.

وفي الدر المختار (۲/۱۲۱): (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم يجاوز من الجانب الآخر

(۳۴۴) مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم عمرہ کرنے گئے۔ وہاں پہنچ کر عمرہ ادا کیا اس کے بعد آرام کرنے ہوٹل چلے گئے اور سو گئے۔ آنکھ کھلی تو عصر کی نماز ہو رہی تھی۔ ہم نے جماعت سے نماز ادا کی۔ پھر اس کے بعد ظہر کی قضا نماز ادا کی۔ لیکن ہمیں پوری کسی نے ہمیں بتایا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیا یہ ٹھیک ہے۔ باقی سب جگہ پر قصر نماز ٹھیک ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جب کوئی مقیم شخص گھر سے سفر شرعی کے ارادے سے نکلتا ہے جو آج کل کے حساب سے لازماً ۴۸ میل (۷۷.۹۸ کلومیٹر) بنتا ہے۔ اپنے شہر یا بستی سے نکلنے کے بعد اس پر مسافر کے احکام جاری ہو جاتے ہیں مثلاً یہ کہ نماز قصر پڑھے گا۔ اور یہ قصر نماز پڑھنا یعنی صرف چار رکعت والی فرض نماز میں دو رکعت پڑھے گا۔ اور یہ حکم کسی خاص جگہ یا مقام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن کی جگہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔ یا اپنے شہر لوٹ نہ آئے۔ اس پر یہی مسافر کے احکام جاری ہوں گے البتہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنے کی نیت کرنے کے بعد وہ شخص پوری نماز پڑھے گا۔

بنا بریں صورت مسئولہ میں اگر آپ عمرہ پر چلے گئے پندرہ دن سے کم وقت کیلئے گئے تھے۔ تو آپ کا پوری نماز پڑھنا درست نہیں۔ بلکہ آپ کیلئے قصر نماز پڑھنا ضروری تھا۔ البتہ جو نمازیں آپ نے امام کے پیچھے پڑھی ہیں وہ ادا ہو گئی ہیں۔ بشرطیکہ ان نمازوں میں قعدہ اولیٰ کیا ہو۔ اور کسی کا یہ کہنا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر درست نہیں بلکہ پوری نماز پڑھی جائے گی۔ یہ بات درست نہیں۔ بلکہ قصر کا حکم مسافر کیلئے ہر جگہ ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو مسجد حرام میں قصر نماز پڑھی ہے۔

لما في الدر المختار (۲/۱۲۳-۱۲۴): (صلى الفرض الرباعي ركعتين) وجوباً لقول ابن عباسؓ: ان الله فرض على لسان نبيكم صلاة المقيم اربعاً والمسافر ركعتين ولذا عدل المصنف عن قولهم قصر

لان الرکعتین لیست قصرا حقیقۃ عندنا بل ھما تمام فرضہ والاکمال لیس رخصۃ فی حقہ بل اساءۃ.

وفی الفتاوی الھندیۃ (۱۳۹/۱): والقصر واجب عندنا کذا فی الخلاصۃ، فان صلی اربعا وقعد فی الثانیۃ قدر التشھد اجزأتہ والاخریان نافلۃ ویصیر مسیئا لتاخیر السلام وان لم یقعد فی الثانیۃ قدرھا بطلت کذا فی الھدایۃ.

(۳۴۳) ۹۵ کلومیٹر مسافت پر پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک استفتاء [illegible] خط سے داخل کیا تھا (استفتاء نمبر ۳۴۳) جسکا جواب مل گیا لیکن اب مسئلہ یہ درپیش ہوا ہے ہمارا گھر اور کوئٹہ کے درمیان 95 کلومیٹر فاصلہ ہے پہلے والے میں (70 کلومیٹر) لکھی ہوئی تھی جو کہ غلط تھا اب معلوم کرنے پر 95 کلومیٹر بنتا ہے۔

اب کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ جبکہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور میں نے کوئٹہ میں ایک کرایہ کا کمرہ لیا ہوا ہے جب میں آتا ہوں تو ایک دو دن کیلئے ٹھہرتا ہوں پھر گھر جاتا ہوں پھر گھر سے واپس آ کر تین چار دن رہ کر پھر واپس گھر جاتا ہوں یعنی پندرہ دن سے کم رہتا ہوں تو کم از کم پندرہ دن میں میں دو تین مرتبہ گھر جاتا ہوں اور کرایہ کا مکان اس لئے لیا ہے تاکہ میرا سامان اور آرام کرنے کی جگہ ممکن ہو۔ تو اب ان تمام صورتوں میں میرے لئے کیا حکم ہے کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ اگر میں مسافر نہیں ہوں تو جو نمازیں میں نے مسافرانہ پڑھی ہیں ان کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر آپ کے گھر اور کوئٹہ شہر کے درمیان 95 کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور آپ کوئٹہ شہر میں 15 روز یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں کرتے (اگرچہ آپ نے سامان وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے وہاں مکان کرایہ پر لیا ہوا ہے) تو شرعاً آپ مسافر ہیں اس لئے آپ کی نماز بھی مسافرانہ ہوگی کیونکہ مقدار مسافت شرعیہ تین منزل کی مسافت ہے جو کہ 48 میل کے برابر ہوتی ہے 48 میل کے تقریباً 77 کلومیٹر بنتے ہیں اور جو نمازیں آپ نے قصر یعنی مسافرانہ پڑھی ہیں وہ ادا ہو گئیں ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

لما فی التاتارخانیہ (۲/۱): فی بیان ادنی مدۃ السفر الذی یتعلق بہ قصر الصلوۃ قال علماؤنا ادناھا مسیرۃ ثلاثۃ ایام ولیالیھا مع الاستراحات...... وعن ابی حنیفۃ انہ اعتبر ثلاث مراحل.

وفی الشامیۃ (۱۲۳/۲): فاذا دخل المسافر بلدۃ ونوی ان یقیم بھا یوما مثلا ثم خرج منھا ثم رجع الیھا فیقصر فیھا کما کان یقصر قبل خروجہ وعلیہ یحمل کلام المحققین لقول البحر انھم قالوا لا فائدۃ فیہ لانہ یبقی فیہ مسافرا علی حالہ

(۳۲۴) کوئٹہ سے قلات اگر پندرہ دن سے کم کیلئے جانا ہو تو قصر کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغرض ملازمت میرا ضلع قلات آنا جانا رہتا ہے۔ ہمیشہ جب بھی جاتا ہوں ایک آدھ ہفتہ کی نیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد واپس اپنے وطن اصلی کوئٹہ آ جاتا ہوں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ قلات میں نماز قصر کروں یا پوری پڑھوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً چونکہ ضلع قلات اور آپ کے وطن اصلی کوئٹہ کے درمیان مسافت شرعی مقدار مسافت سے زیادہ ہے، اور وہاں پر آپ کی پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں ہوتی اس لئے آپ پر قلات میں اور حالت سفر میں قصر نماز پڑھنا لازم ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۳۹): ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة في بلدة او قرية خمسة عشر يوما او اكثر كذا في الهداية هذا اذا سار ثلاثة ايام.

وفي الشامية (۲/۱۳۱): (قوله الوطن الاصلي) ويسمى بالاهلي ووطن الفطرة والقرار (قوله او تأهله) اى تزوجه قال في شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الاقامة به فقيل لايصير مقيما وقيل يصير مقيما وهو الاوجه ولو كان له اهل ببلدتين فأيتهما دخلها صار مقيما، فان ماتت زوجته في احداهما وبقي له فيها دور وعقار قيل لايبقى وطنا له اذ المعتبر الاهل دون الدار كما لو تأهل ببلدة واستقرت سكناه وليس له فيها اهل وقيل تبقى (قوله او توطنه) اى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل، فلو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به فليس ذلك وطنا له الا اذا عزم على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله.

(۳۲۵) دو شہروں میں رہائش ہو تو وطن اصلی کونسا ہوگا؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا آبائی شہر سکھر ہے لیکن اب اس نے لاہور میں شادی کر لی ہے کبھی سکھر میں رہتا ہے اور کبھی لاہور میں تو اس کا وطن اصلی لاہور ہوگا یا سکھر؟

الجواب حامداً ومصلیاً صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکھر میں رہتا ہو اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، اور کبھی لاہور میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتا ہو اور یہاں اپنا گھر بھی ہو اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو تو دونوں شہر اس کا وطن اصلی ہونگے، اور اگر سسر کے ہاں بچوں کو ملنے ملانے کیلئے آیا ہو تو اگر پندرہ دن یا زیادہ دن تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو مقیم ہوگا۔

لما في الهندية (۱/۱۴۲): ويبطل الوطن الاصلي بالوطن الاصلي اذا انتقل عن الاول بأهله واما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث اهلا ببلدة اخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما.

وفی الحاشیۃ علی ھامش الھندیۃ(۱/۱۶۹): الکوفی اذا نوی الاقامۃ بمکۃ ومنی خمسۃ عشر یوما لم یکن مقیما وان لم یکن بینھما مسیرۃ سفر لانہ لم ینو الاقامۃ فی احدھما خمسۃ عشر یوما وان تاھل بھما کان کل واحد من الموضعین وطنا اصلیا لہ۔

وفی الشامیۃ(۲/۱۳۱): ولو کان لہ أھل ببلدتین فأیتھما دخلھا صار مقیما۔

(۳۲۶) کسی دوسرے شہر کو وطن بنالیا تو کیا اب وطن اصلی میں پندرہ دن سے کم قیام پر قصر کریگا؟

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے اور کراچی میں ملازمت کرتا ہوں، اب صورت حال یہ ہے کہ میں اہلیہ کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہوں اور کم از کم پچیس سال ملازمت کے ہیں جن میں یہیں رہنے کا ارادہ ہے اور اپنا ذاتی مکان بنانے کا ارادہ بھی ہے جس کیلئے پلاٹ خرید لیا ہے جبکہ اپنا اصلی گھر جو پنجاب میں ہے وہاں والدین اور بھائی رہتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے بسا اوقات میں پندرہ دن سے کم مدت کیلئے پنجاب جاتا ہوں تو آیا جب میں اپنے وطن اصلی میں جاؤں گا تو میں نماز مکمل پڑھوں گا یا قصر ہوگی؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔۔ صورت مسئولہ میں آپ نے اگر یہاں (کراچی میں) مستقلاً رہنے کا ارادہ کرلیا ہے اور یہاں سے مستقلاً پنجاب واپس جانے کا ارادہ نہیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی کراچی منتقل کردیا ہے تو اس صورت میں کراچی آپ کا وطن اصلی ہوگیا ہے پنجاب آپ کا وطن اصلی نہیں رہا، اگرچہ والدین وغیرہ وہاں ہیں۔ اب پنجاب جانے کی صورت میں اگر آپ کی وہاں ٹھہرنے کی نیت پندرہ دن سے کم کی ہو تو اس صورت میں آپ قصر کریں گے۔

وفی الشامیۃ (۲/۱۳۱): (قولہ الوطن الأصلی) ویسمی بالأھلی ووطن الفطرۃ والقرار ح عن القھستانی (قولہ أو تأھلہ) أی تزوجہ قال فی شرح المنیۃ: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الأقامۃ بہ فقیل لا یصیر مقیما وقیل یصیر مقیما، وھو الأوجہ ولو کان لہ أھل ببلدتین فأیتھما دخلھا صار مقیما، فان ماتت زوجتہ فی إحداھما وبقی لہ فیھا دور وعقار قیل لا یبقی وطنا لہ اذ المعتبر الأھل دون الدار کما لو تأھل ببلدۃ واستقرت سکناہ ولیس لہ فیھا دار ۔۔۔ وقیل تبقی (قولہ أو توطنہ) أی عزم علی القرار فیہ وعدم الارتحال وإن لم یتأھل، فلو کان لہ أبوان ببلد غیر مولدہ وھو بالغ ولم یتأھل بہ فلیس ذلک وطنا لہ الا اذا عزم علی القرار فیہ وترک الوطن الذی کان لہ قبلہ۔

(۳۲۷) رہائش کراچی میں ہو، اور سسرال سجاول میں، تو سسرال میں نمازوں کا حکم

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں خود کراچی میں رہتا ہوں اور میرے سسرال والے سجاول میں رہتے ہیں اور میرا اکثر سجاول آنا جانا رہتا ہے۔ تو کیا میں جب سجاول جاؤں تو وہاں نماز قصر کرسکتا ہوں جبکہ کراچی سے سجاول

تک مسافت شرعی پائی جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً … صورت مسئولہ میں جب آپ کی رہائش بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں ہے اور پھر آپ سسرال جاتے ہیں پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کی نیت سے جاتے ہیں تو پھر آپ وہاں پوری نماز پڑھیں گے اور اگر آپ کی نیت سسرال پندرہ دن سے رہنے کی ہے تو وہاں آپ قصر کریں گے۔

لما فی الهندية (۱/۱۴۲): وطن أصلي وهو مولد الرجل أو البلد الذي تأهل به　　ويبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي اذا انتقل عن الاول باهله وأما اذا لم ينتقل باهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما

وفي الهندية (۱/۱۳۹): ولا يزال على حكم السفر حتى ينوي الاقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر كذا في الهداية.

(۳۲۸) عورت کا شادی کے بعد وطن اصلی کون سا ہوگا؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدین کراچی میں رہتے ہیں میں بھی ان ہی کے ساتھ رہتی تھی اب میرے والدین نے میری شادی لاہور کے ایک لڑکے کے ساتھ کر دی اب میری رہائش بھی لاہور ہی میں ہے اب میرا وطن اصلی کون سا ہوگا؟ اور میرے لئے شرعاً کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً　انسان کی جہاں پیدائش ہو وہ یا وہ شہر جہاں گھر بنالیا ہو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کر لی ہو وطن اصلی کہلاتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ وطن اصلی، وطن اصلی سے باطل ہوتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی سفر واقامت میں اپنے شوہر کے تابع ہوتی ہے بشرطیکہ وہ مہر معجل ادا کر چکا ہو، اور عدم ادائیگی کی صورت میں حق زوجیت ادا کرنے سے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں لاہور آپ کے حق میں وطن اصلی ہے اپنے شوہر کے ہمراہ مستقل رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے۔ اور اب کراچی آپ کے حق میں وطن اصلی نہیں رہا۔

لما في كبيري (ص۵۴۴): فالاصلي وهو مولد الانسان أو موضع تأهل به ومن قصده التعيش به لا الارتحال عنه اما لو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به فليس ذلك وطنا له وفي المحيط هو الذي نشأ فيه أو توطن فيه أو تأهل فقوله أو توطن فيه يتناول ما عزم القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل فعلى هذا لو عزم من له ابوان في بلد على القرار فيه وترك الوطن الذي كان قبله له يكون وطنا له ولو تزوج المسافر ببلدة ولم ينو الاقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما وهو الاوجه لما مر من حديث عثمان.

لما في الشامية (۲/۱۳۱): (قوله الوطن الاصلي) ويسمى بالأهلي ووطن الفطرة والقرار ح عن

القهستاني (قوله أو نائبه) أي تزوجه قال في شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به فقيل لا يصير مقيماً وقيل يصير مقيماً، وهو الأوجه.

وفي الهندية (١/١٤١): وكل من كان تبعاً لغيره يلزمه طاعته يصير مقيماً بإقامته ومسافراً بنيته وخروجه إلى السفر.

(۳۴۹) ۳۰ میل سفر کی نیت کے بعد ۲۵ میل آگے اور جانا پڑ جائے تو نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر تین روز کیلئے جانا ہوا۔ وہاں پر ایک گھنٹہ کام کیا اور اس مقام سے تقریباً ۲۵ میل دور اور سفر کرنا پڑا اور یہاں قیام تین دن کا تھا اس کے بعد اپنے گھر جو کہ یہاں سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے آ گیا تو جناب میں اس دوسرے مقام پر نمازیں قصر کروں یا نہیں؟ براہ کرم جواب سے جلد مطلع فرمائیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: سفر شرعی کیلئے مسافت سفر کی نیت کرنا ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ اس دوسرے مقام پر بھی نماز پوری پڑھیں گے اس لئے کہ وہاں سے نکلتے وقت آپ کی نیت مسافت سفر شرعی سے کم مقدار طے کرنے کی تھی تو آپ شرعاً مسافر نہیں ہوں گے اور آپ پر احکام سفر لاگو نہیں ہوں گے، البتہ وہاں سے گھر لوٹتے وقت آپ قصر کریں گے کیونکہ واپسی کے وقت میں مسافت سفر پوری ہے۔

لما في فتح القدير (٢/٢٨): السفر الذي يتعلق به تغير هذه الأحكام وأخذ فيه مع المقدار الذي ذكره القصد، فلذا لو طاف الدنيا من غير قصد إلى قطع مسيرة ثلاثة أيام لا يترخص، وعلى هذا قالوا أمير خرج مع جيشه في طلب العدو ولا يعلم أين يدركهم فإنهم يصلون صلاة الإقامة في الذهاب وإن طالت المدة، وكذا المكث في ذلك الموضع، أما في الرجوع فإن كانت مدة سفر قصروا.

وعلى اعتبار القصد تفرع في صبي ونصراني خرجا قاصدين مسيرة ثلاثة أيام ففي أثنائها بلغ الصبي وأسلم الكافر يقصر الذي أسلم فيما بقي ويتم الذي بلغ لعدم صحة القصد والنية من الصبي حين إنشاء السفر بخلاف النصراني والباقي بعد صحة النية أقل من ثلاثة أيام.

وفي الشامية (٢/١٢٢): (قوله قاصداً) أشار به مع قوله خرج إلى أنه لو خرج ولم يقصد أو قصد ولم يخرج لا يكون مسافراً. (قوله بلا قصد) بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للإقامة بها فلما بلغها بدا له أن يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جراً. قال في البحر: وعلى هذا قالوا أمير خرج مع جيشه في طلب العدو ولا يعلم أين يدركهم فإنه يتم وإن طالت المدة أو المكث، أما في الرجوع فإن كانت مدة سفر قصر.

﴿فصل فی الجمعة والعیدین﴾

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے بیان میں)

(۳۳۰) جمعہ کی نماز کی نیت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرا دوست پابندی سے نماز پڑھتے ہیں آپ سے ایک بات یہ پوچھنی تھی کہ جمعہ کی نماز کی کیا نیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً جمعہ کی نماز کی نیت کیلئے آپ امام صاحب کے پیچھے ان الفاظ سے نیت کرلیا کریں "دو رکعت جمعہ کی اس امام صاحب کی اقتداء میں ادا کرتا ہوں۔"

وفی الدر المختار (۱/۴۲۴، ۴۲۲): وینوی المقتدی المتابعة لم یقل ایضاً لانه لو نوی الاقتداء بالامام او الشروع فی صلاة الامام ولم یعین الصلاة صح فی الاصح وان لم یعلم بها لجعله نفسه تبعاً لصلوة الامام.

(۳۳۱) نماز جمعہ کا مستحب وقت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی نماز اول وقت میں پڑھنا سنت ہے یا نہیں؟ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے اس میں جمعہ کی نماز بہت تاخیر سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات نمازیوں کو پریشانی ہوتی ہے خاص کر سردیوں کے موسم میں لہٰذا اس مسئلے کا شرعی حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً سردی اور گرمی میں مطلقاً نماز جمعہ اول وقت ہی میں پڑھنا مستحب ہے، اس لئے تمام مساجد اور کمیٹی والوں کو چاہئے کہ وہ مستحب اوقات میں ہی نماز جمعہ کا وقت مقرر کریں، البتہ اگر کسی مصلحت کے تحت نماز جمعہ کا وقت تھوڑا بہت تاخیر سے رکھا جائے تو اس میں فقہاء نے گنجائش رکھی ہے۔ لیکن اتنی تاخیر میں نماز جمعہ کا وقت مقرر کرنا کہ اگلی نماز کا وقت قریب ہونے لگے یا امام کا "مقررہ وقت سے" بلاوجہ کچھ زیادہ تاخیر کرنا کہ جس سے مقتدیوں کو پریشانی ہو، یہ طریقہ خلافِ سنت ہے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

لما فی البخاری (۱/۱۲۳): عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ کان یصلی الجمعة حین تمیل الشمس.

وفی الدر المختار (۱/۳۶۶، ۳۶۷): (وتاخیر ظهر الصیف) بحیث یمشی فی الظل (مطلقا) (وجمعة کظهر اصلا واستحبابا) فی الزمانین لأنها خلفه

وقال الشامی رحمه الله تعالیٰ: (قوله واستحبابا فی الزمانین) ای الشتاء والصیف ح ... وقال الجمهور: لیس بمشروع لأنها تقام بجمع عظیم فتاخیرها مفض الی الحرج ولا کذلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اهـ.

(۳۳۲) سعی الی الجمعہ کونسی اذان پر واجب ہے؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن اذان کے وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے تو اذان سے کون سی اذان مراد ہے آیا خطبے کے وقت کی اذان مراد ہے یا اس سے پہلے والی اذان مراد ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً　جمعہ کے دن خطبہ جمعہ سے قبل دو اذانیں دی جاتی ہیں ان دونوں میں جو پہلی اذان ہے اس وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے۔

لما فی الهندیة (۱/۱۴۹): ویجب السعی وترک البیع بالاذان الاول وقال الطحاوی یجب السعی ویکره البیع عند اذان المنبر وقال الحسن ابن زیاد المعتبر هو الأذان علی المنارة والاصح ان کل اذان یکون قبل الزوال فهو غیر معتبر والمعتبر أول الاذان بعد الزوال سواء کان علی المنبر أو علی الزوراء

وفی الشامیة (۲/۱۶۱): وحاصله ان السعی نفسه فرض والواجب کونه فی وقت الأذان الأول.

(۳۳۳) عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدگاہ سے واپسی پر راستے میں تکبیر پڑھنا مسنون ہے کہ نہیں؟ کوئی پڑھے تو محض جواز کی وجہ سے جائز ہے کہ نہیں یا بدعت کہلائے گی؟ زید کہتا ہے کہ متون وشروح میں صرف جاتے ہوئے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم ہے اس کے علاوہ واپسی پر پڑھنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے لہٰذا واپسی پر پڑھنا صحیح نہیں؟ جبکہ بکر کا کہنا ہے کہ مصنف میں ان من السنة التکبیر یوم العید اور علاء السنن میں زینوا اعیادکم بالتکبیر اور انه ذکر مشروع سے استدلال کر کے جواز کا قول کیا جا سکتا ہے ان دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟ اگر مع حوالہ جات عربی کتب جواب عنایت فرمادیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً　عید الاضحیٰ میں عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے زور سے تکبیر کہنا سنت ہے یہاں تک کہ عیدگاہ پہنچ جائے اور عیدگاہ

سے واپسی پر تکبیر زور سے کہنا مسنون نہیں البتہ آہستہ کہنا جائز ہے۔ لہذا صورت مسئولہ میں زید کا یہ کہنا صحیح ہے کہ کتابوں اور شروحات میں صرف جاتے ہوئے تکبیر کہنے کا حکم دیا گیا ہے البتہ عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم جو دیا گیا ہے وہ جہراً ترک کا حکم دیا گیا ہے اگر کوئی آدمی عیدگاہ سے واپسی پر آہستہ آواز سے تکبیر کہے تو جائز ہے اس لئے کہ یہ ذکر ہے اور ذکر میں اخفاء کا حکم دیا گیا ہے اور عمر نے جو کہا ہے کہ عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر کہنا جائز ہے تو اس کی بات صحیح ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تکبیر آہستہ آواز سے کہی جائے۔ لیکن اس نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے اس کا استدلال کمزور ہے اس لئے کہ مصنف میں جو حدیث ہے کہ ان من السنة ان یکبر یوم العید اس سے کسی نے استدلال نہیں کیا ہے اور دوسری حدیث جو امام سنن میں مذکور ہے زینوا اعیادکم بالتکبیر۔ اس سے مراد جہری تکبیر ہے جو عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑھی جاتی ہے نہ کہ واپسی پر البتہ تکبیر کہنا فی نفسہ جائز ہے اس لئے کہ یہ تکبیرات ذکر ہیں اور ذکر کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ان النبی ﷺ کان یذکر اللہ تعالیٰ فی کل احیانہ لہذا ان تکبیرات کو اگر کوئی آدمی آہستہ آواز سے کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ زور سے کہنا مسنون نہیں۔

لما في المصنف لابن شيبة (۲/۱۶۴): حدثنا عبد الله بن ادريس عن يحيى بن عبد الله بن ابي قتادة قال: اراه عن محمد بن ابراهيم. ان ابا قتادة كان يكبر يوم العيد ويذكر الله.

وفي اعلاء السنن (۸/۱۱۸): ويكبر عقب الصلاة جهراً ولا يجهر فيما سوى ذالك اى لايسن والا فهو ذكر مشروع هذا محصل مافي الشامية (۱/۷۸۵)

وفي كتاب التجنيس والمزيد (۲/۲۳۵): واذا توجه الى المصلى يكبر في عيد الاضحى لانه عليه الصلاة والسلام كان يكبر في الطريق ولا يكبر في عيد الفطر جهراً عند ابي حنيفةؒ خلافاً لهما وهو معروف. وفي الهامش قال المؤلف في الهداية في العنوان السابق (۱/۹۳) ويتوجه الى المصلى ولا يكبر عند ابي حنيفة في طريق المصلى وعندهما: يكبر اعتباراً بالاضحى وله أن الاصل في الثناء الاخفاء والشرع ورد به في الاضحى لانه يوم تكبير ولا كذالك يوم الفطر وروى عن ابن عمر رضي الله عنهما انه كان اذا غدا الى المصلى كبر فرفع صوته بالتكبير وفي رواية اخرى: كان يغدو الى المصلى يوم الفطر اذا طلعت الشمس فيكبر حتى يأتي المصلى ثم يكبر بالمصلى حتى اذا جلس الامام ترك التكبير قال مجد الدين: رواهما الشافعي. المنتقى: باب الخروج الى العيد ماشياً والتكبير فيه وما جاء في خروج النساء (ص۲۲۲) رقم الحديث (۱۲۵۲، ۱۲۵۳) ونيل الاوطار (ص۲۸۵، ۲۸۶) يستفاد من الحديثين واحاديث الباب على ان التكبير سنة حال المشي الى المصلى وفي المصلى الى ان يقيم الصلوة، اشار الى هذا ابن قدامه.

وفي الطحطاوي على الدر (۱/۳۵۵): ويكبر جهراً اتفاقاً في الطريق قيل وفي المصلى وعليه عمل

الناس الیوم لا فی البیت

وفی الدر المختار (۲/۱۸۰): (ولا بأس به عقب العید لأن المسلمین توارثوه) وفی الهامش: "قوله لا بأس" کلمة لا بأس قد تستعمل فی المندوب کما فی البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم (قوله فوجب) الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح علیه وفی البحر عن المجتبی والبلخیون یکبرون عقب صلاة العید لأنها تؤدی بجماعة فأشبهت الجمعة اهـ وهو یفید الوجوب المصطلح علیه ط.

(۳۳۴) خطبۂ عید میں خطیب کے ساتھ تکبیرات پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے خطبے کے دوران خطیب صاحب تکبیر پڑھتے ہیں تو سننے والے بھی خطیب کے ساتھ تکبیر پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: سامعین کو دورانِ خطبے کے وجوب کی وجہ سے تکبیرات پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے اگر کوئی پڑھتا ہے تو گنہگار ہوگا۔

لما فی حاشیة الطحطاوی علی المراقی (ص۵۳۵): قال عبدالله بن مسعودؓ هو السنة ویکبر القوم معه ویصلون علی النبی ﷺ فی أنفسهم امتثالاً للأمر وسنة الانصات.

وقال الطحطاوی تحته: (قوله فی أنفسهم) المراد انهم یسرون به کما تقدم والظاهر انه متعلق بالتکبیر والصلاة لانه یجب الانصات لجمیعها (قوله سنة الانصات) الاولی ان یقول وواجب الانصات.

(۳۳۵) عید کے خطبوں میں تکبیرات کتنی مرتبہ اور کب کہی جائیں گی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدین کے پہلے خطبے میں نو بار اور دوسرے میں سات بار تکبیریں کہنا چاہئے تکبیریں مسلسل کہی جائیں یا پورے خطبے میں متفرق طور پر بھی کہی جا سکتی ہیں؟ اور افضل کیا ہے؟ نیز تکبیر سے مراد صرف اللہ اکبر ہے یا پوری تکبیرِ تشریق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: عیدین میں دورانِ خطبہ تکبیریں کہی جاتی ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں لیکن مناسب یہ ہے کہ تکبیر خطبہ سے زیادہ نہ ہو، اور عید الاضحیٰ کے خطبے میں عید الفطر کے خطبے کی نسبت زیادہ تکبیریں ہوں البتہ مستحب افضل یہ ہے کہ پہلے خطبے کے شروع میں مسلسل نو مرتبہ اور دوسرے خطبے کے شروع میں مسلسل سات مرتبہ تکبیریں کہی جائیں نیز تکبیر سے پوری تکبیرِ تشریق (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) مراد ہے۔

لما فی الدر المختار (۲/[illegible]): (ویبدأ بالتکبیر فی خطبة العیدین) ... (ویستحب ان

کے درجہ میں نماز جمعہ کی صحت کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان و فرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں کہ جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ ص:۳۳۹)

اگرچہ ترک سنت کی وجہ سے مکروہ ہوگا اور اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن کم از کم شرط کے درجہ میں خطبہ کا مقام اس کو بھی حاصل ہے لہٰذا اس دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے اور اس کی اجازت دینے میں شرائط وارکان کے وجود پر مشتمل عمل کے وجود کو تسلیم نہ کرنا لازم آتا ہے جو کہ فقہاء کرام کی تعریفات وتشریحات کے انکار کو مستلزم ہے۔

اس لئے کہ فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے۔ ان کی تعریفات جامع اور مانع ہوتی ہیں چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے۔ ایسے ہی مسئلہ کے متعلق علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں'' والالزوم الحکم ببطلان الاولیٰ بترک ما لیس برکن ولا شرط کما مر عن الفتح (شامی ص ۱۵ ج ۲)''

ذیل میں فقہی عبارات سے حوالے ملاحظہ ہوں اشتباہ صحیح ہو تو براہ کرم تائید فرمائیں اور اگر ہم نے صحیح نہ سمجھا ہو تو اصلاح فرمائیں نوازش ہوگی۔

خطبہ کی تعریف وحقیقت واضح کرتے ہوئے ''مراقی الفلاح'' اور اس کی شرح ''حاشیۃ الطحطاوی'' میں لکھتے ہیں:

(والرابع الخطبۃ ولو بالفارسیۃ من قادر علی العربیۃ ویشترط لصحۃ الخطبۃ فعلها قبلها

وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (والرابع الخطبۃ فعلۃ بمعنی مفعولۃ فهی اسم لما یخطب به غایۃ من الخطب وهو فی الاصل کلام بین اثنین قهستانی عن الا زاهر وهی بالضم فی الموعظۃ الجمع خطب وبالکسر طلب التزوج (ص ۵۰۹، قدیمی کتب خانہ)

کذا فی جامع الرموز للقهستانی (ص ۲۶۳ ج ۱) وکذا فی قواعد الفقه (ص ۲۷۶)

وفی المحیط البرهانی: ولان ما یشبه الامر بالمعروف خطبۃ من حیث المعنی وان لم یکن خطبۃ من حیث النظم لان الخطبۃ فی الحقیقۃ وعظ وامر بالمعروف (المحیط البرهانی ص ۴۵۹ ج ۲)

خطبہ کی شرائط نہایت جامع انداز میں ''مراقی الفلاح'' اور اس کی شرح حاشیۃ الطحطاوی میں بیان فرماتے ہیں:

فهذه خمس شروط اوست لصحۃ الخطبۃ فلینتبه، قال الطحطاوی (۱) الاول ان تکون قبل الصلاۃ (۲) والثانی ان تکون بقصد الخطبۃ (۳) الثالث ان تکون فی الوقت (۴) والرابع ان یحضرها واحد (۵) الخامس ان یکون ذالک الواحد ممن تنعقد بهم الجمعۃ (۶) السادس عدم الفصل بین الخطبۃ والصلاۃ بقاطع (مراقی الفلاح، ص ۵۱۰)

رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔

قال و الطهارة سنة عندنا لاشرط حتى ان الامام اذا خطب جنبا او محدثا فانه يعتبر شرطا لجواز الجمعة.

قال المحشي تحت هذا القول: قوله (فانه يعتبر شرطا اى ما فعله الامام من الخطبة جنبا او محدثا يعتبر ويعتد به من حيث كونه شرطا لصحة الجمعة بمعنى انه يجزى ويكفي وان كان مرتكبا لمحرم لو كان بلا عذر (شامی، ص ۱۵۰، ج ۲)

ان تمام دلائل سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ خطاب بھی خطبہ کے حکم میں ہے اور اس دوران اجتماع کے خلاف کوئی بھی عمل جائز نہیں اگرچہ عربی خطبہ کی طرح تمام صفات پر مشتمل نہ ہونے کی وجہ سے بدرجہ اتم نہیں ہے لیکن خطبہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ کسی عمل کو فقہاء کرام کی تعریفات اور توضیحات پر ہی پرکھا جائے گا۔

عربی اور اس خطبہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اس کے شروع کا حصہ تو عربی ہے لیکن بعد کا حصہ زیادہ اردو پر مشتمل ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ عربی خطبوں کے لیے اذان ثانی دی جاتی ہے، تیسرا یہ کہ یہ خطبہ عموماً خطیب بیٹھ کر دیتا ہے اور عربی خطبے کھڑے ہو کر، چوتھا یہ کہ عربی خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے خطیب بیٹھ کر دونوں خطبوں کے درمیان فصل دیتا ہے لیکن یہ تمام صفات ایسی نہیں ہیں کہ جن کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ خطبہ ہی نہ رہے، بلاشبہ شرط کے درجہ میں یہ بھی خطبہ ہے اگرچہ ناقص ہے اور عربی کے دونوں خطبے بدرجہ اتم و اکمل ہیں اور اس کے لئے شواہد اور نظائر بھی ہیں طوالت کا اندیشہ ہوتا تو ذکر کر دیتے۔ اور اذان ثانی کو قاطع بھی نہیں قرار دے سکتے۔

چنانچہ عمل قاطع کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

(وعمل قاطع) كما اذا جامع ثم اغتسل واما اذا لم يكن قاطعا كما اذا تذكر فائتة وهو في الجمعة فاشتغل بالقضاء او افسد الجمعة فاحتاج الى اعادتها او افتتح التطوع بعد الخطبة لاتبطل الخطبة بذالك لانه ليس بعمل قاطع لكن الاولى اعادتها كمافى البحر. (مراقی الفلاح، ص ۵۱۰، قدیمی) كذافى خلاصة الفتاوى (ص ۲۰۵، ج ۱)

بالغرض فقہاء کرام کی عبارات میں کوئی جزئیہ ملے جس سے یہ واضح ہو کہ اس کو خطبہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا حالانکہ کافی تلاش کے باوجود ہماری نظروں سے اب تک ایسا کوئی جزئیہ نہیں گزرا لیکن اصل موقف " کہ اس خطاب کے دوران حاضرین کے لئے نوافل پڑھنا منع ہے " کے ثبوت کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

"عن ابن عمر رضى الله عنه قال سمعت النبى صلى الله عليه وسلم اذا دخل احدكم المسجد والامام على المنبر فلا صلاة و لا كلام حتى يفرغ الامام. رواه الطبرانى بحواله اعلاء السنن

وعن ابی هریرة رضی الله عنه خروج الامام یوم الجمعة یقطع الصلاة و کلامه یقطع الکلام

(رواه البیهقی بحواله اعلاء السنن ج ۸/ص ۷۱) بھی کافی ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام کے نکلنے کے ساتھ ہی نماز و ذکر تلاوت وغیرہ کو منع فرماتے ہیں۔ اگرچہ منبر تک پہنچے نہیں یا ابھی خطبہ شروع نہیں کیا۔

کما فی مراقی الفلاح (واذا خرج الامام فلا صلاة ولا کلام) وهو قول الامام رحمه الله تعالی لانه نص النبی صلی الله علیه وسلم (ص ۵۱۸)

صاحبین بھی نماز کو امام صاحب کے نکلنے کے ساتھ ہی منع فرماتے ہیں البتہ کلام اور عبادت منبر پر تشریف لانے کے بعد منع فرماتے ہیں۔

وقال ابو یوسف ومحمد رحمهما الله تعالی لا باس بالکلام اذا خرج قبل ان یخطب واذا نزل قبل ان یکبر واختلفا فی جلوسه اذا سکت فعند ابی یوسف یباح وعند محمد لا یباح"

مراقی الفلاح (ص ۵۱۸)

نماز کی ممانعت میں فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہ کے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کو متفق علیہ قرار دیا ہے۔

فی الدر المختار: اذا خرج الامام) من الحجرة ان کان والا فقیامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا کلام الی تمامها) وان کان فیها ذکر الظلمة فی الاصح

قال الشامی: واخرج ابن ابی شیبة فی مصنفه عن علی وابن عباس وابن عمر رضی الله عنهم کانوا یکرهون الصلاة والکلام بعد خروج الامام والحاصل ان قول الصحابی حجة یجب تقلیده عندنا اذا لم ینفه شئ آخر من السنة. (درمختار ج ۲/ص ۱۵۸)

قال الطحطاوی: اذا خرج من حجرته ان کانت والا فقیامه للصعود قاطع کما فی شرح المجمع فیثبت المنع بمجرد ظهوره ولو قبل صعوده المنبر وقیل اذا صعد وعلیه جری الکمال والزیلعی والعینی وقال بعد اسطر اختلف المشائخ علی قول الامام فی الکلام قبل الخطبة (مراقی ص ۵۱۹)

اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب خطبہ ہی کی غرض سے حجرہ سے نکل آتے ہیں اور اب منبر پر بھی تشریف فرما ہیں۔ لہٰذا تمام دلائل اس بات پر متفق ہیں کہ وہاں اردو خطبہ نماز و ذکر و تلاوت وغیرہ کو اب موقوف کریں اور خطبہ کی طرف متوجہ ہوں۔ نوافل اور تلاوت کے لئے پھر بھی موقع مل سکتا ہے اور یہ موقع خطبہ سننے کا ہے۔ نیز تمام فتاوی میں یہ حکم واضح فرما دیا ہے کہ وجوب استماع کا یہ حکم جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام خطبے سننا واجب ہے۔

(۱) چنانچہ مفتی اعظم نے بھی جواہر الفقہ میں واضح فرما دیا ہے۔

خطبہ جمعہ وعیدین ونکاح وغیرہ اس بات میں قول مختار کے موافق سب شریک ہیں کہ جب خطیب خطبہ پڑھے تو کلام وسلام یہاں تک کہ درود وتسبیح وغیرہ سب ناجائز ہو جاتے ہیں بلکہ چپ بیٹھنا اور خطبہ سننا ضروری ہو جاتا ہے۔ (جامع الفقہ ص ۲۶۵ ج ۲)

وفي مراقي الفلاح: كذا استماع سائر الخطب كخطبة النكاح والختم (مراقي الفلاح ص ۵۱۹)

وفي قواعد الفقه: والخطب كثيرة كخطبة الجمعة والعيدين والاستسقاء والكسوف والنكاح وختم القرآن وغير ذالك ويجب في الجميع الاستماع كذا في الدرر. (ص ۲۷۸) كذا في ردالمحتار (ص ۱۵۹ ج ۲)

(۲) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا فتویٰ ہے کہ ہر وعظ کے دوران انصات ضروری ہے۔

وفي التفسير المظهري: قال عمر بن عبدالعزيز الانصات لقول كل واعظ (مظهري ص ۳۵۰ ج ۳)

(۳) امام بخاری اور اسی طرح دیگر محدثین نے اس موضوع پر مستقل ابواب قائم کئے ہیں۔

باب انصات الجليس لحديث جليسه الذي ليس بمحرم واستنصات العالم والواعظ حاضري مجلسه (دليل الفالحين ۳/۱۷۲)

(۴) علماء کرام کے بیان کے لئے انصات کا حکم ہے۔ "لما في البخاري: باب الانصات للعلماء (بخاري ۱/۲۳)"

علامہ بدرالدین عینیؒ عمدۃ القاری میں علماء کے بیان کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم دے رہے ہیں۔

هذا باب في بيان الانصات لاجل العلماء واللام فيه للتعليل والانصات بكسر الهمزة السكوت والاستماع للحديث يقال نصت نصتا وانصت انصاتا اذا سكت واستمع للحديث وجه المناسبة بين البابين من حيث ان العلم انما يحفظ من العلماء ولا بد فيه من الانصات لكلام العالم حتى لا يشذ عنه شئ

وفيه ايضا بيان استنباط الاحكام الاول قال ابن بطالؒ فيه ان الانصات للعلماء والتوقير لهم لازم للمتعلمين قال الله تعالى لا ترفعوا اصواتكم الخ۔

ويجب الانصات عند قراءة حديث رسول الله (صلى الله عليه وسلم) مثل ما يجب له وكذالك يجب الانصات للعلماء لانهم الذين يحيون سنته ويقيمون بشريعته الخ

(عمدة القاري ۲/۳۰۴)

(۵) کسی بھی بیان کرنے والے کے سامنے نماز پڑھنا اس کے لئے تشویش کا باعث ہے بلکہ قریب میں سننے والے بھی متاثر ہوتے ہیں ایسی صورت میں ایذاء مسلم بھی داخل ہے۔

(۶) ایک اصلاحی اجتماعی عمل سے بلا ضرورت اعراض بلکہ ظاہری مخالفت ہے۔ اور اجتماعیت کی اہمیت شاید کسی عالم پر مخفی ہو۔

چند شبہات اور ان کے جوابات:۔

شبہ(۱)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز منبر کے ساتھ کھڑے ہو کر احادیث بیان فرماتے تھے۔

لما فی المستدرک علی الصحیحین عن محمد عن ابیہ قال رأیت اباھریرۃ رضی اللہ عنہ یخرج یوم الجمعۃ فیقبض علی رمانتی المنبر قائما ویقول حدثنا ابو القاسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصادق المصدوق فلایزال یحدث حتی اذا سمع فتح باب المقصورۃ لخروج الامام للصلاۃ جلس (ص ۵۸۶ ج ۳)

وفیہ ایضا۔ عن ابی الزاھریۃ قال کنت جالسا مع عبداللہ بن بسر یوم الجمعۃ فمازال یحدثنا حتی خرج الامام (ص ۳۲۵ ج ۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خطبہ سے پہلے حدیث بیان کرنا کوئی خطبہ نہیں ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ خطیب کے نکلنے سے پہلے تک حدیث بیان فرماتے تھے البتہ خطیب کے نکلنے کے ساتھ ہی درس ختم کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔

جواب۔ مذکورہ دونوں حوالوں میں اس موقف کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ اس سے مزید تائید مل رہی ہے چنانچہ صراحت ہے کہ خطیب کے نکلتے ہی درس کو ختم فرمادیتے تھے اس میں اصل موقف کے خلاف کونسی بات ہے کہ اس دوران نماز پڑھنا جائز ہے یا یہ کہ دو خطبوں سے پہلے خود خطیب صاحب اگر وعظ کریں تو وہ خطبہ نہیں کہلائے گا؟ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام صاحب سے پہلے بھی کوئی دوسرا شخص درس یا وعظ کرے تو یہ جائز ہے۔

شبہ(۲)۔ عربی خطبہ کے لئے اذان دی جاتی ہے اور یہ عربی اردو ملا خطبہ اذان اول کے بعد شروع ہوتا ہے اگر اس کو خطبہ کا حکم دیں تو خطبوں کے درمیان اذان دینا لازم آتا ہے۔

جواب۔ اذان ثانی کوئی شرط نہیں ہے جس کے انتفاء سے حکم بھی منتفی ہو اور خطبہ کے بعد یا درمیان میں دینے سے یہ کوئی عمل قاطع بھی نہیں ہے جیسا کہ حوالوں سے واضح ہے۔

شبہ(۳)۔ اس طرح تو تین خطبے ہوجائیں گے؟

جواب۔ دو خطبے سنت ہیں ایک سے تو شرط کے درجہ میں ضرورت پوری ہوجاتی ہے لیکن دو سے زیادہ خطبے دینے سے یہ تو

لازم نہیں آتا کہ خطبہ قرار نہ دیں۔ اور معذرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ علماء کرام صرف دو خطبوں پر ہی اکتفاء کرتے اگر پاک و ہند کے عوام کی ضرورت سامنے نہ ہوتی۔ تو یہ ضرورت کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔

شبہ (۳):۔ در مختار میں ہے "فی المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة اولی. ص ۶۶۳، ج ۱"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعظ کا سننا اولی ہے، جس کے خلاف کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جواب شبہ:۔ حوالہ میں استماع قرآن کو بمقابلہ وعظ غیر اولی قرار دیا ہے اور استماع وعظ کو اولی قرار دیا ہے جبکہ استماع قرآن خارج نماز بھی مطلقاً واجب ہے۔

فی الدر (فروع) یجب الاستماع للقراءۃ مطلقا لان العبرۃ لعموم اللفظ.

وفی الشامیة قوله یجب الاستماع للقراءۃ مطلقا ای فی الصلاۃ وخارجها لان الآیة وان کانت واردۃ فی الصلاۃ علی مامر فالعبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب وفی الفتح عن الخلاصة رجل یکتب الفقه وبجنبه رجل یقرء القرآن فلا یمکنه استماع القرآن فالاثم علی القاری (ص ۵۴۶، ج ۱)

وکذا فی الطحطاوی علی الدر (ص ۲۳۶، ج ۱)

وفی روح المعانی "وفی کلام اصحابنا یدل علی وجوب الاستماع فی الجهر بالقرآن مطلقا الخ (ص ۱۴۳، ج ۹)

تو اولی یعنی وعظ کا استماع حاضرین مجلس پر بطریقہ اولی واجب ہے۔ آسانی کے لئے ہم شکل اول جو کہ بدیہی الانتاج ہے کو ترتیب دیتے ہیں۔

شکل اوّل:۔ استماع الوعظ اولی من استماع التلاوۃ. واستماع التلاوۃ واجب فاستماع الوعظ واجب.

(۱) مقدمہ اولی مسلم (جیسا کہ شبہ میں پیش کردہ حوالے سے واضح ہے)

(۲) مقدمہ ثانیہ: شامی اور روح المعانی وغیرہ کے حوالے سے واضح ہے۔

بجا استدلال یا تلازم: مقدمہ مسلمہ عند المعقولین: ما ثبت للادنی فهو ثابت للاعلی طبعا بالضرورۃ.

بدقسمتی سے عام لوگ اپنی مذہبی زبان "عربی" کو نہیں جانتے اور خطبہ جس کا بڑا مقصد وعظ و نصیحت اور تعلیم ہے اگر صرف عربی خطبہ ہی ہو تو لوگ اس فائدہ سے محروم رہتے ہیں اسی ضرورت کے تحت تو یہ اردو بیان رائج ہوا ہے ورنہ عربی جیسے جامع خطبوں سے پورا استفادہ کرنے کی صورت میں اردو خطبوں کی کیا ضرورت تھی؟ تو عربی خطبے بدرجہ اتم خطبے ہیں اور اردو خطبہ کو بھی خطبہ کا مقام حاصل ہے ورنہ فقہاء کرام کی تصریحات و تشریحات سے انکار لازم آتا ہے۔

خلاصہ کلام

خطبہ جمعہ سے پہلے اردو وعظ کے دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے، بلکہ کوئی بھی مجلس وعظ ہو تو اس مجلس میں ہوتے ہوئے استماع کے خلاف کوئی عمل کرنا جائز نہیں ہے بضرورت ہو تو اس مجلس سے نکلنا ضروری ہے۔

(۱) جمعہ کا یہ وعظ خطبہ کے حکم میں ہے اس لئے کہ یہ خطبہ کے تمام اغراض اور بعض سنتوں پر بھی مشتمل ہے۔

(۲) چونکہ امام صاحب منبر پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور خطبہ ونماز ہی کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں تو نفلی نماز وتلاوت وغیرہ کی اجازت دینے میں حدیث باب کے ظاہر کی مخالفت ہے۔

(۳) ہر خطبہ کے دوران نفل کا پڑھنا منع ہے جمعہ کے لئے یہ وعظ بھی ایک خطبہ ہے۔

(۴) اس وعظ کا شروع حصہ عربی میں مسنون کلمات کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

(۵) خطبہ جمعہ کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم معلول بالعلۃ ہے یہ علت ہر وعظ میں پائی جاتی ہے۔

(۶) درمختار میں ہے "فی المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة اولیٰ. (ص ۲۹۳، ج ۱)" "علمی یہ قول کے مطابق وجوب استماع قرآن کا حکم مطلقاً واجب ہے یعنی نماز کے علاوہ بھی واجب ہے خصوصاً کوئی قاری پہلے سے پڑھ رہا ہے تو اس کے پاس جا کر خلاف استماع کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے ملاحظہ ہو (حوالہ مذکورہ) تو وعظ جو کہ اولیٰ ہے اس مجلس میں شریک افراد کے لئے خلاف استماع عمل کرنا بطریق اولیٰ ناجائز ہے۔

(۷) شرح بخاری عمدۃ القاری میں ایک حدیث سے استنباط فرماتے ہوئے فیصلہ فرمایا ہے کہ ہر عالم کی مجلس میں انصات کا حکم ہے۔

(۸) ریاض الصالحین میں ہے "باب انصات الجلیس لحدیث جلیسہ الذی لیس بحرام واستماع العالم والواعظ حاضری مجلسہ (دلیل الفالحین ص ۱۳۷، ج ۳)"

تو ایک عام آدمی کی ایک عام بات کی طرف توجہ کرنے کا حکم ہے بالفرض اگر استحباب کے درجہ میں ہے تو دین کی بات (خصوصاً جب اجتماعی ہو) کو عام دنیوی بات پر بلاشبہ فوقیت عظمت اور اہمیت حاصل ہے تو اس کیلئے حکم بھی استحباب سے بڑھ کر ہی ہوگا جس کے خلاف کرنے میں کم از کم کراہت ضروری ہوگی۔

(۹) مجلس میں ہوتے ہوئے خلاف استماع کام کرنے میں واعظ کو اور دیگر مجلس والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس لئے ایذاء مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۱۰) اجتماعی بات سے اعراض بلکہ مخالفت ظاہر ہے اور اجتماعیت کے خلاف کرنا "من شذ شذ" کے مصداق بننے کا اندیشہ ہے۔

تلک عشرة کاملة

علماء کرام سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت سامنے رکھتے ہوئے اپنی تحقیق سے فیض یاب فرمائیں۔

مذکورہ استفتاء پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا جواب

الجواب حامداً ومصلیاً

محترم ومکرمی جناب حضرت مولانا مفتی　　صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دوسرا تفصیلی مراسلہ نظر نواز ہوا مراسلہ کے جواب ہم نے اپنے موقف کی وضاحت دوبارہ کرادی تھی اب قدرے تفصیل سے خدمت عالیہ میں عرض کرتے ہیں۔ ابتداء میں چند ارشادات بطور تمہید زیب قرطاس ہیں۔

تمہید (۱)۔　صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت شرط ہے۔

لمافی مراقی الفلاح (ص ۲۰۱): والثانی ان تکون بقصد الخطبة.

وفی البنایة (۲/۱۰۸): ثم اشترط عند ابی حنیفة ان یکون قوله الحمد للہ علی قصد الخطبة حتی لو قال یرید الحمد للہ علی اعطاء لا ینوب عن الخطبة وقیل ینوب، والاول اصح

وفی فتاوی الهندیة (۱/۱۴۶)، ومنها الخطبة　وکفت تحمیدة او تهلیلة هذا اذا کان علی قصد الخطبة

وفی فتاوی الشامية (۲/۱۴۸)　(بنیتها) ای نية الخطب.

تمہید (۲)۔　عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینے سے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک خطبہ ادا نہیں ہوتا امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اگرچہ جواز کے قائل ہیں لیکن بعض حضرات نے امام صاحب کا صاحبین کی طرف رجوع ثابت کیا ہے اگر رجوع ثابت نہ بھی ہو تب بھی عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے۔

لمافی عمدة الرعایة (ص ۲۰۰)، فانه لا شک فی ان الخطبة بغیر العربیة خلاف السنة المتوارثة من النبی ﷺ والصحابة فیکون مکروها تحریما.

وفی البنایة (۱/۹۵۲): ویروی رجوعه فی اصل المسئلة (یعنی القراءة الفارسیة) الی قولهما وعلیه الاعتماد لتنزله منزلة الاجماع　والخطبة یوم الجمعة والتشهد علی هذا الاختلاف.

وفی جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وعلی هذا الخلاف الخطبة وجمیع الاذکار

یعنی خطبہ اور تمام اذکار وادعیہ میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے۔)

تمہید (۳)　خروج امام منع صلوٰۃ وکلام اس وقت ہے کہ جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو۔

لما فی العنایۃ بہامش فتح القدیر (۲/۶۷): واذا خرج الامام یوم الجمعۃ یعنی لأجل الخطبۃ

وفی البحر الرائق (۲/۱۶۷): وفی شرح المجمع عبارۃ الخروج واردۃ علی عادۃ العرب من

انہم یتخذون للامام مکانا خالیا تعظیما لشانہ فیخرج منہ حین اراد الصعود ہکذا شاہدناہ فی

دیارہم والقاطع فی دیارنا یکون قیام الامام للصعود فالحاصل ان الامام ان کان فی خلوۃ

فالقاطع انفصالہ عنہا وظہورہ للناس والا فقیامہ للصعود.

وفی البنایۃ (۱/۸۵۳): ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابۃ یوم الجمعۃ لأجل الخطبۃ

وفی نہر الفائق (۱/۳۶۳): (واذا خرج الامام) ای صعد علی المنبر کذا فی معراج

والقاطع فی دیارنا ہو قیام الامام للصعود.

مذکورہ بالا تمہیدات کی روشنی میں اردو کے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگو نہیں ہوں گے کیونکہ صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت شرط ہے جیسا کہ تمہید (۱) کے حوالوں سے واضح ہے جبکہ وعظ و نصیحت سے پہلے تحمید و تسبیح بنیت خطبہ نہیں ہوتی بلکہ اتباع حدیث کل امر ذی بال الخ اور تعامل و توارث کی بناء پر پڑھی جاتی ہے۔ نیز سابقہ تحریر کے شبہ اول کے جواب میں درج عبارت "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ جمعہ کی نیت سے یہ خطبہ نہیں دیتے تھے جو کہ خطبہ کیلئے شرط ہے" بھی صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت پر دال ہے۔ نیز اشتراط نیت الخطبہ میں خطیب اور غیر خطیب کا حکم یکساں ہے۔ دونوں میں بہت فرق کرنا قابل دلیل ہے۔ جس پر ہم مطلع نہ ہوسکے۔

نیز خروج امام منع صلوٰۃ وکلام اس وقت ہوگا جب یہ خروج بغیہ خطبہ حجرہ یا محراب کی آغوش سے امام کی عظمت الشان ظاہر کرنے کیلئے واقع مقصورہ (حجرہ) سے ہو جیسا کہ عرب میں دستور تھا۔

لما فی سیر اعلام النبلاء (۲/۶۰۲): عاصم بن محمد عن ابیہ: رأیت ابا ہریرۃ یخرج یوم

الجمعۃ فیقبض علی رمانتی المنبر قائما ویقول: حدثنا ابو القاسم ﷺ الصادق

المصدوق: فلا یزال یحدث حتی یسمع فتح باب المقصورۃ لخروج الامامۃ فیجلس.

جبکہ ہمارے دیار میں خروج امام منع صلوٰۃ وکلام اس وقت ہوگا جب امام صاحب خطبہ کیلئے منبر پر جلوہ افروز ہو جائے۔ کیونکہ ہماری مساجد میں مقصورہ نادر ہے۔

کما فی البحر الرائق (۲/۱۵۵): وفی شرح المجمع عبارۃ الخروج واردۃ علی عادۃ العرب

من انہم یتخذون للامام مکانا خالیا تعظیما لشانہ فیخرج منہ حین اراد الصعود ہکذا شاہدناہ

فی دیارہم والقاطع فی دیارنا یکون قیام الامام للصعود فالحاصل ان الامام ان کان فی خلوۃ

فالقاطع انفصالہ عنہا وظہورہ للناس والا فقیامہ للصعود.

وفيه ايضاً (۲/۰۲۷): فان لم يكن في المسجد مقصورة يخرج منها لم يتركوا القراءة والذكر الا اذا قام الامام الى الخطبة.

وفي البناية على شرح الهداية (۱/۹۵۳): ولا اذا خرج الامام من بيت الخطابة يوم الجمعة لاجل الخطبة.

وفي النهر الفائق (۱/۳۹۳): واذا خرج الامام: اى صعد على المنبر . . . والقاطع في ديارنا هو قيام الامام للصعود.

بالفرض اگر یہی خروج امام مقصود (مجرد) سے ہو تب بھی زیر بحث مسئلہ میں یہ خروج مانع صلوٰۃ و اذکار نہیں ہوگا کیونکہ خروج امام میں المقصورہ پر "فلا صلوۃ ولا کلام" کا حکم اس وقت لاگو ہوگا جب یہ خروج بقصد خطبہ ہو کما في البناية (۱/۹۵۳) جبکہ زیر نظر مسئلہ میں خروج للوعظ ہوتا ہے۔

ولا اذا خرج الامام من بيت الخطابة يوم الجمعة لاجل الخطبة.

نیز اس خروج کو تشریف نیت پر محمول کرنا بایں معنی کہ یہ خروج للوعظ والخطبہ دونوں ہو درست نہیں کیونکہ قصد اول کا اعتبار ہوتا ہے جبکہ خطیب صاحب کا قصد اول بالخروج وعظ کرنا ہوتا ہے۔

کتاب الفتاویٰ (۳/۴۷): یوں تو منبر پر اردو میں بیان وتقریر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے　تاہم جمعہ میں چونکہ منبر پر کھڑے ہو کر اردو بیان میں اس کے خطبہ ہونے کا وہم ہو سکتا ہے حالانکہ خطیب کا مقصد اس سے خطبہ دینا نہیں ہے۔ انتھیٰ

نیز اگر مطلقاً خروج مانع سنت وتحیۃ و اذکار وصلوٰۃ ہو تو سوال ہوگا کہ اردو تقریر کے بعد عربی خطبہ سے قبل چار رکعت سنتیں پڑھنا جبکہ امام تشریف لا چکا ہو جائز ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ اکابرین واسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے عمل سے متصادم ہے اگر جواب اثبات میں ہے تو کس دلیل کی بنیاد پر جبکہ امام منبر پر براجمان ہے۔

معلوم ہوا مطلقاً خروج امام مانع صلوٰۃ و اذکار نہیں۔

یہ مسئلہ چونکہ تعجب اور نیا نہیں بلکہ ہمارے اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی حیات مبارکہ میں بھی پیش آیا تو الحمدللہ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی نوک قلم سے نکلی ہوئی تحقیقات وتدقیقات بھی اس مسئلہ میں موجود ہیں۔ ذیل میں چند ایک ملاحظہ ہو۔

اردو کے خطبہ کے وعظ ہونے پر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا تفصیلی اور تحقیقی فتویٰ۔

سوال　ایک مسجد کا خطیب بعد اذان اول جبکہ کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں مسجد سے ملے ہوئے مکان سے مسجد میں آتا ہے سلام کر کے لکڑی کے منبر کے پاس کھڑے ہو کر خطبہ وعظ یعنی "الحمدللہ ونحمدہ الخ" کے بعد کوئی ایک یا چند آیات تلاوت کر کے اردو میں وعظ کرتا ہے یوں ہوں کہتے یا تم بیش وعظ کے بعد چار سنت ادا کرتا ہے اور دیگر مردم کچھ تو اذان اول کے بعد وعظ سے پہلے فارغ ہو لیتے ہیں کوئی درمیان وعظ ہی میں پڑھ لیتا ہے باقی وعظ کے بعد پڑھ لیتے ہیں۔ خطیب سنت ادا کرنے کے بعد منبر پر بیٹھتا ہے اس کے سامنے اذان

احد الروایتین عن ابی حنیفة لان المامور به فی الجمعة ذکر اللہ مطلقاً ومنها الشرط ذکر اللہ علی الذبح.

لیکن بنایہ میں اشتراط نیت کو صحیح قرار دیا ہے۔

لمافی البنایة (۱/۶۰۸): ثم الشرط عند ابی حنیفة ان یکون قوله الحمدللہ علی قصد الخطبة حتی لو قال یرید الحمدللہ علی اعطاء لا ینوب عن الخطبة وقیل ینوب، والاوّل اصح.

نیز حموی علی الاشباہ والنظائر (۱/۵۷) پر اشتراط قصد کو مذہب ثابت کیا ہے۔

اما النیة فی الخطبة للجمعة فشرط لصحتها. لم تصح قبل هذا هو المذهب . . وفی روایة یجزئه ذالک لکن المذهب ماتقدم.

لمافی فتاوی الهندیة (۱/۱۴۶): ومنها الخطبة . . وکفت تحمیدة او تهلیلة. هذا اذا کان علی قصد الخطبة.

البتہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ کیلئے شرط ہے۔ جبکہ شرائط میں قطع نظر اشتراط نیت وغیرہ سے محض وجود کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

کمافی الحموی علی الاشباه والنظائر (۱/۶۹): اما اذا کان شرطا لحکم لا تشترط النیة فی هذا الشرط لان الشرط یراعی وجوده مطلقاً لا وجوده قصداً.

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطبہ محض شرط ہی نہیں بلکہ اس میں رکنیت کا بھی ادنیٰ شائبہ موجود ہے۔

لمافی البنایة (۱/۸۰۰): وعن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه قال قصرت الصلوة لاجل الخطبة وعن عائشة مثله وعن سعید بن جبیر قال کانت الجمعة اربعاً فجعلت الخطبة، فکان رکعتین.

نیز خطبہ نری شرط ہی نہیں بلکہ مشروط بھی ہے کیونکہ سعی کا حکم خطبہ کیلئے ہے۔

بالفرض اگر تسلیم کرلیا جائے کہ خطیب ابتداء وعظ میں تحمید و تسبیح جیسی خطبہ پڑھتا ہے تب بھی اس اردو کے خطبہ کو اصل خطبہ کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے چہ جائیکہ اس کا استماع لازم ہو اور اس دوران صلوٰۃ ونوافل واذکار حرام ہوں۔

لمافی امداد المفتین (۱/۲۸۵): فالحاصل ان اختصاص اللغة العربیة فی الخطبة وان کان فی الاصل من السنن إلا انه لحق بترکه امور آخر من ابتداع بدعة واثم الادمان علی ترک السنة وترک البدعة واجب: فجاء الوجوب من هذا القبیل لا بمعنی المواظبة علیه وبالجملة فالحکم بوجوب العربیة واثم تارکها فی خطبة الجمعة. وان ترجمتها بغیر العربیة بدعة حق لاریب فیه.

وفيه (۱/۳۸۳): والحاصل ان اللغة العربية في الخطبة سنة مؤكدة عندنا ولكن ترك العربية وجعلها بالعجمية مكروه تحريماً وتاركها آثم ولا سيما المدمن عليه.

یہ شبہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خالص اردو خطبہ کو بدعت فرما رہے ہیں جبکہ ہمارا کلام اردو ملے خطبے کے بارے میں ہے۔ کیونکہ حضرت کے نزدیک خالص اردو خطبہ اور اردو ملا خطبہ بدعت ہونے میں یکساں ہے۔

فی امداد المفتین (۲۸۵/۱):

سوال نمبر (۲۴): جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو تقریر یا آخر میں اس کا مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ آیا اس طرح پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو میں ترجمہ خواہ نثر سے ہو یا نظم سے بدعت ہے اور ناجائز ہے۔ قرون مشہود لہا بالخیر میں باوجود ضرورت و قدرت اس کی کوئی نظیر نہیں۔ نیز مسلک حنفیہ میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں جبکہ یہ موقف قدیم اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ سے منقول نہیں فرمایا۔ نیز حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواہر الفقہ میں خطبہ کیلئے عربی کو شرط کہا ہے۔

جواہر الفقہ (۱/۳۵۵): وقال النووي: في كتاب الاذكار رحمه الله تعالى ويشترط كونها خطبة الجمعة وغيرها بالعربية.

لیکن جواہر الفقہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا کالعدم قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام صاحب اگرچہ جواز کے قائل تھے لیکن ان کا صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع منقول ہے۔

جواہر الفقہ (۱/۳۵۵): وعلى هذا الخلاف الخطبة وجميع الاذكار.

یعنی خطبہ اور تمام اذکار و اوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے)۔ انتہی کلامہ۔

اب نامعلوم غیر خطبہ (جب خالص اردو میں) ہو تو بعد جمعہ (اردو ملا خطبہ) بطور خطبہ کا استعمال کیوں لازم ہے اور اس دوران نوافل کی ممانعت کس بنا پر ہے جبکہ اردو ملا خطبہ جیسے خطبہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے۔

مروجہ تقریر میں خطبہ کا بڑا مقصد وعظ و تعلیم مرقوم ہے جبکہ اکابرین کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔

لما فی جواہر الفقہ (۳۵۵/۱): یہاں تک کی تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ خطبہ جمعہ کا اصلی رکن اور مقصد صرف ذکر اللہ ہے۔ تبلیغ یا وعظ و تذکیر اس کے مقاصد میں داخل نہیں۔ حضرت چند سطر بعد رقم طراز ہیں: اگر خطبہ کا مقصود ذکر نہیں تھا بلکہ وعظ و تبلیغ مقصود تھی تو بوقت ضرورت غیر عربی کی تخصیص نہیں ہے۔

نیز فرماتے ہیں: اگر خطبہ پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہو گیا اور نماز میں کوئی معتد بہ فصل ہو گیا تو قرین قیاس کے موافق خطبہ کا اعادہ ضروری ہے۔ اگرچہ سننے والے دوبارہ بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سن چکے ہیں۔

اگر وعظ و پند ہی خطبہ کا مقصود ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ متصور ہے تحقیق کا مدعا۔

نیز اردو والے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کرنے کی صورت میں دو بدعتوں میں سے ایک کا ارتکاب لازم آئے گا کیونکہ اگر اردو والے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کیا جائے تو باقی دو خطبے نفل ہوں گے جبکہ جمعہ میں خطبہ نفلا مشروع نہیں۔

لما في الاشباه مع الحموي (۱/۱۳۵): وكذا الخطبة ان شرطنا لها النية لانها لا يتنفل بها.

اگر باقی دو خطبے نہ پڑھے جائیں تو اس صورت میں بھی ارتکاب بدعت سے خالی نہیں کیونکہ اردو والا خطبہ بتصریحات اکابرین خطبہ مبتدعہ ہے جبکہ ترک بدعت واجب ہے۔

علاوہ ازیں تینوں خطبوں کو ماننے کی صورت میں ایک تیسرا خلاف سنت امر "تطویل خطبہ" کا ارتکاب لازم آئے گا جو کہ بنص حدیث ممنوع ہے۔ چنانچہ جواہر الفقہ (۱/۳۵۹) میں مذکور ہے کہ موطا امام مالک میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرن صحابہ کے خصوصی فضائل میں اختصار خطبہ کو اور قرامت کے فتن و مفاسد میں تطویل خطبہ کو شمار فرماتے ہیں۔

چونکہ مرسلہ تحریر کا نچوڑ اور لب لباب امرین کا اثبات ہے۔

(۱)۔ اردو والا خطبہ بھی عربی خطبہ کے حکم میں ہے۔

(۲)۔ ہر وعظ کا استماع واجب ہے۔

لہٰذا مرسلہ تحقیق کی ہر شق اور عبارت پر کلام کرنا مفید نہیں انہی دو دعووں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

اب تک پہلے دعوی پر کلام تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ اردو والے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔

اولاً تو اس میں خطبہ کی اہم شرط خطبہ بنیت خطبہ نہیں پائی جاتی۔

ثانیاً اگر خطبہ مان بھی لیا جائے تو بتصریحات اکابرین یہ بدعت ہے جس کا ترک واجب ہے۔

اب ہم دوسرے دعوے (ہر وعظ کا استماع واجب ہے) کے بابت اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں ہمارے نزدیک ہر وعظ کا استماع واجب نہیں اگرچہ استماع اولیٰ اور بہتر ہے جیسا کہ تنبیہ نمبر (۵) میں تفصیل مذکور ہے۔ لیکن خطبہ کی طرح اس خطاب کے دوران صلوٰۃ و اذکار حرام نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اس کیلئے کوئی نص درکار ہے جو ہماری دانست میں دلیل یا جب بناء در مختار کی عبارت في المسجد عظة الخ سے اپنے مدعی کے اثبات کیلئے ترتیب شدہ شکل اول میں ہمیں کبری تسلیم نہیں۔ کیونکہ شامی نے اسی عبارت سے قبل یہ بھی مذکور ہے۔

لما في الفتاوى الهندية (۵/۳۱۸): يكره من الفقه وغيره يقرأ القرآن لا يلزمه الاستماع.

اس سے معلوم ہوا کہ استماع واجب علی الاطلاق نہیں۔

نیز شامی میں استماع انصات اولیٰ کا حکم قاری کے علاوہ دوسرے سامعین کیلئے ہے خود قاری کیلئے کیا حکم ہے؟

فتاویٰ شامی ملاحظہ ہو۔ (۱/۶۶۳)

قوله: فاستماع العظة اولى. الظاهر ان هذا خاص بمن لا قدرة له على فهم الآيات القرآنية والتدبر في معانيها الشرعية والاتعاظ بمواعظها الحكمية اذ لا شك ان من له قدرة على ذالك يكون استماعه اولى بل اوجب. بخلاف الجاهل فانه يفهم من المعلم والواعظ مالا يفهمه من القاري فكان ذالك انفع له.

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامع عالم ذی فہم معانی قرآن سے واقف ہو تو اس کیلئے استماع قرآن اولیٰ بلکہ واجب ہے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب تلاوت جاری ہو جبکہ مرسلہ تحریر میں پیش کردہ دعویٰ دوران وعظ مطلقاً نوافل، تلاوت وغیرہ کی ممانعت کا ہے۔

نیز بحرالرائق (۲/۵۵) میں ہے:

ولهذا نقل الشارح عن الصحابة رضي الله تعالىٰ عنهم ان بعضهم كانوا يقرؤون القرآن وبعضهم يتذاكرون العلم والمواعظ وبعضهم يصلون ولم ينههم النبي ﷺ عن ذالك ولو كان مكروها لنهاهم.

مذکورہ بالا عبارت سے صاحب بحر نے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی نمازی سامنے بیٹھے شخص کی پشت کی طرف نماز پڑھ رہا ہو جبکہ وہ شخص محوِ کلام ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختلف حلقے لگتے تھے اس میں نماز پڑھنے والے بھی، وعظ وپند کرنے والے اور ایک حلقہ تلاوت کرنے والوں کا تھا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرز عبادت وتلاوت سے منع نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ تلاوت اور وعظ کو علی الاطلاق منع واجب نہیں ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کو حلقہ تعلیم میں بیٹھنے یا استماع تلاوت کا حکم صادر فرماتے۔

نیز خارج نماز عدم استماع تلاوت کے عدم وجوب پر ابن کثیر ملاحظہ ہو۔

تفسیر ابن کثیر (۲/۲۵۹): سورۃ الاعراف (آیۃ: ۲۰۴)

حدثنا الجريري عن طلحة بن عبيد الله بن كريز قال رايت عبيد بن عمير وعطاء بن ابي رباح يتحدثان والقاص يقص فقلت الا تستمعان الى الذكر وتستوجبان الموعود؟ قال فنظرا الي ثم اقبلا على حديثهما، قال فاعدت فنظرا الي واقبلا على حديثهما، قال فاعدت الثالثة قال فنظرا الي فقالا انما ذالك في الصلوٰة.

مذکورہ بالا حوالہ میں جہاں خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوۃ کی صراحت ہے وہاں وعظ وپند کے عدم وجوب استماع پر بھی القاص یقص " کی بناء پر بین دلیل ہے۔

نیز ابن کثیر (۲/۲۵۹) ملاحظہ ہو۔

قال عبدالرزاق عن الثوري عن ليث عن مجاهد قال لا بأس اذا قرأ الرجل في غير الصلوة ان يتكلم وكذا قال سعيد بن جبير والضحاك وابراهيم النخعي وقتادة ان المراد بذالك في الصلوة.

كذا في تفسير القرآن لصنعاني (۲/۲۴۴)

اس حوالہ بالا کی روشنی میں علی الاطلاق وجوب استماع تلاوت کا حکم دشوار ہے۔

تفسیر الدر المنثور میں (۹/۱۳۵) پر بھی اس کی تائید موجود ہے:

عن عبدالله بن مغفل انه سئل أكل من سمع القرآن يقرأ وجب عليه الاستماع والانصات؟ قال لا قال انما نزلت هذه الآية ... في قراءة الامام اذا قرأ الامام فاستمع له وانصت.

نیز تفسیر مظہری میں خلاصۃ الفتاویٰ کے جزئیہ "رجل یکتب الفقه وبجنبه یقرأ القرآن فلا یمکنه الاستماع فالاثم علی القاری الخ" پر مصنفؒ کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

تفسير مظهري (۳/۵۰۲): اختلف العلماء في وجوب الاستماع والانصات على من هو خارج الصلوة يبلغه صوت من يقرأ القرآن في الصلوة او خارجها. قال البيضاوي عامة العلماء على استحبابها خارج الصلوة. قال في الخلاصة رجل يكتب الفقه الخ.

قلت: وقد ثبت عنه ﷺ انه كان يقرأ القرآن بالليل جهراً بحيث يسمع من وراء حجرته وربما يسمعه الجيران.

وفي الصحيحين عنه قال قال رسول الله ﷺ اني لاعرف اصوات رفقة الاشعريين حين يرحلون واعرف منازلهم من اصواتهم بالقرآن بالليل ولا شك ان بعض الناس في العسكر كانوا نياما وقت قراءة الاشعريين.

فهذا الاحاديث تدل على فساد ما افتى به صاحب الخلاصة

حضرت کا یہ تبصرہ اگرچہ بظاہر "وعلی ھذا لو قرأ علی السطح الخ" کے متعلق ہے لیکن حضرت کا رجحان خارج نماز عدم وجوب استماع تلاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن مردویہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

اخرج ابن مردويه في تفسيره قال ... قال عبدالله بن مغفل أكل من سمع القرآن وجب عليه الاستماع والانصات قال انما نزلت هذه الآية اذا قرأ القرآن الخ في القراءة خلف الامام.

بلکہ حضرت مندرجہ ذیل الفاظ سے صاف صاف اپنی رائے کا اظہار فرما رہے ہیں۔

قلت واللام في قوله تعالى اذا قرئ القرآن للعهد دون الجنس والمراد به القرآن المقروء لاستماعكم كالامام يقرأ حتى يسمع من خلفه والخطيب يقرأ للمخاطب والمقرئ يقرأ على التلميذ

معلوم ہوا مطلقاً استماع تلاوت واجب نہیں۔

نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ خارج نماز استماع تلاوت کے بابت ملاحظہ ہو۔

امداد الفتاویٰ (۴/۵۹۵) الجواب: سماع قرآن میں دونوں قول ہیں آسانی کیلئے میں اسی کا اختیار کرتا ہوں کہ خارج صلوٰۃ مستحب ہے۔

حضرت کے نزدیک جب وجوب استماع تلاوت علی الاطلاق نہیں تو اس پر مبنی وجوب احترام وعظ بھی یقیناً واجب نہیں ہوگا۔

نیز استماع تلاوت مطلقاً میں اتنا عموم اور توسع کہ مجلس تلاوت میں بیٹھے ہوئے حاضرین وسامعین پر استماع واجب ہو پھر اسی پر بنا کرکے مجلس وعظ میں موجود تمام سامعین پر وجوب وعظ کا حکم لگانا خود علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے متضاد ہے۔ کیونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ جہاں احترام تلاوت علی الاطلاق کے قائل ہیں وہاں استماع تلاوت خارج نماز فرض (واجب) کفائی کی تصریح فرما رہے ہیں۔ چنانچہ مرسلہ تحریر میں ثبت دعویٰ اس کے خلاف ہے۔

فتاویٰ شامیہ (۱/۵۴۶): وفي شرح المنية: والاصل ان الاستماع للقرآن فرض كفاية لانه لاقامة حقه بان يكون ملتفتا اليه غير مضيع وذالك يحصل بانصات البعض، كما في رد السلام حين كان لرعاية حق المسلم كفى فيه البعض عن الكل.

نیز بیان القرآن میں خارج نماز استماع تلاوت کے بابت مفصل اور فیصلہ کن کلام ملاحظہ ہو۔

بیان القرآن (۱/۳۶۳): اور اس سے خارج عن الصلوٰۃ بھی قرأت کے وقت دوسرے کام میں مشغول ہونے کو ہمارے فقہاء حنفیہ نے ممنوع فرمایا ہے۔ اور اسی پر مشغول کے پاس بیٹھ کر پکار کر پڑھنے کو منع کیا ہے تعلق الروح عن الخلاصۃ۔

اور گو اس کا مسئلہ مشہور اصولیہ کے اعتبار سے عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا لیکن اختر کو اس میں شفا نہیں ہوتا اس مسئلہ اصولیہ میں اور اس فرع فقہی میں کیونکہ ایسا عموم جو مراد متکلم سے بھی متجاوز ہو مراد لینا صحیح نہیں جیسے کہ حدیث "ليس من البر الصيام في السفر" میں بیان کو کسی نے عام نہیں لیا اور یہاں مجموعہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تلاوت خارج صلوٰۃ اپنے ثواب پانے کیلئے ہو کسی کو تذکیر وتبلیغ کیلئے نہ ہو وہ آیت میں مراد نہیں۔

وايضا في السراج المنير للخطيب الشربيني عن البيضاوي وظاهر اللفظ يقتضي وجوبهما حيث يقرأ القرآن مطلقا وعامة العلماء على استحبابهما خارج الصلوة.

تناظر میں علامہ ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تاویل کی جائے گی کیونکہ جب کلام خالق جل جلالہ کا استماع علی الاطلاق واجب نہیں تو وجوب استماع کلام عالم اوکلام الناس بدون نص سے تا غیر معارض چہ معنی دارد۔

نیز اگر علماء کرام کے ہر کلام خواہ وہ تبلیغ خطبہ ہو یا وعظ و پند سننا واجب ہو تو پھر "یجب الاستماع لسائر الخطب" کا محمل کیا ہوگا جبکہ مرسوم تحریر کے مطابق "فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے الخ"۔

لہٰذا ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں مذکورہ تاویل کے کوئی چارہ کار نہیں۔

وبیان التاویل متسع

اولاً ... وجوب انصات العالم اس وقت ہوگا جب وہ خطبہ دے رہا ہو جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب الانصات للعلماء کے تحت جو حدیث نکالی ہے اسی حدیث کیلئے (اگرچہ سند مختلف ہے) (۲۲۳/۱) پر باب باندھا ہے باب "الخطبۃ بایام منی" ورنہ انصات مستحب ہوگا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے مطلقاً عالم کیلئے انصات مفہوم ہو رہا ہے کیونکہ "جب کسی اسم مشتق پر حکم لگتا ہے تو مادہ اشتقاق اس کی علت بنتا ہے جیسا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں "الانصات لاجل العلماء واللام فیہ للتعلیل"

جواباً ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر عالم کا ہر کلام خطبہ وغیر خطبہ سننا واجب ہو تو پھر یجب الاستماع لسائر الخطب کے مابین تعارض آئے گا اس تعارض کے دفعیہ کیلئے ذکر کردہ تاویل کے علاوہ کوئی مخلص نہیں۔

ثانیاً ... وجوب کی تصریح نہیں ہے بلکہ ... الخ۔

ثالثاً ... محقق العصر محدث وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے "الدر" کی عبارت "یجب الاستماع لسائر الخطب" کے عموم پر گہری تشویش کا اظہار فرمایا ہے چہ جائیکہ ہر عالم کے کلام اور ہر وعظ کا سننا واجب ہو۔

لما فی فیض الباری (۲/۳۴۲): قولہ (ترکوک قائماً) فان قلت کیف وھم اتقی الناس فی الارضین وارشدھم بعد الانبیاء والمرسلین قلت والجواب کما فی التوشیح للسیوطی ان الخطبۃ فی الجمعۃ کانت علی شاکلۃ العیدین بعد الصلوٰۃ ثم قدمت علیھا فلعلھم حملوا استماعھا علی الاستحباب وظنوہ کسائر الخطب ولم یروہ عزیمۃ علیھم سیما اذا کان عند النسائی ان النبی ﷺ کان ینادی بعد العیدین ان من شاء منکم ان یمکث فلیمکث ومن شاء ان یذھب فلیذھب وتردد فیہ الحافظ فدل علی التوسیع فی خطبۃ العیدین.

وفی الدر المختار ان استماع جمیع الخطب واجب" قلت ولا یناسب ھذا التوسیع بل ینبغی ان یفصل فی الامر.

وفیہ تحت باب کلام الامام والناس فی خطبۃ العید الخ

(۲/۳۹۳) کلام الامام الناس) ــــــ لعل المصنف رحمہ اللہ تعالیٰ یشیر الی ان فی خطبۃ العیدین سعۃ بالنسبۃ الی خطبۃ الجمعۃ وھو المختار عندی وان کان فی کتبنا انھما سواء.

وفی النسائی (۱/۱۷۸) مع حاشیۃ للسیوطی

ان النبی ﷺ صلی العید قال من احب ان ینصرف فلینصرف ومن احب ان یقیم للخطبۃ فلیقم

قولہ من احب ان یقیم. وعلم منہ ان استماع خطبۃ العید غیر واجب.

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تحقیق کے تناظر میں ہر وعظ کے وجوب استماع کا حکم لگانا یقیناً دشوار ہے۔

نیز قاعدہ مسلّمہ "المشقۃ تجلب التیسیر" بھی عدم وجوب کا متقاضی ہے۔ علاوہ ازیں بعض صحابہ کے طرزِ عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

لما فی موضوعات الکبریٰ لملا علی القاری (ص ۳۳): واخرج المروزی عن سالم ان ابن عمر کان یلقی خارجاً من المسجد فیقول ما اخرجنی الا صوت قاصکم ھذا.

یہ تو اس مسئلہ کا علمی اور فقہی پہلو تھا جس کے بابت ہم نے اپنے موقف کی وضاحت کر دی البتہ عملی لحاظ نظر سے علماء کرام کی توقیر، عزت واحترام اور ان کے کلام وعظ اور پند کو بہ تن، دلجمعی اور یکسوئی سے سننے سے کسی کو انکار کی مجال نہیں بلکہ اس پہلو کو عوام الناس میں ترغیبی انداز میں اجاگر کرنے کی اشد ضرورت اور عصر حاضر کا اہم تقاضا ہے۔ کیونکہ افادہ اور استفادہ کا دارومدار اعتقاد اور باہمی الفت ومحبت پر ہے۔ عوام الناس کے قلوب میں علماء کرام کا اعتقاد، تعظیمی اور توقیری شعور بیدار کرنے کیلئے اس مسئلہ کو منصۂ شہود پر لانا انتہائی قابل ستائش اور مستحسن اقدام ہے۔ اس مسئلہ کو عملی جامہ پہنانے سے میڈیا، مغرب زدہ طبقہ اور سازشی عناصر کے ہاتھوں عوام اور علماء کرام کے مابین پھیلائی ہوئی دوری، فساد، نفرت اور وسیع خلیج کے فاصلے رفو ہو کر علماء کرام عوام الناس کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں بہتر انداز میں صحیح دینی اور اخلاقی رہنمائی کر سکیں گے اور کافی حد تک عریانی اور فحاشی سے آلودہ معاشرہ کا مداوا ہو سکے گا۔

(۳۳۷) خطبہ اور جماعت کے درمیان خطیب صاحب کا مخصوص اعلان کرنے کا حکم

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے خطیب صاحب جمعہ کے خطبہ کے بعد اقامت سے پہلے دو چار باتوں کا اعلان کرتے ہیں، وہ یہ ہیں "صفیں درست فرمالیں، چھوٹے بچوں کو پچھلی صفوں میں، یا صفوں کے دائیں بائیں کر دیں، اپنے سروں کو ڈھانپ لیں اپنے پائچوں کو ہمیشہ کھلا رکھا کیجئے اور اپنے موبائل فونز بند کرلیں" اس اعلان کے بعد اقامت ہوتی ہے اور پھر نماز۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ کیا اس طرح کے اعلان سے خطبہ جمعہ اور نماز میں فصل واقع نہیں ہوتا؟ کیا اس طرح کا اعلان کرنا خطیب صاحب کیلئے درست ہے؟ میں نے کئی بڑے بڑے بزرگوں کے پیچھے نماز جمعہ پڑھی ہے انہیں اس طرح کے اعلانات

کرتے بھی نہیں سنا، ازراہ کرم اگر بزرگوں میں سے کسی سے متعلق بھی معلوم ہوجائے کہ ان کی یہ عادت تھی تو بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً: امر بتسویۃ الصفوف یعنی نماز کے لئے جب صفیں بنائی جائیں تو صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم کرنا نمازی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، خدا کے بعد سب سے بڑے بزرگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھانے کے لئے تشریف لاتے تو تکبیر سے پہلے صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم فرماتے۔ کتب احادیث اس قسم کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں جواباً عرض ہے کہ خطیب صاحب کا یہ اعلان کرنا جائز و مستحسن اور سنن صلوٰۃ میں سے ایک سنت کو پورا کرنا ہے، جہاں تک خطبہ اور اقامت کے درمیان فصل کا تعلق ہے جس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ دنیوی باتوں کے ذریعہ ہو، اگر دینی باتوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا کسی عذر شرعی کی بناء پر فصل آجائے تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ خطیب صاحب مذکور فی السوال کا یہ اعلان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قبیل سے ہے لہٰذا یہ فصل مضر نہیں۔ آپ کا کسی سے نہ سننا ان کے خلاف حجت نہیں ہے۔

لما في سنن النسائي (١/ ٩٣): ما يقول الامام اذا تقدم في تسوية الصفوف، اخبرنا بشر بن خالد عن ابي مسعود رضي الله عنه قال كان رسول الله ﷺ يمسح عواتقنا ويقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبكم وليليني منكم اولو الاحلام والنهى ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم. . عن انس قال اقبل علينا رسول الله ﷺ بوجهه حين قام الى الصلوة قبل ان يكبر فقال اقيموا صفوفكم وتراصوا فاني اراكم من وراء ظهري.

وفي صحيح البخاري (١/ ١٠٠): قال انس بن مالك رضي الله عنه اقيمت الصلوة فاقبل علينا رسول الله ﷺ بوجهه فقال اقيموا صفوفكم وتراصوا فاني اراكم من وراء ظهري.

وفي عمدة القاري (٥/ ٢٥٣): ذكر ما يستفاد منه فيه الامر بتسوية الصفوف وهي من سنة الصلوة عند ابي حنيفة والشافعي ومالك رحمهم الله تعالى، وزعم ابن حزم انه فرض لان اقامة الصلوة فرض وما كان من الفرض فهو فرض.

وفي الدر المختار مع الشامية (٢/ ١٦٢): فاذا اتم اقيمت ويكره الفصل بامر الدنيا ذكره العيني.

قوله اقيمت، بحيث يتصل اول الاقامة باخر الخطبة وتنتهي الاقامة بقيام الخطيب مقام الصلوة.

قوله بامر الدنيا اما بنهي عن منكر او امر بمعروف فلا وكذا بوضوء او غسل لو ظهر انه محدث او جنب كما مر بخلاف اكل او شرب.

(۳۳۸) خطبہ اور جمعہ میں فصل کی شرعی حیثیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر خطبہ اور نماز جمعہ میں فصل ہوجائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ۔ خطبہ اور نماز جمعہ میں وصل سنت ہے۔ پھر اگر فصل اخروی امور کی وجہ سے ہو۔ جیسے وضو کرنا وغیرہ تو دوبارہ خطبہ دینا مستحب ہے۔ اگر خطبہ نہ دے پھر بھی جائز ہے۔ لیکن اگر فصل دنیاوی امور کی وجہ سے ہو، جیسے کھانا پینا وغیرہ تو مکروہ ہے اور اگر فصل لمبا ہو جائے تو دوبارہ خطبہ دینا ضروری ہوگا۔

لما فی الدر المختار علی هامش الطحطاوی (۱/ ۳۴۳): ولو خطب جنبا ثم اغتسل وصلی جاز ولو فصل باجنبی فان طال بان رجع لبیته فتغدی او جامع واغتسل استقبل خلاصة ای لزوما لبطلان الخطبة.

وقال الطحطاوی تحته: (قوله جاز) ای ولا یعد الغسل فاصلا لانه من اعمال الصلاة (فان طال) الظاهر انه یرجع فی الطول الی نظر المبتلی.

وفیه ایضا (ص ۳۴۸): (فاذا اتم) الامام الخطبة (اقیمت ویکره الفصل بامر الدنیا) یفهم منه انه لایکره الفصل بامر الآخرة کذکروهو کذلک لان الخلاف علی الاصح انما هو فی کلام الدنیا کما قدمناه ولکن مالم یلزم منه تاخیر.

وفی الشامیة (۲/ ۱۵۱): (قوله جاز) ای ولا یعد الغسل فاصلا لانه من اعمال الصلاة ولکن الاولی اعادتها کما لو تطوع بعدها او فسد الجمعة او فسدت بعد کرالتة فیها. وفی (ص ۱۲۱): (قوله فاذا اتم) ای الامام الخطبة (قوله اقیمت) بحیث یتصل اول الاقامة بآخر الخطبة ....

وفی (ص ۱۲۲): (قوله بامر الدنیا) اما بنهی عن منکر او امر بمعروف فلا وکذا بوضوء او غسل لو ظهر انه محدث او جنب کما مر بخلاف اکل وشرب حتی لو طال الفصل استأنف الخطبة.

(۳۳۹) عربی میں خطبہ پڑھنے کی شرعی حیثیت

سوال: ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے وقت عربی زبان میں جو خطبہ پڑھا جاتا ہے اس کا عربی زبان میں پڑھنا فرض ہے واجب یا سنت؟ اگر کوئی عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھتا ہے یا عربی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی ہوتا ہے تو اس خطبے کا کیا حکم ہوگا؟ اور اس صورت میں نماز جمعہ کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اس مسئلے میں جواز اور عدم جواز کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں ان کو مفصلاً ومدللاً بیان فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: ۔ جمہور ائمہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے خطبہ پڑھنا فرض اور عربی زبان میں پڑھنا واجب ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا پہلے یہ قول تھا کہ قرأت بالفارسیہ جائز ہے اس شخص کیلئے جو عربی زبان پر قدرت رکھتا ہو، پھر انہوں نے صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کرلیا اور اب احناف کا متفق یہ قول یہ ہے کہ قرأت بالفارسیہ جائز نہیں، اور شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ میں بھی یہی اختلاف ہے۔

الافکار شرح درر البحار فی هذا المحل: وکره الدعاء بالعجمیة، لان عمرؓ نهی عن رطانة الأعاجم اهـ. والرطانة کما فی القاموس: والکلام بالاعجمیة، ورأیت فی الولوالجیة فی بحث التکبیر بالفارسیة ان التکبیر عبادة لله تعالی، والله تعالی لایحب غیر العربیة، ولهذا کان الدعاء بالعربیة اقرب الی الاجابة، فلایقع غیرها من الألسن فی الرضاء والمحبة لها موقع کلام العرب اهـ. وظاهر التعلیل أن الدعاء بغیر العربیة خلاف الاولی، وان الکراهة فیه تنزیهیة، الی قول ولا یبعد ان یکون الدعاء بالفارسیة مکروها تحریما فی الصلوٰة وتنزیها خارجها، فلیتامل ولیراجع

وفی مجموعة الفتاوی هامش خلاصة الفتاوی(۱/ ۱۵۰): سوال: چه میفرمایند علماء دین متین اندرین مسئله که خطبه جمعه بر زبان اردو یا فارسی یا باشعار اردو یا فارسی خواندن جائز ودرست است یا نه؟ واگر جائز است پس در کدام کتاب مذکور است بینوا توجروا، هو العلیم الخبیر خطبه جمعه بر زبان اردو نثر باشد یا نظم وهمچنان برزبان فارسی نثر باشد یا فارسی وعلی هذا القیاس خطبه که قدری عبارتش بلغت عربی باشد وقدری برزبان اردو یا فارسی نثر یا نظم باشد مکروه بکراهت تحریمی است چرا که مخالف سنت هدی است زیراچه پیغمبر خدا علیه التحیة والثناء وصحابه کرامؓ علی الدوام خطبه بزبان عربی خوانده است ودر آن وقت از کسی خواندن خطبه بغیر زبان عربی منقول نیست چنانکه در کتاب آکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس مسطورست وهذه عبارته "الکراهة انما هی لمخالفة السنة لان النبی ﷺ واصحابه قد خطبوا دائما بالعربیة ولم ینقل عن احد منهم أنهم خطبوا ولو خطبة غیر الجمعة بغیر العربیة انتهی، وپوشیده نماندکه باعث احداث خطبه غیر عربیه نیست مگر نفهمیدن عجم عبارات عربیه راحالانکه این امردر قرون ثلاثه هم موجود بود چرا که هر گاه بلاد وامصار در اطراف مختلفه مفتوح شدند واکثر مردمان فارس وحبش وروم وغیره مشرف باسلام شدند وایشان درمجالس شعائر الاسلام مثل جمعه وعید وغیرها حاضر میشدند وظاهر است که آن مردمان رابوجه عدم وقوف از لغت عربی شعور فهم عبارات عربیه نبود با این همه کسی شخصی بنا بر رعایت فهم اشخاص عجمیه خطبه در غیر زبان عربی نخوانده باوجودیکه تعلیم وتفهیم که از شان خطبا وعلماست مقتضی این بود هر گاه در آن وقت چنین نه شده پس در کراهت خطبه غیر عربیه که ادنی مرتبه ضلالت ست، هیچ شکی نماند، چنانکه در کتاب آکام النفائس فی اداء الأذکار بلسان الفارس مذکورست، الخطبة بالفارسیة التی احدثوها واعتقدوا حسنها لیس الباعث الیها الاعدم

فهم العجم اللغة العربية وهذا الباعث قد كان موجودا في عصر خير البرية وان كان في اشتباه فلا اشتباه في عصر الصحابة والتابعين ومن تبعهم من الائمة المجتهدين حيث فتحت الامصار الشاسعة والديار الواسعة واسلم اكثر الحبش والروم والعجم وغير هم من الاعجام وحضروا مجالس الجمع والاعياد وغيرها من شعائر الاسلام وقد كان اكثرهم لايعرفون اللغة العربية ومع ذلك لم يخطب احد منهم بغير العربية ولما ثبت وجود الباعث في تلك الازمنة وفقدان المانع والتكاسل ونحوه معلوم بالقواعد المبرهنة لم يبق الا الكراهة التي هي ادنى درجات الضلالة انتهى، الى قول (صـ ١٥) جن انجه هم قرآن كتاب مرقوم است، وقدورد ان النبي ﷺ لما فرغ من الخطبة في بعض الاعياد وظن انها لم تصل الى اذان النساء لبعدهن حضرهن ووعظهن وخطبهن ولم يرو ولو من رواية الافراد انه عقدلهن المجلس علىحدة لمن لم يكن يفهم العربي ووعظهم وخطبهم بلغة غير عربية ولا يتوهم انه لم يكن النبي ﷺ يعلم اللغة العجمية وغيرها من اللغات الغير العربية ولو كان علمها لخطب بها لانا نقول بعد تسليم ذلك ان بعض الصحابة كزيد بن ثابت قد كان يعلم اللسان العجمي والرومي والحبشي وغيرها من الالسنة كما صرح به في الاعلام بسيرة النبي ﷺ وغيره من كتب الاعلام فلم لم يامره النبي ﷺ بان يخطبهم ويعظهم بالسنتهم وبالجملة فالاحتياج الى الخطبة بغير العربية لتفهيم اصحاب العجمية كان موجودا في القرون الثلثة ومع ذلك فلم يرو واحد من احد في تلك الازمنه وهذا اول دليل على الكراهة انتهى.

وفي اعلاء السنن (١١٣/٤): هذا هو قول أبي حنيفة أولا ثم رجع عنه إلى قولهما، وقال بأن القرآن اسم للفظ والمعنى جميعا لا للمعنى فقط. وقال: لا تجوز الصلوة بالعجمية للقادر على العربية، وتجوز للعاجز عنها، قال في البحر: وهو الحق لأن المفهوم من القرآن بالكلام انما هو العربي في عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالى: "فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ".

وفي كتاب الفقه على مذاهب الاربعة (٣٩٣،٣٩٢/١): يشترط لخطبتي الجمعة امور: احدها- أن تتقدما على الصلاة، فلا يعتد بهما إن تأخرتا عنها .. ثالثها أن تكون بالعربية على تفصيل في المذاهب.

(حاشية نمبر ٢): الحنابلة: قالوا لا تصح الخطبة بغير العربية إن كان قادرا عليها، فإن عجز عن الاتيان بها أتى بغيرها مما يحسنه، سواء كان القوم عربا أو غيرهم، لكن الآية التي هي ركن من اركان الخطبتين لا يجوز له ان ينطق بها بغير العربية، فيأتي بدلها بأي ذكر شاء بالعربية، فان عجز

سكت بقدر قراءة الآية.

الشافعية: قالوا: يشترط ان تكون اركان الخطبتين باللغة العربية، فلا يكفي غير العربية متى امكن تعلمها، فإن لم يمكن خطب بغيرها، هذا إذا كان القوم عرباً، اما إن كانوا عجماً فإنه لا يشترط اداء اركانهما بالعربية مطلقاً، ولو امكنه تعلمها ماعدا الآية، فإنه لابد ان ينطق بها بالعربية، الا اذا عجز عن ذلك، فإنه يأتي بدلها بذكر أو دعاء عربي، فان عجز عن هذا ايضاً فعليه ان يقف بقدر قراءة الآية، ولا يترجم، واما غير اركان الخطبة فلا يشترط لها العربية بل ذلك سنة

المالكية: قالوا: يشترط في الخطبة ان تكون باللغة العربية، ولو كان القوم عجماً لايعرفونها، فان لم يوجد فيهم من يحسن اللغة العربية بحيث يؤدي الخطبة بها سقطت عنهم الجمعة.

(۳۴۰) خطبہ میں طہارت شرط نہیں

سوال　ہمارے امام صاحب کچھ عرصے سے سلسل البول کے مرض میں مبتلا ہیں، اس سال عید کے روز لوگ دور دراز سے انکی تقریر سننے آئے تو امام صاحب نے کہا کہ میں معذور ہوں لہٰذا نماز کسی نے پڑھائی اور انہوں نے صرف خطبہ دیا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ معذور شخص خطبہ دے سکتا ہے؟ کیا خطبہ کیلئے طہارت ضروری ہے؟ نیز جو شخص خطبہ دیگا وہی نماز پڑھائیگا یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً　خطبہ کیلئے طہارت شرط نہیں بلکہ سنت ہے، اگر کوئی شخص بغیر طہارت کے خطبہ دیدے تو خطبہ تو ہو جائیگا لیکن مکروہ ہوگا، لہٰذا معذور شخص بوجہ کراہت کے صرف تقریر کرلے خطبہ نہ دے بلکہ خطبہ اور نماز کوئی اور پڑھا لے نیز خطبہ ایک شخص دے اور نماز دوسرا شخص پڑھا دے تو یہ بھی جائز ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ایک ہی شخص خطبہ بھی دے اور نماز بھی پڑھائے۔

لمافي الهندية (۱/۱۴۶): واماسننها فخمسة عشر احدها الطهارة حتى كرهت للمحدث والجنب.

وفيها ايضاً (۱/۱۴۷): ولا ينبغي ان يصلي غير الخطيب. والله اعلم بالصواب

(۳۴۱) خطبہ میں "السلطان المسلم الخ" کے الفاظ پڑھنے کی ابتداء اور شرعی حیثیت

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ خطیب خطبہ میں السلطان المسلم ظل الله في الارض من اهان سلطان الله في الارض اهانه الله کے الفاظ پڑھتے ہیں تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ یہ الفاظ کہیں سے ثابت نہیں، خلفاء راشدین کے بعد کے بادشاہوں کے گھڑے ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی عزت کرانے کیلئے خطبہ میں ان الفاظ کو شامل کیا ہے تو آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ان الفاظ کا ثبوت کہاں سے ہے، اور کب یہ خطبہ میں شامل کئے گئے نیز آج کل کے دور میں ان کا خطبہ میں پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ موجودہ دور کے حکمران ان کو اپنے حق میں سمجھتے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً   صورتِ مسئولہ میں مذکورہ الفاظ باوجود تلاش کے ہمیں کتبِ حدیث میں نہیں ملے بلکہ یہ مختلف احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں۔ ہمیں تتبع بسیار کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ الفاظ خطبہ میں کب شامل کئے گئے البتہ موجودہ دور میں بھی ان الفاظ حدیث کو خطیب خطبہ میں پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ ظالم اور جابر بادشاہ جس سے دین اسلام کو نقصان اور کفر کو فائدہ ہو رہا ہو تو وہ اس حدیث کا مصداق ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ اس حدیث کو اپنے حق میں مراد لے۔ چونکہ اہانت سے مراد جائز امور میں سلاطین کی نافرمانی کرنا ہے۔ لہٰذا ناجائز امور میں ان کی فرمانبرداری جائز ہی نہیں ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم (۲/۱۲۵): عن ابن عمر عن النبی ﷺ انه قال علی المرأ المسلم السمع والطاعة فیما أحب وکرہ الا أن یؤمر بمعصیة فاذا أمر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة.

وفی الجامع للامام الترمذی (۲/۴۴): عن زیاد بن کسیب العدوی قال کنت مع ابی بکرة تحت منبر ابن عامر وهو یخطب وعلیه ثیاب رقاق فقال ابو بلال انظروا الی امیرنا یلبس ثیاب الفساق فقال ابو بکرة اسکت فسمعت رسول الله ﷺ یقول من اهان سلطان الله فی الارض اهانه الله.

(۳۴۲) دورانِ خطبہ چندے کا حکم

سوال   کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خطبہ کے دوران چندہ مانگنا کیسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے، مسئلے کو وضاحت سے تحریر فرمائیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً   ...جب امام خطبہ شروع کردے تو تمام نمازیوں کو چاہئے کہ خاموشی کے ساتھ خطبہ سنیں کیونکہ خطبہ سننا واجب ہے اور خطبہ سننے میں خلل ڈالنے والے تمام کاموں سے اجتناب کریں کیونکہ دورانِ خطبہ ایسے کاموں کا کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا دورانِ خطبہ چندہ نہ کیا جائے کیونکہ اس سے خطبہ سننے میں خلل ہوگا۔ نیز اگر مسجد کیلئے چندہ کرنا ہو تو خطبہ سے پہلے یا نماز کے بعد کیا جائے البتہ اگر لوگوں کا مسجد میں جمع ہونا وقتِ خطبہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں ممکن نہ ہو اور مسجد کیلئے چندہ کی بھی اشد ضرورت ہو تو ایسی صورت میں دورانِ خطبہ چندہ کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ خطبہ سننے میں خلل نہ ہو۔

لما فی الترمذی (۱/۱۱۴): عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال من قال یوم الجمعة والامام یخطب انصت فقد لغا.

وفی سنن ابی داؤد (۱/۱۵۹): عن ابی الزاهریة قال کنا مع عبد الله بن بسر صاحب النبی ﷺ یوم الجمعة فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبد الله بن بسر جاء رجل یتخطی رقاب الناس یوم الجمعة والنبی ﷺ یخطب فقال له النبی ﷺ اجلس فقد آذیت.

وفی سنن النسائی (۱/۱۵۸): (باب حث الامام علی الصدقة یوم الجمعة فی خطبته) عن عیاض بن

عبداللہ قال سمعت ابا سعید الخدری (رضی اللہ عنہ) یقول جاء رجل یوم الجمعة والنبی ﷺ یخطب بهیأة بذّة فقال له رسول اللہ ﷺ اصلیت قال لا قال صل رکعتین وحث الناس علی الصدقة فالقوا ثیاباً فاعطاه منها ثوبین فلما کانت الجمعة الثانیة جاء ورسول اللہ ﷺ یخطب فحث الناس علی الصدقة فالقی احد ثوبیه فقال رسول اللہ ﷺ جاء هذا یوم الجمعة بهیأة بذّة فامرت الناس بالصدقة فالقوا ثیاباً فامرت له منها بثوبین ثم جاء الآن فامرت الناس بالصدقة فالقی احدهما فانتهره وقال خذ ثوبک۔

وفی حاشیته (قوله صل رکعتین) قیل امره لیری الناس هیئته فیترحمون علیه لکن مقتضی السوال بقوله اصلیت الخ انه ماقصد بالامر ذلک ثم کلامه ﷺ وکذا کلام المجیب لیس من باب الکلام حالة الخطبة فلا یشمله النهی لان الامام اذا شرع فی الکلام فما بقیت الخطبة تلک الساعة کذا قال السندی قلت والظاهر انه ﷺ امره لیری الناس هیئته یدل علیه حثه ﷺ بالصدقة۔

(۳۳۳) خطبہ جمعہ کے علاوہ اس سے پہلے کی جانے والی تقریر کی شرعی حیثیت

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جمعہ کے دن بہت سے ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ پہلے ایک شخص منبر کے علاوہ دوسری جگہ کھڑا ہو کر خطبہ دیتا ہے یہ خطبہ اسلامی احکام کے بجائے عام طور پر وہاں کے مسلمانوں کے مسئلے مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ میں دنیاوی باتیں کی جائیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمیشہ دنیاوی باتیں بھی مسجدوں میں زیر بحث آتی رہی ہیں جب پہلا شخص تقریر ختم کرتا ہے تو دوسرا شخص جو امام ہوتا ہے وہ بھی خطبہ دیتا ہے اور نماز پڑھاتا ہے یہ عام طور پر امریکہ کینیڈا اور یورپ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی کسی حد تک یہ طریقہ رائج ہے مگر یہاں عام طور پر امام نہیں بدلتا ہے شرعی حکم بتا کر ممنون فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرا

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ جمعہ کا خطبہ واجبہ اصالۃً تو وہی عربی خطبہ ہے جو کہ دوسری اذان کے متصل بعد دیا جاتا ہے اور اسی خطبہ کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس میں دنیاوی باتیں اور نماز جائز نہیں ہے البتہ عرب ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک میں چونکہ لوگ عربی کو نہیں سمجھتے اور خطبہ کا ایک مقصد وعظ ونصیحت بھی ہے لہٰذا اگر پہلی اذان کے بعد مقامی زبان میں بیان کیا جائے اور وعظ ونصیحت کیا جائے تو یہ جائز ہے جیسا کہ بعض صحابہ سے ثابت ہے۔

لما فی المستدرک علی الصحیحین (۱/۱۹۰): اخبرنا احمد بن سلمان الفقیه ...... کان ابوہریرةؓ یقوم یوم الجمعة الی جانب المنبر فیطرح اعقاب نعلیه فی ذراعیه ثم یقبض علی رمانة المنبر یقول قال ابو القاسم ﷺ قال محمد ﷺ قال رسول اللہ قال الصادق المصدوق ﷺ ثم یقول فی بعض

ذلك، ويبين للقرب من طريقه الغرب إذا سمع حركة باب المقصورة بخروج الإمام جلس.

وفي المصنف لعبد الرزاق (٣/ ٢٠٥): عبد الرزاق عن معمر عن الزهري قال أول من قص تميم الداري على عهد عمر استأذنه في كل جمعة مقاماً فأذن له فكان يقوم قال: ثم استزاده مقاماً آخر فزاده، فلما كان عثمان استزاده مقاماً آخر فكان يقص في الجمعة ثلاث مرات قال معمر وسمعت غير الزهري يقول كان عمر إذا مر به وهو يقص أمر على حلقه السيف

(۳۲۴) جمعہ کی تقریر اگر جمعہ کی سنتوں میں مخل ہو تو سنتوں کو کب ادا کیا جائیگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور نماز جمعہ فیکٹری میں واقع جامع مسجد میں ادا کرتا ہے۔ نماز جمعہ کو کھانے کے وقت ایک بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ جبکہ نماز جمعہ کی جماعت ایک بج کر پچیس منٹ پر کھڑی ہوتی ہے۔ زید پہلے کھانا کھاتا ہے اور پھر مسجد میں نماز پڑھنے آ جاتا ہے۔ اس وقت سوا ایک بج رہا ہوتا ہے یا ایک بج کر بیس منٹ ہو رہے ہوتے ہیں۔ مسجد میں امام صاحب تقریر جو کہ ایک بجے شروع کر چکے ہوتے ہیں۔ اب زید سنت جمعہ جب ادا کرتا ہے تو جمعہ کی تقریر سنت میں مخل ہوتی ہے اور سنت پڑھنے میں تشویش کا سامنا ہوتا ہے۔ تو کیا زید سنت جمعہ دوران تقریر ادا کرے یا بعد جمعہ ادا کرے؟

وضاحت: سنت نہ پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ تقریر ایک بجے شروع ہو جاتی ہے اور بعد میں وقت کی تنگی کی وجہ سے سنت ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت دیا جاتا ہو تو تقریر کے بعد سنت ادا کرے اور یہی طریقہ بہتر ہے۔ اس لئے امام کو چاہئے کہ تقریر کے بعد سنت ادا کرنے کا وقت دیا کریں اور سنت میں خلل واقع ہونے یا سنت میں تاخیر کی وجہ سے امام گنہگار ہوگا۔ اور مقتدیوں کو چاہئے کہ اس بات کی سعادت کریں۔ اور اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت نہ ہو تو پھر مسجد سے باہر کسی جگہ میں سنت ادا کرے تاکہ سنت میں خلل واقع نہ ہو اور اگر کوئی جگہ بھی نہ ہو کہ وہاں آرام سے سنتیں ادا کی جائیں تو پھر سنتیں تقریر کے دوران مسجد ہی میں پڑھی جا سکیں۔

كما في الشامية (١/ ٤٧٣): وتاركها يستوجب إساءة: أي التضليل واللوم. وفي التلويح ترك السنة المؤكدة قريب من الحرام. وهذا يرفق بأن مرادهم بالكراهة التحريمية. قلت: لكن كونه سنة مؤكدة لا يستلزم الإثم بتركه مرة واحدة بلا عذر فيتعين تقييد الترك بالاعتياد والإصرار توفيقاً بين كلامهم. كما قدمناه.

(۳۲۵) آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے دورِ حاضر میں جمعہ کی شرائط

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا علاقہ جماعت تبلیغ کا مرکز ہے اور علاقہ

انتظامات سندھ و بلوچستان تشکیل ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ جماعت جب وہاں پہنچتی ہے تو اگر کوئی عالم صاحب جماعت میں ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ جمعہ پڑھاؤ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہاں تو شرائط ہی پوری نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ

(۱)۔ ہم نے پوچھا ہے مفتیوں سے کہ جہاں پہلے سے (پاک وہند کی تقسیم سے پہلے سے یا بعد میں بھی) جمعہ شروع ہو چکا ہے وہاں جمعہ بند نہ کیا جائے اور نئی جگہ جہاں شرائط نہ ہوں وہاں شروع نہ کیا جائے۔ گاؤں کے لوگ پورا ہفتہ نمازوں کیلئے نہیں آتے صرف ایک دن جمعہ کے عنوان سے آتے ہیں اگر جمعہ بند ہو گیا تو یہ اس دن بھی نہ آئیں گے۔ اس بہانے چلو مسجد میں آ تو جاتے ہیں اور خطبہ سے پہلے بیان بھی سن لیتے ہیں شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔ چلو نماز جمعہ نہ ہوتی ہو۔ اگر ظہر پڑھیں تو بھی وہ نہ آئیں گے۔ جمعہ میں فائدہ ہی ہے نا۔ گاؤں والے یہ دلائل بیان کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں کہ وہاں جماعت والے کیا کریں ان کو سمجھائیں تو مقامی علماء جن کا فتویٰ ان کے پاس ہے اس سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور اگر پڑھائیں تو کیسے؟ آپ سے راہنمائی طلب کی جاتی ہے۔

(۲)۔ اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے کیا ہیں؟

(۳)۔ کیا جمعہ کی شرائط میں موجودہ دور میں بھی سلطان اور قاضی کی شرط ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ موجودہ دور میں تو ناظم، نائب ناظم وغیرہ ہوتے ہیں۔

(۴)۔ جمعہ سلطان قائم کرتا ہے جبکہ آج کل تو امام مسجد ہی پڑھاتے ہیں۔ آپ پورے مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً جمعہ کے درست ہونے کیلئے شہر یا قصبہ ہونا ضروری ہے جس میں تمام ضروریات اصلیہ پورے ہوں وہاں گلی کوچے ہوں محلے ہوں، ضروریات ہمیشہ میسر ہوں۔ تعلیم، ڈاکٹر ہو، ڈاکخانہ ہو، عدالت یا پنچایت کا انتظام ہو، ضروری پیشہ ور موجود ہوں۔ مذکورہ سہولیات جتنی تعداد کی آبادی میں میسر ہوں وہاں جمعہ درست ہے تعداد کی متعین مقدار منقول نہیں ہے۔

(۱)۔ لہٰذا جہاں ان شرائط کے فقدان کے باوجود جمعہ شروع کیا گیا وہاں نماز جمعہ ادا نہیں ہوگی بلکہ ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے اور صرف انتشار کے خوف سے یا یہ کہ لوگ پھر مسجد آنا چھوڑ دیں گے جمعہ جاری رکھنا درست نہیں بلکہ لوگوں کو حکمت و مصلحت سے سمجھائیں اور ظہر کی نماز پڑھنے کیلئے تیار کریں۔

(۲)۔ اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے وہی ہیں جو کہ اوپر مذکور ہیں۔

(۳)۔ جمعہ کی شرائط میں سلطان اور قاضی کی جو شرط رکھی گئی تھی وہ دفع منازعت کیلئے تھی لیکن اگر سلطان اور قاضی ان امور میں سستی سے کام لیتے ہیں جیسا کہ آج کل ہے تو پھر لوگ جس امام پر متفق ہو جائیں وہی نماز جمعہ پڑھائے اور سلطان یا قاضی کی اجازت ضروری نہیں۔

(۴)۔ آج کل کے حکمران چونکہ دینی امور میں سستی سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان میں امامت کی شرائط نہیں پائی جاتیں لہٰذا امام مسجد ہی نماز جمعہ پڑھائے۔

لما في احكام القرآن للجصاص (۳/۵۴۴): اتفق فقهاء الأمصار على أن الجمعة مخصوصة بموضع لا يجوز فعلها في غيره لأنهم مجمعون على أن الجمعة لا تجوز في البوادي ومناهل الأعراب فقال

أصحابنا هي مخصوصة بالأمصار ولا تصح في السواد قال أبو بكر روى عن النبي ﷺ أنه قال لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع وروى عن علي مثله وأيضاً لو كانت الجمعة جائزة في القرى لورد النقل به متواترا كوروده في الأمصار لعموم الحاجة إليه وأيضاً لما اتفقوا على امتناع جوازها في البوادي لأنها ليست بمصر وجب مثله في السواد وروى أنه قيل للحسن أن الحجاج أقام الجمعة بالأهواز فقال لعن الله الحجاج يترك الجمعة في الأمصار ويقيمها في حلاقيم البلاد.

وفي الفقه النافع (١/٢٤٣): لاتصح الجمعة إلا في مصر جامع للحديث لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصر جامع ويجوز في مصلى المصر لإتصاله به ولا يجوز في القرى ولا تجوز إقامتها إلا للسلطان أو من أمره السلطان لأن كل واحد يقدم أو يقدم رجلا فيؤدي إلى المنازعة المبطلة للجمعة.

وفي الشامية (٢/١٣٨): وعبارة القهستاني تقع فرضاً في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها أسواق وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما في المضمرات والظاهر أنه أريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة الا ترى أن في الجواهر لو صلوا في القرى لزمهم أداء الظهر.

وفي الدر المختار مع الشامية (٢/١٤٣): (ونصب العامة) الخطيب (غير معتبر مع وجود من ذكر) أما مع عدمهم فيجوز للضرورة. وفي الشامي تحت (قوله فيجوز للضرورة) ومثله مالو منع السلطان أهل مصر أن يجمعوا إضرارا وتعنتا فلهم أن يجمعوا على رجل يصلي بهم الجمعة.

وفي الشامية تحته: (قوله مالو منع السلطان الخ) ونقل شيخنا عن عقد اللآلي أنه لو تعذر الاستئذان من السلطان كما في هذا الزمان من عدم إلتفات السلاطين لمثل تلك الأمور فاجتمعت الناس على شخص ليصلي بهم جاز

(۳۳۶) گاؤں میں ۴۰، ۵۰ سال سے جاری جمعہ موقوف کرنے پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو کیا کرے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں صوبہ سرحد ضلع کوہاٹ کے نواح میں پہاڑی پر واقع ہے جس کی آبادی تقریباً 1500 نفوس تک پہنچ گئی ہے جس میں ضروریات زندگی کیلئے چودہ دکانیں، ایک میڈیکل کلینک، ایک سبزی کی اور ساتھ ہی ایک ٹیلرز کی دوکان بھی ہے۔ تین مسجدیں ہیں جن میں سے دو میں نمازیں ہوتی ہیں اور ایک بالکل ویران ہے۔ اور گاؤں میں گاڑیوں کی سہولت کے ساتھ فونوں کی سہولت بھی میسر ہے اور اس کے علاوہ آٹے کی مشینیں بھی موجود ہیں اور ان تمام سہولتوں کے

باوجود اکثر ضروریات زندگی کیلئے شہر جانا پڑتا ہے اور بڑے مریضوں کو شہر لے جایا جاتا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس گاؤں میں تقریباً ۴۰۔۵۰ سال سے جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں آیا اس گاؤں میں جمعہ کی نماز کے بارے میں کیا حکم ہے ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض مفتیان صاحبان نے عدم جواز کا حکم دیا ہے جبکہ اس کے روکنے میں فتنہ اور فساد کا قوی اندیشہ ہے اس لئے کہ اس گاؤں میں فرقۂ مخالف کے لوگ (یعنی بریلوی حضرات) موجود ہیں اگر اس کو روکا جائے اگرچہ روکنا ممکن نہیں لیکن بالفرض پھر بھی اگر روکا جائے تو فرقۂ مخالف والے اپنی مسجد میں جمعہ شروع کریں گے جس سے مزید فتنہ اور فساد پھیلنے کا سخت اندیشہ ہے، اس کا خیال رکھتے ہوئے اس مذکورہ مسئلے کا تفصیلی جواب ارسال کر کے احسان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً (۱)۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ جگہ جہاں نماز جمعہ ادا کی جاری ہے شہر ہو، اور شہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہزاروں کے لگ بھگ لوگ بستے ہوں مختلف محلے اور بازار ہوں ضروریات زندگی کو پورا کرنے کیلئے سہولیات میسر ہوں، لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ اس جگہ پر جہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے شہر کی تعریف صادق نہیں آتی جیسا کہ سوال سے واضح ہے۔ اس لئے وہاں جمعہ کی نماز از روئے فقہ حنفی جائز نہیں ہے۔

(۲) اگر نماز جمعہ کی ادائیگی سے روکنے میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہو تو اس صورت میں حکومت وقت یا اس کے نائب سے اجازت لے کر نماز جمعہ کی ادائیگی جائز ہو جائے گی۔

لما فی المصنف لعبد الرزاق (۳/۱۶۷): عن الحارث عن علی قال: لا جمعة ولا تشريق الا فی مصر جامع.

وفی الدر المختار (۲/۱۳۸): وفی القهستانی: اذن الحاكم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقاً علی ماقاله السرخسی واذا اتصل به الحكم صار مجمعاً عليه فليحفظ.

(۳۴۷) چھوٹی بستی میں قائم نماز جمعہ کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں تقریباً پندرہ بیس سال سے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً بالغ افراد ۳۵۰ ہوں گے اور ۱۱۰ گھر ہیں۔ اور دو دکانیں ایک پی سی او، ایک میڈیکل اسٹور اور پن چکی ہیں، نیز لڑکوں کا ہائی اسکول اور لڑکیوں کا مڈل اسکول بھی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ۔

(۱)۔ کیا مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲)۔ بصورت عدم جواز کیا اس نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کرنا درست ہے یا منع نہ کیا جائے۔ جبکہ اس ممانعت میں لوگوں کے انتشار کا خوف اور اندیشہ ہو۔ تو کیا ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست ہے یا نہیں؟

(۳)۔ بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کفایت المفتی وغیرہ میں توسع سے کام لیا ہے۔ تو کیا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست

ہے؟ ایسی صورت میں چند خرابیاں لازم آتی ہیں جیسے کہ احسن الفتاوی میں مذکور ہیں۔

۱) نفل کی جماعت کا التزام لازم آتا ہے۔ ۲) نفل نماز میں جہر۔ ۳) غیر لازم کا التزام۔ ۴) ترک جماعت نماز ظہر جبکہ جمعہ درست نہ ہو۔ ۵) اگر کوئی ظہر نہ پڑھے تو ترک فرض لازم آتا ہے جو کہ فسق ہے۔

نیز احتیاط الظہر ادا کرنا کیسا ہوگا جائز یا ناجائز؟ قرآن وسنت اور فقہ حنفی سے مدلل جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً جمعہ کے واجب ہونے کیلئے شہر کا ہونا شرط ہے، قصبات اور بڑی بستیاں بھی شہر کے حکم میں ہیں۔ قصبہ اور بڑی بستی کی فقہاء کرام نے مختلف علامات بیان کی ہیں۔ جیسا کہ حاشیہ میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

(۱)۔ صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کے گاؤں میں ان علامات میں سے کوئی علامت موجود نہیں ہے لہٰذا یہ بڑی بستی میں داخل نہیں ہے بلکہ قریہ صغیرہ (چھوٹی بستی) ہے اور چھوٹی بستی میں باتفاق فقہاء احناف جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ ادا کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر حاکم اجازت دے دے تو پھر جمعہ درست ہو سکتا ہے۔

(۲)۔ بحالت موجودہ جب جمعہ درست نہیں ہے تو لوگوں کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کیا جائے، دلیل یہ ہے کہ جمعہ کے ادا کرنے سے ظہر کی نماز ذمہ سے ساقط نہ ہوگی بلکہ ظہر کا ادا کرنا لازم ہوگا۔ ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست نہیں ہے اس لئے کہ مذہب غیر پر فتویٰ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور اس مسئلہ میں حنفیہ کو مذہب شوافع نقل کرنے کی فقہاء نے ضرورت نہیں دی۔

(۳)۔ اور کفایت المفتی میں جواز کے بارے میں توسع سے کام لینا حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ذاتی رائے اور تفرد ہے۔ حضرت کے علاوہ کسی نے بھی جواز کا قول نہیں کیا ہے بلکہ سب عدم جواز کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست نہیں ہے۔

رہا احتیاط الظہر کا مسئلہ! تو اس کا پڑھنا وہاں ہوتا ہے جہاں جمعہ کے جواز میں شہر وغیرہ ہونے یا نہ ہونے میں شک واقع ہو جائے اور وہاں کے لوگوں نے جمعہ قائم کرکے شروع کر دیا ہو، جبکہ یہاں پر یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا گاؤں شہر یا بڑی بستی نہیں ہے بلکہ چھوٹی بستی ہے لہٰذا ظہر کی نماز ہی پڑھی جائے گی۔

لما في الفقه النافع (۱/۲۴۲): لاتصح الجمعة الا في مصر جامع للحديث: ((لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحى الا في مصر جامع)) ويجوز في مصلى المصر لاتصاله به ولا يجوز في القرى.

وفي بدائع الصنائع (۱/۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰): اما المصر الجامع: فشرط وجوب الجمعة، وشرط صحة ادائها عند اصحابنا ... فلا تجب على اهل القرى التي ليست من توابع المصر، ولا يصح اداء الجمعة فيها ... (ص۱۸۹) اما المصر الجامع: فقد اختلفت الاقاويل في تحديده. ذكر الكرخي ان المصر الجامع ما اقيمت فيه الحدود، ونفذت فيه الاحكام. وعن ابي يوسف روايات، ذكر في

"الاملاء": كل مصر فيه منبر وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود، فهو مصر جامع، تجب على اهله الجمعة. وفي رواية: قال: اذا اجتمع في قرية من لا يسعهم مسجد واحد، بنى لهم الامام جامعا، ونصب لهم من يصلي بهم الجمعة. وفي رواية: (ولو كان في القرية عشرة آلاف او اكثر، امرتهم باقامة الجمعة فيها) وقال بعض اصحابنا: المصر الجامع مايتعيش فيه كل محترف بحرفته من سنة الى سنة، من غير ان يحتاج الى الانتقال الى حرفة اخرى. وعن ابي عبدالله البلخي، انه قال: احسن ما قيل فيه: اذا كانوا بحال لو اجتمعوا في اكبر مساجدهم لم يسعهم ذلك، حتى احتاجوا الى بناء مسجد الجمعة، فهذا مصر تقام فيه الجمعة، وقال سفيان الثوري: المصر الجامع مايعده الناس مصرا عند ذكر الامصار المطلقة. وسئل ابو القاسم الصفار عن حد المصر الذي تجوز فيه الجمعة، فقال: ان تكون لهم منعة لو جاءهم عدو قدروا على دفعه، فحينئذ جاز ان يمصر، وتمصره ان ينصب فيه حاكم عدل يجري فيه حكما من الاحكام، وهو ان يتقدم اليه خصمان فيحكم بينهما، وروي عن ابي حنيفة رحمه الله: انه بلدة كبيرة، فيها سكك واسواق، ولها رساتيق، وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره، والناس يرجعون اليه في الحوادث، وهو الاصح.

وفي الدر المختار (۲/۱۳۷): (ويشترط لصحتها) سبعة اشياء: الاول: (المصر وهو ما لا يسع اكبر مساجده اهله المكلفين بها) وعليه فتوى اكثر الفقهاء، مجتبى لظهور التواني في الاحكام. وظاهر المذهب انه كل موضع له امير وقاض يقدر على اقامة الحدود كما حررناه فيما علقناه على الملتقى. وفي القهستاني: اذن الحاكم ببناء الجامع في الرستاق اذن بالجمعة اتفاقا على ما قاله السرخسي واذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه فليحفظ. وقال العلامة ابن عابدين الشامي رحمه الله تحته (قوله وفي القهستاني الخ) تأييد للمتن. وعبارة القهستاني تقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالي او القاضي ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فيه فاذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه. وفيما ذكرنا اشارة الى انه لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما في المضمرات والظاهر انه اريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة، الا ترى ان في الجواهر لو صلوا في القرى لزمهم اداء الظهر الخ

وفي الصفحة ۱۳۵ من باب الجمعة: فيصلي بعدها اخر ظهر وكل ذلك خلاف المذهب، فلا يعول عليه كما حرره في البحر. وقال العلامة الشامي تحته (قوله فيصلي بعدها اخر ظهر). وقال في البحر: انه لا احتياط في فعلها لانه العمل باقوى الدليلين اهـ اقول: وفيه نظر بل هو الاحتياط

بمعنی الخروج عن العهدة بيقين لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوى دليلا، لكن فيه شبهة قوية لان خلافه مروی عن ابی حنیفة ایضا (ص ۱۳۱) نعم ان ادى الى مفسدة لاتفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال المقدسی نحن لانامر بذلک امثال هذه العوام بل ندل عليه الخواص ولو بالنسبة اليهم اهـ. والله تعالیٰ اعلم

(۳۲۸) گاؤں میں نمازِ جمعہ درست نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جواز صلوٰۃ الجمعہ کے بارے میں درج ذیل صفات سے متصف بستی کان مہترزئی جو کہ پہاڑ کے دامن میں کوئٹہ ژوب شاہراہ پر واقع ہے بلوچستان کے سرد ترین علاقوں میں سے ہے اور سردیوں میں کافی برف باری ہوتی ہے۔ قریہ ہذا تقریبا ایک مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ہے۔ جس میں کل ۲۹۳ گھر جن میں ۱۶ مساجد ہیں۔ اور گاؤں کے وسط میں ایک بڑی پکی مسجد جس کی لمبائی ۱۱۰ فٹ اور چوڑائی ۴۵ فٹ سے تعمیر کی گئی ہے۔ اور اس میں بالغ مردوں کی تعداد ۱۳۵۰، بالغ عورتیں ۱۳۷۵ اور نابالغ بچوں کی تعداد ۲۲۸۵ ہے۔ کہیں کہیں گھروں میں اتصال اور گلیاں موجود ہیں۔ لیکن اکثر جگہوں پر گلیاں اور بیچ میں باغات اور زیر کاشت رقبہ گھروں کے درمیان فاصل بن رہی ہے۔ دو تین گھروں کے علاوہ تمام مکانات کچی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ چند دوسرے گھروں کے مکانوں کی چھت گارڈر کی چادر اور باقی مکانوں کی چھت جڑی بوٹیوں کی بنی ہوئی ہے۔ اراضی کے سیرابی باغات کیلئے ایک قدرتی چشمہ بہتا ہے۔ جس کے پانی کے لئے نالیاں بستی کے وسط تک پکی بنائی گئی ہیں۔ اور اس کے علاوہ دو سو سے زائد ٹیوب ویل بھی سیرابی باغات کیلئے مصروف عمل ہیں۔ بستی میں تین دینی مدارس ہیں جن میں مقامی اور باہر کے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ لڑکوں کی عصری تعلیم کیلئے ایک ہائی اسکول اور دو پرائمری اسکول ہیں۔ جبکہ لڑکیوں کیلئے ایک ہائی اسکول اور تین پرائمری گرلز اسکول ہیں۔ اور عوامی سہولت کیلئے ایک بڑا ڈیجیٹل سسٹم ایکسچینج ہے جس سے تین سو کے قریب ٹیلیفون کنکشن لگے ہوئے ہیں۔ صحت کیلئے ایک ڈسپنسری بنائی گئی ہے۔ جس میں ایک مستند ایم بی بی ایس ڈاکٹر ایک LHV اور ڈسپنسر کام پر مامور ہیں۔ یہاں ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام نہیں اس لئے وہ ۲۵ کلومیٹر سے روزانہ آتا جاتا ہے۔ اور ایمبولینس بھی ساتھ رکھتا ہے لیکن ادویات کے فقدان کی وجہ سے لوگ اس سے استفادہ نہیں کرتے ہیں۔ بستی کے باشندوں کی ضروریات کیلئے آبنوشی سکیم کے تحت تین ٹیوب ویل حکومت کی طرف سے لگے ہوئے ہیں جو کہ اب معطل ہیں۔ بستی کے اندر پانچ سے زائد میڈیکل اسٹور ہیں جن میں ڈسپنسر لوگوں کے معمولی علاج معالجے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ اور ادویات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پانچ دوکانیں گوشت کی اور تقریبا دس سے زائد سبزی فروش موجود ہیں ایک تنور کا مالک اور پانچ درزی کی دکانیں اور تین الیکٹرک سٹورز ہیں جبکہ پانچ سے زائد گیس سلنڈر میں لاکر فروخت کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ کل تقریبا ۴۵ سے زائد دکانیں جن میں اشیائے ضرورت ملتی ہیں علاوہ ازیں بستی میں متفرق جگہوں پر عوام کی ضروریات کیلئے ۱۵ دکانیں اور ایک جنرل اسٹور اور تین آٹا فروشی کی دکانیں موجود ہے۔ جن میں دو سابق راشن ڈپو رہ چکے ہیں۔ لیکن مکمل ضروریات پورا کرنے کیلئے

وہ اور بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔ نیز آٹھ، دو حمام، موٹر سائیکل مرمت، ویلڈنگ، الیکٹریکل کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور کپڑے کی دو دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور پیٹرول، ڈیزل کے تقریباً پانچ پمپ موجود ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک بیکری اور دو چائے کے ہوٹل مستقل موجود ہیں۔ اور تین پی سی او موجود ہیں۔ جنوباً آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر قومی شاہراہ گزرتی ہے۔ جس پر موسم گرما میں لوگوں کی ضروریات کیلئے عارضی طور پر کریٹ گودام اور فروٹ کی ترسیلی کمپنیاں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ چند ہوٹل اور تندور بھی کھل جاتے ہیں۔ اور یہ چھ مہینے تک تقریباً کھلے رہتے ہیں۔ بستی سے ضرورت آمد و رفت قومی شاہراہ سے بستی کی طرف مختلف فاصلوں پر کچی اور پکی سڑکیں جاتی ہیں۔ جن میں دو مستقل اور تین سیلاب نہ ہونے کی صورت میں سیلابی ندیاں بطور سڑک استعمال کی جاتی ہیں۔ نیشنل ہائی وے پر گاؤں کے زرعی آبادی کے متصل ایک لیویز تھانہ جو مذکورہ گاؤں کے نام سے موسوم ہے (اور پولیس تھانہ نہیں ہے) جو روڈ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ لڑائی جھگڑے کی صورت میں گاؤں میں مداخلت کرتے ہیں۔ اور روڈ کے حفاظت کیلئے ایک اور لیویز چوکی موجود ہے اور یہ حکومت کو مطلع کرتی ہیں اور مذکورہ بستی سے روزانہ ایک بس اور دو ویگن کوئٹہ جاتی ہیں اور متعدد کار اور موٹر قریبی بازاروں میں جاتے ہیں۔ البتہ حکومت کی طرف سے عوام کے درمیان کوئی انصاف دار شخصیت نہیں اور اسی گاؤں کے علماء اور ملک و سردار یہ معاملے حل کرتے ہیں۔ یا پچیس کلومیٹر دور بازار جاتے ہیں۔ اور مذکورہ بستی میں ڈاکخانہ نہیں۔ دھوبی نہیں بزاز نہیں اور کسی نام سے موسوم گلی کوچے نہیں البتہ عرف میں کان مہترزئی ایک بڑے گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ اور آس پاس کے لوگ بھی ضروریات کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن حکومت کی طرف سے اس کو شہر یا قصبہ نہیں کہا جاتا اور بعض پیشے والے لوگ جیسے موچی، لوہار، ترکھان وغیرہ سال بھر کا گزارہ اپنے پیشے پر نہیں کر سکتے اس لئے وہ اور طرح کی محنت میں بھی مشغول ہوتے ہیں۔ اور صنعت و حرفت کیلئے بھی کام شروع ہے۔ اور مسافر خانہ نہیں، مستقل ہوٹل کھانے کا نہیں، پولیس تھانہ نہیں۔ لہٰذا مذکورہ تفصیل کے مطابق بستی مذکورہ کان مہترزئی میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ بستی کا شمار شرعی قریہ کبریٰ ہے یا صغریٰ؟

الجواب حامداً ومصلیاً — جمعہ قائم کرنے کی شرائط میں سے شہر یا بڑی بستی (جس میں گلیاں، عدالت، حکومت کی طرف سے قاضی، مستقل پولیس تھانہ، بازار، محلے، ڈاکخانہ، حکیم یا ڈاکٹر، اور لوگوں کی تمام ضروریات زندگی سہولت کے ساتھ میسر ہوں) کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بستی کان مہترزئی کا شمار بڑی بستی میں مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر نہیں ہو سکتا اور وہ یہ ہیں کہ (۱) اکثر جگہوں میں گلیاں نہیں ہیں۔ (۲) عدالت نہیں ہے۔ (۳) حکومت کی طرف سے کوئی قاضی مقرر نہیں ہے۔ (۴) مستقل پولیس تھانہ نہیں ہے۔ (۵) بازار، محلے، ڈاکخانہ اور حکیم یا ڈاکٹر اس طور پر نہیں ہیں کہ ان سے لوگوں کی ضروریات سہولت کے ساتھ پوری ہو جائیں نیز ادویات کی فراہمی اور اس جیسی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ اور یہ ساری وجوہات ضرورت اصلیہ میں شامل ہیں۔ اسی بناء پر یہاں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔

لما في مصنف عبدالرزاق (۱۶۷/۳): عن علي رضي الله تعالىٰ عنه قال: لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع.

وفي الفتاوى التاتارخانية (۲/۳۰۹): ظاهر المذهب ان المصر الجامع ان يكون فيه جماعات الناس وجوامع واسواق للتجارات وسلطان وقاض يقيم الحدود وينفذ الاحكام وروى عن ابي حنيفة رحمه الله تعالى وهو بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غيره ويرجع الناس اليه فيما وقع لهم من الحوادث وهذا هو الاصح.

وفي الشامية (۲/۱۳۷): "قوله وظاهر المذهب" قال في شرح المنية والحد الصحيح ما اختاره صاحب الهداية انه الذي له امير وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود عن ابي حنيفة رحمه الله تعالى انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الاصح.

وفيه ايضاً (۲/۱۳۸): قوله وفي القهستاني المخ تأييد للمتن وعبارة القهستاني تقع فرضاً في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالي او القاضي ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فيه فاذا اتصل به الحكم صار مجمعاً عليه وفيما ذكرنا اشارة الى انه لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما في المضمرات والظاهر انه اريد به الكراهة الا ترى ان في الجواهر لو صلوا في القرى لزمهم اداء الظهر وهذا اذا لم يتصل به حكم وفي (صفحة ۱۳۹) فقد نص الائمة على ان الفناء ما اعد لدفن الموتى وحوائج المصر كركض الخيل والدواب وجمع العساكر والخروج للرمي وغير ذلك واى موضع يحد بمسافة يسع عساكر مصر ويصلح ميداناً للخيل والفرسان ورمي النبل والبندق البارود واختبار المدافع فظهر ان التحديد بحسب الامصار وقد جزم فيها بصحة الجمعة في مسجد سبيل علان الذي بناه بعض امراء زمانه وهو في فناء مصر بينه وبينها نحو ثلاثة ارباع فرسخ ونحو.

وفي الموسوعة الفقهية (۳۳/۱۹۱): المصر في اللغة اسم لكل بلد محصور اى محدود تقام فيها الدور والاسواق والمدارس وغيرها من المرافق العامة ويقسم فيها الفئ والصدقات واختلفوا في معناها الاصطلاحي، فعن ابي حنيفة رحمه الله تعالى ان المصر بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره والناس يرجعون اليه في الحوادث الخ وقال القليوبي المصر العمارة المجتمعة الذى فيه حاكم شرعي

وشرطی واسواق للمعاملات والمصر اعظم من القریۃ۔

(۳۴۹) جس عذر کی وجہ سے نمازِ جمعہ ترک کرنا جائز نہیں

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر بجلی وغیرہ کے بل کی آخری تاریخ آجائے اور دن جمعہ کا ہو، اور بل بھرنے کی قطار بھی کافی طویل ہو، اور جمعہ کی نماز پڑھنے جانے کی صورت میں نمبر نکل جانے اور پھر کافی مشقت کا سامنا کرنے کا اندیشہ ہو تو اس عذر کی بناء پر جمعہ کی نماز چھوڑنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... نمازِ جمعہ ہر اس مسلمان مرد پر فرض ہے جس میں چند شرائط موجود ہوں، آزاد ہونا، مقیم ہونا، تندرست ہونا، خوف کا نہ ہونا، اس لئے صورتِ مسئولہ میں نمازِ جمعہ مذکورہ عذر کی وجہ سے چھوڑنا جائز نہیں۔

لما فی الطحطاوی علی الدر (۱/۳۳۵): (قولہ فلا یکرہ) ای صلوٰۃ الظہر واما تفویت الجمعۃ فحرام، بحر:

وفی رد المحتار (۲/۱۵۵): (قولہ وحرم الخ) عدل عن قول القدوری والکنز وکرہ لقول ابن الھمام لابد من کون المراد حرم لانہ ترک الفرض القطعی باتفاقھم الذی ھو آکد من الظھر غیر ان الظھر تقع صحیحۃ وان کان مامورا بالاعراض عنھا. واجاب فی البحر بان الحرام ھو ترک السعی المفوت لھا . (قولہ فلا یکرہ) بل ھو فرض علیہ لفوات الجمعۃ قال فی البحر فنفس الصلوٰۃ غیر مکروھۃ وتفویت الجمعۃ حرام وھو مؤید لما قلنا. یعنی ان الکراھۃ لیست لذات الصلوٰۃ بل لخارج عنھا وھو کونھا سبباً لتفویت الجمعۃ بدلیل انہ لو صلاھا بعد فوت الجمعۃ لم یکرہ فعلھا بعدھا بل یجب.

(۳۵۰) عذر کی وجہ سے ایک مسجد میں دومرتبہ نمازِ جمعہ قائم کرنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز جو امریکہ میں ہیں ان سے بات ہوتی رہتی ہے، انہوں نے میری وساطت سے ایک مسئلہ آپ حضرات سے معلوم کرایا ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر ممالک میں مسجدیں جہاں بہت کم ہیں یا چھوٹی ہیں تو عام طور ان مسجدوں میں نماز دوبار ہوتی ہے جو تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے وقفے سے ہوتی ہے ایک مسجد میں دوبارہ نمازِ جمعہ وخطبہ کے بارے میں شرعی کیا حکم ہے؟ براہِ کرم مسئلہ کا جواب جلد سے جلد مرحمت فرما کر ممنون ہوں، تاکہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں یا غلط کرتے ہیں وہ صحیح مسئلہ سے واقف ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... جمہور حضرات فقہاء کے نزدیک مسجد کے اندر ایک نماز خواہ وہ جمعہ کی ہو یا کوئی اور اس کی جماعت ثانیہ مکروہ ہے۔ البتہ اگر کوئی مسجد جو کسی راستے وغیرہ پر واقع ہو یا وہ مسجد ایسی ہو، جس میں امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں تو ایسی مساجد میں تکرارِ جماعت جائز

ہے۔

ہاں اگر کوئی ایسا علاقہ ہے جہاں مساجد بہت کم ہیں یا بہت چھوٹی ہیں ان میں ایک ہی مرتبہ جماعت کرنا ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ دوسری جماعت کی صورت پہلی جماعت سے کچھ مختلف ہو۔ اس کی صورت یہ ہوگی پہلی جماعت جہاں ہوئی ہے دوسری جماعت اس سے ذرا ہٹ کر ادا کی جائے۔

لما في البدائع الصنائع (۱/۱۵۳): ولو صلى في مسجد باذان واقامة هل يكره أن يؤذن ويقام فيه ثانيا فهذا لا يخلو من احد وجهين، اما ان كان مسجداً له اهل معلوم او لم يكن فان كان له أهل معلوم فان صلّى فيه غير أهله باذان واقامة لا يكره لاهله ان يعيد والاذان والاقامة وان صلى فيه أهله باذان واقامة أو بعض اهله يكره لغير اهله وللباقين من اهله ان يعيد والاذان والاقامة. وان كان مسجداً ليس له اهله معلوم بان كان على شوارع الطريق لا يكره تكرار الاذان والاقامة.

ولنا ماروى عبدالرحمن ابن ابي بكرة رضي الله تعالى عنه عن ابيه ان رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار لتشاجر بينهم فرجع وقد صلى في المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ في منزل بعض اهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة ولو لم يكره تكرار الجماعة في المسجد لماترك كها رسول الله ﷺ مع علمه لفضل الجماعة في المسجد.

وروى انس بن مالک رضي الله تعالى عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة صلوا في المسجد فرادى ولان التكرار يؤدى الى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا انهم تفوتهم الجماعة فيستعجلون فتكثر الجماعة واذا علموا أنها لاتفوتهم يتأخرون فتقل الجماعة وتقليل الجماعة مكروه الخ.

وفي الشامية (۱/۳۹۵): (وتكرار الجماعة) لما روى عبدالرحمن بن ابي بكرة عن ابيه رضي الله تعالى عنهما "أن رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار فرجع وقد صلى في المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ في منزل بعض اهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة، ولو لم يكره تكرار الجماعة في المسجد لصلى فيه وروى عن أنس رضي الله عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة في المسجد صلوا في المسجد فرادى، ولان التكرار يؤدى إلى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر والا تأخروا. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ماصلى فيه أهله فانهم يصلون واحداناً وهو ظاهر الرواية الخ وعن ابي يوسف رحمه الله تعالى اذا لم تكن على الهيئة الاولى لاتكره والاتكره وهو الصحيح وبالعدول عن

المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية اهـ وفي التاتارخانية عن الولوالجية، وبه نأخذ اهـ.

وفيه ايضاً (۱/ ۵۵۲): (قوله ويكره) اى تحريما لقول الكافي لايجوز، والمجمع لايباح، وشرح الجامع الصغير إنه بدعة كما في رسالة السندي (قوله بأذان وإقامة الخ) عبارته في الخزائن: أجمع مما هنا ونصها: يكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان وإقامة، إلا اذا صلى بهما فيه أولا غير اهله او أهله لكن بمخافتة الاذان، ولو كرر أهله بدونهما او كان مسجد طريق جاز اجماعا، كما في مسجد ليس له امام ولامؤذن ويصلى الناس فيه فوجا فوجا، فان الافضل ان يصلى كل فريق بأذان واقامة على حدة كما في أمالي قاضيخان اهـ.

(۳۵۱) عیدین میں سجدہ سہو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم صاحب فرما رہے تھے کہ اگر عیدین کی زائد تکبیرات چھوٹ جائیں تو سجدہ سہو کرنا لازمی نہیں ہے حالانکہ میں نے سنا ہے کہ تکبیرات واجب ہیں اور واجب کے چھوٹ جانے کی وجہ سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہے تو کیا ان عالم کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیرات عیدین چونکہ واجب ہیں اس لئے ان کے چھوٹ جانے کی صورت میں سجدہ سہو واجب ہوتا ہے لیکن جمعہ وعیدین میں مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کرنے میں انتشار اور فتنہ کا خدشہ ہوتا ہے اس لئے متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک سجدہ سہو کرنا لازم نہیں، اور بظاہر عالم صاحب کی مراد بھی یہی معلوم ہوتی ہے تاہم اگر فتنہ اور انتشار کا خدشہ نہ ہو یا مجمع چھوٹا ہو تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا لازم ہوگا۔

لما في الهندية (۱/ ۱۲۸): ويستوى في الزيادة والنقصان القليل والكثير فقد روى عن الحسن عن ابي حنيفة رحمه الله اذا سها الإمام عن تكبيرة واحدة في صلاة العيد يسجد للسهو كذا في الذخيرة السهو في الجمعة والعيدين والمكتوبة والتطوع واحد إلا أن مشايخنا قالوا لايسجد للسهو في العيدين والجمعة لئلايقع الناس في فتنة.

وفي الدر المختار (۲/ ۹۲): (والسهو في صلاة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه في الأوليين لدفع الفتنة.

وفي الشامية (۲/ ۹۲): (قوله عدمه في الأوليين) الظاهر ان الجمع الكثير فيما سواهما كذلك كما بحثه بعضهم وكذا بحثه الرحمتي وقال خصوصاً في زماننا وفي جمعة حاشية ابي السعود عن العزمية انه ليس المراد عدم جوازه بل الاولى تركه لئلا يقع الناس في فتنة (قوله وبه جزم في الدرر)

لکن قیده محشیها الواقی بما اذا حضر جمع کثیر والا فلا داعی الی الترک.

(۳۵۲) شافعی امام کے پیچھے نماز عید کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز عید میں حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز عید پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ امام مواضع اختلاف میں حنفی مقتدی کے مذہب کی رعایت کرتا ہو۔

لما فی الهندیة(۱/۸۴): والاقتداء بشافعی المذهب انما یصح اذا کان الامام یتحامی مواضع الخلاف بان یتوضأ من الخارج النجس من غیر السبیلین کالفصد وان لا ینحرف عن القبلة انحرافاً فاحشاً... قال الفقیه یصح اقتداء الحنفی فی الوتر بمن یری مذهب ابی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالی.

وفی الشامیة(۲/۷): (قوله ان لم یتحقق الخ) فلو رآه احتجم ثم غاب فالاصح انه یصح الاقتداء به لانه یجوز ان یتوضأ احتیاطا وحسن الظن به اولی بحر عن الزاهدی (قوله کما بسطه فی البحر) حیث ذکر ان الحاصل انه ان علم الاحتیاط منه فی مذهبنا فلا کراهة فی الاقتداء به وان علم عدمه فلا صحة وان لم یعلم شیئاً کره.

(۳۵۳) خواتین کیلئے جمعہ کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خواتین جمعے کے دن مسجد میں آکر جمعہ کی نماز پڑھتی ہیں حالانکہ ان پر ظہر واجب ہے تو ان کا جمعہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے اور ان کی ظہر اس سے ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ...عورتوں کا نماز جمعہ کے لئے باہر جانا خوف فتنہ کی وجہ سے ناجائز ہے البتہ اگر انہوں نے نماز جمعہ باجماعت ادا کی تو ظہر ان سے ساقط ہو جائیگی۔

وفی خلاصة الفتاوی(۱/۲۱۳): ولا یخرج الشاب من النساء فی جمیع الصلوات واما العجوز فتخرج فی العیدین والفجر والعشاء ... وقد ذکرنا الجواب المختار فی زماننا انهن لا یخرجن.

وفی الهندیة(۱/۱۴۴، ۱۴۵): لاتجب الجمعة علی العبید والنسوان والمسافرین والمرضی کذا فی محیط السرخسی ...... ومن لا جمعة علیه ان اداها جاز عن فرض الوقت کذا فی الکنز.

(۳۵۴) عورتوں کیلئے عیدگاہ جانے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں چند سالوں سے غیر مقلدین آئے ہوئے ہیں پورے گاؤں کو خراب کررہے ہیں کافی لوگ ان کے چکر میں پھنس گئے ہیں اس مرتبہ انہوں نے عید نماز کیلئے اپنی عورتوں کو بھی عید نماز پڑھنے کا حکم دیا کہ جس طرح مردوں پر نماز عید واجب ہے اسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے اگر عورتیں نماز عید نہیں پڑھیں گی تو گناہگار ہوں گی کیا واقعی عورتوں پر نماز عید واجب ہے؟ اور عورتوں کے نماز عید کیلئے عیدگاہ جانے کا ثبوت کسی روایت سے ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً عید کی نماز مردوں پر واجب ہے عورتوں پر عید کی نماز واجب نہیں۔ رہی یہ بات کہ عورتوں کا عیدگاہ میں جانا تو اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ امن تھا اور کوئی فتنے کا خوف نہ تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مساجد اور عیدگاہ میں جانے کی اجازت دی تھی۔ بخاری وترمذی کی روایت ہے کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہمیں عیدگاہ جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جب فتنوں کا دور بڑھا تو عورتوں کو مساجد جانے سے روک دیا گیا اور گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب عورتوں کو مساجد جانے سے روکا تو عورتوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی تو حضرت عائشہ نے فرمایا اگر حضور علیہ الصلاۃ والسلام یہ جان لیتے جو عمرؓ کو معلوم ہے تو وہ تمہیں نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان حالات کو پالیتے جو آج عورتوں کے ساتھ پیش آرہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ضرور مسجد جانے سے منع فرمادیتے۔

بہرصورت مسئولہ میں نہ عورتوں پر عید کی نماز واجب ہے اور نہ ہی ان کا عیدگاہ جانا درست ہے۔

لمافی اعلاء السنن(۳/۲۱۱): عن ام سلمة رضی الله عنها قالت. قال رسول الله ﷺ: صلاة المرأة فی بیتها خیر من صلاتها فی حجرتها، وصلاتها فی حجرتها خیر من صلاتها فی دارها وصلاتها فی دارها خیر من صلاتها فی مسجد قومها.

وفی المحیط البرهانی(۲/۳۸۵): ولیس علی النساء خروج فی العیدین، وکان یرخص لهنّ فی ذالک. قال: وقال ابو حنیفة رحمه الله تعالیٰ: واما الیوم فانی أکره لهنّ ذلک، واکره لهنّ شهود الجمعة الخ.

وفیه ایضاً قال واعلم بانّ النساء امرن بالقرار فی البیوت، قال الله تعالیٰ "وقرن فی بیوتکن" ونهین عن الخروج، قال الله تعالیٰ: "ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولیٰ" الا انه ابیح لهن الخروج فی الابتداء الی الجماعات. لقوله علیه السلام "لاتمنعوا اماء الله مساجد الله ولیخرجن اذا خرجن تفلات" ای غیر متطیبات، ثم منعن بعد ذلک لمافی خروجهن من الفتنة. قال الله تعالیٰ "ولقد علمنا

المستقدمين منكم ولقد علمنا المستأخرين" قيل في تفسير الآية: نزلت في شأن الصفوف كان المنافقون يتأخرون حتى يطلعوا على عورات النساء، فنهي بعد ذالك. وقال النبي عليه الصلاة والسلام: صلاة المرأة في دارها أفضل من صلاتها في مسجد وصلاتها في بيتها افضل من صلاتها في دارها، وعن عمر رضي الله عنه انه نهى النساء عن الخروج إلى المساجد فشكون إلى عائشة رضي الله عنها، فقالت عائشة رضي الله تعالى عنها: لو علم النبي عليه الصلاة والسلام ما علمه عمر ما أذن لكن في الخروج

وفي الدر المختار (۱/۵۶۶): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيد ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (على المذهب) المفتى به لفساد الزمان.

وفي الشامي: (قوله على المذهب المفتى به) أي مذهب المتأخرين. قال في البحر: وقد يقال هذه الفتوى التي اعتمدها المتأخرون مخالفة لمذهب الإمام وصاحبيه، فإنهم نقلوا أن الشابة تمنع مطلقا

انتهى

(۳۵۵) تکبیراتِ تشریق مرد اور عورت دونوں پر واجب ہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حج کے مسائل کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ تکبیراتِ تشریق مرد و عورت دونوں کو پڑھنا چاہئے۔ اپنے امام صاحب سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دراصل اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک صرف مردوں پر ہی ہے البتہ آپ کسی مفتی صاحب سے اس اختلاف کو بھی اور فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی معلوم کریں۔ آنجناب سے پہلے بھی کئی مسائل کے سلسلے میں رجوع کر چکا ہوں امید ہے مہربانی فرما کر اسے ذرا وضاحت و تفصیل سے لکھ دیں نیز فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی بتادیں بندہ آپ کا بہت ممنون ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً: تکبیرات تشریق کس پر واجب ہے؟ اس میں امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ) کی صبح سے عید (دسویں ذی الحجہ) کے عصر تک ایک دفعہ تکبیر تشریق کہنا ہر مرد، عاقل، مقیم، آزاد اور شہر میں رہنے والے پر جس نے فرض نماز جماعت کے ساتھ پڑھی ہو، پر واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق عورت، بچے، مجنون، مسافر اور دیہات میں رہنے والے پر اور اس شخص پر جس نے نفل نماز یا فرض نماز اکیلے پڑھی ہو تکبیر تشریق پڑھنا واجب نہیں ہے۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک ۹ ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز پڑھنے والے پر چاہے جو بھی ہو اور جیسے بھی نماز پڑھی ہو ایک دفعہ تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق مرد و عورت دونوں پر تکبیر تشریق کہنا واجب ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

لـمـافي الدر المختار(۲/۱۷۹): ووجوبه (علی امام مقیم) بمصر (و) علی مقتد (مسافر او قروی او امرأة) بـالتبعية لـكن المرأة تخافت ويجب علی مقيم اقتدی بمسافر (وقالا بوجوبه فور كل فرض مطلقا) ولـو منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمكتوبة (الی) عصر اليوم الخامس (آخر ايام التشريق وعليه الاعتماد) والعمل والفتوی في عامة الامصار وكافة الاعصار. الدر المختار وقال ابن عابـدين الشـامي رحمه الله تحته (قوله تخافت) لان صوتها عورة كما في الكافي والتبيين ـــ (قوله فور كل فرض) بان ياتي به بلا فصل يمنع البناء كمامر ط (قوله لانه تبع للمكتوبة) فيجب علی كل من تجب عليه الصلوة المكتوبة بحر (قوله وعليه الاعتماد الخ) هذا بناء علی انه اذا اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الاصح كما في اخر الحاوی القدسی اوعلی ان قولهما في كل مسألة مروی عنه ايضا والا فكيف يفتی بقول غير صاحب المذهب. وبه اندفع مافي الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوی المشائخ بقولهما بحر.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۲/۱۳۰۸): فقال الحنفية: يجب علی الرجال والنساء تكبير التشريق في الاصح مرة، وان زاد عليها يكون فضلا، عقب كل فرض عيني بلا فصل يمنع البناء علی الصلاة (كالخروج من المسجد او الكلام او الحدث عامدا) ويؤدی بجماعة او منفردا، ولو قضاء، ويكون التكبير للرجال جهرا، وتخافت المرأة بالتكبير، ولا يكبر عقب الوتر وصلاة العيد.

ومدته: من فجر يوم عرفة الی عصر يوم العيد عند ابي حنيفة، والی صلاة العصر من اخر ايام التشريق عند الصاحبين، وبقولهما يفتی، فهي ثلاث وعشرون صلاة.

﴿باب في تقدير الاوزان الشرعية بالمساحة الجديدة﴾

(شرعی اوزان کی مقدار کا از سر نو تحقیق کے ساتھ بیان)

(۳۵۶) الاصبع کی تحقیق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہی کتب میں پیمائش کے پیمانوں میں سے ایک "اصبع" ذکر کیا ہوا ہے آجکل چونکہ جدید پیمانے رائج ہیں ان قدیم کو کوئی بھی نہیں جانتا حالانکہ اصل مدار ان جدید پیمانوں کا قدیم پیمانوں ہی کے اوپر ہے تو الاصبع کس پیمانے کا نام ہے اور اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آتے ہیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ایک ذراع میں چھ قبضہ ہوتا ہے اور ایک قبضہ چار اصبع (انگشت) کا ہوتا ہے۔ اور چار اصبع ۳ انچ کے برابر ہوتے ہیں۔ اور ۳ انچ ۷.۶۲ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے ایک انچ ۲.۵۴ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ لہذا ایک اصبع (انگشت) ۰.۷۵ انچ یعنی ۱.۹۰۵ سینٹی میٹر کے برابر ہے۔ اور ایک سینٹی میٹر میں ۱۰ ملی میٹر ہوتے ہیں تو اس اعتبار سے ایک اصبع (انگشت) تقریباً ۱۹ ملی میٹر ہے۔

لما في منحة الخالق على هامش البحر الرائق (۱/۲۳۳): قال صاحبنا ابو العباس احمد شهاب الدين ابن الهائم رحمه الله واليه يرجع في هذا الباب البريد اربعة فراسخ والفرسخ ثلاثة اميال والميل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعا والاصبع ست شعيرات مرصوصة بالعرض والشعير ست شعرات بشعر البرذون.

وفي الفتاوى الهندية (۱/۱۹): والمعتبر ذراع الكرباس كذا في الظهيرية وعليه الفتوى كذا في الهداية وهو ذراع العامة ست قبضات اربع وعشرون اصبعا كذا في التبيين.

وفي الشامية (۱/۱۹۶): قال في البحر. وفي الخانية وغيرها ذراع المساحة وهو سبع قبضات فوق كل قبضة اصبع قائمة (الى قوله) وفي البحر ان في كثير من الكتب انه ست قبضات ليس فوق كل قبضة اصبع قائمة فهو اربع وعشرون اصبعا بعدد حروف "لا اله الا الله محمد رسول الله" والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام كذا في غاية البيان والمراد بالقبضة اربع اصابع مضمومة.

(۳۵۷) الشبر کی تحقیق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ لمبائی کے پیمانوں کے اندر ایک الشبر نامی پیمانہ ہے تو یہ پیمانہ جدید پیمانوں کے لحاظ سے کتنا ہوگا اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ایک ذراع ۱۸/انچ کا ہوتا ہے اور دو "۲" شبر ایک ذراع ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر "۹" انچ کا ہوا اور ایک انچ ۲٫۵۴ سینٹی میٹر کا ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر تقریباً ۲۳ سینٹی میٹر ہوا اور ایک سینٹی میٹر دس ملی میٹر ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر ۲۳۰ ملی میٹر ہوا۔

لما فی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق (۱/۲۴۴، ۲۴۵): والمیل ألف باع، والباع اربعة اذرع، والذراع اربعة وعشرون أصبعاً، والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض، والشعیر ست شعرات بشعر البرذون. (الی قوله) قلت یمكن ان یقال لا خلاف لحمل كلام ابن شجاع علی ان مراده بالذراع ما فیه اصبع قائمة عند كل قبضة فیبلغ ذراعاً ونصفاً بذراع العامة.

وفی الشامیة (۱/۱۹۲): (قوله وهو سبع قبضات فقط) ای بلا اصبع قائمة، وهذا ما فی الولوالجیة، وفی البحر ان فی كثیر من الكتب انه ست قبضات لیس فوق كل قبضة اصبع قائمة، فهو اربع وعشرون اصبعاً بعدد حروف (لا اله الا الله محمد رسول الله) والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام كما فی (غایة البیان) اهـ والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة نوح، اقول وهو قریب من ذراع الید، لانه ست قبضات وشیء، وذالك شبران.

(۳۵۸) فرسخ کی تحقیق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اگر کوئی سو فرسخ سفر پہ جانے کا ارادہ کریگا تو وہ قصر کرے گا مسئلہ یہ ہے آجکل میل اور فرسخ نہیں بلکہ کلو میٹر اور میٹر ہیں، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک فرسخ میں کتنے کلو میٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ایک فرسخ = ۳ شرعی میل، ایک میل = ۴۰۰۰ ذراع

ایک ذراع ڈیڑھ (۱٫۵) فٹ = ۱۸ انچ، ۱۸×۴۰۰۰=۷۲۰۰۰ انچ

ایک میٹر = ۳۹ انچ، ۷۲۰۰۰÷۳۹=۱۸۴۶٫۱۵۳۸ شرعی میل میں میٹر ۱۸۴۶٫۱۵۳۸÷۱۰۰۰= ۱٫۸۴۶۱۵۳۸ = شرعی میل میں کلو میٹر

ایک فرسخ میں کلو میٹر = ۱٫۸۴۶۱۵۳۸×۳=۵٫۵۳۸۴۶۱۳ کلو میٹر

اس کے برخلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے، اور یہی امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ہے، جبکہ مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جس کے تریسٹھ میل شرعی بنتے ہیں، بعض نے اٹھارہ فرسخ جس کے چوّن میل بنتے ہیں اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل بنتے ہیں مسافت قصر قرار دی ہے (شامی) اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارزم کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے، اس لئے محققین علماء ہند نے (۴۸) اڑتالیس میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دیا ہے اور فقہائے حنفیہ کے اقوال میں سے جو قول ائمہ خوارزم کا پندرہ فرسخ کا نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً اس کے برابر ہے، کیونکہ پندرہ فرسخ کے پینتالیس میل شرعی بنتے ہیں، اور شرعی میل انگریزی میل سے دو سو چالیس گز بڑا ہوتا ہے، اس وجہ سے پینتالیس میل شرعی اڑتالیس میل انگریزی سے [illegible] زیادہ متفاوت نہیں، بہ نسبت دیگر اقوال کے کہ ان میں اور پینتالیس میل شرعی میں فرق بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

پینتالیس میل شرعی کے اعتبار سے مسافت قصر کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی میل دو ہزار گز انگریزی کا ہوتا ہے اور انگریزی میل سترہ سو ساٹھ گز کا تو گویا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دو سو چالیس گز بڑا ہوتا ہے، اس فرق کی وجہ سے اصل مسافت قصر جو کہ پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت جو کہ اڑتالیس میل ہے، میں فرق کا ہونا ظاہر ہے کہ پینتالیس میل شرعی کے ۵۱٫۱۳۶۳۶ میل انگریزی بنتے ہیں، تو اصل مسافت جو شرعاً پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت میں تقریباً ۳٫۱۳۶۳۶ میل کا فرق آتا ہے۔ لیکن اس فرق کے ہوتے ہوئے حالات زمانہ اور چند دیگر ضرورتوں کی بناء پر محققین متاخرین نے اڑتالیس میل انگریزی کو پینتالیس میل شرعی کے قائم مقام قرار دیا ہے اور یہی قول مفتیٰ بہ ہے۔ پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سفر شرعی اڑتالیس میل انگریزی کے حساب سے بنتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس کے میٹر اور کلومیٹر کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

ایک ذراع شرعی = ۱۸ انچ، ایک فٹ = ۱۲ انچ

ذراع انگریزی = ۳۶ انچ، ایک میٹر = ۳۹ انچ

ایک کلومیٹر = ۱۰۰۰ میٹر

۱۷۶۰ گز شرعی x ۲ = ۳۵۲۰ گز انگریزی

۳۵۲۰ x ۱٫۵ = ۵۲۸۰ فٹ

۵۲۸۰ فٹ x ۱۲ = ۶۳۳۶۰ انچ

۶۳۳۶۰ ÷ ۳۹ = ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر

۱۶۲۴٫۶۱۵۴ ÷ ۱۰۰۰ = ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

۱٫۶۲۴۶۱۵۴ x ۴۸ = ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر

اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ ایک میل میں ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر اور ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸ میل میں ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ ـــ

والميل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعا والاصبع ست شعيرات مرصوصة بالعرض والشعيرة ست شعرات بشعر البرذون

ان البريد من الفراسخ اربع ولفرسخ فثلاث اميال ضعوا
والميل الف اى من الباعات قل والباع اربع اذرع فتتبع
ثم الذراع من الاصابع اربع من بعدها العشرون ثم الاصبع
ست شعيرات فظهر شعيرة منها الى بطن لاخرى توضع
ثم الشعيرة ست شعيرات فقل من شعر بغل ليس فيها مدفع

(۳۶۱) مرحلہ کی تحقیق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں سفر کے مسائل میں مراحل کا لفظ آتا رہتا ہے تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک مرحلہ کتنا ہوتا ہے اور آج کل کے لحاظ سے میٹر اور کلومیٹر کے لحاظ سے کتنا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مرحلہ کہتے ہیں ایک دن میں طے کردہ فاصلے کو اور عموماً ایک دن میں آدمی درمیانی رفتار میں پانچ فرسخ طے کرسکتا ہے۔ اور ایک فرسخ تین (۳) میل شرعی بنتا ہے۔ اور پانچ فرسخ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے ایک مرحلہ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتا ہے اور آج کل کے لحاظ سے ایک مرحلہ ۲۷٫۶۹۲ کلومیٹر یا ۲۷۶۹۲ میٹر۔ لہٰذا اس اعتبار سے تین مراحل میں ۴۵ میل شرعی۔ ۸۳۰۷۶ میٹر اور ۸۳٫۰۷۶ کلومیٹر بنتے ہیں۔ البتہ آج کل مفتی بہ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷ء۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر مقدار سفر شرعی ہے۔

مرحلہ کی تحقیق

ایک مرحلہ = ۵ فرسخ

ایک فرسخ = ۳ میل شرعی

ایک میل شرعی = ۴۰۰۰ گز، اور ایک گز = ڈیڑھ فٹ یا ۱۸ انچ۔

ایک میل شرعی میں فٹ = (۴۰۰۰×۱۸=۷۲۰۰۰ انچ (۱) ÷ ۱۲ = ۶۰۰۰ فٹ)

ایک میل شرعی میں ۶۰۰۰ فٹ ہوتے ہیں

ایک میل شرعی میں میٹر (۶۰۰۰ ÷ ۳٫۲۵) = ۱۸۴۶٫۱۵۳۸ میٹر

ایک میل شرعی میں کلومیٹر (۱۸۴۶٫۱۵۳۸ ÷ ۱۰۰۰) = ۱٫۸۴۶ کلومیٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں فٹ = ۶۰۰۰ × ۳ = ۱۸۰۰۰ فٹ

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں میٹر (۱۸۵۲,۱۵۲۸×۳)=۵۵۵۶,۴۵۸۴ میٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں کلومیٹر (۵۵۵۶,۴۵۸۴÷۱۰۰۰)=۵,۵۶۴۸ کلومیٹر

تین مراحل=۱۵ فرسخ=۴۵ میل شرعی

تین مراحل میں میٹر (۱۸۵۲,۱۵۲۸×۴۵)=۸۳۳۴۶,۸۷۶ میٹر

تین مراحل میں کلومیٹر (۸۳۳۴۶,۸۷۶÷۱۰۰۰)=۸۳,۳۴۶ کلومیٹر

میل انگریزی کے حساب سے ایک مرحلہ میں ۱۶ میل انگریزی=۲۵,۷۴۸ کلومیٹر اور ۲۵۷۴۸ میٹر بنتے ہیں۔

تین مراحل میں ۴۸ میل انگریزی ۷۷,۲۴۸ کلومیٹر ۷۷۲۴۸,۱۵۳۴ میٹر بنتے ہیں۔

میل انگریزی اور میل شرعی میں فرق

میل انگریزی میل شرعی سے ۷۲۰ فٹ ۲۴۰ گز چھوٹا ہوتا ہے۔

یہ فرق اسلئے کہ میل شرعی ۲۰۰۰ گز شرعی=۶۰۰۰ فٹ کا ہوتا ہے۔ جبکہ میل انگریزی ۱۷۶۰ گز انگریزی=۵۲۸۰ فٹ کا ہوتا ہے۔
میل شرعی اور میل انگریزی میں اس طور پر فرق اس لئے آرہا ہے کہ میل شرعی ۲۰۰۰ گز شرعی کا ہوتا ہے اور ایک گز ۳۶ انچ کا ہوتا ہے۔
اور میل انگریزی ۱۷۶۰ گز انگریزی کا ہوتا ہے اور ایک گز انگریزی ۳۶ انچ کا ہوتا ہے فرق معلوم کرنے کے لئے میل شرعی کے گز کو
انگریزی گز میں تبدیل کردیا تو میل شرعی انگریزی گز کے اعتبار سے ۲۰۰۰ انگریزی گز کا ہوگا اور میل انگریزی ۱۷۶۰ گز انگریزی کا ہوتا
ہے لہذا ۲۰۰۰ میں سے ۱۷۶۰ نفی کیا تو ۲۴۰ گز کا فرق آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ میل انگریزی میل شرعی سے ۲۴۰ گز چھوٹا ہوتا ہے۔

لما في معجم لغة الفقهاء (ص ۴۲۰): المرحلة: بفتح الميم، مسيرة نهار بسير الابل المحملة وقدرها أربعة وعشرون ميلا هاشميا، أو ثمانية فراسخ أو ۴۴۳۵۲ مترا. وفيه أيضا (ص ۴۷۰) الميل بالكسر جمع أميال: مقدار مد البصر، الميل الشرعي الهاشمي ألف باع والباع قدر مد اليدين ۴۰۰۰ ذراعا = ۱۸۴۸ مترا

وفي الهندية (۱/۱۳۸): أقل ما تتغير فيها الأحكام مسيرة ثلاثة أيام ... وهل يشترط سير كل يوم إلى الليل اختلفوا فيه والصحيح أنه لا يشترط حتى لو بكر في اليوم الأول ومشى إلى الزوال وبلغ المرحلة ونزل وبات فيها ثم بكر في اليوم الثاني كذلك ثم في اليوم الثالث كذلك يصير مسافرا كذا في السراج الوهاج ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح كذا في الهداية.

وفي الشامية (۲/۱۲۳): (قوله ولا يشترط الخ) إذ لا بد للمسافر من النزول للأكل والشرب والصلاة ولأكثر النهار حكم كله فإن المسافر إذا بكر في اليوم الأول وسار إلى وقت الزوال حتى بلغ المرحلة فنزل بها للاستراحة وبات بها ثم بكر في اليوم الثاني وسار إلى ما بعد الزوال ونزل ثم

بكر في اليوم الثالث ومشى الى الزوال فبلغ المقصد قال شمس الأئمة السرخسي الصحيح انه يصير مسافرا عند النية كما في الجوهرة.

وفيه ايضاً (ص ۲۲۳): قال في النهاية. اى التقدير بثلاث مراحل قريب من التقدير بثلاثة أيام لأن المعتاد من السير في كل يوم مرحلة واحدة خصوصاً في أقصر ايام السنة كذا في المبسوط وكذا ما في الفتح من أنه قيل يقدر بأحد وعشرين فرسخا وقيل ثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر منها اعتقد انه مسيرة ثلاثة ايام. اى بناء على اختلاف البلدان فكل قائل قدر ما في بلده من أقصر الأيام او بناء على اعتبار أقصر الأيام أو أطولها او المعتدل منها وعلى كل فهو صريح بأن المراد بالأيام ما تقطع فيها المراحل المعتادة فافهم. (قوله ولا اعتبار بالفراسخ) الفرسخ ثلاثة أميال، والميل أربعة آلاف ذراع. (قوله على المذهب) لأن المذكور في ظاهر الرواية اعتبار ثلاثة ايام كما في الحلية وقال في الهداية هو الصحيح احترازا عن قول عامة المشايخ من تقديرها بالفراسخ. ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون، وقيل ثمانية عشر وقيل خمسة عشر، والفتوى على الثاني لأنه الأوسط وفي المجتبى فتوى ائمة خوارزم على الثالث وجه الصحيح أن الفراسخ تختلف باختلاف الطريق في السهل والجبل والبر والبحر بخلاف المراحل معراج.

﴿فصل في المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة﴾

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

(۳۶۲) فریضہ صلوٰۃ قرض ہے یا فرض؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کا قرض ہے یا فرض؟ میرے ایک دوست فرماتے ہیں کہ قرض ہے؟ آپ صحیح بات کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: پانچوں نمازیں ہر "عاقل، بالغ، مسلمان مرد وعورت" پر ان کے اوقات مقررہ میں ادا کرنا قرآن وحدیث اور اجماعِ امت کی رو سے فرض عین ہے، قرض نہیں۔

اس لئے کہ قرض کہا جاتا ہے کسی دوسرے کو مال دینا اس شرط پر کہ قرض دار وہ مال قرض خواہ کو واپس لوٹائے گا جہاں تک آپ کے دوست کا کہنا ہے کہ فریضہ صلوٰۃ "قرض" ہے تو یہ اس صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ مقصود لزومِ ادائیگی ہو۔ اور عام طور پر مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ جس طرح ادائیگی قرض بہر صورت ضروری ہے اسی طرح ادائیگی فرض بھی ضروری ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز فرض نہیں۔

لما في الهندية (۱/۵۰): الصلاة فريضة محكمة لا يسع تركها ويكفر جاحدها كذا في الخلاصة.

وفي المعجم الوسيط (ص۷۲۷): "القرض ما تعطيه غيرك من مال على أن يرده إليك ....." ج

قروض

(۳۶۳) فقہاء نے "نماز کے ارکان وشرائط" کے اعتبار سے جو تقسیم فرمائی ہے اس کا مقصد

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء نے جو تقسیم فرمائی ہے نماز کے ارکان وشرائط کے اعتبار سے اس کا کیا مقصد ہے؟ کیا نماز کی صحت کیلئے ضروری ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ مراقی الفلاح والے کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا "ويشترط التحريمة وليست ركناً وعليه عامة المشايخ المحققين على الصحيح" (ص۱۶۸، باب شروط الصلوۃ)

الجواب حامداً ومصلیاً: فقہاء نے جو تقسیم کی ہے اس کا مقصد نماز کے "ارکان اور شرائط" کے درمیان فرق کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ "شرط" وہ عمل ہے کہ تمام نماز میں اس کو پورا کرنا صحت نماز کیلئے ضروری ہے اور "رکن" وہ عمل ہے کہ نماز کے اندر اس کو ایک مرتبہ ادا کرنا صحت نماز کیلئے

ضروری ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شرط نماز کا جز اور حصہ نہیں ہوتی بلکہ نماز سے الگ اور باہر ہوتا ہے جیسے نماز کیلئے وضو شرط ہے۔ "نماز" اور "وضو" دونوں الگ الگ عمل ہیں۔ جبکہ نماز کا "رکن" خود نماز کا ایک جز ہوتا ہے جیسے "رکوع" "سجود" نماز کے "ارکان" ہیں البتہ حکماً دونوں فرض ہیں چنانچہ اگر کوئی آدمی ان میں سے ایک کو بھی انجام نہ دے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اور مراقی الفلاح کی عبارت کا مقصد یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ عند الاحناف شروط میں سے ہے کیونکہ خارج نماز ادا ہو جاتی ہے۔

لمافی الحلبی (ص ۲۱۰): ثم اعلم بان للصلوٰۃ شرائط جمع شریطۃ بمعنی الشرط وھو فی اللغۃ العلامۃ اللازمۃ وفی الشرع مایتعلق بہ الوجود دون الوجوب والثبوت قبلھا صفۃ موضحۃ وبیان للواقع اذ شرط الشی لا یکون فیہ ولا بعدہ وانما یکون قبلہ ــــ واعلم ان للصلوٰۃ ارکانا جمع رکن وھو فی اللغۃ الجانب الاقوی و فی الاصطلاح الجزء الذاتی الذی تترکب الماھیۃ منہ ومن غیرہ.

وفی المراقی (۱/۱۹۶): شروط جمع شرط ــــ وفی الشریعۃ ھو مایتوقف علی وجودہ الشی، وھو خارج عن ماھیتہ، والارکان جمع رکن: وھو فی اللغۃ ــــ الجانب الاقوی وفی الاصطلاح الجزء الذاتی الذی تترکب الماھیۃ منہ ومن غیرہ.

وفی الھندیۃ (۱/۶۸): الفصل الاول فی فرائض الصلوٰۃ وھی ست منھا التحریمۃ، وھی شرط عندنا حتی ان من یحرم للفرائض کان لہ ان یودی بھا التطوع.

وفی الدر المختار مع الشامیۃ (۱/۴۴۳): (من فرائضھا) التی لا تصح بدونھا (التحریمۃ) قائماً (وھی شرط)

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ من فرائضھا) جمع فریضۃ اعم من الرکن الداخل الماھیۃ والشرط الخارج عنھا ــــ (قولہ وھی شرط) وانما لم یذکرھا مع الشروط المارۃ لاتصالھا بھا بمنزلۃ الباب للدار ــــ (قولہ بہ یفتی)، الضمیر راجع الی الحکم علیھا بالشرطیۃ.

(۳۶۳) حرم سے باہر سمتِ قبلہ کا تعین

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل مسجد حرام کے باہر سمت قبلہ کا تعین کیسے کیا جائے جبکہ اونچی اونچی عمارتیں حائل ہیں برائے مہربانی مسئلہ کی پوری وضاحت فرمادیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ قبلہ اگر نمازی کے سامنے ہو تو عین قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے البتہ اگر نمازی ایسی جگہ پر ہو جہاں قبلہ نظروں کے سامنے نہ ہو تو جہت قبلہ کا رخ کر لینا کافی ہے لیکن اگر قبلہ نمازی کی نظروں کے سامنے نہ ہو اور سمت قبلہ کے بارے میں بھی شبہ ہو جائے تو وہ مقامی لوگوں سے دریافت کرلے، اگر کوئی شخص ایسا نہ ملے جو اسے سمت قبلہ بتا سکے تو غور و فکر کر کے جس طرف بھی غالب گمان

ہو جائے اسی طرف رخ کر کے نماز ادا کریگا۔

لما فی محیط البرھانی (۲/۱۱۰): وکل من کان بحضرۃ الکعبۃ یجب علیہ اصابۃ عینھا ومن کان غائبا عنھا ففرضہ جھۃ الکعبۃ لا عینھا وھذا قول الشیخ الامام ابی الحسن الکرخی والشیخ الامام ابو بکر الرازی لانہ لیس فی وسعہ سوی ذالک والتکلیف بحسب الوسع.

وفی الھندیۃ (۱/۶۳): وان اشتبھت علیہ القبلۃ ولیس بحضرتہ من یسئلہ عنھا اجتھد وصلی کذا فی الھدایۃ .... واذا کان بحضرتہ من یسئلہ عنھا وھو من اھل المکان عالم بالقبلۃ فلا یجوز لہ التحری.

(۳۶۵) مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے

سوال ... ایک شخص اللہ کے راستہ میں (مراد اس سے دعوت و تبلیغ ہے) نماز پڑھتا ہے جبکہ دوسرا وہ شخص ہے جو مسجد حرام میں نماز پڑھتا ہے ان دونوں میں کس کو زیادہ ثواب ملے گا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً جواب کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھئے کہ حضرات مفسرین نے فی سبیل اللہ میں تبلیغ کے علاوہ اور بھی بہت سے امور داخل کئے ہیں جیسا کہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب قدس اللہ سرہ نے تفسیر مظہری (۲/۲۱۱) میں لکھا ہے کہ طلب علم، جہاد و اطاعت، تقویٰ کیلئے نکلنا اور اسی طرح رزق حلال کے حصول کیلئے نکلنا یہ سب فی سبیل اللہ میں داخل ہیں جبکہ بعض حضرات اسکے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں نکلنے کو صرف تبلیغ کیساتھ خاص کرتے ہیں حالانکہ اسکے علاوہ اور نیک کاموں میں نکلنے والے بھی اللہ کے راستہ میں نکلنے والے ہیں۔ اب جواب کو سمجھ لیجئے کہ اللہ کے راستہ میں عبادت کرنا تو بہت ہی سعادتمندی کی بات ہے احادیث میں اسکے متعلق بہت فضائل مروی ہیں لیکن جو شخص مسجد حرام میں نماز پڑھتا ہو تو ظاہر ہے کہ اسکا ثواب سب سے بڑھ کر ہے بلکہ مسجد نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں نماز پڑھنے سے بھی افضل ہے۔

لما فی الشامیۃ (۱/۶۵۸): وفی تسھیل المقاصد للعلامۃ احمد بن العماد: ان افضل المساجد الارض الکعبۃ لان اول بیت وضع للناس ثم المسجد المحیط بھا لانہ اقدم مسجد بمکۃ ثم مسجد المدینۃ لقولہ ﷺ صلاۃ فی مسجدی ھذا تعدل الف صلاۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام.

(۳۶۶) نماز کا پڑھنا ہی اخلاق کی درستگی کا سبب ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ متقی صاحب میں انکی جماعت کے ساتھ چلہ لگا کر آیا ہوں اللہ کے فضل سے تمام اعمال میں جڑا ہوا ہوں ہماری مسجد میں جمعہ کے دن گشت ہوا ہے ہم باہر گئے تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بظاہر نیک و دیندار معلوم ہوتے تھے ہم نے ان سے بات کی تو فرمانے لگے پہلے اخلاق کی درستگی ہونی چاہیے پھر نماز پڑھنی چاہیے،

سارے ساتھی ان کی بات سن کر حیران ہو گئے کہ یہ بات ہم نے پہلی مرتبہ سنی ہے کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً... نماز چونکہ اہم ترین عبادات ہے قرآن اور احادیث نے جابجا اس کی تاکید فرمائی ہے لہٰذا اس کو کسی حال میں ترک نہیں کیا جائے گا اخلاق کی درستی بھی شریعت میں مطلوب ہے لیکن اس کی وجہ سے نماز کو نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ نماز ہی کی برکت سے رفتہ رفتہ اخلاق کی درستگی بھی ہو جائے گی جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ نماز فحاشی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب کے بارے میں پوچھا گیا کہ نماز بھی پڑھتا ہے اور چوری بھی کرتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ نماز اس کو اس کام سے روک دے گی لہٰذا ان صاحب کا یہ کہنا کہ پہلے صرف اخلاق کی درستگی ہو پھر نماز ہو تو یہ بات از روئے شریعت درست نہیں۔

لما فی احکام القرآن للجصاص (۳/ ۳۵۰): روی عن ابن مسعود و ابن عباس تأمر بالمعروف وتنھی عن المنکر　وقیل ان النبی ﷺ قیل له ان فلانا یصلی باللیل ویسرق بالنھار فقال لعل صلاته تنھاه الخ. وقوله تعالی واقیموا وجوھکم عند کل مسجد. (الآیۃ، سورۃ الاعراف)

وفی الفقہ علی المذاھب الاربعۃ (۱/ ۱۷۳): فھذه ھی الصلوٰۃ فی نظر الدین وھی بھذا المعنی لھا احسن الاثر فی تھذیب النفوس وتقویم الاخلاق فان فی کل جزء من اجزائھا تمرینا علی فضیلۃ من الفضائل الخلقیۃ وتعویدا علی صفۃ من الصفات الحمیدۃ . . .

(۳۶۷) موبائل میں گانے والی ٹونز لگوانے اور دوران نماز موبائل کی گھنٹی بند کرنے کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موبائل فون میں گانے کی ٹونز لگوانا کیسا ہے؟ نیز نماز پڑھنے کے دوران اگر موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے تو کیا نماز کے اندر اس کو بند کیا جا سکتا ہے تاکہ دوسروں کی نماز میں خلل نہ آئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً . دین اسلام میں موسیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا موبائل پر کوئی بھی ایسی گھنٹی لگانا جس میں موسیقی کی آمیزش پائی جاتی ہو ناجائز ہے۔ تاہم موبائل میں عام اور سادہ گھنٹی لگانی چاہیے جس میں موسیقیت کا پہلو ظاہر نہ ہو۔ اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی موبائل بند کر دیا جائے ابتداً اگر کسی وقت بند کرنا بھول جائیں اور نماز میں گھنٹی بجنے لگے تو اول کوشش کریں کہ بغیر عمل کثیر کے اسے ایک ہاتھ سے بند کریں البتہ اگر بغیر عمل کثیر کے اسے بند کرنا مشکل ہو یا گھنٹی کے بار بار بجنے کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کی نماز بھی خراب ہوتی ہو تو بار بار بند کرنے کے بجائے نماز توڑ کر گھنٹی بند کر دیں تاکہ اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بچا جا سکے مثلاً۔

۱)　گھنٹی کا بجتے رہنا نمازیوں کی نماز میں خلل عظیم کا باعث ہے۔

۲)　گھنٹی کا بجتے رہنا تقدس مسجد کے پامال ہونے کا باعث ہے۔

۳)　گھنٹی کا بجتے رہنا نماز کی کامل ادائیگی میں نقصان کا باعث ہے۔

۴)　گھنٹی کا بجتے رہنا مسلمانوں کی ایذا رسانی کا باعث ہے۔

۵) گھنٹی کے بجتے رہنے سے کسی حد تک مشرکین کے افعال قبیحہ سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بیت اللہ میں دوران طواف اور مسلمانوں کی نمازوں میں خلل پیدا کرنے کیلئے سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔

۶) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال وافعال سے گھنٹی کی مذمت فرمائی ہے اور اس کو شیطان کا آلہ فرمایا ہے۔

۷) گھنٹی کے بجتے رہنے سے جہری نمازوں میں امام صاحب کی تلاوت اور مقتدیوں کی سماعت میں حرج پیدا ہوتا ہے۔

۸) گھنٹی کے بجتے رہنے سے گرجا گھروں میں کی جانے والی عبادت کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج بھی نصاریٰ گرجا گھروں میں عبادت بھی گھنٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

۹) گھنٹی کا بجتے رہنا لغویات میں شامل ہے اور نماز میں لغویات سے پرہیز از حد ضروری ہے۔

۱۰) گھنٹی کا بجتے رہنا فرشتوں کیلئے منافرت کا باعث ہے۔ تلک عشرة كاملة

نیز نماز توڑنے کے بعد نئی تکبیر تحریمہ باندھ کر نماز میں شریک ہو جائے۔ اور امام صاحب کی ادائیگی سلام کے بعد فوت شدہ رکعات مکمل کرے۔ اور ادائیگی نماز کے بعد خوب توبہ استغفار کرے۔ اور آئندہ اس طرح کی غفلت سے اجتناب کرے۔

لما في مجمع الانهر (۱/۲۰۸): والاصل فيه ان نقض العبادة قصداً وبلا عذر حرام واما اذا كان لامر شرعي مثل الاكمال ليجوز وان كان نقضا صورة فهو اكمال معنى كهدم المسجد لتجديده.

وفي خلاصة الفتاوى (۱/۲۰): ويكره ان يدعو في الصلاة وبه غائط او بول فلو شرع في الصلاة مع هذا وشغله عن الصلاة قطعها جاز فان مضى جاز واساء وسواء كان به وقت الافتتاح او حصل في الصلاة.

(۳۶۸) فرض نمازوں کی رکعات کا احادیث مبارکہ سے ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں کی رکعتیں قرآن کریم سے ثابت ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو وہ کونسی احادیث مبارکہ ہیں جو ان رکعتوں کی تعیین پر دلالت کرتی ہیں، براہ مہربانی مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً... قرآن پاک سورۃ الروم آیت نمبر ۱۷، ۱۸ سے پانچ نمازوں کے نفس ثبوت کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم بالتفصیل فرض نماز اور ان کی رکعات کا ذکر کتب احادیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فجر کی دو رکعت فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۹، ۱۰۷) ومسلم (۱/۲۰۸)، ابوداؤد (۱/۱۱۸) "باب الرجل يعيد سورة واحدة في الركعتين" پر موجود ہے۔

ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی فرض رکعات کا اکٹھا ذکر: بخاری (۱/۷۷) وابوداؤد (۱/۱۷۱) پر موجود ہے۔ اور اسی طرح ظہر، عصر اور مغرب کی فرض رکعات کا الگ الگ ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ ظہر کی چار رکعات فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۵) وابوداؤد (۱/۱۲۵) ترمذی (۱/۹۱) پر موجود ہے۔

عصر کی چار رکعات فرض کا ذکر: مسلم (۱/۲۲۵) پر موجود ہے۔ مغرب کی تین رکعات فرض کا ذکر بخاری (۱/۱۲۸) پر موجود ہے۔ اور پانچوں نمازوں کی تمام فرض رکعات کا ایک ساتھ ذکر السنن الکبری للبیہقی (۱/۳۶۱) اور اعلاء السنن (۲/عجزء ۲ صفحہ ۷) پر موجود ہے۔

فی القرآن الکریم (سورة الروم: ۱۸،۱۷): وقال الله تعالیٰ "فسبحٰن الله حین تمسون وحین تصبحون ○ وله الحمد فی السمٰوات والارض وعشیا وحین تظهرون ○

وفی التفسیر الکبیر (۱۰۴/۱۳) بالجزء ۲۵: وأما المعنی فقال بعض المفسرین: المراد منه الصلوٰة، أی صلوا، وذکروا انه أشار الی الصلوات الخمس.

وفی التفسیر روح المعانی (۲۸/۷): وقیل: المراد بالتسبیح الصلاة. واخرج عبدالرزاق اخرج عبد الرزاق. والفریابی وابن جریر وابن المنذر............ الی ان قال جاء نافع ابن الازرق الی ابن عباس فقال هل تجد الصلوات الخمس فی القرآن؟ فقال: نعم فقرأ (فسبحان الله حین تمسون) صلاة المغرب (وحین تصبحون) صلاة الصبح (وعشیا) صلاة العصر (وحین تظهرون) صلاة الظهر وقرء (ومن بعد صلاة العشاء) واخرج ابن ابی شیبة وابن جریر وابن المنذر عنه قال: جمعت هذه الایة مواقیت الصلاة (فسبحان الله حین تمسون) المغرب والعشاء (وحین تصبحون) الفجر (وعشیا) العصر (وحین تظهرون) الظهر الخ.

(۳۶۹) کسی مسجد کو مسجد ضرار کہنا درست نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں منافقین نے مسجد قبا کے مقابلے میں ایک مسجد تعمیر کی تھی تو قرآن پاک میں اس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرانے کا حکم دیا تھا اب سوال یہ ہے کہ آج کل اگر کوئی شخص ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد تعمیر کر لیتا ہے تو یہ مسجد ضرار کے زمرے میں آئے گی یا نہیں؟ نیز اس میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً قرآن کریم میں جس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جسے منہدم کر کے جلا دیا گیا در حقیقت وہ مسجد نہ تھی، بلکہ منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے اور ان کے خلاف سازشیں کرنے کیلئے مسجد کا نام رکھ کر ایک عمارت بنائی تھی، جس کے چار مذموم مکروہ مقاصد قرآن کریم نے بیان کیے ہیں اور وہ یہ ہیں:

اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کرنا، مسلمانوں کے اتحاد اور جماعت میں تفریق پیدا کرنا، اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغی (ابو عامر) کو پناہ گاہ فراہم کرنا۔ اس سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔

(۱) اگر کچھ مسلمان کسی مسجد کے مقابلے میں اس کے قریب دوسری مسجد ریاء، نمود یا ضد وعناد کی وجہ سے بنالیں اور بنانے کا مقصد تقسیم

باہم تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں تو اگرچہ نئی مسجد بنانے والے کو ثواب نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گنہگار ہوگا، لیکن پھر بھی باوجود اس قدر شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا اور مسجد کے تمام آداب اور احکام اس پر جاری ہوں گے۔

(۲) اس طرح نئی مسجد کو اصطلاح میں قرآن والی مسجد ضرار کہنا درست نہیں۔

(۳) ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اگر پڑھ لی گئی تو ہو جائے گی۔

لما في الدر المنثور في التفسير بالمأثور (۴/۲۸۴): أخرج ابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه والبيهقي في الدلائل عن ابن عباس في قوله (والذين اتخذوا مسجدا ضرارا) قال: هم أناس من الأنصار ابتنوا مسجدا، فقال لهم أبو عامر: ابنوا مسجدكم واستمدوا ما استطعتم من قوة و سلاح فإني ذاهب إلى قيصر ملك الروم فآتي بجند من الروم فأخرج محمدا وأصحابه. فلما فرغوا من مسجدهم أتوا النبي ﷺ فقالوا: قد فرغنا من بناء مسجدنا فنحب أن تصلي فيه وتدعو بالبركة، فأنزل الله (لا تقم فيه أبدا)

وفي التفسير المظهري (۴/۲۹۵): (والذين اتخذوا مسجدا ضرارا) أي مضارة للمؤمنين

وفي (ص ۲۹۶): (وكفرا) بالله ورسوله ﷺ (وتفريقا بين المؤمنين) لأنهم كانوا يصلون في مسجد قبا فبنوا مسجد الضرار ليصلي فيه بعضهم فيؤدي ذلك إلى الاختلاف وافتراق الكلمة الخ (وإرصادا) أي انتظارا وإعدادا لمن حارب الله ورسوله. الخ

(۲۷۰) ایک طرف سے آکر نمازی کے آگے بیٹھ جانے کے بعد پھر اٹھ کر دوسری طرف جانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عمرو نماز پڑھ رہا تھا کہ زید دائیں طرف سے آیا عمرو کے سامنے قبلہ رو بیٹھ گیا، دو تین منٹ بیٹھا تھا دو تین منٹ کے بعد بائیں طرف گیا تو آیا زید کا اس طرح کرنا مرور میں شمار ہے یا کہ مرور نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں زید کا یہ عمل مرور میں شمار ہوگا۔

لما في صحيح البخاري (۱/۷۳)، باب الصلوة إلى السرير: عن عائشة رضي الله عنها قالت: أعدلتمونا بالكلب والحمار لقد رأيتني مضطجعة على السرير فيجيء النبي ﷺ فيتوسط السرير فيصلي فأكره أن أسنحه فأنسل من قبل رجلي السرير حتى أنسل من لحافي.

وفيه أيضا (۱/۷۳): قال رسول الله ﷺ لو يعلم المار بين يدي المصلي ماذا عليه لكان أن يقف

اربعين خير له من ان يمر بين يديه الخ

وفي فيض الباري (٢/٨٣): قوله: (فاكره ان اسنحه) (يعني أمر جانبه) وعلم ان مسألة المرور في الفقه فيما اذا مر امامه من جانب الى جانب ولا تفصيل فيه فيما اذا كان قاعدا فصلى خلفه رجل هل ينسل ام لا قلت فيعمل بهذا الحديث ولا شك ان الانسلال اشبه وهو الخروج من التحت خفية والسنوح اقرب من المرور فلذا كانت تكرهه.

وفي الشامية (١/٦٣٦): ولو مر اثنان يقوم أحدهما أمامه ويمر الآخر ويفعل الآخر هكذا يمران.

(٣٧١) سترہ کی مقدار اور اس کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی صحرا میں ایک امام ہے اور اس کے پیچھے مقتدی بھی ہیں اب جماعت پڑھنے کے دوران صرف امام کے سامنے کا سترہ کافی ہے یا مقتدی بھی سترہ لگائیں گے، اور سترے کی مقدار کتنی ہونی چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: امام کا سترہ مقتدیوں کیلئے کافی ہے اور سترہ کی مقدار کم از کم ایک ذراع لمبی اور ایک انگلی کے بقدر موٹی ہونی چاہئے۔

لما في معارف السنن (٣/٤٣٣): واتفق الثلاثة على ان سترة الامام سترة لمن خلفه.

معارف السنن (٣/٤٠٥): ونص فقهاؤنا الحنفية قدر السترة بالذراع طولا وبالاصبع ثخنا وغلظا كما هو في عامة كتبنا. وفي (٣/٣٥٣) انه اذا صلى خاشعا راميا بصره الى موضع سجوده لا يقع بصره عليه واختار ابن الهمام في الفتح (١/٢٨٨) في الخلاصة وهو الصحيح وفي البدائع: وهو الأصح، وفي النهاية وهو الأشبه، وراجع "الفتح" للتفصيل اهـ.

وفي البحر الرائق (٢/١٠): واختار فخر الاسلام فانه قال اذا صلى راميا ببصره الى موضع سجوده فلم يقع عليه بصره لم يكره وهذا حسن وفي البدائع وقال بعضهم قدر ما يقع بصره على المار لو صلى بخشوع وفيما وراء ذلك لايكره وهو الأصح ورجحه في النهاية بانه اشبه الصواب

(٣٧٢) حضور ﷺ کیسے درود پڑھتے تھے؟ کیا آپ پر درود پڑھنا واجب تھا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کس طرح درود پڑھا کرتے تھے اور آپ کیلئے درود کا کیا حکم تھا؟ براہ کرم ہمارا جواب جلد از جلد مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں درج ذیل درود پڑھا کرتے تھے۔

اللھم صل علی محمد وال محمد کما صلیت علی ابراھیم وال ابراھیم وبارک علی محمد وال محمد کما بارکت علی ابراھیم وال ابراھیم انک حمید مجید. (السنن الکبریٰ للبیھقی ۲/۱۴۷، مطبع ادارہ تالیفات ،شرفیہ)

نیز اس کے علاوہ بھی الفاظ کی زیادتی کے ساتھ مختلف روایات میں درود پڑھنے کا ثبوت ہے۔ جیسے اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید. (ابن ماجہ ص ۶۵، مستدرک حاکم علی الصحیحین ۳/۱۶۰) جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خود درود کے حکم کی بات ہے تو آپ کے لئے اپنے اوپر درود بھیجنا واجب نہیں تھا۔

لما فی السنن الکبری للبیھقی (۲/۱۴۷): عن کعب بن عجرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یقول فی الصلوۃ اللھم صل علی محمد وال محمد کما صلیت علی ابراھیم وال ابراھیم وبارک علی محمد وال محمد کما بارکت علی ابراھیم وال ابراھیم انک حمید مجید

وفی الدر المختار (۱/۵۱۵): وفی المجتبی: لا یجب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یصلی علی نفسہ.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ لا یجب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یصلی علی نفسہ) لانہ غیر مراد بخطاب صلوا ولا داخل تحت ضمیرہ کما ھو المتبادر من ترکیب. صلوا علیہ. وقال فی النھر: لا یجب علیہ بناء علی ان یایھا الذین امنوا. لا یتناول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم. بخلاف. یایھا الناس. یا عبادی کما عرف فی الاصول اھ.

وفی البحر الرائق (۱/۵۲۳): وفی المجتبی معزیا الی خزانۃ الاکمل: انہ لا یجب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یصلی علی نفسہ.

وفی النھر الفائق (۱/۲۲۳): قال فی ((المجتبی)) معزیا الی ((خزانۃ الاکمل)): ھذا فی حق الامۃ اما ھو فلا یجب علیہ ان یصلی علی نفسہ انتھی بناء علی ان (یایھا الذین امنوا) لا تتناول الرسول بخلاف (یایھا الناس) (یا عبادی) کما عرف فی الاصول.

(۳۷۳) ”ہر وہ نماز جو کراہت تحریمیہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے“

کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ یہ جو قاعدہ ذکر کیا گیا ہے کل صلاۃ ادیت مع

کراھۃ التحریم تجب ان عادتھا" کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟ اور جو بھی نماز مکروہ تحریمی ہو جائے اور جس طرح بھی کراہت تحریمی آئی ہو، اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے یا اس میں تخصیص ہے اور کیا یہ وجوب وقت کے اندر ہے یا وقت کے بعد بھی اس کا اعادہ واجب ہے؟

(۲)۔ نیز اگر تصویر سامنے ہو اور نماز ادا کرلی تو جو علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ جو کراہت ماہیت صلاۃ میں آئی ہو اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے ورنہ نہیں اور کیا تصویر اگر سامنے ہو اور نماز پڑھ لی تو جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً ...... مذکورہ قاعدہ کلی ہے بشرطیکہ کراہت ماہیت صلوٰۃ میں داخل ہو، حاصل اس کا یہ ہے فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن کراہت تحریمی کے ارتکاب کی وجہ سے نماز کا اعادہ واجب ہے یہ وقت کے اندر نہیں کیا تو بعد میں کرے، تصویر سامنے ہونے کی صورت میں جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ ماہیت صلاۃ میں داخل ہے کیونکہ علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے تصویر والے کپڑوں میں نماز کی کراہت کو "حامل صنم پر قیاس کرکے" ماہیت صلاۃ میں داخل کیا، تصویر سامنے ہونے کی صورت میں بھی کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہوگی کیونکہ اس میں کراہت اس سے زیادہ ہے لہٰذا اس نماز کا اعادہ واجب ہے۔

بخلاف اس صورت کے کہ اگر کسی نے تنہا ظہر کی فرض نماز کی تین رکعت پڑھ لیں اور اسی اثناء میں جماعت کھڑی ہوگئی یا اپنی نماز اکیلے پوری کرے اگرچہ جماعت کے ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوئی لیکن کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل نہ ہونے کی وجہ سے اعادہ واجب نہیں کیونکہ جماعت نماز کی ایک صفت ہے جو ماہیت صلاۃ سے خارج ہے اسی لئے اس کو واجبات الصلوٰۃ میں ذکر نہیں کرتے ہیں۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۵۷): وکذا کل صلوٰۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا والمختار انہ جابر للاول ...... وفی الشامیۃ: وان النقص اذا دخل فی صلاۃ الامام ولم یجبر وجبت الاعادۃ علی المقتدی ایضا: وانہ یستثنی منہ الجمعۃ والعید اذا ادیت مع کراھۃ التحریم الا اذا اعادھا الامام والقوم جمیعا ......

بقی ھنا شی وھو ان صلاۃ الجماعۃ واجبۃ علی الراجح فی المذھب او سنۃ موکدۃ فی حکم الواجب کما فی البحر وصرحوا بفسق تارکھا وتعزیرہ وانہ یأثم ومقتضی ھذا انہ لو صلی مفردا یومر باعادتھا بالجماعۃ وھو مخالف لما صرحوا بہ فی باب ادراک الفریضۃ من انہ لو صلی ثلاث رکعات من الظھر ثم اقیمت الجماعۃ یتم ویقتدی متطوعا فانہ کالصریح فی انہ لیس لہ اعادۃ الظھر بالجماعۃ مع ان صلاتہ منفردا مکروھۃ تحریما او قریبۃ من التحریم. فیخالف تلک القاعدۃ، الا ان یدعی تخصیصھا بان مرادھم بالواجب والسنۃ التی تعاد بترکہ ما کان من ماھیۃ الصلاۃ واجزائھا فلا یشمل الجماعۃ

ہونا۔ (۴) مزدلفہ کا میدان ہونا۔ (۵) عشاء کا وقت ہونا۔

لمافی الهندية (۱/۲۲۸، ۲۲۹): ثم لجواز الجمع أعني تقديم العصر على وقتها وادائها في وقت الظهر شرائط ((منها)) ان تكون مرتبة على ظهر جائز استحسانا ... ((ومنها الوقت)) وهو ان يكون يوم عرفة ((و المكان)) وهو عرفات كذا في الكفاية ((ومنها احرام الحج)) قالوا ينبغي ان يكون محرما بالحج عند اداء الصلاتين ثم لابد من الاحرام بالحج قبل الزوال في رواية تقديما للاحرام على وقت الجمع وفي اخرى يكتفي بالتقديم على الصلاة لان المقصود هو الصلاة هو الصحيح كذا في الهداية ... ((ومنها الجماعة)) عند ابي حنيفة رحمه الله تعالى وعندهما ليست بشرط. فمن صلى الظهر وحده في رحله صلى العصر في وقته عند ابي حنيفة رحمه الله تعالى وقالا يجمع بينهما المنفرد كذا في الهداية والصحيح قول ابي حنيفة رحمه الله تعالى. كذا في الزاد ولو فاتتا مع الامام او فاتته واحدة منهما صلى العصر لوقته ولا يجوز له تقديم العصر على قول ابي حنيفة رحمه الله تعالى ولا يشترط الامام لجميع اداء الظهر فاذا ادرك مع الامام ركعة واحدة من الصلاتين او شيئا من الصلاتين جاز الجمع اجماعا كذا في الجوهرة النيرة ولو نفر الناس عن الامام فصلى وحده الصلاتين جاز ((ومنها)) ان يكون الامام هو الامام الاعظم او نائبه وهو شرط عند ابي حنيفة رحمه الله فلو صلى الظهر بجماعة لا مع الامام والعصر مع الامام لم يجز العصر عند ابي حنيفة رحمه الله والصحيح قوله هكذا في البدائع ولو مات الامام وهو الخليفة جمع نائبه او صاحب شرطته ولو لم يكن نائب ولا صاحب شرطته صلوا كل واحدة منهما في وقتها كذا في التبيين.

وفيه ايضاً (ص ۲۳۰): والافضل ان يصلي مع الامام بالجماعة كذا في الايضاح. ذكر الامام المحبوبي ولا يشترط في جمع المزدلفة الخطبة و السلطان والجماعة والاحرام كذا في الكفاية

وفي الشامية (۲/۵۰۴): (تنبيه) اقتصر من الشروط على الامام والاحرام وزاد في اللباب تقديم الظهر على العصر حتى لو تبين للامام وقوع الظهر قبل الزوال او بغير وضوء والعصر بعده او بوضوء اعادهما جميعا والزمان وهو يوم عرفة والمكان وهو عرفة وما قرب منها والجماعة فالشروط ستة.

(۳۷۵) داڑھی منڈوانے والے شخص کو صف اول سے پیچھے کر دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص شیو کرتا ہو تو کیا اس کو صف اول میں [illegible]

پڑھنے سے روکا جائے گا یا نہیں؟ آیا شیو کی وجہ سے اس کو صف اول سے محروم کیا جائے گا یا نہیں؟ کراچی کے ایک بہت بڑے عالم ہیں وہ اپنی مسجد میں شیو کرنے والوں کو صف اول سے نکال دیتے ہیں آیا ان کا یہ فعل درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں مسئلہ کو حل فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً داڑھی رکھنا واجب ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور داڑھی کو منڈوانا حرام ہے۔ جو لوگ اس حرام کام میں مبتلا ہوں ان کو چاہیے کہ اس سے اجتناب کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کریں۔ اور جماعت سے نماز پڑھتے وقت ایسے لوگوں کو چاہیے کہ علماء وصلحاء سے بڑھ کر پہلی صف میں کھڑے نہ ہو جائیں بلکہ پہلی صف میں ایسے لوگ کھڑے ہو جائیں جو علماء وصلحاء ہوں جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس حدیث کی تخریج میں (لیلینی منکم اولو الاحلام والنہی) علامہ شعرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ صف اول میں وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن کا تقویٰ وعلم اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ ورنہ ان کیلئے آخری صفوں میں کھڑا ہونا بہتر ہے (اعلاء السنن ۴/۳۶۶)۔ البتہ ایسے لوگوں کے کھڑے ہو جانے کے بعد بھی اگر پہلی صف میں کوئی خلا باقی رہ جائے تو پھر اس صورت میں ان پر لازم ہے کہ پہلی صف کو مکمل کریں اور اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ جس کو اپنے علاقے میں لوگ اپنا مقتدا مانتے ہوں اور اس کی بات کی وجہ سے لوگ دین سے متاثر ہوتے ہوں تو ایسا عالم اگر اصلاح کیلئے زجراً ان لوگوں کو جو داڑھی منڈاتے ہوں پہلی صف سے ہٹا دے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لما فی الصحیح البخاری (۲/۸۷۵): عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ خالفوا المشرکین اوفروا اللحی واحفوا الشوارب

وفی البدایۃ والنہایۃ (۳/۲۶۹): ودخلا علی رسول اللہ ﷺ وقد حلقا لحاھما واعفیا شواربھما فکرہ النظر الیھما وقال: ویلکما من امر کما بھذا؟ قالا امرنا ربنا یعنیان کسری، فقال رسول اللہ ﷺ ولکن ربی امرنی باعفاء لحیتی وقص شاربی۔

وفی الصحیح لمسلم (۱/۱۸۱): عن ابن مسعود قال کان رسول اللہ ﷺ یمسح مناکبنا فی الصلاۃ ویقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم ولیلنی منکم اولو الاحلام والنہی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم۔

وفی اعلاء السنن (۴/۳۶۵، ۳۶۶): قلت وعلی ھذا فیجوز ایثار العالم وکبیر السن بالصف الأول بل یجب نظرا الی الأمر، فإن الجاھل والصغیر مامور بالتاخر عن اھل العلم والنہی، ویؤیدہ ما رواہ الحاکم فی مستدرکہ عن ابی بن کعب مرفوعاً "لا یقوم فی الصف الاول الا المھاجرون والانصار" ذکرہ فی کنز العمال بلا تعقب (۴:۲۳۵) فھو صحیح علی قاعدتہ، وھو صریح فی النہی لغیر ھؤلاء عن التقدم الی الصف الأول، وتخصیص الانصار والمھاجرین بالذکر لکونہم اولی الاحلام

والنهی اذ ذاک فی الأغلب، وکونهم الفضل من غیرهم وافاد هذا الحدیث ان أمر المسارعة الی الصف الاول لیس علی إطلاقه بل هو مختص بأولی الفضل و الصلاح، وکذا الوعید الوارد علی التأخر عنه مختص بهم أیضا نعم یشمل الوعید غیرهم اذا بقی فی الصف الأول فرجة فلم یسدوها فالهم، فلو تأخر أحد عن الصف الاول لخلوه عن الصلاح والفضل والتقوی بشرط أن یرجوا کمال الصف بغیره ممن هو اهله فله ذلک ولا لوم علیه، بل ذلک متعین فی حقه.

قال العلامة الشعرانی فی العهود المحمدیة: أخذ علینا العهد إذا صفت سرائرنا من جمیع ما یسخط الله عزوجل بحیث لم یبق فی سرائرنا وظواهرنا الا ما یرضی ربنا أن نواظب علی الصلوة فی الصف الأول عملا بقوله ﷺ لیلنی منکم اولو الاحلام والنهی ای العقل ولا یکون العبد عاقلا الا اذا کان بهذه الوصف الذی ذکرناه فان من کان فی ظاهره أو باطنه صفة یکرهها الله تعالی فلیس بعاقل کامل ولا یتقدم للصف الأول بین یدی الله فی المواکب الإلهیة الا الأنبیاء والملائکة ومن کان علی اخلاقهم وأما من تخلف عن اخلاقهم فیقف فی آخریات الناس

وفی الشامیة (۲/۸۱۳): واما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحه أحد.

(۳۷۲) فرض نماز اور تراویح کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ فرض نمازوں اور تراویح ادا اسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان میں ادا کی جاتی ہے، اس کے بعد دعا انفرادی طور پر تو کرنے میں کوئی مزائقہ نہیں ہے۔لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کو ادلہ شرعیہ سے واضح کریں۔ شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً . . دعا ایک عبادت ہے، کثرت سے احادیث مبارکہ دعا کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں۔ جن سے دعا کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ تاہم بعض حضرات نماز کے بعد دعا کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فرض نمازوں اور تراویح کے بعد امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ اس طور پر التزام کرنا، امام کے ساتھ دعا کے شروع کرنے اور ختم کرنے کو لازم سمجھنا یا بغیر دعا مانگے اٹھنے والے کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا اور اسی طرح اس بے جا التزام کی آڑ میں نفس دعا ہی کا انکار کردینا دونوں امر حد سے تجاوز اور غلو فی الدین کے مترادف ہیں۔ ان سے اجتناب انتہائی ضروری ہے خاص طور پر ہمارے زمانے میں جبکہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ اور فقط چند عبادات میں امت کی اجتماعیت کی اک کرن

جاتی ہے۔ اس میں بھی اختلاف و انتشار کا دروازہ کھول لینا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

كما في البخاري (۲/۹۳۷) باب الدعاء بعد الصلوة: ... عن وراد مولى المغيرة بن شعبة قال كتب المغيرة الى معاوية ابن ابي سفيان ان رسول الله ﷺ كان يقول في دبر صلوته اذا سلم لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطي لما منعت ولا ينفع ذا الجد منك الجد.

وفي فتح الباري (۱۱/۱۰۲): (قوله باب الدعاء بعد الصلوة) اي المكتوبة وفي هذه الترجمة رد على من زعم أن الدعاء بعد الصلوة لا يشرع متمسكا بالحديث الذي اخرجه مسلم والجواب ان المراد بالنفي المذكور نفي استمراره جالسا على هيئته قبل السلام الا بقدر ان يقول ما ذكر. فقد ثبت انه كان اذا صلى اقبل على أصحابه فيحمل ما ورد من الدعاء بعد الصلوة على انه كان يقول بعد ان يقبل بوجهه على اصحابه.

وفي فيض الباري على صحيح البخاري (۴/۱۷۳): باب "الدعاء بعد الصلاة" لا ريب ان الادعية دبر الصلوات قد تواترت تواترا لا ينكر، اما رفع الأيدي فثبت بعد النافلة مرة او مرتين، فالحق بها الفقهاء المكتوبة ايضا، وذهب ابن تيمية وابن القيم إلى كونه بدعة بقي ان المواظبة على امر لم يثبت عن النبي ﷺ الامرة او مرتين، كيف هي فتلك هي الشاكلة في جميع المستحبات فانها تثبت طورا فطورا، ثم الامة تواظب عليها، نعم نحكم بكونها بدعة اذا افضى الامر إلى النكير على من تركها.

وفي اعلاء السنن (۳/۱۸۵) قال الحافظ في الفتح: قال ابن المنير: ان المندوبات قد تنقلب مكروهات اذا رفعت عن رتبتها، لان التيامن مستحب في كل شيء من أمور العبادة لكن لما خشي ابن مسعود ان يعتقدوا وجوبه اشار الى كراهته. والله اعلم اهـ.

وليتنبه لهذا من يصر على القيام عند ذكر الولادة الشريفة ويطعن في من لا يقوم وكذا كل من رفع المباح او المندوب عن رتبتهما وطعن في تاركهما فافهم.

وفي مجموعة الفتاوى على خلاصة الفتاوى (۱/۱۰۰): الجواب صحيح والرأي نجيح ويؤيد ما رواه ابو بكر بن ابي شيبة في المصنف عن الاسود العامري عن ابيه قال صليت مع رسول الله ﷺ الفجر فلما سلم انصرف ورفع يديه ودعا الحديث. فثبت بعد الصلوة المفروضة رفع اليدين في الدعا عن سيد الانبياء و اسوة الاتقياء صلعم كما لا يخفى على العلماء الاذكياء.

﴿احکام المساجد﴾

(۳۷۷) مسجد میں کسی جگہ رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں دو چار آدمی ایسے ہیں جو کہ پہلی صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرتے ہیں اور خود وضو وغیرہ کیلئے چلے جاتے ہیں تو کیا اس طرح صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جو شخص پہلے آ کر مسجد میں نہ بیٹھا ہو وہ اپنا رومال کسی جگہ مسجد میں قبضہ کرنے کی غرض سے رکھ دے یہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس سے اس کا حق بھی قائم نہیں ہوتا خواہ وضو کیلئے جائے یا اور کسی غرض سے جائے۔ ہاں وہ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا لیکن کسی عذر کی وجہ سے چلا جائے تو پھر گنجائش ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۰۸): ويكره للانسان ان يخص لنفسه مكانا في المسجد يصلي فيه.

وفي الشامية (۱/۲۲۲): قوله وتخصيص مكان لنفسه: لانه يخل بالخشوع كذا في القنية اي لانه اذا اعتاده ثم صلي في غيره يبقى باله مشغولا بالاوّل بخلاف ما اذا لم يالف مكانا معينا (قوله وليس له) قال في القنية له في المسجد موضع معين يواظب عليه وقد شغله غيره قال الاوزاعي له ان يزعجه وليس له ذلك عندنا اي لان المسجد ليس ملكا لاحد. بحر عن النهاية قلت: وينبغي تقييده بما اذا لم يقم عنه على نية العود بلا مهلة، كما لو قام للوضوء مثلا ولا سيما اذا وضع فيه ثوبه لتحقق سبق يده تامل.

(۳۷۸) سرکاری زمین میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع اور اس میں نماز پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرکاری زمین پر حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع کرنا اور اس میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد بنائے اور ان کی توسیع کرے اگر حکومت اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو وہ گناہگار ہوگی۔ جاننا چاہئے کہ سرکاری زمینیں دو قسم کی ہیں پہلی قسم وہ زمینیں جو صرف حکومت کی ملکیت میں ہوں اور عوام کا اس میں کوئی حق نہ ہو مثلاً حکومت نے اس کو ہسپتال یا اسکول کیلئے خاص کیا ہو تو ایسی زمینوں میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا یا اس کی توسیع کرنا

جائز نہیں اور اگر بنالی گئی تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

دوسری قسم وہ زمینیں جو رفاہی ہوں جیسے مویشیوں کی چراگاہ، بچوں کے کھیل کے میدان وغیرہ تو ان میں ضرورت کے وقت حکومت کی اجازت کے بغیر بھی مسجد کی توسیع کرنا جائز ہے، اور اس میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہوگا۔

لما في الهندية (۲/۳۵۳): ومنها الملک وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه او صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفا كذا في البحر الرائق.

وفيه ايضا (۲/۴۵۶): ارض وقف على مسجد والارض بجنب ذلک المسجد وارادوا ان يزيدوا في المسجد شيئا من الارض جاز لكن يرفعون الامر الى القاضي ليأذن لهم.

وفي الفقه الاسلامي (۶/۴۶۰۷): الاراضي نوعان ارض مملوكة وارض مباحة والمملوكة نوعان عامرة وخراب والمباحة نوعان ايضا نوع هو من مرافق البلد للاحتطاب ورعي المواشي ونوع ليس من مرافقها وهو الارض الموات او ما يسمى الآن املاک الدولة العامة

وفيه ايضا (۶/۴۶۰۸): ما كان من مرافق أهل بلدة تستعمل مرعى للمواشي ومحتطبا لهم او مقبرة لموتاهم او ملعبا لصغارهم، سواء كانت داخل البلدة أم خارجها ليكون حقا لهم لاموتا فلا يجوز للامام أن يقطعه لاحد.

(۳۷۹) مساجد میں ایکو ساؤنڈ کے استعمال کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد (جیسے کہ ہماری مسجد) میں ایکو ساؤنڈ لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے جب مؤذن یا امام ایک مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے تو تکبیر مرتبہ کہنے کی وجہ سے تین چار مرتبہ آواز سنائی دیتی ہے، کیا اس سے نماز میں کراہت نہیں آتی؟ نیز یہ آواز جتنی مرتبہ سنائی دیتی ہے اتنی مرتبہ ہی شمار ہوگی یا ایک مرتبہ شمار ہوگی؟ بخاری (۱/۸۵) پر حضرت عمر بن عبد العزیز کا اثر ہے کہ "اذن اذانا سمحا والا فاعتزلنا" اور سمحا کا مطلب یہ ہے کہ بغیر لحن وتغنی ہو، آواز میں طرب (یعنی دیہ بدیہ) نہ ہو، کیا ایکو (Echo) والی آواز میں طرب نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی رو سے تحقیقی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: عبادات کی ادائیگی کا جو طریقہ عہد نبوی سے چلا آرہا ہے وہ شریعت میں آج بھی ممدوح ومطلوب ہے، جیسے کہ باجماعت نماز کی ادائیگی میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مکبرین کا تقرر، جو کہ قدیم سنت ہے، اس پر عمل پیرا ہونا افضل ہے، جبکہ سائنس کی نئی نئی ایجادات جن میں آلہ مکبر الصوت "لاؤڈ اسپیکر" بھی داخل ہے جس کے ہوتے ہوئے مکبرین کے تقرر کی طرف احتیاج باقی نہیں رہتی تو حضرات مفتیان کرام نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو سہولت اور عموم بلویٰ کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے۔

جہاں تک مساجد میں ایکو ساؤنڈ کا استعمال ہے تو اس سے مقصود تحسین صوت ہے کہ اذان و قرآت کی ادائیگی خوب پُر اثر انداز ہو کے خشوع کی زیادتی کا باعث بنے جو کہ غرض بھی ہے۔ ایکو ساؤنڈ کے ذریعہ کلمات کا تکرار جو سننے میں آتا ہے تو وہ بحکم صدائے بازگشت کے ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک ہی تکبیر شمار ہوگی البتہ اگر یہ گونج اس قدر زیادہ ہو کہ جس سے نمازی کے خشوع میں خلل واقع ہو، اور قرآت ہی سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت میں ایکو ساؤنڈ کے استعمال سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا مؤذن کو "اذن اذانا سمحا و الا فاعتزلنا" ارشاد فرمانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ اذان کے کلمات میں زائد تکرار کر رہے تھے بلکہ وہ تصنع اور گا گا کر اذان دیا کرتے تھے اس تعبیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے اس مقولہ کو (جو کہ صحیح بخاری شریف میں تعلیقاً ذکر ہے) ابن ابی شیبہ نے موصولا روایت کیا ہے۔ جس میں لفظ طرب کی صراحت ہے۔ (۲۰۷/۱)

وفي الدر المختار (۱۰۹/۳): (لا) تجب (بسماعه من الصدى والطير)

وفي اللجنة الدائمة (۶۵/۲): س: هل صح قول من قال: بعدم استحباب الأذان بمكبرات الأصوات باعتبارها المولدة لمضاعفات الأصوات عن الحجم الصغير يلقيه المؤذن في الأصل، ذلك لالحاقه بالأذان بالراديو او التلفاز.

ج: الأذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لا حرج فيه، لما في ذلك من المصلحة العامة.

(۳۸۰) مسجد میں نمازیوں کے سامنے کی طرف ہیٹر لگانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں ہیٹر لگانا کیسا ہے؟ نیز اگر ہیٹر نمازیوں کے سامنے صف میں یا کسی آدمی کے سامنے پڑا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا؟ یا اگر دیوار پر ہو سامنے لگا ہوا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا یا نہیں؟ کیا اس میں تشبہ بالمجوس ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً: مسجد میں ضرورت کی وجہ سے ہیٹر لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے سامنے ہونے سے تشبہ بالمجوس بھی لازم نہیں آتا۔

لما في الشامية (۶۵۲/۱): وفي شرح المنية: وجه عدم الكراهة أن كراهة استقبال بعض الأشياء باعتبار التشبه بعبادها.... (قوله أو شمع)... وعدم الكراهة هو المختار كما في غاية البيان وينبغي الاتفاق عليه فيما لو كان على جانبيه كما هو المعتاد في ليالي رمضان بحر:.......(قوله قنية) ذكر ذلك في القنية في كتاب الكراهية ونصه: الصحيح انه لا يكره أن يصلي وبين يديه شمع أو سراج لأنه لم يعبدهما أحد والمجوس يعبدون الجمر لا النار الموقدة، حتى قيل لا يكره إلى النار الموقدة

وظاھرہ ان المراد بالموقدۃ التی لھا لھب. لکن قال فی العنایۃ: ان بعضھم قال: تکرہ الی شمع او سراج کما لو کان بین یدیہ کانون فیہ جمر او نار موقدۃ اھ وظاھرہ ان الکراھۃ فی الموقدۃ متفق علیھا کما فی الجمر تأمل.

وفی اللجنۃ الدائمۃ(۷/۸۸) س ۵: ھل یجوز توزیع الدفایات الکھربائیۃ امام المصلین اولا.

ج ۵: یجوز ذلک لمسیس الحاجۃ الی ذلک.

(۳۸۱) مسجد کے پودوں کے مالی کو مسجد کی آمدنی سے تنخواہ دینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک متولی مسجد نے مسجد کی رقم سے مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ سبزہ و پودے لگوائے ہیں۔ وہ عرصہ تک ایک مالی کو رکھ کر اس کو بھی مسجد سے تنخواہ ادا کرتا رہا ہے۔ اب وہاں کی کمیٹی ترک کی ہے جس سے وہ سبزہ وغیرہ خشک ہو رہے ہیں۔ اب حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے سبزہ و پودے وغیرہ لگانا اور مالی کو تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ متولی عند اللہ مجرم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: مسجد میں سبزہ و پودے لگانے سے مسجد کا ماحول پررونق وخوشگوار رہتا ہے، اس لئے یہ مصالح مسجد میں داخل ہے اور اس کیلئے مالی رکھنا اور اس کو مسجد کی رقم سے تنخواہ دینا درست ہے، مسجد کے مصارف میں تعاون کرنے والوں کی طرف سے دلالۃً اس کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہئے، اسراف ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

کما فی الولوالجیۃ(۳/۹۸): رجل غرس فی المسجد فھنا اربع مسائل احداھا ھذہ: (بعد ثلاثۃ اسطر) ففی المسئلۃ الاولیٰ: الشجر یکون للمسجد، لانہ بمنزلۃ بناء المسجد.

وفی الخانیۃ علی الھندیۃ (۳/۳۱۰): ولو غرس فی المسجد یکون للمسجد لانہ لایغرس لنفسہ فی المسجد ..... مسجد فیہ شجرۃ التفاح قال بعضھم یباح للقوم ان یفطروا بھذا التفاح والصحیح انہ لایباح لان ذالک صار للمسجد یصرف الی عمارۃ المسجد.

(۳۸۲) جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور انہی میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ (۱) کوئی آدمی جوتے پہن کر مسجد میں آ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) حرم وغیرہ میں ان جوتوں میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جوتے اگر ایسے ہوں کہ سجدے میں دونوں پیروں کی انگلیاں زمین پر لگنے سے مانع نہ ہوں اور ناپاک نہ ہوں تو ایسے

جوتوں میں اگر نماز پڑھ لی جائے گرچہ مسجد میں ہی کیوں نہ ہو درست ہو جائے گی البتہ آجکل رواج یہی مناسب ہے کہ جوتوں کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آجکل مساجد میں فرش اور قالین ہوتا ہے جوتوں میں نماز پڑھنے کی وجہ سے ملوث ہونے یعنی مسجد کی تلویث کا خطرہ رہتا ہے۔

(۳)۔ اسی طرح گھر وغیرہ میں بھی جوتوں میں نماز پڑھنا درست ہے مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ۔

لما في فتح الملهم (۳/۱۲۹): قوله قال نعم الخ فيه جواز الصلوة في النعال والخفاف، اى اذا تحقق طهارتها، ويتمكن معهما من تمام السجود، بأن يسجد على جميع اصابع رجليه كما قاله الخطابي.

وفي الدر المختار مع رد المحتار (۱/۶۵۷): وينبغي لداخله تعاهد نعله وخفه وصلوته فيهما افضل (لا) يكره. (قوله وصلاته فيهما) اى في النعل والخف الطاهرين افضل مخالفة لليهود... قلت لكن اذا خشي تلويث فرش المسجد بها ينبغي عدمه وان كانت طاهرة واما المسجد النبوي فقد كان مفروشا بالحصى في زمنه ﷺ بخلافه في زماننا الخ.

وفي الشامية (۱/۴۴۷): (قوله وقدميه) يجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدة منهما يكفي كما ذكره بعد ح وافاد انه لو لم يضع شيئا من القدمين لم يصح السجود.

وفي الفقه الاسلامي (۱/۵۵۳): السنة لمن اراد دخول المسجد أن يتفقد نعليه ويمسح ما فيهما من اذى قبل دخوله لحديث: (اذا جاء احدكم المسجد فلينظر فان رأى في نعليه قذرا او اذى فليمسحه وليصل فيهما.

﴿کتاب الجنائز والشھید﴾

(نماز جنازہ، تجہیز و تکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

(۳۸۳) میت کو غسل دیتے وقت کان وناک کے سوراخوں میں روئی رکھنے کا حکم

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جس وقت میت کو غسل کیلئے تختے پر لٹایا جائے تو پہلے میت کے ناک وکان کے سوراخوں میں روئی کی پھریری رکھنے کا جو دستور ہے اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔۔ ظاہر الروایات سے تو اس کا ثبوت نہیں ملا لیکن غیر ظاہر الروایت میں امام ابوحنیفہؒ سے ایک قول مروی ہے کہ بعد الغسل روئی کی پھریری میت کے اعضائے مذکورہ میں رکھ دے۔

لما فی الدر المختار(۱۹۸/۲): ولاباس بجعل القطن علی وجهه وفی مخارقه کدبر وقبل واذن وفم.

وفی الشامية(۱۹۸/۲): (قوله ولا باس الخ) كذا فی الزيلعی واشار الی ان ترکه اولیٰ قال فی الفتح وليس فی الغسل استعمال القطن فی روايات الظاهرة وعن ابی حنيفة انه يجعل فی منخريه وفمه وقال بعضهم فی صماخه ايضاً وقال بعضهم فی دبره ايضاً قال فی الظهيرية واستقبحه عامة العلماء لكن فی الحلية انه منقول عن الشافعی وابی حنيفة فاطلاق انه قبيح ليس بصحيح الخ

(۳۸۴) میت کو غسل دیتے وقت سر کے مسح کا حکم

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میت کو غسل دیتے وقت سر کا مسح کرنا بھی سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً۔ صحیح قول کے مطابق میت کو غسل سے پہلے وضو کراتے وقت اس کے سر پر مسح کیا جائے گا۔

لما فی الدر المختار(۱۹۶/۲): ويبدأ بوجهه ويمسح رأسه. وقال الشامی تحت قوله يمسح رأسه ای فی الوضوء وهو ظاهر الرواية كالجنب بحر.

وفی الهندية(۱۵۸/۱): الفصل الثانی فی الغسل... واختلفوا فی مسح رأسه والصحيح انه يمسح رأسه

(۳۸۵) میت کو غسل دینے کے بعد اگر نجاست خارج ہوجائے تو غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر میت کو کفن دینے کے بعد کوئی نجاست خارج ہوتو کیا اسے دوبارہ غسل دیا جائے گا یا پہلا غسل کافی ہے اور صرف نجاست کو دھو دیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں دوبارہ غسل دینے کی ضرورت نہیں پہلے والا غسل کافی ہے صرف محل نجاست کو دھولیا جائے جہاں پر نجاست لگی ہے اس مقام کو دھولیا جائے۔

لما فی الھندیۃ (۱/۱۵۸): ویمسح بطنہ مسحاً رفیقاً تحرزاً عن تلویث الکفن فان خرج منہ شیٔ غسلہ ولا یعید غسلہ ولا وضوءہ ثم ینشفہ بثوب کیلا تبتل اکفانہ الخ.

وفی ملتقی الابحر (۱/۱۵۶): فان خرج منہ شیٔ غسلہ ولا یعید غسلہ ولا وضوءہ وینشفہ بثوب الخ.

وفی الدر المختار مع الشامیۃ (۲/۱۹۷): ولا یعاد غسلہ ولا وضوءہ بالخارج منہ لان غسلہ ما وجب لرفع الحدث لبقائہ بالموت بل لتنجسہ بالموت کسائر الحیوانات الدمویۃ الا ان المسلم یطھر بالغسل کرامۃ لہ وقد حصل بحر.

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وقد حصل) ای الغسل ویطھر النجاسۃ بعدہ لایعاد بل یغسل موضعھا.

(۳۸۶) کوئی شخص کسی حادثہ میں مرجائے اور اعضاء متفرق ہوجائیں تو غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص آگ میں جھلس کر مرگیا اس کے بعض اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گئے اور بعض راکھ بن گئے۔ اسی طرح سے ایک شخص گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگیا اور اس کے بھی بعض اعضاء دھماکے میں بکھر گئے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ اس کا سر کہاں ہے؟ ایسے اشخاص کے بارے میں غسل اور ان کی نماز جنازہ کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر میت کے جسم کے اکثر اعضاء یا آدھا جسم سر کے ساتھ موجود ہوتو اس صورت میں اس کو غسل بھی دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی لیکن اگر میت کا آدھا جسم بغیر سر کے یا آدھے سے بھی کم جسم (اگرچہ سر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) پایا گیا تو اس کو نہ ہی غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ بلکہ اس کو یونہی دفن کردیا جائے گا۔

لما فی الھندیۃ (۱/۱۵۹): ولو وجد اکثر البدن او نصفہ مع الراس یغسل ویکفن ویصلی علیہ کذا فی المضمرات وان وجد نصفہ من غیر الراس او وجد نصفہ مشقوقاً طولاً فانہ لایغسل ولا

يصلى عليه ويلف في خرقة ويدفن فيها كذا في المضمرات.

وفي الدر المختار ورد المحتار (٢/١٩٩): (وجد رأس آدمي) او احد شقيه (لا يغسل ولا يصلى عليه) بل يدفن الا ان يوجد اكثر من نصفه ولو بلا رأس الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله ولو بلا رأس) وكذا يغسل لو وجد النصف مع الرأس بحر.

(٣٨٧) عورت کی میت کو نہلاتے وقت اس کے ستر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مردہ عورت کو نہلاتے وقت پورے بدن پر کپڑا ڈالنا ضروری ہے یا مردوں کی طرح صرف گھٹنوں اور ناف تک چھپانا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں عورت کا عورت سے اسی قدر پردہ ہے جتنا مرد کو مرد سے اس لئے عورت کو نہلاتے وقت صرف ناف سے گھٹنوں تک ڈھانپنا کافی ہے۔

كما في الدر المختار (٢/١٩٥): عبارة الزيلعي حتى يغسل وعبارة النهر قبل غسله (وتستر عورته الغليظة فقط على الظاهر) من الرواية (وقيل مطلقا) الغليظة والخفيفة (وصحح) صححه الزيلعي وغيره (ويغسلها تحت خرقة) السترة (بعد لف) خرقة (مثلها على يديه)

وفي الشامية تحته: (قوله صححه الزيلعي وغيره) والاول صححه في الهداية وغيرها لكن قال في شرح المنية ان الثاني هو الماخوذ به لقوله عليه الصلوة والسلام لعلي "لاتنظر الى فخذ حي ولا ميت" لان ما كان عورة لا يسقط بالموت. وهذا شامل للمرأة والرجل لان عورة المرأة للمرأة كالرجل للرجل.

(٣٨٨) عورت کو کفن دیتے وقت بالوں کو کس طرح رکھا جائے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفن کے وقت عورت کے سر کے بالوں کو کیسے رکھا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں عورت کے سر کے بالوں کو دو حصے کر کے سینے کے اوپر دائیں بائیں رکھا جائے۔

وفي الهندية (١/١٦١): ويجعل شعرها ضفيرتين على صدرها فوق الدرع.

وفي الدر المختار (٢/٢٠٢): ويجعل شعرها ضفيرتين على صدرها فوقه اي الدرع.

(۳۸۹) آبِ زمزم سے احرام کی چادریں دھو کر کفن کے لیے رکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے میری خالہ جو کہ میری ساس بھی ہیں نے ایک نصیحت کی ہے کہ میں اس سال آپ حج پر جا رہے ہو اپنے احرام کا ساتھ زمزم میں خرید وہ جو میاں اور پھر گھر آ کر اس کو تھوڑا کر کے کفن کی نیت سے رکھ دینا۔ کیا اس طرح کرنا بدعت تو نہیں ہوگا؟ اور اس میں کوئی شرعی مانع تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اپنے مرنے سے پہلے کفن تیار کرنا اور اسی طرح مقدس چیزوں سے تبرک حاصل کرنا شرعاً جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ احرام کی چادروں کو آبِ زمزم سے دھو کر اپنے کفن کے لیے رکھ سکتے ہیں، نہ یہ بدعت میں شامل ہے اور نہ اس میں کوئی شرعی مانع ہے۔

لما في مرقاة المفاتيح (۴/۱۰۲): وعن عبدالله بن عباس قال ان رجلا كان مع النبي ﷺ فوقصته ناقته وهو محرم فمات فقال رسول الله ﷺ ((اغسلوه بماء وسدر وكفنوه في ثوبيه ولا تمسوه بطيب ولا تخمروا راسه فانه يبعث يوم القيامة ملبيا)) متفق عليه. وقد قال عليه الصلوة والسلام في ذلك المحرم كفنوه في ثوبيه وهما ثوبا احرامه ازاره ورداؤه ومعلوم ان ازاره من الحقو وكذا حديث ام عطية.

وفي عمدة القاري (۸/۹۳ ط ۶۱): (باب من استعد الكفن في زمن النبي ﷺ فلم ينكر عليه) واستفيد من ذلك جواز تحصيل ما لا بد للميت منه من كفن ونحوه في حال حياته لان الغسل مما ينظر فيه الرجل في الوقت المهمل وفسحة الاجل الاعتداد للمعاد. وفيه التبرك بآثار الصالحين وفيه جواز اعداد الشيء قبل وقت الحاجة اليه

وفي فتح الباري (۳/۱۰۳ ط ۱۰۸): (قوله باب الكفن في القميص الذي يكف او لا يكف) وكذا رايته في اصل ابي القاسم بن الورد قال والذي يظهر لي ان البخاري لحظ قوله تعالى استغفر لهم او لا تستغفر لهم اي ان النبي ﷺ البس عبدالله بن ابي قميصه سواء كان يكف عنه العذاب او لا يكف استصلاحا للقلوب المؤلفة فكانه يقول يؤخذ من هذا التبرك بآثار الصالحين سواء علمنا انه مؤثر في حال الميت او لا.

واستنبط منه الاسماعيلي جواز طلب آثار اهل الخير منهم للتبرك بها وان كان السائل غنيا فيستفاد منه جواز تحصيل ما لا بد للميت منه من كفن ونحوه في حال حياته.

(۳۹۰) نمازِ جنازہ کی ترتیب اور تکبیرات کا حدیث سے ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی ترتیب کیا ہوگی؟ نیز اس میں تکبیریں چار ہیں یا پانچ؟ حدیث سے چار کا ثبوت ملتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات ہوتی ہیں، پہلی تکبیر کہہ کر سبحانک اللھم الخ پڑھا جائے پھر دوسری تکبیر کہہ کر درود شریف پڑھا جائے پھر تیسری تکبیر کہہ کر میت کیلئے دعا پڑھی جائے اور تمام مسلمانوں کیلئے دعا کی جائے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اللھم اغفر لحینا ومیتنا الخ ثابت ہے۔ اگر میت چھوٹا بچہ ہے تو دعا میں اللھم اجعلہ لنا فرطاً واجعلہ لنا اجراً وذخراً واجعلہ لنا شافعاً ومشفعاً پڑھے۔ اور اگر بچی ہو تو اللھم اجعلہا لنا فرطاً الخ پڑھے پھر چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں طرف سلام پھیر دے۔ اور جنازے میں چار تکبیروں کا ثبوت حضرت ابو ہریرۃؓ، عبداللہ بن ابی اوفیؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور یزید بن ثابتؓ کی احادیث سے ہوتا ہے، نیز حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

لما فی الترمذی (۱/۱۹۸): کما جاء عن ابی ھریرۃ: ان النبی ﷺ صلی علی النجاشی فکبر اربعاً۔ وفی الباب عن ابن عباسؓ وابن ابی اوفیؓ وجابرؓ وانسؓ ویزید بن ثابت۔ قال ابو عیسی حدیث ابی ھریرۃ ھذا حدیث حسن صحیح۔

وفی الھندیۃ (۱/۱۶۴): وصلاۃ الجنازۃ اربع تکبیرات ولو ترک واحدۃ منھا لم تجز صلاتہ ھکذا فی الکافی یکبر للافتتاح ویقول سبحانک اللھم الخ ثم یکبر اخری ویصلی علی النبی ﷺ ثم یکبر اخری ویدعو للمیت ولجمیع المسلمین ولیس فیھا دعاء موقت وعن رسول اللہ ﷺ انہ کان یقول اللھم اغفر لحینا ومیتنا الخ فان کان المیت صغیراً عن ابی حنیفۃ انہ یقول اللھم اجعلہ لنا فرطاً الخ ثم یکبر الرابعۃ ثم یسلم تسلیمتین۔

وفی الدر المختار مع التنویر (۲/۲۰۲): وھی اربع تکبیرات کل تکبیرۃ قائمۃ مقام رکعۃ یرفع یدیہ فی الاولی فقط ... ویثنی بعدھا وھو سبحانک اللھم وبحمدک" ویصلی علی النبی ﷺ کما فی التشھد بعد الثانیۃ ... ویدعو بعد الثالثۃ ... ویسلم بلا دعاء بعد الرابعۃ"۔

(۳۹۱) نمازِ جنازہ کی ثناء میں اور درود شریف میں زیادتی کا حدیث سے ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں جو ثناء پڑھی جاتی ہے جس میں وجل ثناؤک کی زیادتی ہے اسی طرح درود شریف میں زیادتی ہے آیا یہ حدیث سے ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ثناء کے متعلق جو مشہور روایات ہیں ان میں یہ وجل ثناؤک کے الفاظ نہیں ہیں، اسی طرح درود شریف میں بھی کوئی زیادتی نہیں ہے لیکن بعض شاذ روایات میں یہ زیادتی موجود ہے لہٰذا اگر کہہ دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی فتح القدیر (۱/۲۹۰): وان کان روی فی الجملۃ عن ابن عباس فی حدیث طویل من قولہ وذکرہ ابن ابی شیبۃ وابن مردویۃ فی کتاب الدعا لہ ورواہ الحافظ ابو شجاع فی کتاب فردوس عن ابن مسعودؓ ان من احب الکلام الی اللہ عزوجل ان یقول العبد سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک وجل ثناؤک ولا الہ غیرک وابغض الکلام الی اللہ ان یقول الرجل للرجل اتق اللہ فیقول علیک نفسک.

وفی فتح القدیر (۱/۳۱۷): وروی البیھقی عن یحیی بن السباق عن رجل من بنی الحارث عن ابن مسعود عنہ ﷺ اذا تشھد احدکم فی الصلاۃ فلیقل اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد وبارک علی محمد وعلی آل محمد وارحم محمدا وآل محمد کما صلیت وبارکت وترحمت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید.

(۳۹۲) نمازِ جنازہ مکروہ اوقات میں پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کن کن اوقات میں مکروہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: نمازِ جنازہ کا پڑھنا سورج کے طلوع وغروب کے وقت اور عین دوپہر کے وقت مکروہ ہے البتہ جنازہ اسی وقت تیار ہو جائے تو صحیح ہے۔

لما فی نور الایضاح (ص ۵۰): ثلاثۃ اوقات لایصح فیھا شیٔ من الفرائض والواجبات التی لزمت فی الذمۃ قبل دخولھا عند طلوع الشمس الی ان ترتفع وعند استوائھا الی ان تزول وعند اصفرارھا الی ان تغرب ویصح اداء ما وجب فیھا مع الکراھۃ کجنازۃ حضرت وسجدۃ آیۃ تلیت فیھا کما صح عصر الیوم عند الغروب مع الکراھۃ.

وفی الھندیۃ (۱/۵۲): ثلاث ساعات لا تجوز فیھا المکتوبۃ ولا صلاۃ الجنازۃ ولا سجدۃ تلاوۃ.... فلو وجبتا فی ھذا الوقت وادیتا فیہ جاز لأنھا أدیت ناقصۃ کما وجبت. کذا فی السراج الوھاج.

وفی الشامیۃ (۱/۳۷۳): (قولہ وصلاۃ جنازۃ) فیہ أنھا تصح مع الکراھۃ کما فی البحر ..... (قولہ فلو وجبتا فیھا) ای بأن تلیت الآیۃ فی تلک الأوقات أو حضرت فیھا الجنازۃ، قولہ أو تحریما) افاد ثبوت الکراھۃ التنزیھیۃ اھ.

(۳۹۳) نماز جنازہ میں تکبیرات چھوٹنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر نماز جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیرات چھوٹ جائیں تو اب وہ انہیں کیسے ادا کرے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۱)۔نماز جنازہ اگر مکروہ وقت میں حاضر ہو جائے اس کو مکروہ وقت ہی میں پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں اور اگر جنازہ مکروہ وقت سے پہلے حاضر کردیا جائے پھر اس کو مکروہ وقت میں ادا کرنا جائز نہیں۔

(۲)۔اگر نماز جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیریں چھوٹ جائیں تو وہ ان کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرے گا پھر اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف نہ ہو تو تکبیرات کے ساتھ ساتھ دعا ماثورہ وغیرہ بھی پڑھنی چاہئے اور اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف ہو تو پھر صرف تکبیرات کہہ لے دعا وغیرہ نہ پڑھے۔

لما فی الشامیۃ(۱:۳۷۲)، واعلم أن الأوقات المکروھۃ نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب، والثانی مابین الفجر والشمس ومابین صلاۃ العصر الی الاصفرار. فالنوع الأول لاینعقد فیہ شیء من الصلوات التی ذکرناھا اذا شرع بھا فیہ وتبطل ان طرأعلیھا الاصلاۃ جنازۃ حضرت فیھا وسجدۃ تلیت آیتھا فیھا وعصر یومہ والنفل والنذر المقیدیھا وقضاء ماشرع بہ فیھا لم افسدہ فتنعقد ھذہ الستۃ بلا کراھۃ أصلا فی الأولی منھا، ومع الکراھۃ التنزیھیۃ فی الثانیۃ والتحریمۃ فی الثالثۃ وکذا فی البواقی.

وفی الدر المختار(۲/۲۱۷) (فلو جاء) المسبوق (بعد تکبیرۃ الامام الرابعۃ فاتتہ الصلاۃ) لتعذر الدخول فی تکبیرۃ الامام وعند ابی یوسف یدخل لبقاء التحریمۃ فاذا سلم الامام کبر ثلاثا کمافی الحاضر وعلیہ الفتوی.

(۳۹۴) نماز جنازہ میں امامت کا زیادہ مستحق کون ہے؟ اور عصبہ کا شرعی معنی

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز میں امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ عصبہ کا شرعی معنی کیا ہے ان کی ترتیب کیا ہے؟ وہ کتنے افراد پر مشتمل ہے نیز اگر کسی شخص کا دوسرے شہر میں انتقال ہو جائے تو اس میت کو اپنے وطن اصلی میں لا کر دفن کرنا اور نماز جنازہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً نماز جنازہ کی امامت میں سب سے مستحق بادشاہ یا اس کا نائب ہے بشرطیکہ یہ موجود ہوں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو قاضی اس کے بعد شہر کا امیر ہے اگر امیر شہر نہ ہو تو اس کا نائب مستحق قائم مقام ہوا اگر یہ نہ ہو تو پھر قاضی کا خلیفہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر امامت کا

زیادہ استحقاق میت کے محلے کی مسجد کے امام کو حاصل ہے اور اس کے بعد میت کا وہ قریبی جو نکاح میں ولایت کی ترتیب کی طرح مستحق اور میت کے سب سے زیادہ قریب ہو درجہ بدرجہ آخر تک جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

(2) شریعت میں عصبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کیلئے کوئی متعین حصہ مال وراثت میں مقرر نہ کیا گیا ہو بلکہ ذوی الفروض (جن کے متعین حصے بیان کیے گئے ہیں) کے حصے سے جو مال بچ جائے ان کو ملتا ہو، نیز جب ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا مال انہی کو ملتا ہو، پھر عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عصبہ بالنسب، (۲) عصبہ بالسبب اور عصبہ بالنسب کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) عصبہ بنفسہ، (۲) عصبہ بغیرہ، (۳) عصبہ مع غیرہ۔ اب مذکورہ بالا اقسام میں جنازہ کی امامت میں عصبہ بنفسہ کا اعتبار ہوتا ہے جس کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) میت کا جزء جیسے بیٹا، (۲) میت کا اصل جیسے باپ، (۳) میت کے باپ کا جزء جیسے میت کا بھائی

(۴) میت کے باپ کے باپ کا جزء جیسے میت کا چچا۔

(3) اگر کسی شخص کا انتقال دوسرے شہر میں ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ اسی شہر میں دفن کر دیا جائے البتہ اگر میت کو اپنے وطن میں دفن کرانا ہو تو لا کر اپنے وطن میں دفن کیا جائے تب بھی شرعاً جائز ہے البتہ ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔

لما في اعلاء السنن (۸/ ۲۵۱): عن الحسين بن علي (مرفوعا) "اذا حضرت الجنازة فالامام احق بالصلاة عليها من غيره"، رواه ابن منيع.

وفي القدوري (ص ۳۹): واولى الناس بالامامة عليه السلطان ان حضر فان لم يحضر فيستحب تقديم امام الحي ثم الولي.

وفي الشامية (۲/ ۲۳۹): (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا، وقيل الى مادون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل او ميلين لان مقابر البلد وربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر واما نقله بعد دفنه فلا مطلقا

وفي الدر المختار (۳/ ۷۶): (الولي في النكاح العصبة بنفسه) وهو من يتصل بالميت حتى المعتقة

وفي الشامية تحته: (قوله العصبة بنفسه) خرج به العصبة بالغير كالبنت تصير عصبة بالابن ولا ولاية لها على امها المجنونة وكذا العصبة مع الغير كالاخوات مع البنات ولا ولاية للاخت على اختها المجنونة.

وفي مراقي الفلاح مع الطحطاوي (ص ۶۰۵): (فان نقل قبل الدفن قدر ميل او ميلين) ونحو ذلك (لا بأس به) لان المسافة الى المقابر قد تبلغ هذا المقدار (وكره نقله لاكثر منه) اي اكثر من الميلين كذا في الظهيرية وقال شمس الائمة السرخسي: وقول محمد في الكتاب لابأس ان ينقل الميت قدر ميل او ميلين بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه قاله قاضيخان وقد قال قبله لو مات في غير

بلدة يستحب تركه فان نقل الى مصر آخر لاباس به لما روى ان يعقوب صلوات الله عليه مات بمصر ونقل الى الشام وسعد بن ابى وقاص مات فى ضيعة على اربعة فراسخ من المدينة ونقل على اعناق الرجال الى المدينة قلت: يمكن الجمع بان الزيادة مكروهة فى تغير الرائحة او خشيتها وتنتفى بانتفائها لمن هو مثل يعقوب عليه السلام او سعدؓ لانهما من احياء الدارين (قوله اى اكثر من الميلين) كثرة فاحشة اما الزيادة عليهما بقدر يسير فلا تضر فلا ينافى قوله قيل ونحو ذلك (قوله بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه) اى تحريما لان قدر الميلين فيه ضرورة ولا ضرورة فى النقل الى بلد آخر وقيل: يجوز ذلك الى مادون مدة السفر وقيل فى مدة السفر ايضاً كذا فى حلبى وفيه ان كلام محمد مطلق عن قيد لضرورة وايضا لاتظهر الكراهة فى نقله من بلد الى بلد الا اذا كانت المسافة اكثر من ميلين　　قوله (وان نقل الى مصر آخر لاباس به) وظاهره عدم كراهة النقل من بلد الى بلد مطلقا، قوله (لما روى ان يعقوب الخ) وموسىٰ عليه السلام نقل تابوت يوسف عليه السلام من مصر الى الشام بعد زمان قوله (قلت الخ) اصله للكمال فانه قال فى رده كلام صاحب الهداية فى التجنيس انه لا اثم فى النقل من بلد الى بلد لما نقل ان يعقوب الخ ما نصه ان ذلك شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه من شرعنا ولان اجساد الانبياء عليهم السلام اطيب مايكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضى الله عنه ليسوا كغيرهم ممن جيفتهم اشد نتنا من جيفة البهائم فلا يلحق بهم

(۳۹۵) نومولود جو رویا نہیں اور تین گھنٹے بعد مر گیا اس کی نماز جنازہ کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک بچہ پیدا ہوا اور رویا بھی نہیں تین گھنٹے کے بعد فوت ہوگیا کیا اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً　صورت مسئولہ میں بچہ جب زندہ پیدا ہوا تھا اس میں ایسے اثرات تھے، جو اس کی زندگی پر دلالت کرتے ہوں، مثلاً کھانسے، جمائی لے، روئے یا کسی اندام کو حرکت دے (صرف کسی اندام کے کھینچنے اور پھیلانے کا اعتبار نہیں ہے) پھر فوت ہوا تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

لما فى الشامية مع الدر المختار (۲۲۷/۲): ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه، قوله اى وجد منه مايدل على حياته اى من بكاء او تحريك عضو او طرف ونحو ذلك بدائع، وهذا معناه فى الشرع كما فى البحر: وقال فى الشرنبلالية: يعنى الحياة المستقرة، ولا عبرة لانقباض وبسط اليد وقبضها.

لأن هذه الأشياء حركة المذبوح ولا عبرة بها الخ۔

(۳۹۶) مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا اور اس کی جائز صورتیں کون کون سی ہیں؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اکثر یہاں دیکھا جاتا ہے کہ جنازہ محراب کے اندر رکھ کر محراب کے سامنے امام کھڑے ہو جاتے ہیں اور مقتدی حضرات مسجد میں صف آرا ہوتے ہیں بعد میں نمازِ جنازہ پڑھ دی جاتی ہے کیا یہ طریقہ صحیح ہے اور عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھنے کی تین صورتیں ہیں احناف کے نزدیک تینوں مکروہ ہیں، البتہ ایک صورت کو احناف نے مستثنیٰ کیا ہے کہ جنازہ باہر ہو اور امام اور بعض افراد بھی باہر ہوں تو جائز ہے کیونکہ علت عدم جواز نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ باقی صورتیں ناجائز ہیں۔

لما في الهندية (۱/۱۶۵): وصلاة الجنازة في المسجد الذي تقام فيه الجماعة مكروهة. سواء كان الميت والقوم في المسجد أو كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد أو كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقي في المسجد أو الميت في المسجد والامام والقوم خارج المسجد، هو المختار كذا في الخلاصة ولا تكره بعذر المطر ونحوه الخ۔

وفي شرح العناية على هامش فتح القدير (۲/۱۲۸): وإن كانت الجنازة والإمام وبعض القوم خارج المسجد. والباقي فيه لم تكره بالاتفاق الخ۔

(۳۹۷) جو شخص جل گیا صرف ہڈیاں رہ گئیں تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص جل جائے گوشت پوست وغیرہ سب کچھ ختم ہو گیا صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں ڈھانچہ بالکل ختم ہو گیا اس پر جنازہ وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً صرف ہڈیوں پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں اس لئے کہ نمازِ جنازہ پورے جسم یا جسم کے اکثر حصے پر مشروع ہے اور پورا جسم گوشت پوست ہڈیوں کے مجموعہ کا نام ہے صرف ہڈیوں کو جسم اور بدن نہیں کہا جاتا۔ جیسا کہ صاحب بحر علامہ ابن نجیم کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بدن پھولا پھٹا نہ ہو بدن سلامت ہو تو پھر قبر کے سامنے میت پر نمازِ جنازہ پڑھا جائے گا اگر پھول پھٹ جائے تو پھر اس پر جنازہ نہیں پڑھا جائے گا اس لئے کہ وہ پھر پورے بدن کے حکم میں نہیں ہوتا بلکہ اعضاء کے حکم میں ہوتا ہے۔

وفي البحر الرائق (۲/۱۸۲): لأنه لا يصلي عليه بعد التفسخ لأن الصلوة شرعت على بدن الميت فاذا تفسخ لم يبق بدنه قائما

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ امداد الاحکام (۱/۸۲۰) میں اسی قسم کے سوال کے بارے میں لکھتے ہیں:

قلت والظاهر ان البدن يطلق على مجموع اللحم والعظام لا على العظام وحدها.

خیر الفتاوی (۳/۲۷۸) میں ہے: "ہڈیوں کے ڈھانچے پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔ الخ"

(۳۹۸) خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک عورت اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی، اب اس کے بھائی وغیرہ کو لوگ [illegible] ہیں اور مختلف طعنے دیتے ہیں۔ گزشتہ روز اس عورت کے بھائی نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرلی ہے۔ کیا اس شخص کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا شرعاً درست ہے؟ اور گاؤں والوں کا اس عورت کے گھر والوں کو اس طرح طعنہ وغیرہ دینا از روئے شریعت کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی مگر اس نماز جنازہ میں اہل علم وفضل کا شریک ہونا مناسب نہیں ہے خواہ مقتدی کی حیثیت سے ہو یا امام کی حیثیت سے۔ گاؤں والوں کا اس طرح طعن وتشنیع کرنا از روئے شریعت ناجائز ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ایسے حرکت کرنے والوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

لما في القرآن الكريم (النور ۱۹): ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة في الذين آمنوا لهم عذاب اليم في الدنيا والآخرة والله يعلم وانتم لا تعلمون.

وفي الشامية (۲/۲۱۱، ۲۱۲): قد يقال لا دلالة في الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى انه عليه الصلاة والسلام لم يصل عليه. فالظاهر أنه امتنع زجرا لغيره عن مثل هذا الفعل كما امتنع عن الصلاة على المديون ولا يلزم من ذلك عدم صلاة أحد عليه من الصحابة، اذ لا مساواة بين صلاته وصلاة غيره.

وفي الفقه الاسلامي (۲/۵۰۹): ومن قتل نفسه عمداً يغسل ويصلى عليه، على المفتى به عند الحنفية وعند الشافعية وان كان اعظم وزراً من قاتل غيره لأنه فاسق غير ساع في الأرض بالفساد وان كان باغياً على نفسه كسائر فساق المسلمين. ورأى قوم كأبي يوسف وابن الهمام انه لا يصلى عليه لما في صحيح مسلم انه عليه السلام اتي برجل قتل نفسه فلم يصل عليه.

وقال المالكية ايضاً ويندب لاهل الفضل ان يجتنبوا الصلاة على المبتدعة ومظهري الكبائر ردعاً لامثالهم

(۳۹۹) نومولود بچی کو جان بوجھ کر مار دینے کے بعد بغیر جنازہ پڑھے دفنا دیا اس پر جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دوست کے گھر لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی تو زندہ پیدا ہوئی لیکن اس کو جان بوجھ کر مارا گیا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی، اب اس کا کیا حکم ہے؟ مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں مع حوالہ جات۔

الجواب حامداً ومصلیاً ... مذکورہ واقعہ کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ایک مسلمان نے ایسی حرکت کی، جس کے سبب وہ حیوانیت کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بچیوں کو مارنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، مشرکین عرب زمانہ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور بچی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے بلکہ اس وقت بھی شرفاء عرب یہ حرکت نہیں کرتے تھے اور ذلیل اور جاہل اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ یہ حرکت عملاً کفر اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے جو کہ حکیم ذات ہے ناراضگی کا اظہار ہے اس پر توبہ واستغفار کیا جائے اور دل سے ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑایا اور رویا جائے ورنہ سخت پکڑ کا اندیشہ ہے اگر باپ نے قتل کیا ہے تو دیت بھی لازم ہوگی، اسی طرح نماز جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے جو گناہ لازم آیا اس کیلئے بھی کثرت سے توبہ واستغفار کیا جائے۔

تنبیہ ... اگر باپ کے علاوہ کسی اور نے قتل کیا ہے تو قتل کی کیفیت اور وضاحت لکھ کر حکم دریافت کر لیا جائے۔

لما في القرآن الكريم (بني اسرائيل: ۳۱) ولاتقتلوا اولادكم خشية املاق نحن نرزقهم واياكم ان قتلهم كان خطأ كبيراO

وفي الدر المختار (۶/ ۵۳۴، ۵۳۵): اى لايقتص الأصول وإن علوا مطلقا ولو إناثا من قبل الأم في نفس أو اطراف بفروعهم وإن سفلوا لقوله عليه الصلوة والسلام ((لايقاد الوالد بولده)) وهو وصف معلل بالجزئية فيتعدى لمن علا لأنهم أسباب في إحيائه فلا يكون سببا لافنائهم وحينئذ فتجب الدية في مال الاب في ثلاث سنين لأن هذا عمد والعاقلة لاتعقل العمد.

(۴۰۰) نمازِ جنازہ جوتوں کے ساتھ پڑھنا نیز سلام پھیرتے وقت امام کس کی نیت کریگا

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز جوتوں کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے؟ نیز امام کو سلام پھیرتے وقت کس کی نیت کرنی چاہئے میت کی یا دیگر لوگوں کی یعنی مقتدیوں کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... (۱)۔ جنازے کی نماز جوتے پہن کر پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے اور وہ جگہ جہاں کھڑا ہے پاک ہو، اور اگر

جوتے پاؤں سے نکال کر اس کے اوپر کھڑا ہو جائے تو صرف جوتوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔

(۲) جنازے کی نماز میں سلام پھیرتے وقت مقتدی یوں کی نیت کرے گا میت کی نیت نہیں کرے گا کیونکہ میت خطاب کا اہل نہیں ہے۔

لما في البحر (۲/۱۹۵): لو قام على النجاسة وفي رجليه نعلان لم يجز ولو افترش نعليه وقام عليهما جازت وبهذا يعلم ما يفعل في زماننا من القيام على النعلين في صلاة الجنازة لكن لابد من طهارة النعلين

وفي الهندية (۱/۱۲۳): ولا ينوي الميت في التسليمتين بل ينوي بالاولى من عن يمينه وبالثانية من عن شماله كذا في سراج الوهاج

وفي الدر المختار مع الشامية (۱/۶۵۴): وصلاته فيهما افضل. (قوله وصلاته فيهما) اي في النعل والخف الطاهرين افضل مخالفة لليهود تتارخانية، وفي الحديث صلوا في نعالكم ولا تشبهوا باليهود

وفيه ايضا (۲/۲۱۳): قوله ناويا الميت مع القوم) كذا في الفتح وظاهره أنه ينوي الملئكة الحفظة ايضا ثم رأيته صريحا في شرح درر البحار وذكر في الخانية والظهيرية والجوهرة انه لا ينوي الميت قال في البحر وهو الظاهر لأن الميت لا يخاطب بالسلام حتى ينوي به اذ ليس اهلا له واقره في النهر

(۲۰۱) نمازِ جنازہ میں سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنا چاہیے یا پہلے؟

الجواب حامداً ومصلياً: تکبیرات کے ختم ہونے پر سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

لما في خلاصة الفتاوى (۱/۵۴): والاعتماد سنة وانما يعتمد كما فرغ من التكبير باليمنى على اليسرى وعند محمد رحمه الله الاعتماد سنة القراءة حتى اذا فرغ من التكبير يرسل فاذا شرع في القراءة يعتمد وفي القنوت في الوتر اختلف المشائخ فيه والاصح هو الاعتماد وفي القومة بين الركوع والسجود يرسل ولا يعتمد وكذا في كل قيام لا ذكر فيه ولا يطول كتكبيرات العيدين وفي صلوة الجنازة يعتمد

وفي الهندية (۱/۷۳): كل قيام فيه ذكر مسنون فالسنة فيه الاعتماد كما في حالة الثناء والقنوت وصلاة الجنازة وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كما في تكبيرات العيدين فالسنة فيه الارسال كذا في

النهاية وهو الصحيح كذا في الهداية وبه كان يفتي شمس الائمة السرخسي.

(۳۰۲) مسبوق اپنی بقیہ رکعات پڑھنے کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ چھوٹی ہوئی رکعتوں والا شخص اپنی نماز پوری کرنے کیلئے کس وقت اٹھے امام کے ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد یا دونوں طرف کے بعد؟

(۲)۔ اور نماز جنازہ میں ہاتھ کس وقت چھوڑے جائیں امام کے سلام کہنے سے پہلے یا بعد؟ جوابات دیکر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: (۱)۔ مسبوق اپنی بقیہ رکعتوں کو ادا کرنے کیلئے اس وقت اٹھے جب امام دوسری جانب سلام پھیر لے۔

(۲)۔ نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دیے جائیں۔

وفي الشامية (۱/۵۹۷): (قوله وينبغي أن يصبر الخ) أي لا يقوم بعد التسليمة أو التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام بعدهما كما في الفيض والفتح والبحر قال في الحجة: وليس هذا بلازم بل المقصود مايفهم أن لا سهو على الإمام أو يوجد له ما يقطع حرمة الصلاة اهـ وقيده في الفتح بحثا بما إذا اقتدى بمن يرى سجود السهو بعد السلام أما اذا اقتدى بمن يراه قبل السلام فلا.

وفي خلاصة الفتاوى (۱/۲۲۵): ولا يجوز الاستخلاف ولا يعقد بعد تكبير الرابع لانه لا يبقى ذكر مسنون حتى يعقد فالصحيح أنه يحل اليدين ثم يسلم تسليمتين هكذا في الذخيرة.

(۳۰۳) امام کا محراب میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھانا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے باہر جنازہ رکھا گیا اور امام صاحب محراب کے اندر کھڑے تھے؟ کیا امام صاحب کا محراب میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھانا صحیح ہے؟ اور کیا محراب کا حکم مسجد کا حکم ہے یا مسجد سے خارج ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ... نماز جنازہ کیلئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کوئی جگہ الگ مقرر کی جائے اور نماز جنازہ مسجد کی حدود (اگرچہ محراب ہی کیوں نہ ہو) میں پڑھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ محراب مسجد کے حکم میں ہے البتہ اگر کوئی عذر مثلاً جگہ کی تنگی وغیرہ ہو تو اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ امام کچھ مقتدیوں کے ساتھ محراب کے باہر کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھا سکتا ہے۔

لما في الدر المختار (۲/۲۲۵): (واختلف في الخارجة) عن المسجد وحده أو مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً خلاصة بناء على أن المسجد انما بني للمكتوبة الخ.

(ص ۲۲۹) وقال الشامي رحمه الله تعالى تحته: إنما تكره في المسجد بلا عذر، فإن كان فلا

(۳۰۴) دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب یہاں پر کوئی میت ہوتی ہے تو بسا اوقات اس کو گاؤں لے جاتے ہیں۔ کسی میت کے "ورثاء" یہاں پر بھی ہوتے ہیں اور گاؤں میں بھی ہوتے ہیں تو آیا شریعت کی روشنی میں میت کو دوبارہ جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ یہاں پر اس کے بیٹے نے نماز جنازہ پڑھائی ہو اور وہاں پر بھی جا رہا ہے جس نے جنازہ نہیں پڑھا ہے۔ مفصل بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: مسلمان میت پر اس کے ولی بیٹے وغیرہ کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھی جائے تو دوبارہ (جو بعد میں موجود ہوا ہو) نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اس لئے کہ ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھنے سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

لما في فتاوى الهندية (۱/۱۶۴): وإن صلى عليه الولي لم يجز لأحد أن يصلي بعده ولو أراد السلطان أن يصلي عليه فله ذلك لأنه مقدم عليه ولو صلى عليه الولي وللميت أولياء آخر بمنزلته ليس لهم أن يعيدوا كذا في الجوهرة النيرة.

وفي رد المحتار (۲/۲۲۳): فإن صلى غير الولي أو السلطان أعاد الولي لأن الحق للأولياء وإن صلى الولي لم يجز لأحد أن يصلي بعده ونحوه في الكنز وغيره فقوله لم يجز لأحد يشمل السلطان ثم رأيت في غاية البيان قال ما نصه هذا على سبيل العموم حتى لا تجوز الإعادة لا للسلطان ولا لغيره.

(۳۰۵) قبر کے اندر صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کے اندر سے صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں اسی طرح اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: میت کو دفن کرنے کے بعد نکالا جائے یا کسی عذر کی بنا پر میت کو قبر سے صحیح سلامت نکالا جائے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اسی طرح اس کو غسل بھی نہیں دیا جائے گا۔

لما في الدر المختار (۲/۲۰۵): (و) آدمي (منبوش طري) لم يتفسخ (يكفن كالذي لم يدفن) مرة بعد أخرى (وإن تفسخ كفن في ثوب واحد)

وفي الشامية (۲/۲۰۵): (قوله كالذي لم يدفن) أي يكفن في ثلاثة أثواب ... أي لو نبش ثانيا وثالثا

واکثر کفن کذلک مادام طریا من اصل ماله عندنا.

(۴۰۶) نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا طریقہ

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا کیا طریقہ ہے؟ امام نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ گاہ میں چارپائی کا ایک پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر دوسرا پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر تیسرا پھر چوتھا کیا ایسا کرنا صحیح ہے۔ نیز اس کو لازم سمجھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ صورتِ مسئولہ میں دس دس قدم چلنا صحیح ہے لیکن امام کا چارپائی کا پایا پکڑ کر وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا ثابت نہیں ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کا دائیں طرف والا پایا اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلیں پھر اس کے پیچھے والا پایا پکڑ کر دس قدم چلیں پھر میت کے بائیں طرف والا پایا اپنے بائیں کندھے پر آگے کی طرف سے دس قدم چلیں اسی طرح پیچھے والا پایا دس قدم چلیں اسطرح چالیس قدم ہو جائیں گے اور یہ چلنا قبرستان کی طرف ہے نہ کہ وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا۔ اور اس کو لازم بھی نہ سمجھا جائے اگر اس طریقے سے چلا جائے تو صحیح ہے صرف امام کا چارپائی کا پایا پکڑنے والا طریقہ خلافِ سنت ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۶۲): ثم ان فی حمل الجنازة شیئین نفس السنة وکمالها اما نفس السنة فهی ان تاخذ بقوائمها الاربع علی طریق التعاقب بان تحمل من کل جانب عشر خطوات وهذا یتحقق فی حق الجمع واما کمال السنة فلا یتحقق الافی واحد وهو ان یبدأ الحامل بحمل یمین مقدم الجنازة کذا فی التاتارخانیة فیحمله علی عاتقه الایمن ثم المؤخر الایمن علی عاتقه الایمن ثم المقدم الایسر علی عاتقه الایسر ثم المؤخر الایسر علی عاتقه الایسر هکذا فی التبیین.

وفی الشامیة (۲/۲۳۱): وفی شرح المنیة ویستحب ان یحملها من کل جانب اربعین خطوة للحدیث المذکور رواه ابوبکر النجار الخ ـــــ (قوله کذلک)ای عشر خطوات وهی معنی کذلک الثانیة ویمین الحامل یمین المیت ویسار الجنازة ویساره یساره ویمین الجنازة قهستانی.

(۴۰۷) عورت کیلئے جنازہ میں شرکت کرنے کا حکم

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت نمازِ جنازہ میں شرکت کر سکتی ہے؟ یعنی جماعت کے پیچھے عورتیں کھڑی ہو سکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ عورتیں نمازِ جنازہ میں فتنے کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکتیں البتہ اگر ساتھ کھڑی ہو گئیں تو نماز درست ہو جائے گی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۸۰): واما مایفسدها فما افسد الصلاة افسدها الا المحاذاة ...

وفي جوهرة النيرة (۱/۴۳): وإن قامت امرأة إلى جانب رجل لم تفسد عليه صلاته.

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح (ص۳۰۶): (ولا يحضرن الجماعات لما فيه من الفتنة والمخالفة) (قوله ولا يحضرن الجماعات) لقوله ﷺ "صلاة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها". قال الطحطاوي تحته فالأفضل لها ما كان أستر لها لا فرق بين الفرائض وغيرها كالتراويح إلا صلاة الجنازة فلا تكره جماعتهن فيها لأنها لم تشرع مكررة فلو انفردت تفوتهن.

(قوله والمخالفة) أي مخالفة الأمر لأن الله تعالى أمرهن بالقرار في البيوت فقال تعالى وقرن في بيوتكن وقال ﷺ "بيوتهن خير لهن لو كن يعلمن"

وفي الدر المختار (۱/۵۶۶): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيد ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (على المذهب المفتى به) لفساد الزمان واستثنى الكمال بحثا العجائز المتفانية

وفي الشامية (۱/۵۶۶): (قوله على المذهب المفتى به) أي مذهب المتأخرين قال في البحر وقد يقال هذه الفتوى التي اعتمدها المتأخرون ... وفيه نظر بل هو مأخوذ من قول الإمام وذلك أنه إنما منعها لقيام الحامل وهو فرط الشهوة بناء على أن الفسقة لا ينتشرون في المغرب ... الخ

(قوله واستثنى الكمال الخ) أي مما أفتى به المتأخرون لعدم العلة السابقة فيبقى الحكم فيه على قول الإمام فافهم.

(۴۰۸) عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں کیونکہ الدر المختار (۱/۵۶۵) پر ایک عبارت ہے جس سے جواز کی صورت معلوم ہوتی ہے عبارت ملاحظہ ہو "ویکرہ تحریما جماعة النساء ولو في التراويح في غير صلاة جنازة" اب آپ سے معلوم کرنا ہے کہ یہ بات درست ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس عبارت کو کہاں منطبق کریں گے اور اس کا محمل کیا ہوگا؟ کیا کسی خاص صورت میں فقہاء کہتے ہیں یا یہ بات مطلقاً ہے اگر اس جنازے میں مرد بھی شریک ہوں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اگر کل عورتیں ہیں تو اس صورت میں جواز معلوم ہو رہا ہے تو باقی فرائض اور تراویح میں اس کی کیوں ممانعت ہے؟ پھر تقریباً چھ سال پہلے جو امریکہ میں واقعہ پیش آیا تھا کہ عورت نے امامت کرلی تھی کیا وہ درست ہے اس عبارت کے تحت میں، براہ کرم تمام پہلوؤں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں کیونکہ یہ میرے سوال کا باقی حصہ ہے ساتھ آپ کو جزائے خیر عطا کرے آمین۔

الجواب حامداً ومصلیاً نماز جنازہ میں عورت صرف خواتین کی امامت کر سکتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں مکروہ ہے چاہے خواتین کی امامت ہی کیوں نہ ہو۔ سوال میں درج "الدر" کی عبارت کا مطلب اور محمل یہی ہے۔ نیز نماز جنازہ میں اگر مرد حضرات عورت کی اقتداء میں شریک ہو جائیں تو مردوں کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ مرد کیلئے کسی بھی نماز میں عورت کی اقتداء درست نہیں، البتہ اس صورت میں نماز جنازہ ادا ہو جائے گی اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ عورت کی نماز درست ہونے کی بناء پر سب کی طرف سے فریضہ ادا ہو گیا۔

نیز سوال میں مذکور "امریکہ میں پیش آمدہ واقعہ" کا جواز سوال میں درج "الدر" کی عبارت سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس عبارت سے فقط نماز جنازہ میں عورت کی امامت کا جواز صرف خواتین کیلئے ثابت ہوتا ہے۔ نماز جنازہ میں صرف خواتین کیلئے عورت کی امامت کا جواز اور دیگر نمازوں میں ممانعت کی وجہ فرق یہ ہے کہ اگر کسی نماز جنازہ میں صرف خواتین ہوں تو نماز جنازہ پڑھنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱)۔ بغیر جماعت کے علیحدہ علیحدہ نماز ادا کر لیں۔　　(۲)۔ کسی خاتون کی اقتداء میں جماعت کرا لیں۔

اول الذکر صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز جنازہ پوری کر لیتی ہے تو اس کی نماز سے فریضہ ادا ہو جائے گا کیونکہ نماز جنازہ فرض علی الکفایہ ہے کسی ایک فرد کے پڑھنے سے فریضہ ادا ہو جاتا ہے لہٰذا دیگر خواتین کی نمازیں نفل بن جائیں گی جبکہ نماز جنازہ نفل مشروع نہیں ہے۔ لہٰذا نماز جنازہ میں جبکہ صرف خواتین موجود ہوں مؤخر الذکر صورت متعین ہے۔ نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں یہ علت نہیں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک پر الگ الگ فرض یا سنت ہوتی ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ پڑھنے کی صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز سے فارغ ہوتی ہے تو دیگر خواتین کی نمازیں نہ تو نفل بن جاتی ہیں اور نہ ہی ان سے فریضہ ساقط ہوتا ہے۔ لہٰذا نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں عورت کی امامت مطلقاً مکروہ ہے۔

لما في المدونة الكبرى (۱/۱۷۸): عن ابن ابي ذئب عن مولى لبني هاشم اخبره عن علي بن ابي طالب انه قال: لا تؤم المرأة.

وفي الدر المختار (۱/۵۶۵): ويكره تحريماً (جماعة النساء) ولو في التراويح في غير صلاة جنازة لانها لم تشرع مكررة فلو انفردن تفوتهن بفراغ احداهن ولو امت فيها رجالاً لا تعاد لسقوط الفرض بصلاتها

وفي الشامية تحته: قال في الفتح، واعلم ان جماعتهن لا تكره في صلاة الجنازة لانها فريضة وترك التقدم مكروه فدار الامر بين فعل المكروه لفعل الفرض او ترك الفرض لتركه فوجب الاول. بخلاف جماعتهن في غيرها، ولو صلين فرادى فقد تسبق احداهن فتكون صلاة الباقيات نفلاً والتنفل بها مكروه، فيكون فراغ تلك موجباً لفساد الفرضية لصلاة الباقيات كتقييد الخامسة بالسجدة لمن ترك القعدة الاخيرة . ومفاده ان جماعتهن في صلاة الجنازة واجبة، حيث لم يكن غيرهن ولعل وجهه الاحتراز عن فساد فرضية صلاة الباقيات اذا سبقت احداهن، وفيه ان الرجال لو

صلوا منفردین یلزم فیھا مثل ذلک فیلزم علیہ وجوب جماعتھم فیھا مع ان المصرح بہ ان الجماعة فیھا غیر واجبة فتأمل.

وفی تقریرات الرافعی علی حاشیة ابن عابدین (۱/۴۲۷): انما یتم بارجاع ضمیر "لانھا" فریضة للجماعة کما فعل فی حاشیة البحر وھو خلاف الظاھر بل ھو راجع لصلاة الجنازة فانھا فرض کفایة علی کل منھن قال السندی نقلاً عن شرح المنیة ویستحب ان یصلین منفردات وتجوز جماعتھن. فمراد الفتح وغیرہ من الوجوب معناہ اللغوی ای ثبت الاول ویکون مقدما علی الترک لا علی الانفراد المستحب.

(۴۰۹) متوفیہ عورت کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ یا خاوند؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زن متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ کے ذمہ ہے یا خاوند کے ذمہ؟ محقق جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً زوجہ متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچ خاوند کے ذمہ لازم ہے۔

لما فی حلبی کبیر (۱/۵۸۳): وکفن الزوجة علی الزوج عند ابی یوسف وفی شرح السراجیة لمصنفہ اما المرأة اذا لم یکن لھا مال فکفنھا ومؤنتھا علی الزوج عند ابی حنیفة وابی یوسف الخ.

وفی الھندیة (۱/۱۶۱): وعلی قول ابی یوسف یجب الکفن علی الزوج وان ترکت مالا وعلیہ الفتوی الخ.

(۴۱۰) میت کو اپنے آبائی گاؤں میں منتقل کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک شہر کے اندر وفات پائی اس کو اس کے آبائی گاؤں لے جانے ہیں کیا میت کو منتقل کرنا جائز ہے جبکہ اس نے اس شہر کی وصیت بھی کی ہو کہ مجھ کو یہاں ہی دفن کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اگر میت کا آبائی گاؤں ایک دو میل سے زیادہ دور ہے تو پھر منتقل کرنا مکروہ ہے۔

لما فی الشامیة (۲/۲۳۹): (قولہ ولا بأس بنقلہ قبل دفنہ) قیل مطلقا وقیل الی مادون مدة السفر وقیدہ محمد بقدر میل او میلین لان مقابر البلد ربما بلغت ھذہ المسافة فیکرہ فیما زاد قال فی النھر عن عقد الفرائد: وھو الظاھر

وفی الفقہ الاسلامی (۲/۵۴۳): وقال الحنفیة والمالکیة: لا بأس بنقل المیت من بلد الی آخر ان

كان لم يدفن ، والنقل عند الحنيفة جائز قدر ميل أو ميلين لكن يندب دفنه في جهة موته أى في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل . انتهى.

(۴۱۱) قبر کتنی گہری کھودی جائے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کتنی گہری کھودی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قبر کی گہرائی کم از کم نصف قدِ آدم ہونی چاہئے اور اگر آدمی کے قد کے برابر کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

لما في حلبي كبير(ص ۵۹۶): مقدار عمق القبر قدر نصف قامة ذكره في الروضة وفي الذخيرة الى صدر الرجل او وسط القامة فان زادوا فهو افضل وان عمقوا مقدار قامة فهو احسن فعلم بهذا ان الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما بينهما.

وفي بحر الرائق(۲/ ۱۹۳): واختلفوا في عمق القبر فقيل قدر نصف القامة وقيل الى الصدر وان زادوا فحسن.

وفي النتف في الفتاوى(ص ۸۴): واما القبر فالمستحب فيه خمس خصال والمكروه فيه عشر خصال اما المستحب فيه فاولها ان يحفر القبر الى مبلغ السرة.

وفي طحطاوى (۱/ ۳۸۱): ويحفر القبر طوله على قدر طول الميت وعرضه على قدر نصف طوله قوله فان زاد فحسن فلو كان على قدر قامته فهو احسن.

وفي الدر المختار(۲/ ۲۳۳، ۲۳۴): (وحفر قبره) في غير دار (مقدار نصف قامة) فان زاد فحسن

وفي الشامية تحته: (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الى حد الصدر وان زاد الى مقدار قامة فهو احسن كما في الذخيرة فعلم ان الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما شرح المنية وهذا حد العمق والمقصود منه المبالغة في منع الرائحة ونبش السباع.

(۴۱۲) قبر کی گہرائی کتنی ہو؟ میت کو گھر میں رکھا جائے یا مسجد میں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر جب شق کی صورت میں ہو تو میت کو دفن کرنے کے بعد جو اوپر بانس یا پتھر وغیرہ رکھ کر مٹی ڈالی جاتی ہے اس میں یعنی پتھروں یا بانس اور میت کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ ہمارے یہاں میت اور ان پتھروں یا بانس کے درمیان بہت فاصلہ رکھا جاتا ہے تقریباً پتھر اور بانس زمین کے برابر ہوتے ہیں اور میت بہت نیچے، شریعت میں اس کا کیا حکم ہے کیا اس کی کوئی حد متعین ہے۔ از روئے شریعت اس کا کیا حکم ہے؟ جبکہ اس مٹی کے کم ڈالنے کی وجہ سے قبر ن

الجواب حامداً ومصلیاً: بلا ضرورت میت کو تابوت کے اندر رکھ کر دفنانا مکروہ ہے، اگر ضرورت ہو تو جائز ہے مثلاً زمین گیلی ہو یا کوئی اور ضرورت ہو تو بلا کراہت جائز ہوگا۔

لما في الهندية (١/١٦٦): ويحكى عن الشيخ الامام ابي بكر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت في بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ التابوت من حديد لا بأس به لكن ينبغي ان يفرش فيه التراب ويطين الطبقة العليا مما يلي الميت ويجعل اللبن الخفيف على يمين الميت وعلى يساره ليصير بمنزلة اللحد

وفي خلاصة الفتاوى (١/٢٢٦): وعن الامام ابي بكر محمد بن الفضل انه جوز اتخاذ التابوت في بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذوا تابوتاً من حديد فلا بأس به.

(۳۱۶) میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانے کا حکم اور نبی ﷺ کیلئے چٹائی بچھانے کی وجہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سننے میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال جس چٹائی پر ہوا تھا وہی چٹائی آپ کیلئے لحد میں بچھائی گئی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو پھر آپ ﷺ کیلئے کیوں بچھائی گئی؟

الجواب حامداً ومصلیاً: میت کے لئے قبر میں چٹائی بچھانا درست نہیں، آپ نے جو سنا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے لحد میں چٹائی بچھائی گئی تھی آپ نے غلط سنا ہے اصل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک سرخ رنگ کی چادر تھی جس کو آپ علیہ السلام کبھی نیچے بچھایا کرتے تھے اور کبھی اس کو اوپر لیا کرتے تھے، جب آپ علیہ السلام کا وصال ہوا تو حضرت شقران رضی اللہ عنہ (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) نے یہ سوچا کہ اب آپ کے بعد اس چادر کو پہننے کا کوئی اہل نہیں، اسی لئے یہ فرما کر اسے قبر میں ڈال دیا۔ واللہ لا یلبسها احد بعدك ابدا یعنی آپ کے بعد کوئی دوسرا اس چادر کو نہیں اوڑھ سکتا۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا کہ اس چادر کو دفن سے پہلے نکال لیا تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

لما في المرقاة (٣/٢٤٦): عن ابن عباس قال جعل في قبر رسول الله ﷺ قطيفة حمراء في النهاية القطيفة هي كساء له خمل وهو الهدب ومنه الحديث تعس عبد القطيفة اي الذي يعمل لها ويهتم بتحصيلها قال النووي وهذه القطيفة القاها شقران مولى من موالي رسول الله ﷺ وقال كرهت ان يلبسها احد بعده عليه الصلوة والسلام وقد نص الشافعي وغيره من الفقهاء على كراهة وضع القطيفة والمخدة ونحوهما تحت الميت في القبر فقيل ان ذلك من خواصه عليه الصلوة والسلام فلا يحسن في غيره قال الدارقطني نقلا عن وكيع ان ذلك من خصائصه عليه الصلوة والسلام قال التوربشتي

وذلک انه عليه الصلوة السلام كما فارق اهل الدنيا في بعض احكام حياته فارقهم في بعض احكام مماته فان الله تعالىٰ حرم على الارض لحوم الانبياء وحق لجسد عصمه الله عن البلى والاستحالة ان يفرش له في قبره لان المعنى الذى يفرش للحى له لم يزل عنه ﷺ بحكم الموت وليس الامر في غيره على هذا النمط وقال بعضهم تنازع عليؓ وعباسؓ فقصد شقران بوضعها دفع ذلک ذكره ابن حجر وهو بعيد جدا ـــــ قال ابن عبد البر في الاستيعاب انها اخرجت قبل اهالة التراب.

وفي البحر الرائق(۲/۱۹۳): وذكر في الظهيرية معزيا الى السرخسي في الجامع الصغير انه لايجوز ان تطرح المضربة في القبر وماروى عن عائشةؓ فغير مشهور.

وفي الدر المختار(۲/۲۳۳): (ولا) يجوز ان (يوضع فيه مضربة) وما روى عن عليؓ فغير مشهور لا يوخذبه. وفي الشامي (قوله ولا يجوز الخ) اى يكره ذلک قال في الحلية ويكره ان يوضع تحت الميت في القبر مضربة او مخدة او حصيرا ونحو ذلک ولعل وجهه انه اتلاف مال بلا ضرورة فالكراهة تحريمية ولذا عبر بلا يجوز. (قوله وماروى عن عليؓ) يعنى من فعل ذلک نهر ثم ان الشارح تبع في ذلک المصنف في منحه والذى وجدته في الظهيرية عن عائشةؓ وكذا عزاه الى الظهيرية في البحر والنهر، قال في شرح المنية وما روى انه جعل في قبره عليه الصلوة والسلام قطيفة قيل لان المدينة سبخة وقيل ان العباس وعليا تنازعاها فبسطها شقران تحته لقطع التنازع وقيل كان الصلاة والسلام يلبسها ويفترشها فقال شقرانؓ والله لايلبسک احد بعده أبداً فالقاها في القبر.

(قوله فغير مشهور) اى غير ثابت عنه او المراد انه لم يشتهر عنه فعله بين الصحابة ليكون اجماعا منهم بل ثبت عن غيره خلافه ففي شرح المنية وكره ابن عباسؓ ان يلقى تحت الميت شئ رواه الترمذى وعن ابى موسىٰ لا تجعلوا بينى وبين الارض شيئاً.

(۴۱۷) عورت کو قبر میں اتارتے وقت پردہ ڈالنے کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورتوں کو دفن کرتے وقت ان کی قبر پر پردہ ڈالا گیا ہے؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ صورت مسئولہ میں پردہ ڈالنا سنت ہے۔

وفي اعلاء السنن(۸/۳۱۳): عن الثورى عن ابى اسحاقؒ قال شهدت جنازة الحارث فمد والقبره ثوبا فجذبه عبدالله بن يزيد، وقال انما هو رجل رواه ابن ابى شيبة فهذا هو الصحيح.

وفی البدائع (۳۱۹/۱): ویسجی قبر المرأۃ بثوب لما روی انّ فاطمۃ سجی قبرھا بثوب ونعش علی جنازتھا لان مبنی حالھا علی الستر فلو لم یسج ربما انکشفت عورۃ المرأۃ فیقع بصر الرجال علیھا.

وفی رد المحتار (۲۳۶/۲): ویسجی قبرھا ای بثوب ونحوہ استحبابا حال ادخالھا القبر حتی یسوی اللبن علی اللحد کذا فی شرح المنیۃ والامداد.

(۳۱۸) قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل قبروں کے اردگرد لکڑیوں سے چاردیواری بنائی جاتی ہیں جس کا مقصود قبر کو مزین کرنا بھی ہوتا ہے اور قبر کی حفاظت بھی، اور اگر صرف حفاظت کیلئے ہو تو کیسا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً: قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ قبر کی حفاظت مقصود ہو، اور اگر چاردیواری بنانے سے مقصود زیب وزینت ہو تو اس صورت میں مکروہ ہے۔

لما فی مراقی الفلاح (ص۵۰۳): انما یکرہ الآجر اذا ارید بہ الزینۃ اما اذا ارید بہ دفع اذی السباع او شیء آخر لا یکرہ.

وفی حاشیۃ الطحطاوی (ص۵۰۳): وقد اعتاد اھل مصر وضع الاحجار حفظا للقبور عن الاندراس والنبش ولا باس بہ وفی الدرر ولا یجصص ولا یطین ولا یرفع علیہ بناء وقیل لا باس بہ ھو المختار.

وفی حاشیۃ الطحطاوی علی الدر (۳۸۲): قولہ وقیل لا باس بہ) ینبغی تقیید الجواز علی ھذا القول بما اذا .

(۳۱۹) حفاظت کی غرض سے قبر پر بغیر چھت کے چاردیواری بنانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر پر چار پانچ فٹ بلند صرف چاردیواری بغیر چھت کے بغرض حفاظت بنانا جائز ہے یا نہیں؟ نیز چبوترہ بنا کر اس کے اوپر قبر بنانا تاکہ بارش کے سیلاب سے حفاظت رہے اور زائرین کے بیٹھنے کیلئے جگہ ہو، شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں بغرض حفاظت چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ فخر ونمود، ریاکاری وزینت مقصود نہ ہو، نیز سیلاب وغیرہ سے جو خطرہ قبر کو لاحق ہے وہی خطرہ چبوترے کو بھی لاحق ہو سکتا ہے جو مناسب معلوم نہیں ہوتا، البتہ اگر واقعی اس میں قبر کی حفاظت ہے اور زیب وزینت، اسی طرح زائرین کے بیٹھنے کا اہتمام مقصود نہ ہو تو ضرورۃً جائز ہے۔

لما في مراقي الفلاح (ص ۵۰۴،۵۰۳): انما يكره الآجر اذا اريد به الزينة اما اذا اريد به دفع اذى السباع او شيء آخر لا يكره　(ويكره) البناء عليه (للإحكام بعد الدفن) لأنه للبقاء والقبر للفناء　اهـ

وفي الدر المختار (۲/۲۳۷): (ولا يجصص) للنهي عنه، (ولا يطين) ولا يرفع عليه بناء وقيل لا بأس به وهو المختار) وفي الشامية: (قوله لا يرفع عليه بناء) اي يحرم لو للزينة　اهـ

وفي الدر المختار (۲/۲۳۶) (ويسوى اللبن عليه والقصب لا الآجر) المطبوخ والخشب لو حوله

وفي الشامية تحته: وقال مشايخ بخارى لا يكره الآجر في بلدتنا للحاجة اليه لضعف الاراضي.

(۴۲۰) قبر کے اوپر میت کے نام کا کتبہ لگانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبروں کے اوپر اہل قبور کے ناموں کے کتبے لگانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورت مسئولہ میں اگر ضرورت اس کی ہو کہ قبر کا نشان رہ جائے قبر کا اثر مٹ نہ جائے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

لما في رد المحتار (۲/۲۳۷): (قوله لا بأس بالكتابة الخ) لان النهي عنها وان صح فقد وجد الاجماع العملي بها فقد اخرج الحاكم النهي عنها من طرق ثم قال هذه الاسانيد صحيحة وليس العمل عليها فان ائمة المسلمين من المشرق الى المغرب مكتوب على قبورهم وهو عمل اخذ به الخلف عن السلف　نعم يظهر ان محل هذا الاجماع العملي على الرخصة فيها ما اذا كانت الحاجة داعية اليه في الجملة كما اشار اليه في المحيط بقوله وان احتيج الى الكتابة حتى لا يذهب الاثر ولا يمتهن فلا بأس به فاما الكتابة بغير عذر فلا حتى انه يكره كتابة شيء عليه من القرآن او الشعر او اطراء مدح له ونحو ذلك حلية ملخصا.

وفي الهندية (۱/۱۶۶): ويكره ان يبنى على القبر او يقعد او ينام عليه او يوطأ عليه او يقضى حاجة الانسان من بول او غائط او يعلم بعلامة من كتابة ونحو كذا في التبيين.

(۴۲۱) قبروں پر نام، تاریخ وغیرہ لکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کی قبر کو بطور نشان پکی رکھنا اور اس خیال سے کہ قبر کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو لوگ اس کو پامال نہ کریں تو اس پر نام اور تاریخ وفات لکھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: قبر پر بوقت ضرورت نام، تاریخ وغیرہ لکھی جا سکتی ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ۵۰۵): (ولا بأس) ایضاً (بالکتابة فی حجر صین به القبر ووضع) علیه لئلا یذهب الاثر) فیحترم للعلم بصاحبه.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): لابأس بالکتابة ان احتیج الیها حتی لا یذهب الاثر ولا یمتهن.

(۴۲۲) پکی اور خوبصورت قبر بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ قبریں عموماً شوق میں بہت ہی خوبصورت بناتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پکی قبر منع ہے آپ بتائیں کہ کیا پکی اور خوبصورت قبر بنانا جائز نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبر کو پکا کرنا اور خوبصورت کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۶۶): ویسنم القبر قدر الشبر ولایربع ولا یجصص ولا بأس برش الماء علیه ویکره ان یبنی علی القبر.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): (ولا یجصص) للنهی عنه (ولا یطین ولا یرفع علیه بناء) (قال ابن عابدین رحمه الله تحت قوله ولا یجصص) ای لا یطلی بالجص بالفتح ویکسر قاموس (قوله ولا یرفع علیه بناء) ای یحرم لو للزینة، ویکره لو للاحکام بعدالدفن.

(۴۲۳) پرانی یا نئی قبر گر جائے اس کو دوبارہ بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قبرستان میں ایک پرانی قبر یا نئی قبر گر جائے تو دوبارہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبر گرنے کی صورت میں دوبارہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی التاتارخانیة(۲/۱۰۰-۱۰۱): وفی النوازل سئل ابو نصر عن تطیین القبر: قال: لا بأس به وفی الغیاثیة وعلیه الفتوی: ...... الحجة واذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لماروی ان النبی علیه السلام مرّ بقبر ابنه ابراهیم فرأی فیه حجرا سقط منه فسده واصلحه ثم قال: من عمل عملاً فلیتقنه: ...... وفی کفایة الشعبی: کان عصام بن یوسف یطوف حول المدینة یعمر القبور الخربة.

وفی الهندیة(۱/۱۶۶): واذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها کذا فی التاتارخانیة: وهو الاصح وعلیه الفتوی کذا فی جواهر الاخلاطی.

وفی الشامیة(۲/۲۳۷): وفی شرح المنیة عن منیة المفتی: المختار انه لا یکره التطیین.

(۴۲۴) قبر پر سبز پتی پھول اور خوشبو رکھنے کی شرعی حیثیت

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ قبروں پر سبز پتی یا پھول اور خوشبو وغیرہ رکھتے ہیں، یہ فعل سنت ہے، مستحب ہے یا مباح ہے یا بالکل بے فائدہ ہے؟ شرعی دلیل سے جو ثابت ہو مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً — قبروں پر سبز پتی، پھول اور خوشبو وغیرہ رکھنا یہ نہ سنت ہے اور نہ مستحب، بلکہ یہ ایک بے فائدہ چیز ہے اور شریعت میں اس کی کوئی اصل اور ثبوت نہیں ہے، اور آج کل لوگ اس کام کو کار ثواب سمجھتے ہیں لہٰذا اس کا ترک کرنا واجب ہے۔

لما فی شرح مسلم (۱/۱۴۱): قال النووی، فقیه انه رضی الله عنه تبرک بفعل مثل فعل النبی ﷺ وقد انکر الخطابی مایفعله الناس علی القبور من الاخواص ونحوها متعلقین بهذا الحدیث وقال لا اصل له ولا وجه له، والله اعلم.

وفی عمدة القاری (۳/۱۲۱): وکذلک مایفعله اکثر الناس من وضع مافیه رطوبة من الریاحین والبقول ونحوهما علی القبور لیس بشیء وانما السنة الغرز.

وفی معارف السنن (۱/۲۲۶): قال الشیخ المحدث الاکبر العلامة محمد یوسف بنوری نور الله مرقده: اتفق الخطابی والطرطوشی والقاضی عیاض علی المنع وقولهم اولی بالاتباع حیث اصبح مثل تلک المسامحات والتعللات مثاراً للبدع المنکرة والفتن السائرة فتری العامة یلقون الزهور علی القبور وبالأخص علی قبور الصلحاء والاولیاء والجهلة منهم ازدادوا اصراراً علی ذلک وتغالوا فیه واوضحت ذلک منشاء فی الجهة لعقائد فاسده تاباها الشریعة النقیة وظنوا ذلک سببا للثواب والاجر الجزیل فالمصلحة العامة فی الشریعة تقتضی منع ذلک بتاتا استئصالاً لشأفة البدع وحسماً لمادة المنکرات المحدثة وبالجملة هذه بدعة مشرقیة منکرة ویجنبها بدعة اخری مغربیة قدراجت فی کثیر من البلاد المشرقیة التی تدعی بلاد اسلامیة الخ وکل هذه بدع ومنکرات لااصل لها فی الدین ولا مستندلها من الکتاب والسنة ویجب علی اهل العلم ان ینکروها وان یبطلوا هذه العادات ما استطاعوا انتهی.

(۴۲۵) پوسٹ مارٹم وغیرہ کی غرض سے میت کو قبر سے نکالنے کا حکم

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل بعض اوقات پوسٹ مارٹم کرنے کیلئے میت کو قبر سے نکالا جاتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور وہ کونسا عذر ہے جس کی وجہ سے میت کو دفن کرنے کے بعد قبر سے نکالا جا سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد بلا عذر شرعی نکالنا جائز نہیں۔ اور پوسٹ مارٹم میں چونکہ میت کی توہین ہے نیز یہ کوئی عذر شرعی بھی نہیں ہے اس لئے پوسٹ مارٹم کے لیے میت کو قبر سے نکالنا درست نہیں اور وہ عذر جس کی بنا پر میت کو دفن کے بعد نکالا جا سکتا ہے یہ ہے کہ جس زمین میں دفن کیا وہ زمین مغصوبہ ہو یا شفیع نے حق شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہو اور وہ اس کا مطالبہ کر رہا ہو تو پھر میت کو قبر سے نکالنا جائز ہے۔

لما فی الهندية (۲:۱۶۷): المیت بعد ما دفن بمدة طويلة او قليلة لا يسع اخراجه من غير عذر ويجوز اخراجه بالعذر والعذر ان يظهر ان الارض مغصوبة او اخذها الشفيع بالشفعة كذا في الواقعات الحسامية الخ

(۴۲۶) میت گھر میں موجود ہو تو اس جگہ تلاوت کلام پاک کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی میت جب تک گھر میں موجود رہتی ہے تو اس جگہ تلاوت قرآن شریف کرنی چاہیے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: غسل سے پہلے میت کے پاس قرآن پاک کی تلاوت مکروہ ہے البتہ جب میت کو غسل دے دیا جائے تو پھر اس کے پاس تلاوت کرنا درست ہے۔

لما فی الهندية (۱:۱۵۷): ويكره قراءة القرآن عنده حتى يغسل كذا في التبيين الخ.

وفي حاشية الطحطاوي على الدر (۱:۳۵۰): قوله تكره القراءة) اي تحريما اخذا من التعليل الآتي (قوله عنده) اي بعد موته (قوله تحريما) اي تبعيدا والاولى في التعبير زيادة بقوله.

(۴۲۷) نمازِ ظہر، نمازِ جنازہ اور کسوف میں کون سی نماز مقدم ہوگی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ، کسوف اور صلوٰۃ ظہر جمع ہو گئیں تو ان میں سے کس کو مقدم کیا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں سب سے پہلے فرض پڑھے جائیں گے اس کے بعد نماز جنازہ پڑھے اس کے بعد صلوٰۃ کسوف پڑھے۔

لما في خلاصة الفتاوى (۱:۲۲۳): اما بعد غروب الشمس يبدأ بالمغرب ثم بصلوة الجنازة ثم بسنة المغرب كذا افتى شمس الائمة الحلواني

وفي الهندية (۱:۱۵۳): وان غربت كذا تمسك عن الدعاء وتشتغل بصلاة المغرب وان اجتمع الكسوف والجنازة يبدأ بالجنازة

(۲۲۸) نمازِ جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا جائز ہے یا نا جائز؟

(۲)۔ جنازہ کے بعد مولوی صاحب کے ساتھ لوگ بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن مجید کے نیچے روپے باندھ لیتے ہیں اور یہ روپے ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو جمع ہوتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا نا جائز؟

(۳)۔ پھر چالیس دن تک یہ لوگ قبرستان میں جا کر مردے کی قبر پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا نا جائز؟

(۴)۔ پھر یہ لوگ چار ہفتے یا سات ہفتے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن مجید ختم بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں خیرات بھی کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن مجید کے ایک یا دو پارے پڑھنے پر ان کو دس یا بیس روپے دیتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا نا جائز؟

(۵)۔ اور یہ لوگ اپنے مردے کے سال پورا ہونے کے بعد خیرات کرتے ہیں اس میں غریب بھی ہوتے ہیں جس کی وصیت نہیں ہوتی لیکن رواج کے مارے یہ لوگ پھر بھی اس کو کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا نا جائز؟

(۶)۔ ایک آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے اور پھر آٹھ نو سال اس کی کوئی اولاد نہ ہو، اور وہاں کا رواج اس طرح کا ہے کہ ایک بابا وہاں گھوڑے پر آتا ہے اور جس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو کہتا ہے کہ پانچ سو یا ہزار روپے دیدو اسی طرح میرے ماں باپ نے مجھے مجبور کیا کہ آپ بابا کے پاس جاؤ یا دوسری شادی کرو مگر میرا یہ یقین تھا کہ جس اللہ نے پہلے بچے دیئے ہیں وہ اللہ پاک اب بھی دے سکتے ہیں۔ مگر گھر میں اگر ماں باپ اور بھائی کہیں تو ان کا کہنا ماننا کیا گناہ ہوگا؟ اس بارے میں مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ استفتاء میں مذکور سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں

(۱)۔ یہ بات تو حقیقت اور مسلم ہے کہ قرآن مقدس ایک مبارک اور برکت والی کتاب ہے۔ اس کا اپنے پاس رکھنا موجب برکت وثواب ہے۔ لیکن شریعت اسلامی میں مسلمان اپنے ہر معاملے میں قرآن وسنت کا پابند ہے کسی بھی دینی معاملے میں اپنی طرف سے بنایا ہوا بے اصل فعل شریعت میں قابل قبول نہیں ہے اور نہ ہی شریعت ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ شریعت نے ایسے کاموں کو ضلالت اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا مذکورہ مروجہ طریقہ یعنی قرآن مجید کو جنازے سے پہلے لے کر جانا چونکہ نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے باوجودیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، خیر اور دین کے معاملے میں بہت حریص تھے، کسی بھی کام میں اگر ذرا سی خیر اور نیکی ہوتی تو صحابہ کرامؓ وہ کام ضرور سرانجام دیتے۔ لیکن مذکورہ مروجہ طریقہ نہ تو صحابہ کرامؓ سے اور نہ ہی سلف صالحین سے ثابت ہے لہٰذا یہ طریقہ من گھڑت اور بدعت ہے اور اس کو ترک کرنا لازمی ہے۔

لما في تفسير ابن كثير (۴/۱۴۱): كل فعل وقول لم يثبت عن الصحابة رضي الله عنهم هو بدعة، لأنه لو كان خيراً لسبقونا اليه لأنهم لم يتركوا خصلة من خصال الخير إلا وقد بادروا اليها.

وفی مشکوٰۃ(صـ ۲): ولما جاء فی الحدیث النبوی، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، قالت، قال رسول اللہ ﷺ، من أحدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔

وفی المرقاۃ(۱/۲۱۶): قال النووی، البدعۃ کل شیٔ عمل علیٰ غیر مثال سبق، وفی الشرع، إحداث مالم یکن فی عھد رسول اللہ ﷺ۔

(۲)۔ مذکورہ مروجہ طریقہ کہ قرآن مقدس کے پیچھے دکھ روپے باندھے جاتے ہیں، یہ طریقہ نہ تو صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اور نہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور نہ ہی کسی امام مجتہد سے نقل ہے لہٰذا یہ طریقہ خاص بدعت ہے اور قابل ترک ہے۔

لما فی مشکوٰۃ(صـ ۲): لما جاء فی الحدیث، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، قالت، قال، رسول اللہ ﷺ من أحدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد۔

(۳)۔ میت کے ایصال ثواب کیلئے قرآن مجید کی تلاوت گھر میں اور قبر پر دونوں جگہ جائز ہے اور موجب ثواب ہے، لیکن اس میں اپنی طرف سے دنوں کی تخصیص اور تعیین کرنا کہ چالیس دن تک ہی پڑھیں گے یہ درست نہیں ہے، کسی بھی عبادات میں اپنی طرف سے دن اور وقت کا تعین اور تخصیص کرنا بدعت ہے، ورنہ فی نفسہٖ قبر پر تلاوت کرنا جائز بھی ہے اور میت کو اس کا ثواب بھی پہنچتا ہے اور اس سے عذاب میں کمی بھی واقع ہوتی ہے۔

لما فی فتح القدیر(۲/۱۴۲): واختلف فی اجلاس القارئین لیقرؤا عند القبر والمختار عدم الکراھۃ۔

وفی البحر (۲/۱۹۵): ولا بأس بقراءۃ القرآن عند القبور وو ما تکون افضل من غیرہ، ویجوز أن یخفف اللہ عن اھل القبور شیأ من عذاب القبر او یقطعہ عند دعآء القاری وتلاوتہ۔

وفی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ (۴/۸۱): مات فاجلس وارثہ من یقرأ القرآن لابأس بہ أخذ بعض المشایخ۔

وفی الھندیۃ(۱/۱۶۶): قراءۃ القرآن عند القبور عند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ لاتکرہ، ومشائخنا أخذوا بقولہ وھل ینتفع والمختار انہ ینتفع۔

وفی الشامیۃ(۱/۵۷): ولو زار قبر صدیق او قریب لہ وقرأ عندہ شیأ من القرآن فھو حسن۔

(۵،۴)۔ صدقہ، خیرات، تلاوت قرآن مقدس، ذکر، اور کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور مستحسن امر ہے اور ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا بھی ہے، لیکن سوال میں مذکورہ مروجہ طریقے میں تین خرابیاں پائی جاتی ہیں جن خرابیوں نے ان امور کو ناجائز بنا دیا ہے۔ اول ۔۔۔ یہ کہ لوگ چار جمعے، سات جمعے اور سال کے بعد خیرات کرتے ہیں، اور ان چار جمعوں، سات جمعوں یا سال کے بعد خیرات کرنے کی تخصیص اور تعیین قرون اولیٰ سے ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔ دوم ۔۔۔ لوگ ختم قرآن پر کھانا کھلاتے ہیں، اور یہ صورت بھی درست نہیں ہے۔ سوم ۔۔۔ ایک یا دو پارے پڑھنے پر پڑھنے والے کو دس، بیس روپے دیے جاتے ہیں، یہ صورت بھی ناجائز ہے، اور اس صورت میں نہ میت کو ثواب ملتا ہے اور نہ تلاوت کرنے والے کو، بلکہ پڑھنے والا اور پیسے دینے والا دونوں گنہگار ہو جاتے

ہیں۔ اور علاوہ ازیں ان چار جمعوں، سات جمعوں کے بعد خیرات کرنا، ان میں عموماً نام ونمود، ریا اور دکھاوا اور رسم ورواج کا رفرما ہوتا ہے، جیسا کہ سائل کے سوال سے بھی معلوم ہوتا ہے، ان امور میں رضاء الٰہی مقصود نہیں ہوا کرتی، اور لوگ یہ امور اس لئے سرانجام دیتے ہیں کہ نہ کرنے کی صورت میں برادری اور خاندان میں عزت نہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ان امور سے احتراز کرنا چاہئے اور دنوں کی تعیین کیے بغیر میت کے ایصال ثواب کیلئے صدقہ، خیرات کرنا چاہئے۔

لما فی الشامیة(۲/۲۴۳): وفی البحر، من صام او صلّی او تصدق وجعل ثوابه لغیره من الاموات والأحیاء جاز ویصل ثوابها إلیهم عند اهل السنة و جماعة.

وفی البحر(۲/۱۹۲): ان اتخذ ولی المیت طعاماً للفقراء کان حسناً اذا کانوا بالغین، وان کان فی الورثة صغیر لم یتخذ ذلک من التر کة.

وفی الطحطاوی علی المراقی(ص۵۰۱): قال فی البزازیة ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ـــــ واتخاذ الدعوة بقراءة القرآن.

وفی الشامیة(۶/۵۷): ونقل العلامة الخلوتی ـــــ عن شیخ الاسلام تقی الدین ما نصه ولا یصح الاستئجار علی القراءة واهدائها الی المیت ـــــ وقد قال العلماء ان القاری إذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شئ یهدیه الی المیت.

وفی الشامیة(۶/۵۶): ان القرآن بالاجرة لا یستحق الثواب لا للمیت ولا للقاری وقال العینی فی شرح الهدایة ویمنع القاری للدنیا، والآخذ والمعطی آثمان، فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرآءة الاجزآء بالاجرة لایجوز.

وفی الشامیة(۲/۲۴۰): ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی مواسم واتخاذ الدعوة لقراءة القران ـــــ وقال (ص۲۴۱) وهذه الافعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لانهم لا یریدون به وجه الله تعالی.

(۶)۔ اولاد کا دینا یا نہ دینا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف اور قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کو اولاد نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں نرینہ اولاد دے دیں اور جسے چاہیں لڑکی دے دیں اور جسے چاہیں بالکل ہی اولاد سے محروم کردیں۔ اس سلسلے میں نیک اور اللہ والے لوگوں سے دعا تو کرائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس طرح سے کہ عقیدہ میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو، اس مسئلہ میں لوگوں کو اپنا عقیدہ درست کرنا چاہئے، آپ اپنے والدین کو سمجھائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے والدین کی ہدایت کی دعا کیا کریں اس معاملے میں آپ کیلئے ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر عقیدہ میں کچھ فرق ہے تو اُن کا کہنا ماننا اس معاملے میں بالکل جائز نہیں ہے۔

لما فی القرآن الکریم(الشوریٰ: ۴۹، ۵۰): لِلّٰهِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ، یَهَبُ لِمَنْ

یشاء اناثا ویهب لمن یشاء الذکور، او یزوجهم ذکرانا و اناثا، ویجعل من یشاء عقیما، انه علیم قدیر.

وفی تفسیر لابن کثیر (۱۰۸/۴): فجعل الناس اربعة اقسام: منهم من یعطیه البنات، ومنهم من یعطیه البنین ومنهم من یعطیه من النوعین ذکورا و اناثا ومنهم من یمنعه هذا وهذا فیجعله عقیما لا نسل له ولا ولد له.

وفی کنز العمال (۶۷/۶): الحدیث: لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

(۴۲۹) نماز جنازہ میں تین سے زائد صفوں میں طاق عدد کی رعایت نیز جنازہ کی آخری صف کا اجر

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں اگر صفیں تین سے زائد ہوں تو کیا اس وقت بھی طاق عدد کی رعایت ضروری ہے؟ یا جفت بنا سکتے ہیں نیز کیا نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر زیادہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً باشبہ نماز جنازہ میں طاق صفوں کی فضیلت روایات سے ثابت ہے لیکن فقہی کتابوں کی عبارات میں تین صفوں تک تحدید کرتی ہیں اس لئے اس کی رعایت بہتر ہے۔ اور اسی طرح نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر زیادہ ہوتا ہے۔

لما فی جامع الترمذی (۲۰۰/۱): عن مرثد بن عبداللہ الیزنی قال کان مالک بن هبیرة اذا صلی علی جنازة فتقال الناس علیها جزاهم ثلثة اجزاء ثم قال قال رسول الله ﷺ من صلی علیه ثلثة صفوف فقد اوجب.

وفی تحفة الاحوذی (۱۳۳/۴): واقل الصف ان یکون اثنین علی الاصح قاله القاری قلت ولاحد لاکثره.

وفی المشکوٰة (ص ۱۴۶): عن مالک بن هبیرة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ما من مسلم یموت فیصلی علیه ثلثة صفوف من المسلمین الا اوجب.

وفی المرقاة (۴۳۹/۴): قال ابن الملک فی شرح الوقایة: ذکر الکرمانی ان افضل الصفوف فی صلاة الجنازة آخرها وفی غیرها اولها اظهارا للتواضع.

وفی الدر المختار (۲۱۴/۲): وافضل صفوفها آخرها اظهارا للتواضع.

وفي الشامية(۲/۲۱۴): فلو كان الصف الاول افضل في الجنازة ايضاً لكان الافضل جعلهم صفاً واحداً ولكره قيام الواحد وحده.

(۴۳۰) نمازِ جنازہ کی آخری صف میں کھڑے ہونے کی فضیلت کی کیا وجہ ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ میں سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہونے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جتنا میت سے دور ہوگا اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ آیا اس بات میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی علت کیا ہے؟ دلائل سے مسئلے کو مزین فرمادیں تو نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً نمازِ جنازہ میں آخری صف افضل ہے کیونکہ اقرب لتواضع ہے۔

لما في حلبي كبير(۱/۵۸۸): افضل صفوف الرجال في الجنازة آخرها وفي غيرها أولها اظهاراً للتواضع لتكون شفاعته ادعى للقبول.

وفي الشامية(۲/۲۱۴): وقوله: وافضل صفوفها آخرها الخ كذا في القنية وبحث فيه في الحلية باطلاق مافي صحيح مسلم عنه ﷺ خير صفوف الرجال اولها وشرها آخرها وبأن اظهار التواضع لايتوقف على التاخر: اقول قد يقال ان الحديث مخصوص بالصلاة المطلقة لأنها المتبادرة ولقوله ﷺ من صلى عليه ثلاثة صفوف غفرله رواه ابو داؤد وقال حديث حسن والحاكم وقال صحيح على شرط مسلم ولهذا قال في المحيط يستحب أن يصف ثلاثة صفوف حتى لو كانوا سبعة يتقدم أحدهم للامامة ويقف وراءه ثلاثة ثم اثنان ثم واحد فلو كان الصف الاول افضل في الجنازة ايضاً لكان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولكره قيام الواحد وحده كما كره في غيرها هذا ما ظهرلي.

(۴۳۱) کیا حاضرین جنازہ کیلئے نماز جنازہ فرض عین ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ جب مسجد یا جنازہ گاہ میں آجائے تو اس وقت وہاں موجود سب افراد پر اس کا پڑھنا فرض عین ہو جاتا ہے یا پھر صرف بعض لوگوں کا پڑھنا کافی ہے۔ اگر کوئی نماز جنازہ میں شریک نہ ہو تو کیا وہ گناہگار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں جن میں سے ایک اس کی وفات پر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونا ہے اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر چہ بعض افراد کا نماز جنازہ ادا کرنے سے باقی لوگوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن حاضرین کیلئے ایک مسلمان کا حق ہونے کی وجہ سے جنازہ میں شریک نہ ہونا مناسب نہیں نیز بعض حضرات نے حاضرین جنازہ پر

نماز جنازہ کو فرض عین کہا ہے لیکن یہ قول شاذ ہے۔

لما فی صحیح مسلم(۲/۲۱۳): عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ خمس تجب للمسلم علی اخیہ رد السلام وتشمیت العاطس واجابۃ الدعوۃ وعیادۃ المریض واتباع الجنائز۔

وفی الھندیۃ(۱/۱۶۵): لا ینبغی ان یرجع من جنازۃ حتی یصلی علیہ۔

وفی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص۵۷۷، ۵۷۸): (فرض کفایۃ) بالاجماع — والاصل فیہ قولہ تعالیٰ "وصل علیھم" (التوبۃ:۱۰۳) وقولہ علیہ الصلوۃ والسلام صلوا علی کل بر وفاجر وانما کانت فرض کفایۃ لقولہ علیہ السلام "صلوا علی صاحبکم" ولو کانت فرض عین ماترکھا ولان فی الایجاب ای العینی علی الجمیع استحالۃ وحرجاً فاکتفی بالبعض۔

وفی الدر المختار(۲/۲۰۷): والصلاۃ علیہ — فرض کفایۃ بالاجماع: الشامیۃ(۱/۵۳۸): وفرض الکفایۃ معناہ فرض ذو کفایۃ ای یکتفی بحصولہ من ای فاعل کان۔

وفی تقریرات الرافعی علی رد المحتار(۲/۱۱۹): (قول المصنف فرض کفایۃ) فی السندی ثم انہ قیل کون صلاۃ الجنازۃ فرض کفایۃ مقید بما اذا لم یکن الناس حاضرین فی مجلس الجنازۃ لانہ ذکر فی فتاوی قاضیخان وظھیر الدین والمستصفی قال السید الامام ناصر الدین واذا لم یکن الناس حاضرین فی مجلس الجنازۃ و لم یعاینوھا فالصلاۃ علیھا فرض کفایۃ واما عند حضورھم ومشاھدتھم فالصلاۃ واجبۃ علی کل واحد من الناس باداء نفسہ لانھا حینئذ فرض عین ولا خلاف فیہ اصلاً کذا رأیتہ بخط بعض الفضلاء، ونقلہ الملا علی قاری عن فتوی ابی المعالی وھکذا وجدتہ بھامش المنح وقد طالعت فی مختار الفتاوی ومتانۃ الروایات وغیرھما من المعتبرات المتعددۃ فلم اجد احداً ذکر انھا تصیر فرض عین علی الحاضرین فلتراجع المسئلۃ وقولہ ﷺ "صلوا علی صاحبکم" مع حضورہ دلیل علی عدم افتراضھا علی کل حاضر اھ. لکن الاولیٰ مراجعۃ الکتب التی نسب لھا القول بالافتراض عند الحضور وقد راجعت فتاوی قاضیخان فلم اجد ھذہ المسئلۃ فیھا

(۴۳۲) امام پر نمازِ جنازہ کے بعد تدفین تک شریک رہنے اور تقریر کرنے کی شرط لگانا کیسا ہے؟

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علاقوں میں خطباء جب نماز جنازہ پڑھالیتے ہیں تو پھروں کے مقتدیوں کی طرف سے اس کو اجازت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ میت دفن ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد قبر کے ایک طرف پر سورۃ

بقرہ کا پہلا رکوع اور دوسری طرف آخری رکوع پڑھ لیتے ہیں پھر اس کے بعد تقریر کرتے ہیں اور پھر رخصتی ہوتی ہے اگر کوئی اس طرح نہیں کرتے تو وہ ان کو امام نہیں رکھتے یہاں تک کہ یہ شرائط مان لے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کا امام پر یہ الزام صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ یہ مذکورہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ اس طرح کی شرائط لگانا صحیح نہیں ہے البتہ مذکورہ طریقہ کہ سورۂ بقرۃ کا پہلا رکوع اور آخری رکوع پڑھنا صحیح ہے۔

لما فی الشامیۃ (۲/ ۲۳۷): (قولہ وجلوس الخ) لما فی سنن ابی داؤد کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبرہ وقال: استغفروا لاخیکم واسألوا اللہ لہ التثبیت فانہ الآن یسأل وکان ابن عمر یستحب ان یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورۃ البقرۃ وخاتمتہا، اھ۔

(۴۳۳) جنازہ کے بعد صفیں بکھر جانے پر دعا و وعظ وغیرہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ کے بعد اگر صفوں کو توڑا جائے تو دعا کرنا جائز ہے۔ کیا یہ مسئلہ ان لوگوں کا صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو اس کی دلیل بیان فرمائیں، بڑی مہربانی ہوگی۔

(نوٹ)۔ ہمارے علاقوں میں رواج ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۲)۔ میت کو دفن کرنے کے بعد بعض لوگ قبر پر وعظ اور دعا کرتے ہیں۔ اگر ان کا ثبوت ہو تو مع دلائل ارشاد فرمائیں بڑی نوازش ہوگی۔

(۳)۔ قبر پر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کو سراً پڑھنا چاہئے یا جہراً؟ اور اس وقت باقی لوگ بیٹھے ہوں گے یا کھڑے ہوں گے؟ نیز یہ بتائیں کہ اگر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کا التزام کی جگہ شروع ہو جائے تو بدعت تو نہ بنے گی۔ جبکہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

ان تمام صورتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ ارشاد فرمائیں بڑے مشکور ہوں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ (۱)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا جائز نہیں، بلکہ بدعت ہے۔ خواہ صفوں میں کھڑے کھڑے کی جائے یا صفیں توڑ کر کی جائے۔ اور جو لوگ نماز جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر دعا کرنے کو جائز کہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ فقہاء کرام ومحدثین عظام نے نماز جنازہ کے بعد مطلقاً دعا کرنے کو منع فرمایا ہے۔

(۲)۔ میت کو دفن کرنے کے بعد تھوڑی دیر قبر کے پاس بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور میت کیلئے دعا کرنا جائز ہے۔ اور اسی طرح اس وقت میں ایسا وعظ کرنے کی بھی گنجائش ہے جو موت اور آخرت کی یاد دلانے کیلئے ہو اور اس میں دوسرے منکرات اور بدعات کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو۔

(۳)۔ سب سے بہتر اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ دفن کرنے کے بعد کوئی میت کے سرہانے سورۃ البقرۃ کے اوائل پڑھے اور دوسرا میت کی

پائنتی (پاؤں کی طرف) سورۃ البقرۃ کے اواخر پڑھے اور باقی لوگوں کو بھی اگر یہ یاد ہوں تو یہی پڑھیں ورنہ جو بھی سورۃ یا آیات ان کو یاد ہوں وہ پڑھیں۔ نیز دفن کرنے کے بعد اگرچہ قبر کے پاس بیٹھنا، دعا کرنا، سورۃ البقرۃ کے اوائل و اواخر پڑھنا مستحب ہے لیکن ان امور کا التزام کرنا (یعنی ان کو ضروری سمجھنا) درست نہیں ہے۔ دفن کرنے کے بعد اگر کوئی ان امور کے بغیر جانا چاہے تو اس کیلئے بغیر کراہت کے جانا درست ہے۔

لما فی مشکوۃ المصابیح مع مرقاۃ المفاتیح (۴/۸۰): وعن عمرو ابن العاص قال لابنه وهو فی سیاق الموت اذا أنا مت فلا تصحبنی نائحة ولا نار فاذا دفنتمونی فشنوا علی التراب شنا ثم اقیموا حول قبری قدر ما ینحر جزور ویقسم لحمها حتی استأنس بکم واعلم ماذا أراجع به رسل ربی رواه مسلم. وفی المرقاۃ تحت قوله (ثم اقیموا حول قبری) لعله للدعاء بالتثبیت وغیره وتحت قوله (حتی استأنس بکم) ای بدعائکم واذکارکم وقرائتکم واستغفارکم والمورد فی خبر أبی داؤد انه علیه الصلاۃ والسلام کان اذا فرغ من دفن الرجل یقف علیه ویقول استغفروا الله لأخیکم واسألوا له التثبیت وفی روایة التثبت فانه الآن یسئل.

وفیه ایضاً (ص ۸۱): وعن عبدالله بن عمر (رضی الله عنهما) قال سمعت النبی ﷺ یقول اذا مات احدکم فلا تحبسوه واسرعوا به الی قبره ولیقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجلیه بخاتمة البقرة رواه البیهقی فی شعب الایمان وقال والصحیح انه موقوف علیه.

وفی الهندیة (۱/۱٦٦): ویستحب اذا دفن المیت ان یجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ینحر جزور ویقسم لحمها یتلون القرآن ویدعون للمیت کذا فی الجوهرة النیرة. قراءة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالیٰ لا تکره، ومشایخنا رحمهم الله اخذوا بقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع هکذا فی المضمرات.

وفی الدر المختار (۲/۲۳۵، ۲۳٦): ویستحب حثیه من قبل رأسه ثلاثا، وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء، وقراءة بقدر ما ینحر الجزور ویفرق لحمه وفی الشامی تحت (قوله وجلوس الخ) لما فی سنن ابی داؤد ((کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره وقال: استغفروا لأخیکم واسألوا الله له التثبیت فانه الآن یسأل)) وکان ابن عمر (رضی الله عنهما) یستحب ان یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها — وفی الشامیة (۲/۳۸۱): وکذا قالوا بسنیة قراءة السور الثلاثة فی الوتر مع الترک احیانا لئلا یعتقد وجوبها.

(۴۳۴) نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض ائمہ مساجد کو دیکھا گیا ہے کہ صلوۃ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں، کیا شریعت میں اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ جنازہ کی نماز میت کیلئے دعا ہی ہے اس لئے نماز جنازہ کے بعد جنازہ کو روک کر سب مل کر دعا مانگنے کا اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے اور نہ یہ طریقہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور ہر وہ کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ: من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد (مسلم شریف ۲/۷۷)

لما فی خلاصۃ الفتاوی (۱/۲۲۵): لایقوم بالدعاء بعد صلوۃ الجنازۃ ــــ الی ولا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لاجل المیت بعد صلوۃ الجنازۃ وقبلھا الخ.

وفی فتاوی سراجیہ (ص۲۳): لیس فی صلوۃ الجنازۃ دعاء موقت اذا فرغ من الصلوۃ لایقوم بالدعاء.

(۴۳۵) میت کو دفن کرنے کے بعد کی دعا

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد کونسی دعا پڑھنی چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ میت کو دفن کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ ذیل دعا ثابت ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَکْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا نَقَّیْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَیْرًا مِّنْ دَارِهٖ وَاَھْلًا خَیْرًا مِّنْ اَھْلِهٖ وَزَوْجًا خَیْرًا مِّنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ۔

لما فی المسلم (۱/۳۱۱): عن عوف بن مالک رضی اللہ عنہ صلی رسول اللہ ﷺ علی جنازۃ فحفظت من دعائہ "اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الأبیض من الدنس وابدلہ داراً خیراً من دارہ وأھلاً خیراً من أھلہ وزوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار".

(۴۳۶) تلقین جہراً کرنا چاہیے یا سراً؟

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تلقین علی القبر جہراً کرنا چاہیے یا سراً؟ جواب دیکر ثواب

دارین حاصل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ یہ صراحت تو کہیں نہیں ملی، البتہ فقہاء کے کلام اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تلقین میں میت کو مخاطب کیا جاتا ہے لہذا اتنی اونچی آواز سے تلقین ہو کہ وہ سن سکے۔

لما فی الفقہ الاسلامی (۲/۱۵۱۵): ویقعد الملقن عند راس القبر فیقال لہ: یاعبداللہ ابن امۃ اللہ اذکر ما خرجت علیہ من دار الدنیا: شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ وان الجنۃ حق والنار حق وان البعث حق و ان الساعۃ اتیۃ لاریب فیہا وان اللہ یبعث من فی القبور وانک رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا وبالقرآن إماما وبالکعبۃ قبلۃ وبالمؤمنین اخوانا۔ انتھی۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

(۴۳۷) جنازہ میں شرکت سے تعزیت کی ادائیگی کا حکم

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تعزیت کیلئے نماز جنازہ کے بعد میت کے اہل خانہ کے پاس جانا ضروری ہے یا صرف نماز جنازہ میں شرکت کر لینے سے تعزیت ادا ہو جاتی ہے۔ دوبارہ اہل میت کے پاس جانا ضروری نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ نماز جنازہ اور تعزیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ نماز جنازہ میت کا حق ہے جبکہ تعزیت میت کے اہل وعیال و عزیز و اقارب سے کی جاتی ہے تعزیت کرنا مسنون ہے، تعزیت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل میت کو تسلی دے اور ان کو صبر کی ترغیب اور رضا بالقضاء کی تلقین کرے، میت کے لئے مغفرت کی دعا کرے۔ تین دن تک تعزیت کر سکتا ہے اس کے بعد تعزیت نہ کرے ہاں اگر وہ غائب ہے یا اہل میت میں سے کوئی غائب ہے تو پھر تین دن کے بعد بھی تعزیت کر سکتا ہے۔ البتہ جنازہ سے قبل بھی تعزیت کر سکتا ہے مگر جنازہ کے بعد تعزیت کرنا زیادہ بہتر ہے لہذا صرف جنازہ میں شرکت سے تعزیت نہیں ہوگی بلکہ اہل میت کے پاس جا کر ان کو تسلی وغیرہ دینے سے تعزیت ہوگی۔

لما فی المشکوۃ المصابیح (صـ ۱۵۱): عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من عزی مصابا فلہ مثل اجرہ۔

وفی مصنف عبدالرزاق (۳/۳۹۹): ان الحسن مرّ بأھل المیت فوقف علیھم فقال اعظم اللہ اجرکم وغفر اللہ لصاحبکم ثم مضی ولم یقعد

وفی الشامیۃ (۲/۲۳۹): (قولہ: وبتعزیۃ أھلہ) ای تصبیرھم والدعاء لھم بہ قال فی القاموس: العزاء الصبر أو حسنہ وتعزی۔

(صـ ۲۴۰) وتستحب التعزیۃ للرجال والنساء اللاتی لایفتن (صـ ۲۴۱) (قولہ: واولھا افضل) وھی

بعد الدفن افضل منها قبله، لأن اهل الميت مشغولون قبل الدفن بتجهيزه ولأن وحشتهم بعد الدفن لفراقه أكثر، وهذا اذا لم ير منهم جزع شديد والاقدمت لتسكينهم

(۴۳۸) میت کی تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنے کے مروجہ طریقے کا حکم

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی تعزیت کے سلسلہ میں آج کل عموماً لوگ مسجد میں بیٹھتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح تعزیت کے لئے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنا بعض علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۶۷): ولا بأس لاهل المصيبة ان يجلسوا في البيت او في مسجد ثلاثة ايام والناس يأتونهم ويعزونهم ـــ

وفي الدر المختار (۲/۲۴۱): وبالجلوس لها في غير مسجد ثلاثة ايام ـــ

وفي الشامية: قوله في غير مسجد، اما فيه فيكره كما في البحر عن المجتبى، وجزم به في شرح المنية والفتح لكن في الظهيرية لا بأس به لاهل الميت في البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم ـــ

وفي الفقه الاسلامي (۲/۵۴۳،۵۴۴): لا بأس بالجلوس للتعزية في غير المسجد ثلاثة ايام وقال في الفتاوى الظهيرية لا بأس بها لاهل الميت في البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم ـــ

(۴۳۹) معمر عورت کا اپنے اقارب کی قبر پر جانے کا حکم

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت قبرستان میں اپنے شوہر، بھائی، باپ یا بیٹے کی قبر پر جائے اور اس کی عمر تقریباً پچاس (۵۰) سال ہو تو اس عورت کا قبرستان جانا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ صورتِ مسئولہ میں اس عورت کا قبرستان میں جانا جائز ہے بشرطیکہ مروجہ بدعات وغیرہ سے بچی رہے۔

لما في الشامية (۲/۲۴۲): (قوله ولو للنساء) وقيل تحرم عليهن. والأصح أن الرخصة ثابتة لهن بحر وجزم في شرح المنية بالكراهة لما مر في اتباعهن الجنازة. وقال الخير الرملي: إن كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ماجرت به عادتهن فلاتجوز، وعليه حمل حديث "لعن الله زائرات القبور" وإن كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس

الصمت وصنعهم الطعام من النياحة) اهـ وفي البزازية ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأكل يكره. وفيها من كتاب الاستحسان: وإن اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اهـ وأطال في ذلك في المعراج. وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى اهـ

(۴۴۱) اگر کسی کی زمین میں بنی قبر کے اوپر بدعات اور رسومات ہونے لگیں تو کیا کریں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے گاؤں سے تھوڑی دور ایک بڑا درخت ہے جس کے نیچے عرصہ دراز سے ایک قبرنما ڈھیری بنی ہوئی ہے جس کو سب لوگ "شہید" کہتے ہیں اس "شہید" کے بارے میں پورے گاؤں میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اس کی تاریخ جانتا ہو بس "شہید" کے نام سے جانی جاتی ہے اور مشہور ہے۔ اب اس کے اردگرد مٹی گارے کی چھوٹی سی چاردیواری بنی ہوئی ہے اس موجود درخت پر رنگ برنگے بالخصوص سبز رنگ کے کپڑوں کے ٹکڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ خشک سالی کے موسم میں لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس شہید پر مٹی کا لیپ کردو، چاول پکاؤ وغیرہ تو پھر بارش ہوگی۔ اب کچھ عرصہ سے اس شہید کے متصل ایک آدمی نے جگہ خریدی ہے اور رہائش رکھی ہے جو کہ بڑے اہتمام سے اس شہید کو سنبھال رہے ہیں۔

یہ جگہ میری نہیں ہے بلکہ ایک حاجی صاحب کی ہے جو کہ بفضل خدا صحیح العقیدہ ہیں تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں اور کافی سارا وقت لگا چکے ہیں۔ ذاتی طور پر وہ اس شہید کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں ان حاجی صاحب کی اجازت سے اس درخت کو مزدوری پر جڑ سے اکھیڑ دوں یا کسی کو جڑ سے اکھیڑنے کی شرط پر بیچ دوں اور وہ رقم کسی مسجد یا مدرسہ میں دے دوں تو کیسا ہے یہ کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ یا کوئی اور طریقہ آپ کے ذہن میں ہو تو مہربانی کر کے بتا دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں اس طرح قبر کی تزئین وتزیش کا بندوبست کرنا اور قبر کے پاس جا کر صاحبِ قبر سے مانگنا، سب ناجائز وحرام ہیں۔ جس شخص کی یہ جگہ ہے اس پر یہ لازم ہے کہ وہ ان تمام شرکیہ رسومات کو اس جگہ سے ختم کرے ورنہ اس برائی کا گناہ اس شخص پر ہے جس کی یہ جگہ ہے۔ اور درخت کی مالیت کے متعلق درخت کے مالک کو اختیار ہے چاہے تو وہ اپنے تصرف میں لے آئے یا اس کو کسی مسجد مدرسہ وغیرہ میں دے دے۔

لما في عمدة القاري (۸/۱۸۳): ورأى ابن عمر رضي الله عنهما فسطاطاً على قبر عبدالرحمن فقال انزعه يا غلام فإنما يظله عمله. قوله فإنما يظله أي لا يظله الفسطاط بل يظله العمل الصالح فدل هذا على أن نصب الخيام على القبر مكروه ولا ينفع الميت ذلك ولا ينفعه إلا عمله الصالح الذي

قدمه

وفي مشكوة المصابيح(ص٤٣٦): عن أبي سعيد الخدري عن رسول الله ﷺ قال من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان.

وفي الشامية(٢/٢٣٧): أما البناء عليه فلم أر من اختار جوازه ــــ وعن أبي حنيفة يكره أن يبني عليه بناء من بيت أو قبة ونحو ذلك لما روى جابرؓ نهى رسول الله ﷺ عن تجصيص القبور وأن يكتب عليها وأن يبنى عليها

(۲۴۴) مجالس تعزیت، اور ان میں رُلا دینے والے مضامین کا پڑھنا، نیز شخصیات کی تاریخ وفات پر اجتماع کا حکم

سوال ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) ـــ کسی کی وفات کے بعد تین دن تک مجلس تعزیت تو صراحۃً روایات میں ہے۔ تین دن کے بعد مجالس تعزیت کا انعقاد جائز ہے؟ اور کس کی دلیل سے ۲۰،۱۰ سال بعد بھی اگر کسی بزرگ کیلئے مجالس عزا قائم کی جائیں تو کیا شرعاً کوئی ممانعت کی وجہ ہے؟

(۲) ـــ تعزیتی جلسوں میں سیرتی اور مدحی قصائد اور اعراء ومدح پر مشتمل بیانات سے رُلانا کیا یہ جاہلیت کی مجالس نوحہ کی نشأۃ ثانیہ تو نہیں ہے؟

(۳) ـــ وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین کا تکرار ہر سال کیا یہ برسی منانے کے حکم میں نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــ شریعت مقدسہ میں کسی آدمی کے مرنے پر اس کے ورثاء کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ تین دن تک اپنے دکھ اور غم کا اظہار کریں اور تعزیت کیلئے آنے والے لوگوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر میں بیٹھے رہیں تاکہ آنے والے لوگ بسہولت تعزیت کرکے لوٹ جائیں اور ان تین دنوں کے اندر بھی شریعت نے اعتدال کا حکم دیا ہے اور شامیانے لگانے اور دعوت وغیرہ کے اہتمام کو فقہاء نے اقبح القبائح میں شمار کیا ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کو نے مکروہ لکھا ہے الا یہ کہ تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جارہی ہے وہ غائب ہو تو پھر اس کی اجازت ہے لہٰذا تین دن کے بعد تعزیتی مجالس قائم کرنا شریعت سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

(۲) ـــ جب اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تعزیتی جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی سے ثابت نہیں تو ان جلسوں میں مدحی قصائد پڑھنا یا بیانات کرکے لوگوں کو رلانا ان کی شناعت وقباحت میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے رسومات جاہلیت کی یاد تازہ ہوتی ہے لہٰذا ایسے جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی کی رو سے جائز نہیں۔

(۳) ـــ اگر کسی شخصیت کی وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین اور بیانات میں التزام اور کار ثواب سمجھے بغیر اس کی دینی خدمات کا ذکر کر دیا جائے اور مروجہ خرافات (مثلاً کھانے کا التزام، لوگوں کو اعلان کرکے جمع کرنا، اس کو دین کا حصہ اور کار ثواب سمجھنا، اور بعض مقامات پر

مردوزن کا اختلاط وغیرہ) نہ پائی جاتی ہوں تو یہ بری کے حکم میں نہیں ہے ہم اگر اس کو بھی کار ثواب سمجھا جائے اور اس کا التزام کیا جائے تو یہ بدعت میں داخل ہوگا۔

لما فی تبیین الحقائق (۱/۵۸۹): (فصل) ولا بأس بتعزیة اهل المیت وترغیبهم فی الصبر لقوله علیه الصلوٰة و السلام من عزا مصاباً فله مثل أجره ویقول له اعظم الله أجرک واحسن عزاء ک وغفر لمیتک ولاباس بالجلوس لها الی ثلاثة ایام من غیر ارتکاب محظور من فرش البسط والاطعمة من أهل المیت لأنها تتخذ عند السرور وعن انس أنه علیه الصلوٰة والسلام قال لاعقر فی الاسلام وهو الذی کان یعقر عند القبر بقرة أوشاة.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۵۲۷): هی ان یسلی أهل المیت ویحملهم علی الصبر بوعد الأجر ویرغبهم فی الرضا بالقضاء والقدر ویدعو للمیت المسلم وتکون الی ثلاثة لیال بایامها وتکره بعدها الا لغائب حتی لایجدد له الحزن ولاذن الشارع فی الاحداد فی الثلاث بقوله ﷺ لایحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الاخر ان تحد علی میت فوق ثلاثة ایام الاعلی زوجها أربعة أشهر وعشراً — وقال الحنفیة لاباس بالجلوس للتعزیة فی غیر المسجد ثلاثة ایام، واولها افضلها وقال فی الفتاوی الظهیریة لاباس بها لأهل المیت فی البیت او المسجد والناس یأتونهم ویعزونهم ویکره الجلوس عند أهل المیت وتکون التعزیة فی بیت المصاب — (وبعد صفحة قال) ولاباس کما ذکر الحنفیة برثاء المیت بشعر اوغیره لکن یکره الافراط فی مدحه لاسیما عند جنازته لحدیث من تعزی بعزاء الجاهلیة فاعضّوه بهن ابیه ولا تکنوا وهذا امر تادیب ومبالغة فی الزجر عن دعوی الجاهلیة.

(۴۴۳) خودکشی کرنے والے کی قیامت میں سزا

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو خودکشی کرے تو وہ جس طرح اپنے آپ کو مارتا ہے قیامت تک اسی طرح وہ اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔ کیا لوگوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً — خودکشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور ایسے شخص کے متعلق احادیث مبارکہ کے اندر سخت وعیدیں آئی ہیں چنانچہ احادیث مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جس طریقے سے خودکشی کرتا ہے جب تک وہ جہنم میں رہے گا اسی حالت میں رہے گا، البتہ خودکشی کرنے والے شخص کو مفتی بہ قول کے مطابق غسل بھی دیا جائے گا اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی، لیکن علماء، صلحاء اور مقتدا حضرات اس میں شرکت نہیں کریں گے تاکہ دوسرے لوگوں کو تنبیہ ہو اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

لما فی البخاری (۱/۱۸۲) عن ثابت بن الضحاک عن النبی ﷺ قال من حلف بملة غیر الاسلام کاذبا متعمداً فهو کما قال ومن قتل نفسه بحدیدة عذب بها فی نار جهنم قال وقال حجاج بن منهال حدثنا جریر بن حازم عن الحسن قال حدثنا جندب فی هذا المسجد فما نسیناه وما نخاف ان یکذب جندبٌ علی النبی ﷺ قال کان برجل جراح فقتل نفسه فقال الله بدرنی عبدی بنفسه حرمت علیه الجنة.

عن ابی هریرةؓ قال قال النبی ﷺ الذی یخنق نفسه یخنقها فی النار والذی یطعنها یطعنها فی النار.

وفی الدر المختار (۲/۲۱۱) (من قتل نفسه) ولو (عمداً یغسل ویصلی علیه) به یفتی وان کان اعظم وزراً من قاتل غیره، ورجح الکمال قول الثانی بما فی مسلم ((أنه علیه الصلوة والسلام أتی برجل قتل نفسه فلم یصل علیه))

وفی الشامیة تحته: (قوله به یفتی) لأنه فاسق غیر ساع فی الارض بالفساد وان کان باغیاً علی نفسه کسائر فساق المسلمین زیلعی.

اقول قد یقال لا دلالة فی الحدیث علی ذلک لأنه لیس فیه سوی انه علیه الصلوة والسلام لم یصل علیه فالظاهر أنه امتنع زجراً لغیره عن مثل هذا الفعل کما امتنع عن الصلوة علی المدیون ولا یلزم من ذلک عدم صلاة احد علیه من الصحابة اذلا مساواة بین صلاته وصلاة غیره قال تعالی ان صلاتک سکن لهم ثم رأیت فی شرح المنیة بحثاً کذلک.

(۴۴۳) جانتے بوجھتے مرزائی کا جنازہ پڑھانے والے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معلوم ہونے کے باوجود "مرزائی" کا جنازہ پڑھانے والا امام شرعاً فاسق اور قابلِ معزول ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً اس بات کے معلوم ہونے کے باوجود کہ "مرزائی" کا جنازہ ہے، پھر بھی اس کی نماز جنازہ پڑھاتا ہے تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

لما فی الشامی (۱/۵۲۳): وقد علمت أن الصحیح خلافه، فالدعاء به کفر لعدم جوازه عقلا ولا شرعا ولتکذیبه النصوص القطعیة بخلاف الدعاء للمؤمنین کما علمت، فالحق مافی الحلیة علی الوجه الذی نقلناه عنها لاعلی مانقله ح فافهم.

(۴۴۵) قبرستان پر چھت اور عمارت بنانے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاندان کا ایک قبرستان ہے جس پر چھت بنالیتے ہیں تو قبرستان میں عمارت بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... صورت مذکورہ میں اگر میت کے دفن کرنے کے بعد قبر کی مضبوطی کیلئے چھت بنائی جائے ہو تو یہ مکروہ ہے اور اگر تزئین کیلئے بنائے جاتی ہو تو یہ حرام ہے اور قبرستان میں عمارت چونکہ قبروں ہی کے اوپر بنائی جاتی ہے اس لئے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

وفی الهندیة(۱/۱۶۶): ویکره ان یبنی علی القبر.

وفی الشامیة(۲/۲۳۷): (قوله ولا یرفع علیه بناء) ای یحرم لو للزینة ویکره لو للاحکام بعد الدفن.

(۴۴۶) جنازہ گاہ میں وقتیہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبرستان میں ایک جگہ نماز جنازہ پڑھنے کیلئے تعمیر کی گئی ہے اس میں نماز جنازہ پڑھتے ہیں پھر اسی قبرستان میں دفن کرتے ہیں اگر اس وقت نماز کا وقت داخل ہو جائے تو اسی جگہ فرض نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ... وہ جگہ جو قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنے کیلئے مخصوص کی گئی ہو، یا وہ جگہ جو عید کی نماز کیلئے مخصوص کی گئی ہو، نماز پڑھنے کے واسطے مسجد ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اور اس میں ضرورتاً وقتیہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔

لما فی طحطاوی علی المراقی(ص۲۹۰): وفی زاد الفقیر تکره الصلاة فی المقبرة الا ان یکون فیها موضع اعد للصلاة لانجاسة فیه ولا قذر فیه الخ.

وفی الدر المختار(۱/۶۵۷): (و)اما (المتخذ لصلاة جنازة او عید) فهو (مسجد فی حق جواز الاقتداء) وان انفصل الصفوف رفقا بالناس (لافی حق غیره) به یفتی الخ.

وفی الشامیة (قوله به یفتی نهایة) عبارة النهایة والمختار للفتوی انه مسجد فی حق جواز الاقتداء.

(۴۴۷) نماز جنازہ کی فرضیت کب ہوئی؟ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی نماز جنازہ پڑھی گئی تھی یا نہیں؟

سوال ... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ کب فرض ہوئی قبل ہجرت یا بعد ہجرت، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھائی گئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ نماز جنازہ ہجرت کے پہلے سال میں شروع ہوئی اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات ہجرت سے پہلے ہوئی تھی تو اس وجہ سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی گئی تھی۔

لما فی حاشیة الطحطاوی علی المراقی (ص۲۸۷): قال الواقدی: لم تکن شرعت یوم موت خدیجة، وموتها رضی اللہ عنها بعد النبوة بعشر سنین علی الأصح

وفی اوجز المسالک (۱۹۱/۲): وفی الانوار الساطعة شرعت صلاة الجنازة بالمدینة المنورة فی السنة الاولیٰ من الهجرة فمن مات بمکة المشرفة لم یصل علیه اهـ

وفی البدایة والنهایة (جزء۲، ۱۲۵/۳): قال عروة بن الزبیر وقد کانت خدیجةؓ توفیت قبل ان تفرض الصلاة ثم روی من وجه آخر عن الزهری انه قال توفیت خدیجةؓ بمکة قبل خروج رسول اللہ ﷺ الی المدینة وقبل ان تفرض الصلوٰة اهـ

(۴۴۸) خلفاء راشدین کی نماز جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی؟

سوال ۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کی نماز جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی تھی؟ با حوالہ نقل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ۔۔۔ حضرات خلفاء راشدین کی نماز جنازہ جن حضرات نے پڑھائی تھی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

(۲)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے

(۳)۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے

(۴)۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔

وفی تاریخ الخلفاء: وأخرج ابن سعد عن سعید بن المسیب أن عمر رضی اللہ عنه صلی علی أبی بکر بین القبر والمنبر وکبر علیه أربعا (ص۹۵)

أصیب عمر یوم الأربعاء لأربع بقین من ذی الحجة ودفن یوم الأحد مستهل المحرم الحرام، وله ثلاث وستون سنة ۔۔۔ وصلی علیه صهیب فی المسجد. (ص۱۰۹)

قال قتادة: صلی علیه الزبیر ودفنه، وکان اوصی بذلک إلیه. (ص۱۲۹)

وأقام علیّ الجمعة والسبت، وتوفی لیلة الأحد، وغسله الحسن والحسین، وعبداللہ بن جعفر وصلی علیه الحسن. (ص۱۳۹)

(۴۴۹) ڈاکوؤں وغیرہ کے ہاتھوں مارے جانے والے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو مثلاً ڈاکو یا قطاع الطریق شہید کردے یا اہل فریقین کی لڑائی میں یہ شخص غلطی سے مارا گیا ہو تو کیا اس پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے یعنی اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: صورت مسئولہ میں اگر زید کو ڈاکو یا قطاع الطریق وغیرہ قتل کردیں۔ پھر وہ دنیاوی نفع حاصل نہ کرسکے یعنی کھانا پینا علاج کرنا وغیرہ تو زید پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے اگر یہ فریقین کی لڑائی میں غلطی سے مارا گیا تو وہ شہید اخروی ہوگا۔

لما فی البخاری (۱/۹۰): عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوک علی الطريق فاخره فشكر الله له فغفر له. ثم قال الشهداء خمسة المطعون والمبطون والغريق وصاحب الهدم والشهيد في سبيل الله.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۲/۱۵۸۳): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغی او قطاع الطريق او اللصوص في منزله ليلا او نهاراً بای آلة: مثقل او محدد او وجد في المعركة وبه اثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من اذن او عين او قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفاً (بالغا عاقلا) طاهرا (خالياً من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعد انقضاء الحرب ای لايموت عقب الاصابة.

وفی الشامية (۲/۲۴۸): (قوله حتى لو وجب الخ) تفريع على مفهوم قوله بنفس القتل، فان المال لم يجب بنفس القتل العمد لان الواجب به القصاص، وانما سقط بعارض وهو الصلح او شبهة الابوة، فلا يغسل في الرواية المختارة. كما في الفتح والحاصل انه اذا وجب بقتله القصاص وان سقط لعارض اولم يجب بقتله شئ اصلا فهو شهيد كما علمته اما اذا وجب به المال ابتداء فلا، وذلك بان كان قتله شبه العمد كضرب بعصا او خطا كرمى غرض فاصابه او ماجرى مجراه كسقوط نائم عليه.

وفی ابی داؤد (۲/۴۴۳): جابر بن عتيک اخبره ان رسول الله ﷺ جاء يعود عبدالله بن ثابت فوجده قد غلب فصاح به رسول الله ﷺ فلم يجبه فاسترجع رسول الله ﷺ وقال غلبنا عليک يا ابا الربيع فصاح النسوة وبكين فجعل ابن عتيک يسكتهن فقال رسول الله ﷺ دعهن فاذا وجب فلا تبكين باكية قالو او ما الوجوب يا رسول الله قال الموت قالت ابنته والله ان كنت لارجوان تكون شهيد افانک قد كنت قضيت جهازک قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل قد اوقع اجره على قدر

بينه وما تعدون الشهادة قالوا القتل في سبيل الله قال رسول الله ﷺ الشهادة سبع سوى القتل في سبيل الله، المطعون شهيد والغرق شهيد وصاحب ذات الجنب شهيد والمبطون شهيد وصاحب الحريق شهيد والذي يموت تحت الهدم شهيد والمرأة تموت بجمع شهيد.

(۳۵۰) سیاسی قائدین وکارکنان اور رافضی، بدعتی وغیرہ کا مارا جانا شہادت ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سیاسی جماعتوں کے کارکنان وقائدین جو کہ باہم سیاسی اختلافوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں اور بعض اوقات ان میں سے کچھ مارے جاتے ہیں۔ یا اسی طرح کسی کو نامعلوم افراد مار دیتے ہیں۔ تو دریافت طلب بات یہ ہے کہ (۱) ایسے مارے جانے والے کیا شہید ہوں گے؟ (۲) ان میں جو بے گناہ مارا جائے کیا اس کو بغیر غسل دیئے دفن (شہادت دنیاوی کے اعتبار سے) جائز ہے؟۔ (۳) ... ان میں جو (رافضی یا بدعتی یا کوئی اور فاسق یا قاتل) مارا جائے۔ کیا وہ بھی شہید ہوگا؟۔ (۴) رافضی وامثالہ کے جنازے میں یا قبر پر حاضر ہونا جائز ہے؟۔ (۵) کیا ایسا شخص کہ جو سراسر (مسلمان یا دین کا مخالف اور غیر مسلموں کے مقابلے میں) ساتھی ہو، اس کو کوئی قتل کر دے تو کیا وہ شہید ہوگا؟ اور اس کو قتل کرنے والا کیا گنہگار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۲،۱) شریعت اسلامیہ میں شہید کامل (دنیاوی واخروی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں چھ شرائط پائی جاتی ہوں۔ (۱) مکلف ہونا، (۲) مسلمان ہونا، (۳) ظلماً قتل ہونا، (۴) نفس قتل سے عوض مالی کا واجب نہ ہونا، (۵) طاہر ہونا، (۶) زخمی ہونے کے بعد کوئی دنیاوی فائدہ نہ اٹھانا۔ لہٰذا جس شخص میں مذکورہ بالا چھ شرائط بیک وقت موجود ہوں وہ شخص شہید کامل کہلائے گا اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے۔

البتہ شہید کی ایک دوسری قسم ہے شہید اخروی، جس کی فقہائے کرام نے ایک طویل فہرست ذکر کی ہے مثلاً مبطون یعنی پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والا، مطعون یعنی طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والا، غریق پانی میں ڈوب کر مرنے والا، غریب حالت سفر میں مرنے والا، طالب علم، حالت جنابت میں مارا جانے والا وغیرہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ غسل بھی دیا جائے گا اور نماز بھی پڑھی جائے گی البتہ آخرت میں یہ لوگ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔

(۳) چونکہ شہید کیلئے ایک شرط مسلمان ہونا ہے، لہٰذا جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں تو وہ اگر مارا جائے تو وہ شہید نہیں کہلائے گا البتہ مقتول کے بدعتی یا فاسق یا قاتل ہونے سے اس کی شہادت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اگرچہ اس معصیت کا وبال ہے اس کو گناہ ہوگا۔

(۴) جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں اس کی نماز جنازہ اور قبر پر حاضر ہونا ناجائز ہے۔

(۵) مسلمانوں میں سے جو شخص مسلمانوں اور دین کا مخالف ہو اور دلی طور پر کفار کا ساتھی ہو، اگرچہ وہ مجرم تو ضرور ہے، امام وقت اگر مناسب سمجھے تو اس کو تعزیر کا حق ہے لیکن عام شہری کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کو قتل کر دے اگر قتل کر دیا تو اس پر دنیا میں شہید کے احکام جاری ہوں گے اور قاتل گناہگار ہوگا۔

لما فی الدرالمختار (۲۴۷/۲): (هو کل مکلف مسلم طاهر) ــــ (ص۲۴۸) (قتل ظلماً) بغیر حق (بجارحة) ای بما یوجب القصاص (ولم یجب بنفس القتل مال) بل قصاص ــــ (ص۲۴۹) (ولم یرتث) فلو ارتث غسل کما سیجئ (وکذا) یکون شهیداً (لو قتله باغ او حربی او قاطع طریق ولو تسبباً او (بغیر آلة جارحة) فان مقتولهم شهید بای آلة قتلوه ــــ (او وجد جریحاً میتاً فی معرکتهم) المراد بالجراحة علامة القتل ــــ (ص۲۵۰) (ویصلی علیه بلا غسل ویدفن بدمه وثیابه) ــــ (ویغسل من وجد قتیلاً فی مصر) او قریة (فیما) ای فی موضع (یجب فیه الدیة) ــــ (ولم یعلم قاتله) او علم ولم یجب القصاص فان وجب کان شهیداً کمن قتله اللصوص لیلاً فی المصر فانه لاقسامة ولادیة فیه للعلم بان قاتله اللصوص غایة الامر ان عینه لم تعلم فلیحفظ فان الناس عنه غافلون (اوقتل بحد او قصاص) (ص۲۵۱) ای یغسل وکذا بتعزیر او افتراس سبع (اوجرح وارتث) ــــ (ص۲۵۲) وهذا کله اذا کان (بعد انقضاء الحرب ولوفیها) ای فی الحرب (لا) یصیر مرتثاً بشیئ مما ذکر وکل ذلک فی الشهید الکامل والا فالمرتث شهید الاخرة وکذا الجنب ونحوه.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۱۵۸۸/۲): فالشهداء ثلاثة، شهید فی حکم الدنیا والآخرة: وهو شهید المعرکة اما حکم الدنیا فلا یغسل ولا یصلی علیه عند الجمهور کما ابث واما حکم الاخرة فله ثواب خاص وهو الشهید الکامل الشهادة.

وشهید فی حکم الدنیا فقط وهو عند الشافعیة من قتل فی قتال الکفار بسببه وقدغل من الغنیمة اوقتل مدبراً او قاتل ریاءً اونحوه ای لایغسل ولا یصلی علیه ولا ثواب له فی الاخرة.

شهید فی حکم الاخرة فقط کالمقتول ظلماً من غیر قتال والمبطون اذا مات بالبطن والمطعون والغریق، والغریب، وطالب العلم ــــ وحکم هؤلاء الشهداء فی الدنیا ای شهداء الاخرة ان الواحد منهم یغسل ویکفن ویصلی علیه اتفاقاً کغیره من الموتی اما فی الاخرة فله ثواب الاخرة فقط وله اجر الشهداء یوم القیامة.

المعصیة والشهادة: المعصیة لاتمنع الاتصاف بالشهادة فیکون المیت شهیداً عاصیاً لان الطاعة لاتلغی المعصیة الا فی الصغائر قال تعالیٰ ان الحسنات یذهبن السیئات سورة هود (۱۱۴/۱۱).

(۴۵۱) دہشتگردوں کی فائرنگ سے چوکی پر موجود پولیس ملازم قتل ہو گیا، کیا وہ شہید ہے؟

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ جو پولیس یا حکومتی ملازم کسی حادثہ میں قتل ہو جاتا ہے

جیسے عام طور پر دہشت گرد آ کر چوکی پر فائر کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے عام طور پر پولیس والے مرجاتے ہیں تو کیا وہ شہید کے حکم میں داخل ہوں گے یا نہیں، اگر ہوں گے تو کیا حقیقی ہوں گے یا حکمی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ یہ حقیقی شہید کے حکم میں ہوں گے۔

لما فی الهندیة (۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة بأی آلة قتل بحديد أو حجر أو خشب فهو شهيد.

وفی الدر المختار مع رد المحتار (۲/۲۴۹): (كذا) يكون شهيدا (لو قتله باغ أو حربی أو قاطع طريق ولو) تسبيبا الخ ـــــ قال العلامة ابن العابدين تحت (قوله أو قاطع طريق) والمكابرون فی المصر ليلا بمنزلة قطاع الطريق كما فی البحر عن شرح المجمع، فمن قتلوه ولو بغير محدد فهو شهيد كما لو قتله القطاع، وكذا من قتله اللصوص ليلا كما سيأتی وذكر فی البحر أنه زاد فی المحيط سببا رابعا وهو من قتل مدافعا ولو عن ذمی فانه شهيد بأی آلة قتل وان لم يكن واحداً من الثلاثة أی ممن قتله باغ أو حربی أو قاطع طريق وقال فی النهر: كونه شهيدا وان قتل بغير محدد مشكل جدا لوجوب الدية بقتله. فتدبره ممعنا النظر فيه اهـ قلت يمكن حمله علی ما اذا لم يعلم قاتله عينا، كما لو خرج عليه قطاع طريق أو لصوص أونحوهم.

(۳۵۲) ہندوؤں کے میلوں وغیرہ میں کسی حادثہ کا شکار ہونے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال ـــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی اپنے کو قتل کر دے یعنی زہر کھا کر مرجائے یا چھت پر چڑھ جائے یا کافروں کی طرف سے منعقدہ کسی فنکشن میلہ اور ہندو تہوار وغیرہ میں شرکت کر کے ان کی تماشاؤں میں مشغول ہو کر کسی حادثہ کا شکار ہو گیا اور ان کے رسم ورواج کے مطابق کسی تقریب تہوار وغیرہ میں شامل ہو کر مر گیا اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ اگر جمعیت علماء پہلے سے ان لوگوں کے متعلق یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی تاکہ دوسرے لوگ اس سے پرہیز کریں یعنی عبرت حاصل کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر محلے کے امام مسجد نے اس شخص کا جنازہ پڑھا دیا تو اس امام کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر امام کے علاوہ کسی اور نے اس کا جنازہ پڑھا دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ ہندوؤں اور غیر مسلموں کے تہواروں اور میلوں میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ان میلوں میں شرکت کرتے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو کر مرجائے، اسی طرح اگر خودکشی کرے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ البتہ ان کی نماز جنازہ میں اگر چیدہ علماء زجراً شرکت نہ کریں تو یہ درست ہوگا۔ جیسا کہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ لیکن جمعیت علماء کا یہ فیصلہ کہ نماز جنازہ ہی نہیں پڑھی جائے گی، درست نہیں۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ہر

ٹیک وجہ پر نماز جنازہ پڑھا کرو، اور نماز جنازہ پڑھانے والے امام پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اس کو جنازہ پڑھانے کا ثواب ملے گا۔

وفی النسائی(۱/۲۱۵): عن جابر بن سمرة أن رجلا قتل نفسه بمشاقص فقال رسول الله ﷺ أما انا فلا اصلّی علیه

وفی کنز العمال(۲/۵۴)(حدیث:۱۴۸۱۵): صلوا خلف کل برّ وفاجر وصلوا علی کل برّ وفاجر ......الخ.

وفی اعلاء السنن (۸/۲۷۳): قال النووی: أخذ بظاهره من قال: "لا یصلی علی قاتل نفسه لعصیانه" "وهو مذهب الاوزاعی وأجاب الجمهور: بانه ﷺ لم یصلّ علیه بنفسه زجراً للناس عن مثل فعله وصلت علیه الصحابة وهذا کما ترک ﷺ فی أوّل الامر الصلاة علی من علیه دین زجراً لهم عن التساهل فی الاستدانة وعن اهمال وفاء ها وأمر أصحابه بالصلاة علیه فقال" صلّوا علی صاحبکم.

وفی الدر المختار(۲/۲۱۱): (من قتل نفسه) ولو (عمداً یغسل ویصلی علیه) به یفتی وإن کان اعظم وزرا من قاتل غیره (وتحته فی الشامیة) أقول: قد یقال: لا دلالة فی الحدیث علی ذلک لأنه لیس فیه سوی أنه علیه الصلوة والسلام لم یصلّ علیه، فالظاهر أنه امتنع زجراً لغیره عن مثل هذا الفعل کما امتنع عن الصلوة علی المدیون ولا یلزم من ذلک عدم صلوة أحد علیه من الصحابة إذلا مساواة بین صلاته وصلاة غیره.

(۴۵۳) جہاد میں اگر کوئی اپنے فعل کی وجہ سے قتل ہو جائے تو اس کے غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی جہاد میں اپنے ہی اسلحہ وغیرہ سے مارا جائے تو اسے عام میت کی طرح غسل وغیرہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اسے غسل دیا جائے گا۔

لما فی التاتارخانیة(۲/۱۶۴): ومن قتل نفسه خطأ بان تاول رجلا من العدو لیضربه فاخطأ واصاب نفسه ومات فانه یغسل ویکفن ویصلی علیه.

وفی الهندیة(۱/۱۶۳): ومن قتل نفسه خطأ بان تاول رجلا من العدو لیضربه بالسیف فاخطأ واصاب نفسه، ومات غسل وصلی علیه.

(۴۵۴) میت کے سینے پر انگلی سے کلمہ وغیرہ لکھنے اور قبر میں آیات قرآنیہ رکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے چہرے یا سینے پر انگلی سے کلمہ، آیات وغیرہ لکھنا

یا کاغذ پر لکھی ہوئی آیتوں کا قبر میں رکھنا شرعا کیسا ہے؟ اور اسی طرح جنازہ دفن کرنے کے بعد میت کے گھر پر کوئی پڑوسی یا اس کا رشتہ دار (کڑوی روٹی) کھانا کھلاتے جسے کڑوی روٹی کہتے ہیں۔ کیا یہ لوگوں کو کھلانا شرعا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً (۱)۔ میت کے چہرے یا سینے پر بغیر سیاہی کے انگلی کے ساتھ کوئی آیت یا کلمہ وغیرہ لکھنا جائز ہے لیکن اسے ضروری نہ سمجھا جائے۔

(۲)۔ کاغذ پر لکھی ہوئی آیات کا میت کے ساتھ قبر میں رکھنا درست نہیں اس میں قرآن کریم کی بے حرمتی ہے۔

(۳)۔ جب کسی گھر میں فوتگی ہو جائے تو میت کے پڑوسیوں کیلئے مستحب ہے کہ وہ اہل میت کے کھانے کا انتظام کریں اور خود اہل میت کے ساتھ بیٹھ کر انہیں کھلائیں، لیکن آجکل جو عام رواج بن گیا ہے کہ کسی شخص کے انتقال پر اس کا پڑوسی یا کوئی رشتہ دار تمام شرکاء جنازہ کیلئے کھانے کا انتظام کرتا ہے اور اسے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اور سب شرکاء انتظام نہ ہونے کی صورت میں اسے برا سمجھتے ہیں اس کی شرعا کوئی گنجائش نہیں۔ اور جہاں تک کڑوی روٹی کھلانے کا تعلق ہے تو یہ بدعت قبیحہ ہے اس سے اجتناب کیا جائے۔ البتہ میت کے وہ رشتہ دار جو دور سے آئے ہوں یا ایسے رشتہ دار جن کا اہل میت کے پاس رہنا ضروری ہو ان کا اہل میت کے ہاں کھانا کھانا درست ہے۔

لما فی فتح القدیر (۲/۱۴۲): ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم لقوله ﷺ "اصنعوا لآل جعفر طعاماً فقد جاء هم ما یشغلهم ..... ولانه بر ومعروف ویلح علیهم فی الاکل لان الحزن یمنعهم من ذلک فیضعفون

وفی الشامیة (۲/۲۴۹): تکره کتابة القرآن واسماء الله تعالیٰ علی الدراهم والمحاریب والجدران وما یفرش، وما ذاک الا لاحترامه وخشیة وطئه ونحوه مما فیه اهانة فالمنع هنا بالاولیٰ مالم یثبت عن المجتهد أو ینقل فیه حدیث ثابت. نعم نقل بعض المحشین عن فوائد الشرجی أن مما یکتب علی جبهة المیت بغیر مداد بالاصبع المسبحة بسم الله الرحمن الرحیم وعلی الصدر لا اله الا الله محمد رسول الله وذلک بعد الغسل قبل التکفین.

وفی الشامیة (۲/۲۴۰): ویکره اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لافی الشرور وهی بدعة مستقبحة

(۲۵۵) میت کو غسل دیتے وقت ذکر و دعا کرنے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی مردوں کو غسل دیتا ہے۔ وہ دوران غسل کبھی ذکر و اذکار اور وضو کی دعاؤں کا ورد کرتا ہے۔ اور کبھی چھوڑ دیتا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت غاسل اور اس کے معاونین ذکر و اذکار اور دعا میں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اگر میت غسل خانے میں ہو تو کیا حکم ہے؟ اور اگر غسل خانے کے علاوہ دوسری

صاف جگہ میں غسل کا بندوبست ہوا ہو تو پھر وہاں کیا حکم ہوگا مذکورہ ذکر واذکار ودعاؤں کا؟ نیز اگر جائز ہو تو پھر غاسل دوسروں کو اس کے پڑھنے کی ترغیب دے سکتا ہے یا نہیں؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ شرعاً انسان نجاست کی جگہ میں اور ستر کھلا ہونے کی حالت میں بلند آواز سے ذکر واذکار نہیں پڑھ سکتا ہے البتہ دل میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر موضع نجاست نہ ہو اور کشف عورت بھی نہ ہو تو پھر بلند آواز سے ذکر واذکار پڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں میت کو جس جگہ غسل دیا جارہا ہے اگر وہ موضع نجاست نہیں ہے اور نہ میت کو نجاست لگی ہوئی ہے اور نہ ستر کھلا ہوا ہے تو اس صورت میں غاسل اور اس کے معاونین ذکر واذکار ودعا ووضو بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں ہاں اگر وہ موضع نجاست ہے یا کشف عورت پایا جارہا ہے تو اس صورت میں دل میں ذکر واذکار ودعا ووضو پڑھیں گے اور اگر میت کو غسل خانہ میں غسل دیا جارہا ہے تو پھر بھی یہی حکم ہے کہ نجاست ہونے اور کشف عورت کی صورت میں دل میں ذکر وغیرہ پڑھیں گے نہ ہونے کی صورت میں بلند آواز سے ذکر وغیرہ پڑھیں گے البتہ قرآن شریف کی تلاوت کرنا میت کے پاس بیٹھ کر غسل دینے سے پہلے مکروہ ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص ۵۶۲): وتكره قراءة القرآن عنده حتى يغسل تنزيها للقرآن عن نجاسة الحدث بالموت والخبث فانه يزول عن المسلم بالغسل تكريماً له بخلاف الكافر قوله: (عن نجاسة الحدث) ــــ والحاصل انهم اختلفوا في نجاسة الميت فقيل نجاسة خبث وقيل حدث ويشهد للثاني ماروينا من تقبيله ﷺ عثمان بن مظعون وهو ميت قبل الغسل اذلو كان نجسا وقع فاه الشريف على جسده ولا ينافي ذلك ماذكروه من انه لو حمله انسان قبل الغسل فصلى به لا تصح صلاته وكذا كراهة القراءة عنده قبل الغسل لجواز ان يكون ذلك لعدم خلوه عن نجاسة غالبا والغالب كالمحقق.

وفي الهندية(۱/ ۵۰): ويستحب له عند الدخول في الخلاء ان يقول اللهم انى اعوذبك من الخبث والخبائث ــــ كذا في التبيين ولا يتكلم ولا يذكر الله تعالىٰ ولا يشمت عاطسا ولا يرد السلام ولا يجيب المؤذن فان عطس يحمد الله بقلبه ولا يحرك لسانه ــــ كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار(۱/ ۱۰۸، ۱۰۹): والبداءة بالتسمية قولا وتحصيل بكل ذكر ــــ قبل الاستنجاء وبعده الاحال انكشاف وفي محل نجاسة فيسمى بقلبه.

وفي الشامية(۲/ ۱۹۳): وذكر . ط. ان محل الكراهة اذا كان قريبا منه اما اذا بعد عنه بالقراءة فلا كراهة اهـ ــــ وتكره قراءة القرآن في موضع النجاسة كالمغتسل والمخرج والمسلخ وما اشبه ذلك واما في الحمام فان لم يكن فيه احد مكشوف العورة وكان الحمام طاهرا لا باس بان يرفع صوته بالقراءة وان لم يكن كذلك فان قرأ في نفسه ولا يرفع صوته فلا باس به ولا باس بالتسبيح

وقطع الشعر لا يجوز نهر، فلو قطع ظفره أو شعره أدرج معه في الكفن قهستاني عن العتابي۔ — وأيضاً (صـ۲۰۲) (قوله إزار الخ) هو من القرن إلى القدم والقميص من أصل العنق إلى القدمين بلا دخريص وكمين الى قول والدخريص: الشق الذي يفعل في قميص الحي ليتسع للمشي (قوله وتكره العمامة الخ) هي بالكسر مايلف على الرأس قاموس قال ط: وهي محل الخلاف وأما ما يفعل على النعش من العمامة والزينة ببعض حلي فهو من المكروه بلا خلاف لما تقدم انه يكره فيه كل ما كان للزينة اهـ

وفي المحيط البرهاني (۶۲/۳): وقيل معناه يزاد على ما عليه من الثياب ثوب جديد تكرماً له، وإن كان عليه يبلغ السنة، وينقصون ماشاؤوا، وإن كان ما عليه يبلغ السنة، ويخيطونه ان شاؤ وا كما يفعل ذلك لغيره من الموتى، انما لا يزال عنه اثر الشهادة فأما فيما سوى ذلك فهو كغيره من الموتى۔ — وأيضاً (صـ۶۶) ولنا: حديث ابن عباسؓ، أن النبي ﷺ كفن في حلة وقميص، والحلة اسم الثوبين عند العرب، ازار ورداء، ولأن اشرف لباس الأحياء القميص، فوجب تقديمه، إلا انه لا يجعل قميصه على هيئة قميص الاحياء فلا يجعل له دخريص، لأن ذلك انما يجعل في حق الحي ليتسع أسفله، فيتيسر له المشي، والميت لا يحتاج إلى ذلك، ولا يكف اطرافه، لأنه ذلك يفعل للحي، ولا حاجة للميت إليه، والأخذ بحديث ابن عباسؓ اولى من الأخذ بحديث عائشةؓ، لان الرجال هم الذين حضروا رسول الله ﷺ.

(۴۵۷) حرم میں جنازہ اندر ہونے کی وجہ اور حرم میں خواتین کا نماز پڑھنا

سوال — کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض دینی باتیں جو ہمارے یہاں منع ہوتی ہیں لیکن حرم شریف میں لوگ کر رہے ہوتے ہیں، اور علماء بھی اس کی اجازت دیتے ہیں یا منع نہیں کرتے، ایسی ہی ایک دو باتیں ہیں جو آپ سے معلوم کرنی تھیں۔ براہِ کرم اگر آسانی اور سہولت ہو تو کرم نوازی فرمادیں۔

(۱)۔ ہمارے یہاں مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاتی جبکہ حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲)۔ ہمارے یہاں خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آنے سے روکا جاتا ہے جبکہ حرم میں خواتین نماز مسجد حرام میں ہی پڑھتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً — (۱)۔ مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ ابوداؤد (۴۵۳/۲) میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مسجد میں جنازے پر نماز ادا کی تو اس کیلئے کوئی ثواب نہیں“۔ اور چونکہ اس میں مسجد کی ناپاکی کا بھی خطرہ رہتا ہے اس وجہ سے احناف نے مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے کو مکروہ کہا ہے۔ البتہ اگر جنازہ اور کچھ نمازی مسجد

سے پہلے ہوں اور باقی نمازی مسجد میں ہوں تو اس صورت میں جائز ہے اور حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باہر رکھنے میں حرج عظیم لازم آئے گا اور اس حرج کو دفع کرنے کیلئے جنازہ کو اندر رکھ کر نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۲)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے ممانعت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ عورتوں کیلئے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے اور گھر میں بھی بالکل پوشیدہ جگہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے عورتوں کے مسجد میں جانے سے متعلق شدت اختیار کی اور فتنے کے خوف سے عورتوں کو منع کیا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے کی عورتوں کا حال دیکھ لیتے تو ان کو مسجد میں آنے سے منع فرمادیتے۔ اسی وجہ سے متاخرین نے فتنے کے خوف سے مطلقاً عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ لکھا ہے البتہ مسجد حرام کے متعلق علماء نے ضرورت کی وجہ سے گنجائش نکالی ہے کہ اگر مسجد حرام یا مسجد نبوی میں عورتیں نماز ادا کریں تو اس میں کراہت نہ ہوگی اور عام طور پر وہاں عورتوں کیلئے نماز پڑھنے کی الگ جگہ متعین ہوتی ہے جہاں عورتیں نماز ادا کرتی ہیں لہٰذا فتنہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

لمافی سنن ابی داؤد (۲/۴۵۴) (کتاب الجنائز): ــــ عن ابی هريرة (رضی الله عنه) قال قال رسول الله ﷺ من صلى على جنازة في المسجد فلا شیء له.

وفيه ايضاً (۱/۸۴): باب ماجاء فی خروج النساء الى المسجد) عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ لا تمنعوا نساء كم المساجد وبيوتهن خير لهن.

وفيه ايضاً (۱/۸۴): عن عبدالله عن النبی ﷺ قال صلوة المرأة فی بيتها افضل من صلاتها في حجرتها، وصلاتها في مخدعها افضل من صلاتها في بيتها.

وفی اعلاء السنن (۴/۲۶۲): ــــ فيه دلالة على جواز خروج النساء مطلقاً سواء كن شواب أو عجائز للصلاة فی مسجد الحرام او مسجد النبی ﷺ وعليه عمل اهل الحرمين اليوم، ولكن ينبغی تقييده بوقت الضرورة كما اذا حضرت المسجد للطواف فی الحج والعمرة فلا بأس لها بأن تصلی فيه وحدها او جماعة أو حضرت المسجد النبی للتسليم والصلوة على النبی ﷺ فلا بأس لصلاتها فی المسجد تحية أو مكتوبة واما ان تاتی المسجد الحرام أو المسجد النبوی لاجل الصلوة فحسب فينافيه قوله ﷺ "صلاتک فی بيتک خير من صلاتک فی حجرتک" الى ان قال: "ومن صلاتک فی مسجدی" والله تعالى اعلم

وفی الهداية (۱/۸۶): (ويكره لهن حضور الجماعات) يعنی الشواب منهن لمافيه من خوف الفتنة (ولا بأس للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء) وهذا عند ابی حنيفة (وقالا يخرجن فی

الصلوات كلها) لانه لا فتنه لقلة الرغبة فلا يكره كما في العيد وله ان فرط الشبق حامل فتقع الفتنة غير ان الفساق انتشارهم في الظهر والعصر والجمعة اما في الفجر والعشاء هم نائمون وفي المغرب بالطعام مشغولون.

وفي الدر المختار(۲/۲۲۴،۲۲۵،۲۲۶): (وكرهت تحريماً) وقيل (تنزيها في مسجد جماعة هو) اى الميت (فيه) وحده أو مع القوم.

(واختلف في الخارجة) عن المسجد وحده او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً خلاصة، بناءً على أن المسجد انما بني للمكتوبة وتوابعها كنافلة وذكر وتدريس علم وهو الموافق لا طلاق حديث ابي داؤد "من صلى على ميت في المسجد فلاصلاة له".

وفي الشامية(۲/۲۲۵): (قوله مطلقاً) اى في جميع الصور المتقدمة كما في الفتح عن الخلاصة وفي مختارات النوازل سواء كان الميت فيه او خارجه هو ظاهر الرواية وفي رواية لايكره اذا كان الميت خارج المسجد(قوله بناء على أن المسجد الخ) أما اذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره اذا كان الميت خارج المسجد وحده او مع بعض القوم قال في شرح المنية: واليه مال في المبسوط والمحيط" وعليه العمل وهو المختار اهـ قلت: بل ذكر غاية البيان والعناية انه لا كراهة فيها بالاتفاق.

(۴۵۸) بم دھماکے میں مرنے والے اہل تشیع کا حکم

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ میں شیعہ، سنی مختلف مکاتب فکر کے لوگ رہتے ہیں گزشتہ رات شیعوں کے امام بارگاہ میں دھماکہ ہوا جس کی وجہ سے وہاں موجود لوگوں میں دس پندرہ آدمی مرگئے اور اس طرح دو راہگیر سنی مسلمان بھی مرگئے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ شیعہ شہید ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اسی طرح جو دو مسلمان راہگیر مرگئے ہیں وہ شہید ہیں یا نہیں؟ ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عربی حوالوں کے ساتھ تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ خصوصی فضل وکرم کا معاملہ ہے۔ کوئی مسلمان بیماری، ایکسیڈنٹ یا کسی حادثہ میں مرجائے تو شہید ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی شہادت اخروی ہے دنیا میں شہید کے احکام اس کے نہیں ہیں۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں دھماکہ میں مرنے والے دو سنی مسلمان شہید ہیں۔ البتہ ان کی شہادت اخروی ہے۔ اس لئے شہید کے دنیاوی احکام ان کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ عام اموات کی طرح غسل، کفن وغیرہ دیا جائے گا۔

باقی شیعہ کے متعلق اگر یہ ضروریات دین اور صریح نصوص کے منکر ہیں مثلاً قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں۔ یا جبرئیل امین (علیہ

(السلام) سے وحی لانے میں غلطی کرنے کا قول کرتے ہیں، یا قذف عائشہ رضی اللہ عنہا کو برحق سمجھتے ہیں، وغیرہ تو ان کو تو بتصریح فقہاء کافر ہیں۔ جبکہ مرتبہ شہادت مسلمانوں کیلئے ہے کوئی کافر کسی حال میں بھی مرجائے وہ شہید نہیں ہوتا۔

لمافی عمدۃ القاری (۱۴/۱۲۷): (باب الشهادة سبع سوى القتل) اى هذا باب يذكر فيه الشهادة سبع اى سبعة انواع وكونها سبعا باعتبار الشهداء ولهذا جاء فى حديث جابر بن عتيك عن رسول الله ﷺ الشهداء سبعة انواع سوى القتل فى سبيل الله تعالى المطعون شهيد والغريق شهيد وصاحب ذات الجنب والمبطون شهيد والحريق شهيد والذى يموت تحت الهدم شهيد والمرأة بجمع شهيد الحديث فى الموطا.

وفى الهندية(۲/۲۶۴): الرافضى اذا كان يسب الشيخين ويلعنهما والعياذ بالله فهو كافر وان كان يفضل عليا كرم الله تعالى وجهه على أبى بكر رضى الله عنه لا يكون كافرا الا انه مبتدع — إلى قوله ولو قذف عائشة رضى الله عنها بالزنى كفر بالله — الى قوله من أنكر امامة ابى بكر الصديق رضى الله عنه فهو كافر وعلى قول بعضهم هو مبتدع وليس بكافر والصحيح انه كافر وكذلك من انكر خلافة عمر رضى الله عنه فى اصح الاقوال كذا فى الظهيرية.

وفى الشامية على الدر(۴/۲۳۷): نعم لاشك فى تكفير من قذف السيدة عائشة رضى الله تعالىٰ عنها او انكر صحبة الصديق او اعتقد الالوهية فى على أو ان جبريل غلط فى الوحى، او نحو ذلك من الكفر الصريح المخالف للقران، ويكن لو تاب تقبل توبته.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۲/۱۵۸۳): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغى او قطاع الطريق او اللصوص فى منزله ليلا او نهارا باى آلة: مثقل اومحدد او وجد فى المعركة وبه أثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من أذن اوعين أو قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفا (بالغا عاقلاً) طاهرا (خاليا من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعد انقضاء الحرب اى لا يموت عقب الاصابة — إلى قوله وبه تبين ان شروط تحقق الشهادة عندهم هى الاسلام والعقل والبلوغ والطهارة من الحدث الاكبر وان يموت عقب الاصابة.

(۳۵۹) سیلاب، زلزلہ وغیرہ میں مرنے والوں کی شہادت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ابھی چند دن پہلے بلوچستان میں ضلع زیارت پر خوفناک زلزلہ آیا اور اس میں کئی گاؤں تباہ ہوگئے اور بہت سے افراد مر گئے، زید کہتا ہے کہ یہ لوگ چونکہ زیادہ گنہگار تھے اس لئے ان پر یہ

زلزلے آتے ہیں اور یہ ان کی سزا ہے جبکہ عمر کہتا ہے کہ ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خاص فضل وکرم ہے کہ ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے اگر عام عذاب آجائے جیسے زلزلہ، سیلاب وغیرہ تو اس سے ان کے گناہ دھل جائیں گے اور اس میں مرنے والوں کی موت شہادت کی موت ہوگی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ سیلاب، زلزلہ، یا دوسری ناگہانی آفات سے جو اموات واقع ہوتی ہیں ان کو شہادت کہنا درست ہے، نیز اس میں مرنے والوں کے غسل اور کفن دفن عام اموات کی طرح ہوگا یا کوئی فرق ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ـــــ شہید کی دو قسمیں ہیں:

شہید کی پہلی قسم یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں شہید ہو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہو جائے یا اس کو ظلماً قتل کیا جائے اور وہ کچھ دنیاوی نفع بھی حاصل نہ کرسکے، اس شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جائے گا اور اس کو اپنے خون آلود کپڑوں میں دفن کیا جائے گا البتہ اس سے زائد کپڑے، کوٹ، واسکٹ، اور اسلحہ وغیرہ نکال دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو شہید کا درجہ ملے گا۔

شہید کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف آخرت میں شہید کہلائے گا اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو دین کی فکر میں مرجائے یا کسی ناگہانی موت مرجائے ایسے شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو ان شاء اللہ شہید کا ثواب ملے گا، لہٰذا صورت مسئولہ میں زلزلہ، سیلاب، اور ناگہانی آفات میں مرنے والوں کو عام مردوں کی طرح غسل اور کفن دیا جائے گا اور ان کو شہداء کہنا درست ہے۔ البتہ رہی زید کی بات کہ یہ لوگ گنہگار تھے اس لئے ان پر زلزلے آتے ہیں تو گناہ شہادت کے منافی نہیں اگر کسی آدمی پر گناہ کی حالت میں شہادت کے اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے موت واقع ہو جائے تو اس کو شہید کا ثواب ملے گا البتہ اس پر اپنے ناجائز عمل کا گناہ ہوگا۔

لما فی تکملة فتح الملهم (۳/۳۶۲): قوله والشهید فی سبیل الله یعنی من قتل مجاهداً فی سبیل الله تعالیٰ، وهذا الأخیر هو الشهید فی احکام الدنیا والآخرة فلا یغسل، ویدفن فی ثیابه بشرط ان لا یکون مرتثاً ویلحق به عند الحنفیة من قتل ظلماً بجارحة ولم یوجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربی أو قاطع طریق ولو بغیر آلة جارحة أو وجد جریحاً میتاً فی محل القتال کما فی الدر المختار، فهؤلاء کلهم شهداء فی حکم الدنیا والآخرة، وأما الأنواع الأخرى فهم شهداء فی احکام الآخرة دون الدنیا، فیغسلون ویکفنون، ولهم فی الآخرة أجر شهید، وقد وردت روایات أخرى الحقت کثیراً من الانواع بهؤلاء الاربعة فی احکام الآخرة وکونهم ماجورین أجر الشهداء، وقد جمع الحافظ ابن حجر عشرین کما هنا وجمع السیوطی نحو الثلاثین، ومنها "من مات بالسل أو الغرق أو الهدم، أو بالعطش۔۔۔ الخ.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۵۹۰): والخلاصة: إن كل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعركة حيا أو مات في اثناء الغربة أو طلب العلم أو ليلة الجمعة، فهو شهيد الآخرة وحكم هؤلاء الشهداء في الدنيا، أي شهداء الآخرة، أن الواحد منهم يغسل، ويكفن ويصلى عليه اتفاقاً كغيره من الموتى، أما في الآخرة فله ثواب الآخرة فقط، وله أجر الشهداء يوم القيامة.

وفی الشامية (۲/۲۵۳): (حاشية) ذكر الأجهوري قال في العارضة: من غرق في قطع طريق فهو شهيد وعليه إثم معصيته وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وإن مات في معصية بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعليه إثم معصيته، وكذالك لو قاتل على فرس مغصوب أو كان قوم في معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم إثم المعصية

(۴۶۰) گرمی کی شدت سے مرجانے والے کی شہادت کا حکم

سوال　کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید اخروی کی بہت سی اقسام احادیث میں ذکر ہیں کیا وہ شخص جو گرمی کی شدت سے مرجائے وہ شہید اخروی ہے یا نہیں؟ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں شہر میں اتنے افراد گرمی کی شدت سے جاں بحق ہو گئے اور فلاں شہر میں اتنے۔ برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب سے جلد سرفراز فرمائیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً　تتبع اور تلاش کے بعد تقریباً پچاس ایسے افراد ملے ہیں جن کو مختلف کتب میں شہداء اخروی کہا گیا ہے اور ان میں اکثر وہ شہداء ہیں جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے اور ان تمام شہداء کے مجموعے سے دو اصول سمجھ میں آتے ہیں ایک اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی دینی فکر میں مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ وہ طالب علم جو کہ علم شرعی کی طلب میں مرجائے یا وہ شخص جو اللہ کے راستے میں بستر پر مرجائے یا وہ شخص جو کہ امت کے فساد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھام لے وغیرہ وغیرہ اور دوسرا اصول یہ ہے کہ جو شخص ناگہانی موت مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ پانی میں غرق ہو کر مر گیا یا جس کو درندوں نے مار کر قتل کر دیا ہو یا وہ شخص کہ جس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور اس کی موت واقع ہو گئی ہو وغیرہ وغیرہ لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ شخص جو کہ گرمی کی شدت سے مرجائے وہ بھی ناگہانی موت میں داخل ہے اور ان شاء اللہ شہید اخروی ہے۔

لما فی فتح الباری (۶/۴۳،۴۴): ويحتمل أن يكون أراد التنبيه على ان الشهادة لا تنحصر في القتل بل لها أسباب أخر وتلك الاسباب اختلفت الاحاديث في عددها ففي بعضها خمسة وفي بعضها سبعة والذي وافق شرط البخاري الخمسة فنبه بالترجمة على أن العدد الوارد ليس على معنى التحديد انتهى　والذي يظهر أنه ﷺ أعلم بالاقل ثم اعلم بزيادة على ذالك فذكرها في وقت آخر ولم يقصد الحصر في شيء من ذالك وقد اجتمع لنا من الطرق الجيدة اكثر من عشرين

خصلة فان مجموع ماتقدم مما اشتملت عليه الأحاديث التي ذكرتها أربع عشرة خصلة وتقدم في باب من ينكب في سبيل الله حديث أبي مالك الأشعري مرفوعا من وقصه فرسه أو بعيره أو لدغته هامة أو مات على فراشه على أي حتف شاء الله تعالى فهو شهيد وصحح الدار قطني من حديث ابن عمر موت الغريب شهادة ولابن حبان من حديث أبي هريرة من مات مرابطا مات شهيداً الحديث وللطبراني من حديث ابن عباس مرفوعاً المرء يموت على فراشه في سبيل الله شهيد وقال ذالك ايضاً في المبطون واللديغ والغريق والشريق والذي يفترسه السبع والخار عن دابته وصاحب الهدم وذات الجنب ولابي داؤد من حديث ام حرام المائد في البحر الذي يصيبه القئ له اجر شهيد وقد تقدمت احاديث فيمن طلب الشهادة بنية صادقة انه يكتب شهيداً في باب تمني الشهادة ويأتي في كتاب الطب حديث لمن صبر في الطاعون انه شهيد وتقدم حديث عقبة بن عامر فيمن صرعته دابته وانه عند الطبراني وعنده من حديث ابن مسعود باسناد صحيح ان من يتردى من رؤس الجبال وتأكله السباع ويغرق في البحار لشهيد عند الله ووردت احاديث اخرى في امور اخرى لم أعرج عليها لضعفها قال ابن التين هذه كلها ميتات فيها شدة تفضل الله على أمة محمد ﷺ بان جعلها تمحيصا لذنوبهم وزيادة في أجورهم يبلغهم بها مراتب الشهداء (قلت) والذي يظهر أن المذكورين ليسوا في المرتبة سواء   ويتحصل مما ذكر في هذه الاحاديث ان الشهداء قسمان شهيد الدنيا وشهيد الآخرة وهو من يقتل في حرب الكفار مقبلاً غير مدبر مخلصاً وشهيد الآخرة وهو من ذكر بمعنى انهم يعطون من جنس أجر الشهداء ولا تجري عليهم احكامهم في الدنيا

وكمافي تكملة فتح الملهم (۳/ ۴۹۲، ۴۹۳)

وكمافي الشاميه (۲/ ۲۵۲)

(۳۶۱) ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کی شہادت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دینی مدرسہ میں حفظ کررہا ہوں اور چند دن پہلے چھٹی کے موقع پر ہم گھر جارہے تھے کہ رات کو ایک جگہ پر ہماری بس دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی اور ایکسیڈنٹ ہوا جس کے نتیجے میں کافی سارے لوگ زخمی ہوگئے اور چند حضرات موقع ہی پر مر گئے اور دو تین آدمی چند دن زخم کی حالت میں رہ کر آخرکار زخموں کی تاب نہ لاسکے اور رخصت ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آیا یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ نیز ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: بصورت مسئولہ میں ایکسیڈنٹ میں فوت ہونے والے افراد صرف آخرت کے اعتبار سے شہید ہیں لہٰذا ان کو غسل

دیا جائے گا اسی طرح عام مُردوں کی طرح کفن اور دفن کا انتظام کیا جائے گا۔

لما فی تکملة فتح الملهم(۳/۲۲۲): قوله والشهيد في سبيل الله يعني من قتل مجاهداً في سبيل الله تعالى، وهذا الأخير هو الشهيد في احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن في ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً في معركتهم كما في الدر المختار، فهو لاء كلهم شهداء في حكم الدنيا والاخرة، وأما الاربعة الاولى فهم شهداء في أحكام الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم في الأخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخرى الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة في احكام الاخرة وكونهم ماجورين أجر الشهداء، وعدّهم الحافظ ابن حجر عشرين كمامرّ وعدّهم السيوطي نحو الثلاثين، وهي "من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم، أو بالجنب ... الخ.

وفي الفقه الاسلامي (۲/۱۵۹۰): والخلاصة، إن كل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعركة حيا أو مات في اثناء الغربة أو طلب العلم أو ليلة الجمعة، فهو شهيد الاخرة وحكم هولاء الشهداء في الدنيا، أي شهداء الاخرة، أن الواحد منهم يغسل، ويكفن ويصلى عليه اتفاقاً كغيره من الموتي، أما في الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجر الشهداء يوم القيامة.

وفي الشامية(۲/۲۵۳): (خاتمة) ذكر الأجهوري قال في العارضة: من غرق في قطع طريق فهو شهيد وعليه إثم معصيته وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وان مات في معصية بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعليه إثم معصيته، وكذلك لو قاتل على فرس مغصوب أو كان قوم في معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم إثم المعصية.

(۳۶۲) جو شخص اپنی یا مسلمانوں کی جان ومال کا دفاع کرتے ہوئے مرجائے وہ شہید ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ... میں دو مسلمان جماعتوں کے درمیان لڑائی ہوئی زمین کے سلسلے میں جس میں ایک جماعت برحق اور مظلوم تھی اور دوسری جماعت بالکل ظالم تھی مظلوم جماعت سے دو آدمیوں کو پتھروں سے قتل کیا گیا اور دونوں جنگ کے موقع پر ہی وفات پاگئے اور نہ کوئی بات کی اور نہ کچھ کیا اور ان میں ایک کا قاتل بھی معلوم ہوا، اور دوسرے کا قاتل معلوم نہیں ہوا بلکہ جماعت کے ہر فرد پر شبہ قتل کیا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان ہلاک شدگان میں سے کس کو غسل دیا جائے اور کس کو غسل نہ دیا جائے، تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ جو آدمی اپنی جان، مال، اہل یا مسلمانوں کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے، چاہے کسی بھی آلہ سے ہو شرعاً شہید ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شہید کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی غسل نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے۔

لما في الهندية (۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة بأي آلة قتل بحديد أو حجر أو خشب فهو شهيد كذا في محيط السرخسي

وفيه أيضاً (۱/۱۶۸): وحكمه ان لا يغسل ويصلى عليه كذا في محيط السرخسي ويدفن بدمه وثيابه كذا في الكافي.

وفي الشامية (۲/۲۴۹): ومفاده أنه لو كانت إحدى الفرقتين ظالمة للأخرى بأن علموا حالهم لايغسل من قتل من الأخرى وإن جهل قاتله عينا لكونه مدافعا عن نفسه و جماعته تأمل.

(۲۶۳) عدالت کی طرف سے کسی کو ظلماً قتل کرنا

سوال ــــ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد اکرم ایک دیندار آدمی ہے پچھلے سال انہوں نے چار مہینے بھی لگائے لیکن اس کا بھائی محمد انور ایک شریر آدمی ہے اور اس نے ایک آدمی کو قتل کیا اور فرار ہوگیا جس کی وجہ سے محمد اکرم کو پولیس نے گرفتار کیا اور جھوٹے گواہوں کی گواہی کی وجہ سے عدالت نے ان کو سزائے موت سنائی جو کہ دو تین دن میں ہونے والی ہے۔ حالانکہ وہ اس قتل میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ عدالت اگر کسی شخص کو ناحق سزا دے جس کی وجہ سے وہ مر جائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں؟ اور اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ــــ شہید کی تعریف میں وہ شخص داخل ہے جس کو بغیر گناہ اور ناحق قتل کیا گیا ہو، اور جس کا بدل اصلاً قصاص ہو نہ کہ دیت۔ صورت مسئولہ میں اگر گواہوں کے ذریعہ ثابت ہو جائے کہ یہ گواہ جھوٹے تھے تو قصاص نہ قاضی پر لازم ہوتا ہے اور نہ ورثاء پر، بلکہ اس صورت میں ورثاء پر دیت لازم ہوگی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی کو حاکم اور یا قاضی ظلماً قتل کروائے تو اس مظلوم مقتول کو شرعاً شہید اخروی قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص محمد اکرم کو غسل اور کفن دے کر دفن کیا جائے۔

لما في الهندية (۱/۱۶۷): وهو في الشرع من قتله أهل الحرب والبغي وقطاع الطريق او وجد في معركة وبه جرح او يخرج الدم من عينه أو اذنه او جوفه ــــ او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية وكذا ان قتله أهل الذمة او المستأمنون

ولو وجبت الدية بصلح او بقتل الأب ابنه لا تسقط الشهادة لأن الواجب القصاص لكنه سقط بالصلح او الشبهة

لازم نہ سمجھا، اگرچہ درست ہے لیکن "نماز جنازہ کے بعد" کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے جا کر یہ بدعت کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس کو لازم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ تخصیص ختم کرنا چاہیے بلکہ اس کے علاوہ جب چاہے بطور ایصال ثواب کے پیسے دے سکتا ہے۔

(۵) نماز جنازہ خود دعا ہے اور نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا کرتا ہے اس لئے فقہاء کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا ممنوع لکھا ہے۔ لہٰذا نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا بدعت ہے۔ جس کا خیر القرون میں کوئی ثبوت نہیں۔

لما فی صحیح مسلم (۴۱/۲): عن ابی هريرة ان رجلا قال للنبی ﷺ ان ابی مات وترک مالا ولم يوص فهل يكفر عنه أن اتصدق عنه قال نعم.

وفی شرح المسلم للنووی (۴۱/۲، ۱۳۰): فان الصدقة تصل الى الميت وينتفع بها بلا خلاف بين المسلمين وهذا هو الصواب ...... وذهب جماعة من العلماء الى انه يصل الى الميت ثواب جميع العبادات من الصلاة والصوم والقراءة و غير ذلک وفی صحيح البخاری فی باب من مات وعليه نذر ان ابن عمر امر من ماتت امها وعليها صلوة ان تصلی عنها الخ

وفی شرح العقائد (ص ۱۷۲): وفی دعاء الاحياء للاموات وصدقتهم ای صدقة الاحياء عنهم ای عن الاموات نفع لهم ای للاموات ...... ولنا ما ورد فی الاحاديث الصحاح من الدعا للاموات خصوصا فی صلاة الجنازة وقد توارثه السلف فلو لم يكن للاموات نفع فيه لما كان له معنى وقال عليه السلام ما من ميت تصلی عليه امة من المسلمين يبلغون مائة كلهم يشفعون الا شفعوا فيه وعن سعد بن عبادة انه قال يا رسول الله ان ام سعد ماتت فای الصدقة افضل قال الماء فحفر بيرا وقال هذا لام سعد.

وفی الشامية (۲/۲۴۳): مطلب فی القراءة للميت واهداء ثوابها له. (تنبيه) صرح علماء نا فی باب الحج عن الغير بان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة او صوما او صدقة او غيرها كذا فی الهداية، بل فی زكاة التتارخانية عن المحيط: الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوی لجميع المؤمنين والمؤمنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شئ اهـ هو مذهب اهل السنة والجماعة ...... ولهذا اختاروا فی الدعاء: اللهم اوصل مثل ثواب ما قرأته الى فلان، واما عندنا فالواصل اليه نفس الثواب وفی البحر: من صام اوصلی او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز، ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة كذا فی البدائع

وفی الشامية (۲/۲۴۰، ۲۴۱): ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من اهل الميت لانه شرع فی السرور

لافی الشرور، وهی بدعة مستقبحة، وروی الامام احمد وابن ماجة باسناد صحیح عن جریر بن عبدالله قال ((کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة)) اهـ وفی البزازیة: ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة سورة الانعام او الاخلاص. والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الاکل یکره۔۔۔۔ واطال ذلک فی المعراج وقال: وهذه الافعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لانهم لا یریدون بها وجه الله تعالیٰ اهـ

وفی المرقاة شرح المشکوٰة (۳/ ۱۳۹): ولا یدعوا للمیت بعد صلاة الجنازة لانه یشبه الزیادة فی صلاة الجنازة.

وفی البزازیة علی هامش الهندیة (۴/ ۸۰): لایقوم بالدعاء بعد صلاة الجنازة لانه دعا مرة لان اکثرها دعاء.

وفی الدر المختار (۲/ ۱۴۰): ۔۔۔ لان الجهلة یعتقدونها سنة او واجبة وکل مباح یؤدی الیه فمکروه.

(۴۶۵) مظاہروں اور ہڑتالوں وغیرہ کے موقع پر مرنے والے پولیس اہلکاروں کا حکم

سوال۔۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے زمیندار ایکشن کمیٹی کی کال پر مظاہرہ ہوا۔ شروع میں مظاہرہ پُر امن طریقے سے جاری رہا۔ تھوڑی دیر بعد مظاہرہ والوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور فائرنگ شروع ہوئی اور پولیس نے حالات کنٹرول کرنے کیلئے ہوائی فائرنگ کی جس میں چار، پانچ آدمی مر گئے جن میں دو پولیس والے بھی شامل تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ اور ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ نیز اس طرح مظاہروں ہڑتالوں، انتخابات کے موقع پر یا ڈاکوؤں وغیرہ سے مقابلہ کے دوران جو پولیس والے مرتے ہیں ان کو شہادت نصیب ہوگی یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں اور عندالناس مشکور ہوں۔

الجواب حامداً و مصلیاً۔۔۔ شہادت کی دو قسمیں ہیں دنیوی اور اخروی، شہادت اخروی ایسی شہادت کو کہتے ہیں جس میں آخرت میں تو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اور انہیں دنیا وی شہید جیسا اعزاز و اکرام کیا جاتا ہے لیکن ان پر شہیدوں کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوتے ایسی شہادت پانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، آگ میں جل کر مرنے والا مکان کے نیچے دب کر مرنے والا اور اتفاقی حادثے میں مرنے والا انہیں میں داخل ہے۔ شہادت دنیوی جس میں دنیا میں بھی شہیدوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اس سے مراد ہر وہ مکلف مسلمان ہے جس کو ظلماً آلہ جارحہ سے قتل کیا گیا ہو، اور وہ قتل موجب قصاص ہو، اور وہ مقتول حدث اکبر سے پاک ہو، اور زخمی ہونے سے لے کر وفات تک زندگی کا کوئی فائدہ مثلاً کھانا پینا دوا کرنا وغیرہ نہ پایا جائے اور جو باغیوں، ڈاکوؤں اور میدان جنگ میں کافروں سے لڑتے ہوئے مارا جائے وہ بھی اسی شہادت دنیوی میں داخل ہے خواہ وہ کسی طرح بھی قتل کریں، اسی طرح وہ

شخص بھی اسی شہید کے حکم میں ہے جو کہ اپنی جان مال یا مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے۔ ایسے شہید کا حکم یہ ہے کہ اسے غسل نہ دیا جائے بلکہ ان ہی کپڑوں سمیت نماز پڑھ کر دفن کر دیا جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جو پولیس والے لوگوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے جاتے ہیں وہ تو دنیاوی احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ باقی ہڑتال و مظاہرے وغیرہ اگر جائز حق کیلئے اور ظالم حکومت کو ظلم سے روکنے کیلئے ہوں اور پر امن مظاہرہ ہو، اس میں کسی کی جان و مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو چونکہ یہ جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہوتا ہے اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکے تو وہ ظلم کرنے والے ہوں گے اب جو عوام مر جائیں وہ شہید دنیوی ہوں گے اور پولیس والے چونکہ ظالم ہیں اس لئے وہ شہید نہ ہوں گے۔ اور اگر ہڑتال والے شر و فساد کریں لوگوں کی جان و مال کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ چونکہ جائز نہیں اگرچہ ہڑتال کسی جائز حق کیلئے ہو، اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکنے کیلئے لڑائی کرے اور دوران لڑائی پولیس والے مر جائیں تو وہ شہید ہوں گے کیونکہ یہ ظلماً قتل کئے گئے اور مدافع عن نفسہ و عن المسلمین بھی ہیں۔

لما فی تکملة فتح الملهم (۳/۳۲۲، ۳۲۵): وهذا هو الطریق المشروع للضغط علی الحکومات فی سبیل اقامة شرع الله وتطبیق احکامه واما ما تفعله الناس من القرب من الوسائل الضغط علی الحکومات کالاضطرابات والمظاهرات وسد الشوارع وسفک الدماء وتخریب العمران فلیس من الاسلام فی شئ.

وفی الهندیة (۱/۱۶۷): وهو فی الشرع من قتله اهل الحرب والبغی وقطاع الطریق او وجد فی معرکة وبه جرح او یخرج الدم من عینه او اذنه او جوفه او به اثر الحرق او وطئته دابة العدو وهو راکبها او سائقها و کدمته او صدمته بیدها او برجلها او نفروا دابته بضرب او زجر فقتله او طعنوه فالقوه فی ماء اونار او رموه من سور او اسقطوا علیه حائطاً او رموا ناراً فینا او هبت بها ریح الینا او جعلوها فی طرف خشب راسها عندنا او ارسلوا الینا ماء فاحترق او غرق مسلم، او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دیة.

وفی الدر المختار (۲/۲۴۷): باب الشهید (هو کل مکلف مسلم طاهر) ــــ (قتل ظلماً) بغیر حق (بجارحة) ای بما یوجب القصاص (ولم یجب بنفس القتل مال) بل قصاص، وکذا یکون شهیدا لو قتله باغ او حربی او قاطع طریق ولو تسبباً او بغیر الة جارحة فان مقتولهم شهید بأی الة قتلوه ــــ

(۳۶۶) شہید دنیوی میں عدم ارتثاث کی قید کا حدیث سے ثبوت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید دنیوی کی تعریف میں جو عدم ارتثاث کی قید لگائی جاتی ہے کہ اس شخص نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، آیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا جیسا کہ حضرت عمرؓ وہ شہید دنیوی نہ ہوں گے؟ نیز کسی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ ان

کو غسل دیا گیا تھا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: شہید دنیوی کی تعریف میں فقہاء کرام جو عدم ارتثاث کی قید لگاتے ہیں یعنی اس نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، یہ احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے اور انہوں نے دنیا کا کوئی نفع نہیں اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بغیر غسل کے دفن کرنے کا حکم فرمایا جیسے شہداء احد (صحیح البخاری ۵۸۴/۲)۔ اور جن صحابہ کرام نے شہادت کے بعد دنیا کا کوئی نفع اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غسل دینے کا حکم فرمایا جیسے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (کتاب المغازی للواقدی ۵۲۵/۲) اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں جو شہداء دنیا کا کوئی نفع حاصل کرتے ان کو غسل دیا جاتا جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ۔

یہ احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ غسل دینے اور نہ دینے میں ارتثاث اور عدم ارتثاث کی قید ملحوظ ہے۔ یعنی شہید مرتث کو غسل دیا جائے گا اور شہید غیر مرتث کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا ہے وہ شہید دنیوی نہ تھے بلکہ ان کو غسل دیا گیا تھا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ۔ اور روایات سے ان کو غسل دینا ثابت ہے۔ (جیسے موطا للامام مالک رحمہ اللہ (ص ۳۴۸) مطبع نور محمد، الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۶۷/۳ مکتبہ دار الفکر، کتاب المغازی للواقدی ۵۲۵/۲ مؤسسۃ الاعلمی)

لما في صحيح البخاري (۵۸۴/۲): عن ابن شهاب عن عبدالرحمن بن كعب بن مالك ان جابر بن عبدالله اخبره ان رسول الله ﷺ كان يجمع بين الرجلين في قتلى احد في ثوب واحد ثم يقول ايهم اكثر اخذا للقرآن فاذا اشير له الى احد قدمه في اللحد وقال انا شهيد على هؤلاء يوم القيامة وامر بدفنهم بدمائهم ولم يصل عليهم ولم يغسلوا.

وفي سنن ابي داؤد (۴۴۷/۲): عن ابن عباس قال امر رسول الله ﷺ بقتلى احد ان ينزع عنهم الحديد والجلود وان يدفنوا بدمائهم وثيابهم.

وفي الموطا للامام مالك رحمه الله (ص ۳۴۸): مالك عن نافع عن عبدالله بن عمر ان عمر بن الخطاب غسل وكفن وصلي عليه وكان شهيدا يرحمه الله.

وفي الطبقات الكبرى لابن سعد (۶۷/۳): وبعث الاشعث بن قيس ابنه قيس بن الاشعث صبيحة ضرب علي عليه السلام فقال: اي بني انظر كيف اصبح امير المؤمنين. فذهب فنظر اليه ثم رجع فقال: رايت عينيه داخلتين في راسه، فقال الاشعث: عيني دميغ ورب الكعبة، قال ومكث علي يوم الجمعة وليلة السبت وتوفي رحمة الله عليه وبركاته ليلة الاحد لاحدى عشرة ليلة بقيت من شهر رمضان سنة اربعين. وغسله الحسن والحسين وعبدالله بن جعفر وكفن في ثلاثة اثواب ليس فيها قميص.